محمد اسد
بندۂ صحرائی
خودنوشت سوانح عمری
1932ء - 1992ء
محمد اسد
پولا حمیدہ اسد
مترجم / مرتب
محمد اکرام چغتائی

Marfat.com

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

Marfat.com

محمد اسد۔ بندۂ صحرائی

(خودنوشت سوانح عمری، 1932ء۔1992ء)

ذخیرہ محمد اقبال مجددی

محمد اسد

پولا حمیدہ اسد

مترجم / مرتّب

محمد اکرام چغتائی

Marfat.com

138221

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ISBN-978-969-9363-00-9

طبع اول	2009
تعداد	500
مترجم / مرتّب	محمد اکرام چغتائی
قیمت	500-00

ناشر

دی ٹروتھ سوسائٹی

81-A2، گلبرک III، لاہور

مشیران

پروفیسر ڈاکٹر شاہد وہاب

ڈاکٹر عثمان احمد

محمد افضل دیوڑا

ملنے کا پتہ

کوآپرا بک سنٹر اینڈ آرٹ گیلری، 70- شاہراہ قائد اعظم، لاہور (042-7321161,7322926)

پروگریسو بکس، یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور (042-7352795, 7124354)

طابع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

Marfat.com

ڈاکٹر فریڈرش پوش (ستارۂ قائداعظم)

(Dr. Friedrich Posch)

سابق آسٹرین سفیر در پاکستان

ڈاکٹر ہربرٹ ٹراکسل

(Dr. Herbert Traxl)

سابق آسٹرین سفیر در بھارت

اور

گیارگ مِش

(Georg Misch)

ڈائریکٹر،

دستاویزی فلم ''شاہراہ مکہ'' (بزبان جرمن، 2008ء، ویانا)

کے نام

Marfat.com

Marfat.com

فہرستِ مندرجات

دیباچہ 16

باب اول

ارضِ ہند

(1932ء-1933ء) 21

1- اپنے روحانی مسکن یعنی سعودی عرب سے روانگی

2- ''استاذ افغانستان'' ڈاکٹر عبدالغنی سے ملاقات اور ہندوستان جانے کا فیصلہ

3- مکہ میں مولانا عبدالقادر قصوری سے ملاقات

4- بیوی (منیرہ) اور بچے (طلال) سمیت کراچی آمد

5- کراچی میں مختصر قیام، لاہور آمد اور مولانا عبداللہ قصوری کے گھر قیام (بیرون شیرانوالہ گیٹ)، اندرونِ شہر کی سیر، مسجد وزیر خاں

6- براستہ سیالکوٹ کشمیر روانگی

7- ہندو مذہب اور اسلامی تعلیمات سے اُس کے بنیادی اختلافات

باب دوم

سیاحتِ ہمالیہ

(1933ء) 35

1- کولو (شہر) کی مسلمان رقاصہ

2- کولو کی جانب سفر، منڈی میں قیام

3- کوہ ہمالیہ کی وادیاں

4- کولو میں آمد

5- کولو کے راجا کا محل، یہاں کا ایک مندر

Marfat.com

6- دسہرہ کا تہوار

7- دیوی دیوتاؤں کی تعارفی تقریب

8- مردوں اور عورتوں کا مشترکہ رقص

9- کولو کا ایک مندر

10- ایک مسلمان صوفی سے ملاقات

11- صوفیانہ جماعت کی محفلِ ذکر

12- کولو سے واپسی، ہندوؤں کے ذات پات کے نظام سے شدید نفرت

باب سوم

''اسلام دوراہے پر''

(1933ء-1934ء)

55

1- لاہور میں احباب کی مہمان نوازی، لوگوں کی عادات واطوار پر مغربی اثرات

2- انجمن حمایت اسلام کے زیر اہتمام دو لیکچر، اولیں کتاب ''اسلام دوراہے پر'' کی اشاعت

3- ''اسلام دوراہے پر'' کی مقبولیت، ڈاکٹر محمد اقبال سے پہلی ملاقات

4- اقبال منزل میں آمد، صحیح بخاری کے انگریزی ترجمہ کے متعلق محمد اقبال کا مشورہ

5- سوئٹزرلینڈ کے ایک جرمن اخبار کے لیے مضامین، صحیح بخاری کے ترجمہ کا آغاز، مالی اعانت کے لیے دہلی کے ایک مخیّر مسلمان سے ملاقات

6- چودھری رحمت علی اور سر سکندر حیات خاں سے ملاقات

باب چہارم

سنہری دور

(1934ء-1937ء)

65

1- براستہ مری بیوی بچے سمیت سرینگر آمد اور پُرتکلف دعوت

2- میر واعظ یوسف شاہ کشمیری سے ملاقات، صحیح بخاری (انگریزی) کی طباعت کے لیے نجی پریس کا انتظام، محمد حسین بابری سے ملاقات

3- لاہور میں مختصر قیام، صحیح بخاری کے حصہ اول کا مسودہ تیار

4- صحیح بخاری کے پہلے دو حصوں کی طباعت

Marfat.com

-5 قرآن اوراحادیث کی عربی زبان میں فرق

-6 ایک جلاوطن افغان شہزادے سے ملاقات، نظام دکن سے ملاقات کوحیدرآباد روانگی

-7 نظام دکن سے ملاقات

-8 سراکبرحیدری، مسزاکبرحیدری، ترکی شہزادیوں دُرِّشہوار اور نیلوفر سے ملاقات، محمد اقبال کا سفارشی خط بنام سراکبرحیدری، ''اسلامک کلچر'' کی ادارت

-9 سرینگر واپسی، لاہور میں عرفات پریس

-10 خفیہ پولیس والوں کی مسلسل نگہداشت اوراس سے نجات

-11 والد، ہمشیرہ اور سوتیلی والدہ کو نازیوں سے بچانے کی کوشش، سرینگر سے لاہور منتقلی کی تیاری

-12 چودھری نیازعلی سے پہلی ملاقات، سرینگر سے ایبٹ آباد منتقلی، صحیح بخاری کے ترجمہ کے دوسرے حصہ کی اشاعت

باب پنجم

خنک سال

(1938ء-1945ء) 81

-1 ڈاکٹر محمد اقبال کی وفات اوران کے جنازہ میں شرکت

-2 آسٹریا پر ہٹلر کا غاصبانہ قبضہ، والدین اور اپنے قریبی اعزہ کو بچانے کی کوشش، جسٹس دین محمد کی معاونت، دوسری جنگ عظیم کا آغاز اور گرفتاری

-3 پولیس ہیڈکوارٹرز (راولپنڈی) میں حاضری، واحد مسلمان قیدی (نمبر 622، جو ہجرت کا سال ہے)

-4 احمد نگر میں جنگی قیدیوں کا کیمپ

-5 نازیوں کی ابتدائی کامیابیاں، کیمپ میں مسلمان ملازمین کا حسن سلوک

-6 تفتیشی افسران کی پوچھ گچھ، سرسکندر حیات اور سرظفراللہ خاں کی رہائی کے لیے ناکام کوشش، سیکرٹری امور داخلہ کوخط

-7 کیمپ کی احمد نگر سے صوبہ بمبئی کے ایک شہر کو منتقلی، جرمن یسوعیوں کے سربراہ سے بحث

-8 جنگ میں بالواسطہ شرکت کی پیشکش، سنوسیوں سے تعلق، تفتیش کنندہ سے سوال وجواب

-9 کیمپ کی ڈیرہ دون منتقلی، پونا کے قریب ''فیملی کیمپ'' میں بیوی بچے سمیت قیام، جنگ کے اختتام پر رہائی اور جمال پور میں چودھری نیازعلی سے ملاقات

Marfat.com

باب ششم

تقسیمِ ہند
(1946ء-1947ء)

97

1- تحریک پاکستان اپنے عروج پر، انگریزی ماہنامہ ''عرفات'' کا اجراء

2- بیوی بچے سمیت چودھری نیاز علی خاں کے گھر قیام (جمال پور)، ''عرفات'' کے اجراء کی وجوہ

3- ''عرفات'' کے پہلے اور دیگر شماروں کے اہم مضامین کا ذکر

4- ڈلہوزی کو عارضی منتقلی، ریڈکلف کا جرم

5- مسلم کش فسادات، راشٹریہ سیوک سنگھ کی قتل و غارت

6- ڈلہوزی سے بحفاظت لاہور پہنچنا

7- لاہور میں افراتفری کا عالم، خواجہ عبدالرحیم کے تعاون سے تین بسیں لے کر جمال پور روانگی

8- چودھری نیاز علی مع افراد خانہ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مع رفقائے کار اور دیگر مسلمانوں کو لے کر بحفاظت جمال پور سے لاہور پہنچنا

9- جمال پور میں ذاتی کتب خانہ کی بربادی' دریائے راوی کے پانی پر تیرتے ہوئے مسودات

10- ریڈیو پاکستان (لاہور) سے روزانہ تقاریر کا سلسلہ، قصور میں مولانا عبداللہ قصوری اور محمد علی قصوری سے ملاقات، مقتول اور برہنہ خواتین سے بھری ٹرین کا خوفناک منظر

باب ہفتم

احیائے اسلام
(1947ء-1950ء)

111

1- نواب آف ممدوٹ کی تجویز محکمہ احیاء ملت اسلامیہ کا قیام اور اس ادارے کی سربراہی، مولانا داؤد غزنوی سے رابطہ

2- چمبہ ہاؤس میں رہائش مع بیوی بچہ، کیتھولک اسکول میں بیٹے طلال کا داخلہ، سردار شوکت حیات سے ملاقات، مہاتما گاندھی کا قتل

3- محکمہ احیاء ملت اسلامیہ کی جانب سے مجلّہ ''عرفات'' کا اجراء، وزیراعظم لیاقت علی خاں کا بلاوا اور ان سے سابقہ ملاقاتیں، لیاقت علی خاں اور چودھری محمد علی سے ملاقاتیں، نظام دکن کے خزائن

4- کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی، کشمیر میں استصواب رائے کے لیے اقوام متحدہ کی قرارداد، کشمیر محاذ پر جانے کا فیصلہ

Marfat.com

5- مظفرآباد اور کشمیر محاذ کے اگلے مورچوں کا دورہ

6- میجر جنرل حمید سے ملاقات اور پونچھ کے کشمیر محاذ کی جانب روانگی

7- سیکٹر کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل یعقوب خاں اور میجر جنرل حمید سے ملاقات

8- میجر جنرل حمید کا سرینگر کی طرف پیش قدمی کا منصوبہ، بذریعہ تار وزیر اعظم لیاقت علی خاں کا طے شدہ حملہ منسوخ کرنے کا حکم، پنڈت جواہر لعل نہرو کا برطانوی وزیر اعظم ایٹلی سے رابطہ، سر ظفر اللہ خاں کا وزیر اعظم پاکستان کو ایٹلی کا پیغام پہنچانا، سر ظفر اللہ خاں اور قادیانی جماعت، نہرو کا کشمیر میں استصواب رائے کا وعدہ، وزیر اعظم کے جنگ بندی کے حکم نامہ پر اظہار ناپسندیدگی، میجر جنرل کی محاذ سے واپسی اور بعد میں استعفیٰ

ہوائی حادثہ میں ضیاء الحق کی ہلاکت

باب ہشتم

وزارت خارجہ: شعبہ مشرق وسطیٰ

(1949ء-1951ء)

123

1- لیاقت علی خاں کی تجویز کہ محکمہ احیاء ملت اسلامیہ سے سبکدوش ہو کر وزارت خارجہ میں شامل ہو جائیں

2- سول سروس کمیشن کے صدر نشین حسن سہروردی سے انٹرویو اور کامیابی

3- وزارت خارجہ کے شعبہ مشرق وسطیٰ میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدہ پر تعیناتی، مروجہ سرکاری پالیسیوں پر تنقیدی میمورنڈم برائے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں، سیکرٹری وزارت خارجہ اکرام اللہ سے ملاقات

4- میمورنڈم میں پیش کردہ تجاویز، وزیر اعظم لیاقت علی خاں سے تبادلۂ خیال

5- وزیر اعظم کی تجویز پر مشرق وسطیٰ کے ممالک کا سرکاری دورہ، پہلا پاکستانی پاسپورٹ، جس پر ''پاکستانی شہری'' لکھا گیا

6- پاکستان میں مصری سفیر عبدالوہاب عزام اور شام و سعودی عرب کے سفراء سے ملاقاتیں

باب نہم

اتحاد بین المسلمین

(1951ء)

131

1- مشرق وسطیٰ کے لیے بھیجے گئے سرکاری وفد کا پہلا پڑاؤ سعودی عرب میں، برسوں بعد فریضۂ حج کی ادائیگی، شاہ عبدالعزیز ابن سعود کی ضیافت، اٹھارہ سال بعد شاہ فیصل سے ملاقات

Marfat.com

10

2- سعودی عرب کے شاہ عبدالعزیز اور وزیر خارجہ شاہ فیصل سے ملاقاتیں
3- مدینہ طیبہ میں روضۂ رسولؐ پر حاضری، پرانے احباب سے ملاقاتیں
4- دوسرا پڑاؤ مصر، قاہرہ شہر، ماضی اور حال کے آئینے میں
5- مصری وزیر خارجہ صلاح الدین سے ملاقات، زغلول پاشا سے ملاقات کی یاد
6- دمشق آمد، پرانا اور نیا دمشق، وزیر اعظم شکری قوتلی کا پُر تپاک استقبال
7- شام کی بزرگ ترین مسیحی شخصیت فارس الخوری سے ملاقات
8- دمشق سے بذریعہ کار بغداد آمد، ولی عہد شہزادہ عبداللہ اور وزیر خارجہ فاضل الجمالی سے ملاقات
9- اگلا پڑاؤ ترکی، انقرہ میں پاکستانی سفیر میاں بشیر احمد کے ساتھ نماز جمعہ کی ادائیگی
10- جلال بایار اور عدنان میندریس سے ملاقات
11- وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے قتل کی خبر اور بلا تاخیر پاکستان واپسی، اُس تقریر کے دو اہم نکات جو وزیر اعظم نہ کر سکے
12- نئے پاکستانی وزیر اعظم محمد علی بوگرہ، مشرق وسطیٰ کے دورہ کی رپورٹ برائے ملاحظہ وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں
13- پاکستان اور شام میں معاہدۂ دوستی
14- کراچی میں تیونس کی آزادی کے جلاوطن رہنما حبیب بورقیبہ سے ملاقات
15- بحکم وزیر خارجہ ارجنٹائن میں بطور ناظم الامور تقرری اور پھر منسوخی

باب دہم

اقوام متحدہ میں

145 (1951ء-1952ء)

1- اقوام متحدہ میں تعیناتی بطور ناظم الامور، اقوام متحدہ میں پاکستانی سفیر احمد شاہ بخاری
2- اقوام متحدہ کا اجلاس منعقدہ پیرس، سر ظفر اللہ خاں کی آمد
3- بیٹا طلال لندن میں زیر تعلیم، بیوی بیٹے کی رہائش کا بندوبست، لندن سے نیویارک روانگی، سفیر پاکستان احمد شاہ بخاری سے پہلی ملاقات، جن سے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے
4- مراکش کی استقلال جماعت کے رہنما سے ملاقات، پرانے دوست اور شام کے نمائندے فارس الخوری سے ملاقات
5- ایک دعوت میں نومسلم امریکی خاتون پولا سے ملاقات

Marfat.com

6- پولا کا خاندان اور اس سے ملاقاتیں

7- غیر خود مختار علاقوں کے لیے کمیشن اور اس کی کارروائی

8- اس کمیشن کی صدارت اور بطور صدر نشین اظہار خیال

9- پولا سے رشتۂ محبت کو شادی میں بدلنے کی تجویز اور اس کی قبولیت، بیوی بیٹے کا شدید ردعمل، کسی غیر ملکی خاتون سے شادی سے قبل وزارت خارجہ سے باقاعدہ اجازت، پاکستانی ہائی کمشنر (لندن) اور احمد شاہ بخاری کی جانب سے رخنہ اندازی، ملازمت سے استعفیٰ اور پولا سے شادی، بیٹے طلال کا خط کہ ''میرا باپ مر گیا ہے۔''

حصۂ دوم
(پولا حمیدہ اسد)

باب یازدہم

''شاہراہِ مکہ''
(1952ء-1953ء)

163

1- ''شاہراہ مکہ'' لکھنے کے لیے ایک پرانے دوست کی تحریک، اسد کا استعفیٰ منظور ہونے کے بعد شادی کی تقریب، نیویارک کے دوست، اسد کے ترک اسلام کی افواہ، اس بے سروپا خبر کی تردید کرنے والے پاکستانی احباب، ''شاہراہ مکہ'' کے دو ابواب مکمل، حسن البنا کی بیٹی سے ملاقات

2- ہیوسٹن میں خاندان والوں سے ملاقات، آخری باب کے علاوہ ''شاہراہ مکہ'' کا مسودہ تیار، مالی دشواریاں، طلال کی پڑھائی کا سلسلہ منقطع، جرمن ناشر سے ملاقات، ''شاہراہ مکہ'' کے جرمن ترجمہ کے لیے بذریعہ بحری جہاز جرمنی روانگی

3- برسلز اور فرانکفورٹ سے ہوتے ہوئے ہامبورگ جانے کا ارادہ، اسد کے سوتیلے بیٹے احمد شیمان سے پہلی ملاقات، ہامبورگ میں جرمن ریڈیو سے تقاریر، ہامبورگ سے بلیک فارسٹ کے علاقے باڈن وائیلر نقل مکانی، یہیں ''شاہراہ مکہ'' (بزبان جرمن) کی تکمیل، بون میں سفیر پاکستان کے گھر قیام، باڈن وائیلر کے گھنے جنگلات اور خوبصورت مناظر

4- فرانکفورٹ میں ''شاہراہ مکہ'' (جرمن) ناشر کے حوالے، کراچی کے ایک ادارے سے اسلام کے سیاسی نظام پر کتاب لکھنے کی فرمائش اور اس کی قبولیت، باڈن وائیلر سے روانگی، جے نوا کا خوبصورت شہر

5- بذریعہ کشتی روانگی، نیپلز سے بذریعہ بحری جہاز سفر بجانب بیروت

Marfat.com

باب دوازدہم

مشرقی بحیرۂ روم تا خلیجِ فارس

(1955ء-1957ء)

175

1- بیروت میں پرانے دوست سعید رمضان کا استقبال، دمشق میں فارس الخوری سے ملاقات

2- دمشق میں سعودی عرب کے سفیر شیخ عبدالعزیز بن زید اور شامی دوست شیخ عبدالحمید الخطیب سے ملاقات

3- جمال عبدالناصر کی شہرت، فارس الخوری سے ملاقاتیں

4- تنازعہ نہر سویز، بیروت واپسی، ظفر اللہ خاں اور ان کی نئی بیگم بشریٰ سے ملاقات، اسد کی ناسازیٔ طبع

5- اسد کے قریبی مسیحی دوست خواجہ خوری' حسن البنا کے بہنوئی عبدالحکیم، اسد کے مرض میں اضافہ، انگریزی کتاب بعنوان ''اسلام میں ریاست اور حکومت کے اصول'' کی اشاعت جو ایوب خاں اور ضیاء الحق کی پسندیدہ کتاب تھی۔

6- ''شاہراہ مکہ'' کی اشاعت اور اس کی مقبولیت، بلا اجازت عربی ترجمہ، دیگر زبانوں میں تراجم

7- حمدون میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملاقات، سعودی عرب کے ناظم شعبہ اطلاعات شیخ عبداللہ

8- ابن تیمیہ اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے مزارات (دمشق) کی زیارت، شام کی قومی اسمبلی میں ڈاکٹر محمد اقبال کے فکر وفن پر تقریر اور غیر سنجیدہ سامعین، پنجاب یونیورسٹی (لاہور) سے ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے انتظام وانصرام کی دعوت

باب سیزدہم

دوبارہ پاکستان میں

(1958ء-1959ء)

187

1- کراچی آمد، لاہور کے ہوٹل فلیٹیز میں قیام، پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملاقات، بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں اسد بطور منتظم تعینات، چمبہ ہاؤس لین میں گھر، ماڈل ٹاؤن کے گھر میں منتقلی، لاہور کے پرانے دوستوں سے ملاقات، جنرل بختیار کی دعوت پر پشاور روانگی، لنڈی کوتل اور ٹیکسلا کی سیر، لاہور کی بادشاہی مسجد

2- وائس چانسلر سے اختلاف اور اس کی وجوہ، مولانا مودودی اور اسد کے تعلقات، مولانا مودودی کا میرے مغربی لباس پر اظہار ناپسندیدگی، وائس چانسلر سے اختلافات میں شدت اور اسد کا استعفیٰ، کانفرنس کے مندوبین سے ملاقاتیں

Marfat.com

3- پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ، قرآن کے انگریزی ترجمہ وتفسیر کا مشورہ، قرآن کے بعض انگریزی تراجم، بھارت کی سیر وسیاحت، بھارت میں سعودی عرب کے سفیر شیخ یوسف کی میزبانی، تاج محل، کراچی واپسی، ادارۂ تحقیقات اسلامی کے شریک ناظم کے عہدے کی پیشکش اور اسد کی معذرت

4- کراچی سے بذریعہ بحری جہاز واپسی، مسقط-کویت-بحرین-شارجہ اور قطر میں قیام

5- بذریعہ ہوائی جہاز بغداد روانگی، عراقی احباب کی آؤ بھگت

باب چہاردہم

سوئٹزرلینڈ

(1959ء-1964ء)

197

1- جنیوا میں کرائے کا گھر، منیرہ اور طلال کو پاکستان میں چودھری نیاز علی خاں کے گھر ٹھہرنے کا مشورہ، منیرہ کی سعودی عرب واپسی اور انتقال، جنیوا کے قریب ایک گاؤں میں منتقلی

2- ترجمہ قرآن پر بھرپور توجہ، پالتو کتوں کا شوق، سعودی شہزادہ امیر نواف بن عبدالعزیز سے ملاقات، ترکی کے سابق سلطان عبدالحمید کے پوتے محمد اکرم سے ملاقات، امیر فیصل سے ملاقات، بیٹے طلال کا یہ بتانے کے لیے آنا کہ وہ ایک انگریز لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے، طلال سے تعلقات میں کشیدگی

3- قرآن کا ترجمہ وتفسیر مکمل، صدر محمد ایوب کی جانب سے پاکستان آنے کی دعوت لیکن اسد کی معذرت

4- ترجمہ قرآن کی جزوی اشاعت، قبرص میں مستقل رہائش کا ارادہ، پالتو کتوں کے باعث وہاں منتقلی میں مشکلات، یونانیوں اور ترک قبرصیوں کے مابین جنگ، قبرص جانے کا ارادہ ختم اور تنجیہ (Tangier) جانے کا فیصلہ، اپنا گھر

5- سوئٹزرلینڈ سے رخصتی، سپین کے شہر ملاغہ سے بذریعہ فیری تنجیہ روانگی

باب پانزدہم

تنجیہ (Tangier)

(1964ء-1983ء)

207

1- مراکش کے اس شہر میں کرائے کا مکان، اپنے گھر کی تعمیر، مراکش کی طرز زندگی

2- ذاتی گھر کی تکمیل، شیخ احمد ذکی یمانی سے ملاقات، ترجمہ قرآن میں انہماک اور میری معاونت، قرآن کا مکمل ترجمہ مع تشریحات

Marfat.com

3- غیر ملکی سفارت کاروں اور سبکدوش سیاست دانوں سے سماجی تعلقات، سعودی عرب کے تاجر شیخ سالم سے دوستانہ مراسم

4- رابطہ عالم اسلامی کے بعض علماء کا ترجمہ قرآن سے اختلاف، بعض حصوں کے حذف کرنے کا مطالبہ لیکن اسد کا انکار، اسد کے آٹھ اور میرا پہلا حج

5- عرب اسرائیل جنگ، یروشلم جانے میں دشواری، تیونس کا سرکاری دورہ، صدر حبیب بورقیبہ کی قدر افزائی

6- پالتو کتیا کی موت، سپین کی سیاحت، پالتو کتے عفریت کی موت

7- شاہ فیصل سے جنیوا اور رباط میں ملاقاتیں، شاہ فیصل کا قتل اور اسد کا زار و قطار رونا

8- لندن میں منعقدہ کانفرنسوں میں شرکت، اسلامی کونسل کے سیکرٹری جنرل سالم عزام سے ملاقات، احمد ذکی یمانی سے میری پہلی ملاقات، انگریزی روزنامہ ''عربیا'' کا اجراء، جنوبی افریقہ میں لیکچرز، اسد ٹھوکر لگنے سے زخمی، طلال کا آنا، اسد کا گرنا اور کولہے کی ہڈی کا ٹوٹنا، ہسپتال میں علاج معالجہ اور آپریشن، طلال کی مزاج پرسی، لندن میں آپریشن، اسد کے سوتیلے بھائی مارٹن کی مزاج پرسی، طلال کا اپنی بیوی تانیا کے ساتھ آنا

9- ملائشیا کے سیمینار مین شرکت، سراوک کی ملائشین فیڈریشن میں شمولیت کی سالگرہ پر تقریبات اور ان میں ہماری شمولیت، کوالالمپور میں مختصر قیام اور وزیر اعظم سے ملاقات، ''یہ قانون ہمارے اور دیگر مضامین'' کی اشاعت

10- تنجیہ سے پرتگال نقل مکانی کا فیصلہ، صدر پاکستان ضیاء الحق کی جانب سے بطور سرکاری مہمان بلاوا، اسلام آباد میں پہلی آمد، سرکاری حکام سے ملاقاتیں، لاہور میں پرانے دوستوں سے ملاقات، واپسی کے بعد پاکستان میں مستقل رہائش پذیر اختیار کرنے کے متعلق مراسلات، پرتگال روانگی

باب ششد ہم

پرتگال

(1983ء-1986ء) 231

1- لزبن میں پرانے احباب سے ملاقات، سفیر پاکستان برجیس حسن خاں سے دوستی، ذاتی گھر

2- اسد کے مطالعہ قرآن پر مبنی غیر مطبوعہ انگریزی کتاب، احمد ذکی یمانی کی دعوت پر ہماری سعودی عرب روانگی، ماہ رمضان کی یادگار افطاریاں، مکہ مکرمہ میں طواف کعبہ، مسجد نبوی میں عبادت گزاری، مسلسل تین رمضان سعودی عرب میں، جنیوا میں احمد ذکی یمانی سے ملاقات اور ان کے ساتھ ریاض آمد، ذکی یمانی کی فراہم کردہ سہولتیں

Marfat.com

3- سعودی عرب کے متعدد سفر، افغانی النسل پالتو کتے کی موت، پرتگال سے سپین نقل مکانی

باب سیزدہم

بند گلی

(1987ء-1992ء)

241

1- لندن میں مستقل رہائش کا فیصلہ، سپین واپسی، میجاس میں اپنا گھر

2- جرمنی کے مشہور اخبار کے صحافی کا اسد سے انٹرویو، ضیاء الحق کی جانب سے پاکستان آنے کی دعوت، سفر کی تیاری، ضیاء الحق کے ہوائی حادثہ میں ہلاکت کی خبر، پاکستان جانے کا پروگرام منسوخ

3- پالتو کتے شیطان کی موت، اسد مثانے کے کینسر میں مبتلا، اپریشن، علاج معالجے کے لیے ذکی یمانی کی فراہم کردہ سہولیات، صحت یابی کے بعد نیویارک واپسی، ہوائی اڈہ پر طلال سے آخری ملاقات

4- سپین واپسی، معمولات زندگی کی درستی

5- اسد کی روز بروز گرتی ہوئی صحت، قریبی لوگوں اور کتابوں سے عدم دلچسپی، انتقال پُر ملال، مختلف ممالک کے مقتدر اصحاب کا فون پر اظہار تعزیت، تجہیز و تکفین، بیٹے طلال کی آمد اور آخری رسوم تدفین میں شرکت، الحمرا پہاڑی کے سامنے مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے قبرستان میں تدفین

6- سپین میں سعودی عرب کے قونصل جنرل کی جنازے میں عدم شرکت، احمد ذکی یمانی نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکے

7- اسد کی شخصیت، کردار، مزاج اور عادات، چالیس سالہ رفاقت پر مبنی تاثرات

8- ''شاہراہ مکہ'' سے اقتباس

حواشی 261

Marfat.com

محمد اکرام چغتائی

دیباچہ

پروردگار کے ''انعام یافتگان'' کی طرح بعض کتابیں بھی اسی حوالے سے ''انعام یافتہ'' قرار دی جا سکتی ہیں۔ وہ کسی سرکاری یا غیر سرکاری علمی وادبی ادارے کی پذیرائی کی محتاج نہیں ہوتیں، کسی ثقہ ناقد کے تنقید وتبصرے کی بھی انہیں ضرورت نہیں پڑتی۔ ایسی قلمی نگارشات موضوعی اہمیت اور اسلوب تحریر کے سبب پہچانی جاتی ہیں اور یہی مقبولیت عامہ ان کا حقیقی سرمایہ ہوتا ہے۔ ان تمام صفات اور محاسن کے باوجود ہر دور میں ان کی پسندیدگی اور دائمی شہرت میں کوئی غیر محسوس یا پُر اسرار پوشیدہ عنصر دکھائی دیتا ہے۔ بظاہر اس عنصر کو تفصیل سے بیان کرنا ممکن نہیں، البتہ اس کے پس منظر میں کوئی ایسا پارس ضرور کارفرما نظر آتا ہے، جس کے چھو جانے سے پتھر بھی اپنی ہیئت تبدیل کر لیتا ہے۔ عالمی ادب میں ایسی جانی پہچانی، ہر دلعزیز اور قارئین کو اپنے حصار میں جکڑ لینے والی کتابوں کی صف میں محمد اسد کی The Road to Mecca (شاہراہ مکہ) کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے، جو گذشتہ تقریباً نصف صدی سے ذوق وشوق سے پڑھی جا رہی ہے، مشرق ومغرب کے نامور ناشرین اسے بڑے اہتمام سے شائع کر رہے ہیں اور دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی بڑی زبان ہو، جس میں اس کا ترجمہ موجود نہ ہو۔

''شاہراہ مکہ'' کے منظر عام پر آتے ہی اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور یہ اپنے پہلے سال اشاعت (1954ء) میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں شمار ہونے لگی۔[1] اخبارات ورسائل میں اس کے تصنیفی محاسن پر تفصیل سے اظہار خیال ہونے لگا۔ اس کے مؤثر بیانیہ اسلوب کی گہرائی کے پیش نظر اس کو ڈاؤٹی (Doughty) کے سفرنامہ سے بہتر قرار دیا گیا۔[2] اس میں مہم جوئی کے واقعات کو اعلیٰ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور مسلمانوں بالخصوص عربوں کی حقیقی زندگی کی جھلک واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔[3] یہ کتاب مصنف کے غیر جانبدارانہ رویّے اور ذہنی خصائص کا پتہ دیتی ہے۔[4] اس نے بلاد اسلامیہ کے سفری تجربات وتاثرات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کے لیے نئی راہ متعین کر دی۔[5] اس میں حقیقت وافسانہ کا حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے اور یہ جرمن شاعر گوئٹے کی خودنوشت سوانح عمری Dichtung und Wahrheit (سچائی اور افسانہ) کی یاد دلاتی ہے۔[6] یہ انتہائی دلچسپ اور پُر اثر کتاب ہے۔[7] فریا سٹارک (Freya Stark) کے بعد خطہ عرب پر اس سے زیادہ مفید کتاب شائع نہیں ہوئی۔[8] ان توصیفی تبصروں کے علاوہ چند اصحاب نے ''شاہراہ مکہ'' پر مخالفانہ رائے دی ہے' مثلاً جان (عبداللہ) فلبی (1885ء-1960ء، قبول اسلام 1930ء) نے اسے مہمل اور غیر معمولی سادہ لوحی کا مظہر کہا ہے۔ اُس کی رائے میں اخباری مضامین اور تراشوں کے بیچ بیچ میں اپنے انداز فکر کو جذباتی پیرائے میں بیان کر دیا گیا ہے۔ فلبی کی طرح یڈ ٹیلر (Judd Teller، 1912ء-1972ء) نے بھی بعض واقعاتی فروگذاشتوں کی نشاندہی کی ہے اور یہ اعتراض بھی

Marfat.com

کیا ہے کہ اسد نے اس میں مستقلاً سعودیہ چھوڑنے کی کوئی معقول وجہ نہیں بتائی۔[10] ان تعریفی یا معاندانہ تبصروں کے باوصف ''شاہراہ مکہ'' کی مقبولیت عامہ میں ذرہ بھر فرق نہیں پڑا اور روز بروز اس کے قارئین کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

''شاہراہ مکہ'' میں جو روداد سفر بیان کی گئی ہے، وہ 1932ء پر ختم ہو جاتی ہے یعنی جب محمد اسد اپنے ''اصل گھر'' سعودیہ کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کا رخ کرتے ہیں۔ وہ چاہتے تو اپنے نجی حالات، قبول اسلام اور دیگر تجربات و مشاہدات کو برصغیر آتے ہی کاغذ پر منتقل کر سکتے تھے، لیکن وہ تقریباً بیس بائیس برس ادھر توجہ نہ دے سکے۔ بظاہر تو اس عدم توجہی کی وجہ وہ نت نئی مصروفیات تھیں، جن میں وہ یہاں آتے ہی پھنس گئے۔ پھر ان کی طویل نظر بندی بھی اس تاخیر کا سبب بنی۔ جب ان کے خوابوں کا مسکن پاکستان معرض وجود میں آیا تو وہ اس کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ مختلف محکموں کے فرائض منصبی سے سبکدوش ہوئے تو انہیں قدرے سکھ کا سانس لینا نصیب ہوا۔ فراغت کے انہی لمحات میں ان کی توجہ اس روداد کو حیطہ تحریر میں لانے کی جانب مبذول کرائی گئی۔ انہیں یہ بات ایسی دل کو لگی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کو لکھنے بیٹھ گئے اور تھوڑی ہی مدت میں اس کو مکمل کر لیا۔

''شاہراہ مکہ'' کے دو اہم نکات درج ذیل ہیں:

1- یہ کتاب پہلی بار 1954ء میں طبع ہوئی، لیکن اسد نے پاکستان کی وزارت خارجہ سے مستعفی ہونے اور پولا سے شادی کرنے کے فوراً بعد اس کو لکھنا شروع کر دیا تھا۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو ان دنوں محمد اسد، پولا کے دام محبت میں بری طرح اسیر ہو چکے تھے اور وہ ہر قیمت پر اسے اپنانے کا تہیہ کئے بیٹھے تھے۔ اسد اور پولا کی پہلی ملاقات 7 مئی 1952ء کو ہوئی اور دیکھتے ہی وہ ان کی محبت کا حقیقی محور و مرکز بن گئی۔ اسد فطرتاً حسین خواتین کی صحبت میں وقت گزارنا پسند کرتے تھے۔ بقول پولا ''وہ میرے جسمانی اوصاف کو پسند کرتے تھے۔ جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی، میں ایک نوجوان خوبصورت خاتون تھی۔ عمر کے بڑھنے سے میں ویسی تو نہیں رہی تھی لیکن پھر بھی ان کی نظروں میں خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ میں ان کی اکیلی محبوب نظر تھی اور وہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔'' پہلی ملاقات کے بعد ان دونوں کا چھ ماہ تک شدید معاشقہ چلتا رہا اور بالآخر وہ یکم نومبر 1952ء کو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ جذباتی سکون اور ذہنی آسودگی کے اس ماحول میں اسد نے ''شاہراہ مکہ'' کی تصنیف کا آغاز کر دیا اور ایک ماہ بعد ابتدائی ابواب لکھ لئے۔ 1953ء کے اواخر میں اس کا مسودہ تیار ہو گیا اور اس سے اگلے برس یہ زیور طبع سے آراستہ ہو گئی۔ اس کا انتساب بھی پولا کے نام ہے۔ یوں دیکھا جائے تو ''شاہراہ مکہ'' محمد اسد کی زندگی کے ایک شدید رومانوی دور کی یادگار ہے اور یہ سہانی گھڑیاں پھر لوٹ کر نہیں آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خود یہ تسلیم کیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو پھر بھی ویسی کتاب دوبارہ نہیں لکھ سکتے۔

۲- بہت سے نومسلموں نے تلاش حق کے سفر کے بعد قبول اسلام کے ایمان افروز واقعات تحریر کئے ہیں، لیکن شاذ و نادر ہی ایسا ہوا ہے کہ انہیں پڑھ کر کسی اور نے اس راہ پر چلنے کا فیصلہ کیا ہو۔ یہ سعادت صرف محمد اسد کی ''شاہراہ مکہ'' ہی کو حاصل ہے، جسے پڑھ کر بعض لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اس ضمن میں امریکی یہودی خاتون

Marfat.com

مریم جمیلہ اور سابق جرمن سفیر مراد ولفریڈ ہافمان کے اسمائے گرامی بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔
اوپر یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ''شاہراہ مکہ'' 1932ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے، جبکہ بائیس برس بعد یہ کتابی صورت میں لوگوں تک پہنچی۔ اس کے شائع ہوتے ہی بعض مبصرین نے اس رائے کا اظہار کیا کہ مصنف کو 1932ء کے بعد رونما ہونے والے حالات زندگی کو بھی اسی پیرائے میں لکھنا چاہیے۔[11] ابتدا میں تو اسد نے اس مطالبے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا، لیکن جب عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مختلف حلقوں اور دوستوں کی جانب سے یہ فرمائش زور پکڑتی گئی تو پھر انہیں بھی اس پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔ ویسے بھی یہ عجیب سا محسوس ہوتا تھا کہ ایک خاصی طویل عمر پانے والے شخص (اسد کا انتقال اکانوے سال کی عمر میں ہوا) نے صرف ابتدائی بتیس سال کے حالات تو لکھ ڈالے ہیں، لیکن بقیہ ساٹھ برس کے سوانح معلوم نہیں۔ یہ درست ہے کہ جس رومان پرور ماحول میں ''شاہراہ مکہ'' تصنیف ہوئی، وہ قصہ پارینہ بن چکا تھا، ذہنی اور جسمانی قواء میں اضمحلال در آیا تھا، پھر بھی اس بجھی ہوئی آگ میں جو کچھ چنگاریاں لو دے رہی تھیں، ان کے بل بوتے پر اسد نے اس کتاب کا جزو مابعد (sequel) لکھنا شروع کر دیا۔ اس کی تصنیف کے تمام مراحل صیغہ راز میں رہے، البتہ کبھی کبھار اپنے کسی مکتوب نویس کو مختصراً بتا دیا کرتے تھے۔ ان کے ایک مداح حسن ظل الرحمٰن نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ انہوں نے ''شاہراہ مکہ'' کو جہاں ختم کیا ہے وہاں سے آگے بھی بڑھانا چاہیے۔ جواباً اسد لکھتے ہیں:

"I have promised my wife, who has been insisting for a long time that I should continue and complete my memoirs. My next work will be just that and of course it will, of necessity, include my years in India and Pakistan...... Please pray that God will allow me to accomplish this work."[12]

بعض شواہد سے پتا چلتا ہے کہ محمد اسد اپنی وفات (1992ء) سے تین چار سال پہلے تک یہ کتاب لکھنے میں مشغول رہے۔ اس کے بعد روز بروز گرتی ہوئی صحت اور مختلف بیماریوں کے سبب وہ خود اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ وہ ملازمت سے استعفیٰ دینے اور پولا سے شادی تک کے واقعات لکھ پائے تھے کہ ان کی ہمت جواب دے گئی۔ ازاں بعد ان کے ساتھ چالیس سال تک رفیقۂ حیات رہنے والی پولا حمیدہ اسد نے بقیہ حالات و واقعات قلمبند کیے۔ مسودہ کی تکمیل کے بعد اس کتاب کا نام وہی رکھا گیا، جو اسد نے خود طے کر دیا یعنی Home-coming of the Heart[13] اور یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول اسد کا تحریر کردہ ہے اور یہ 1932ء تا 1952ء کے واقعات پر مشتمل ہے اور حصہ دوم پولا کا لکھا ہوا ہے اور اس میں بقیہ چالیس برس (1952ء-1992ء) کے نجی کوائف کو بیان کیا گیا ہے۔[14]

جب تک محمد اسد زندہ رہے، ان کے بعض قریبی احباب اور ان کو گاہے بگاہے خطوط لکھنے والے اصحاب ہی کو اس بات کا علم تھا کہ وہ ''شاہراہ مکہ'' کا ذیلی حصہ لکھ رہے ہیں، لیکن ان کے انتقال کے بعد جو تعزیت نامے شائع

Marfat.com

ہوئے، ان میں اس کتاب کی فوری اشاعت پر زور دیا گیا۔ان کے اسی اصرار کا یہ نتیجہ تھا کہ اس سے اگلے سال یعنی 1993ء میں ''شاہراہ مکہ'' اور ترجمہ قرآن کے جوایڈیشن سامنے آئے، ان میں اسد کی دو غیر مطبوعہ کتابوں کا اشتہار دیا گیا۔ان میں ایک تو یہی زیر نظر کتاب ہے اور دوسری کا عنوان Meditations تھا۔ ثانی الذکر عنوان بھی اسد کا اپنا انتخاب کردہ تھا، جس میں قرآن حکیم کے کچھ ایسے پہلوؤں کو پوری شرح وبسط کے ساتھ بیان کرنا مقصود تھا، جن کی روشنی میں ان کے شائع کردہ ترجمہ وتفسیر کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ درحقیقت یہ ان کی اپنی تفسیر کی تفسیر ہے۔ بالعموم وہ اپنے نتائج فکر کو کاغذ پر منتقل کرتے رہتے تھے لیکن انہوں نے باقاعدہ طور پر انہیں مرتب صورت میں نہیں لکھا تھا۔ بلاشبہ یہ ان کے ترجمۂ قرآن کی طرح ختم نہ ہونے والا کام تھا۔ برسوں ان دونوں کتابوں کا اشتہار چھپتا رہا اور کبھی کبھار پولا اپنے کسی مراسلے میں ان کا ذکر کردیا کرتی تھی۔ 15 متواتر کوششوں کے باوجود وہ ''شاہراہ مکہ'' کے تسلسل میں لکھی جانے والی کتاب کو چھپوا نہ سکی۔ اب تو وہ بھی انتقال کر چکی ہے (2007ء)۔ معلوم نہیں، اس کتاب کی اشاعت کی نوبت آئے گی یا نہیں۔ پولا نے اپنی رفاقت سے چند سال قبل اس کتاب کے مسودے کو آخری شکل دے کر اس کی چند نقلیں تیار کرائی تھیں اور وہ بعض انتہائی ذمہ دار احباب کو برائے تنقید وتبصرہ ارسال کی تھیں۔ انہی نقول میں سے ایک نقل محمد اسد پر حال ہی میں ریلیز ہونے والی دستاویزی جرمن فلم (2008ء) کے ڈائریکٹر گیارگ مِش (Georg Misch) کے پاس بھی تھی۔ اس فلم کے لیے آسٹریا کی حکومت نے فنڈز مہیا کئے اور ویانا ہی کی ایک فلم کمپنی نے تقریباً تین سال کی محنت شاقہ کے بعد یہ فلم بنائی ہے۔ اسی ڈائریکٹر کے پاس پولا کی ارسال کردہ نقل موجود تھی اور یہ ترجمہ اسی غیر مطبوعہ مسودے کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔

محمد اسد خود اس بات کا برملا اظہار کرتے تھے کہ وہ اگر چاہیں بھی، تو دوسری بار ''شاہراہ مکہ'' جیسی کتاب نہیں لکھ سکتے، اس لیے موجودہ کتاب یعنی Home-coming of the Heart کا ان کی ''روحانی خودنوشت سوانح عمری'' سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بھی اس کے حصہ اول میں محمد اسد کے پُر زور اور مؤثر انداز بیان کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ پولا کے تحریر کردہ حصہ دوم میں یہ جھلکیاں کچھ مزید ماند پڑ گئی ہیں، لیکن معلومات کے اعتبار سے یہ حصہ بھی مفید ہے۔ محمد اسد نے ''شاہراہ مکہ'' میں ابتدا سے 1932ء تک اپنی روداد زندگی بیان کردی۔ راقم نے اپنے ایک مقالہ (در: گفت، جلد اول) میں مختلف مآخذ کی بنیاد پر 1932ء تا 1947ء کے حالات تفصیل سے لکھ دیئے ہیں۔ اب اس کتاب کی اشاعت کے حوالے سے اس میں جو باتیں لکھی گئی ہیں، وہ خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ ان سے اتفاق اور اختلاف کی گنجائش موجود ہے، لیکن پھر بھی ان کی اہمیت اور تعجب خیزی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بلاشبہ اس کتاب سے تاریخ پاکستان کے کئی نئے گوشے سامنے آئے ہیں۔

محمد اسد نے خود اس کتاب کا جو نام تجویز کیا تھا، اس میں مراجعت کا پہلو نمایاں ہے یعنی اپنے گھر کو واپسی اور وہ بھی جسمانی نہیں، قلبی۔ گھر سے مراد آبائی گھر نہیں، بلکہ روحانی گھر یعنی خطہ عرب اور اس کے تاحد نظر پھیلے ہوئے صحرا اور لق ودق ریگزار۔ ان کی پوری زندگی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالیں، تو وہ مدام بگولے کی طرح سراپا گردش میں

Marfat.com

رہے۔ پولا بھی یہی بتاتی ہے کہ رات دن ان کے پاؤں میں ایک چکر سا رہتا تھا اور وہ کہیں جم کر نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ یہ بادیہ پیمائی یا صحرانوردی ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور اسی کے پیش نظر اس ترجمہ کا عنوان ''محمد اسد-بندۂ صحرائی'' رکھا گیا، کیونکہ وہ بھی تو مقاصد فطرت کی نگہبانی پر مامور رہے۔

حواشی

1- ''بک آف منتھ کلب'' کے پانچ مصنفین نے اتفاق رائے سے ''شاہراہ مکہ'' کے حق میں رائے دی تھی، لیکن ایک رکن نے اس متفقہ فیصلہ کو مسترد کر دیا۔

2- *Times Literary Supplement* (24 Dec. 1954)

3- *The Christian Science Monitor* (see my book *Muhammad Asad-Europe's Gift to Islam*, vol. I, Lahore 2006, pp. 154-155 (=*Gift*)

4- *New York Post* (cf. *Gift*, p. 155)

5- سعودی اسکالر اسماعیل ابراہیم نواب کا مقالہ، در: *Gift*، ص155

6- سابق جرمن سفیر نومسلم مراد ولفریڈ ہافمان کا مقالہ، در: ایضاً، ص226

7- S.C. Chew, in: *New York Herald Tribune Book Review*, 15 August 1954

8- Robert Payne, in: *New York Times* (15 August 1954)

9- *The Middle East Journal*, ix (1953), pp. 81-82

10- *Commentary 18* (Sept. 1954), p. 280

11- Samuel C. Chew: "A Westerner finds more in Islam than in Christianity or Judaism", in: *New York Herald Tribune Book Review*, 15 August 1954, p. 3
"It is greatly to be hoped that some day, when diplomatic discretion permits, Mr. Asad will carry his story beyond 1932."

12- "Muhammad Asad: Visionary Islamic Scholar", in: *Gift*, I, p. 305 and also Mushtak Parker: "Death of a Muslim Mentor", in: *The Middle East*, no. 211, May 1992, p. 28.

13- رک: ایضاً، جلد اول، ص306۔ یہاں اسد جس گھر کو لوٹنے کی شدید خواہش رکھتے ہیں، وہ خطہ عرب ہی ہے۔ چنانچہ وہ خود اس کی صراحت کرتے ہیں، رک: گفٹ، جلد اول، ص199

14- دیکھیے حسن ظل الرحمٰن کا متذکرہ صدر مضمون، در: گفٹ، جلد اول، ص306
مزید تفصیل کے لیے رک: معروف سعودی اسکالر اور اسد شناس اسماعیل ابراہیم نواب اور یہودی مورخ مارٹن کریمر کے مقالات، در: گفٹ، جلد اول، ص260،154

15- رک: ان کا مکتوب بنام Günther Windhager، بابت 5 فروری 1997ء۔

Marfat.com

باب اول

ارضِ ہند
(1932ء-1933ء)

(1)

میں کبھی جاگتا اور کبھی سوتا۔ جاگنے اور سونے کا یہ عمل خاصی دیر تک جاری رہتا۔ پانی کے تیز بہاؤ کی آواز میرے کانوں میں آتی اور غنودگی کے دھندلکوں میں سرسراتی رہتی، جس کے باعث بمشکل ادھر اُدھر جھلانے کی قابل ادراک حس محسوس ہوتی۔ میں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ان پر سورج کی تیز شعاعیں تیر کی مانند پڑیں۔ ترچھی وضع کا ایک چھوٹا سا گول سوراخ نظر آیا۔ اس حالت میں سمجھ نہ پایا کہ یہ بحری جہاز ہے یا اس کا کوئی روشندان اور جب میں مکمل طور پر بیدار ہو گیا تو پتہ چلا کہ فی الواقع میں ایک بحری جہاز پر ہوں، جو مجھے بحیرۂ عرب سے ہندوستان کے ساحل کی جانب کشاں کشاں لیے جا رہا ہے۔ میں اس ملک عرب سے دور جا رہا تھا، جہاں میں نے اپنی زندگی کے انتہائی خوش کن چھ سال گزارے تھے۔ وہ ملک عرب جہاں کے ریگستان، ناقائیں، سیاہ بدوی خیمے، نخلستان اور گاتے، چرمراتے، سائیں سائیں کرتے کنوئیں اور کچی مٹی کے بنے ہوئے مہمان نواز دیہاتیوں کے گھر اور ان گھروں سے ہاون دستوں کی آوازیں گونجتی تھیں اور یہیں تازہ بھنے ہوئے کافی کے بیجوں کا چورا کیا جاتا تھا اور پھر یہ سیاہ کافی تانبے کی لمبی چینکوں سے چھوٹے کپوں میں انڈیلی جاتی اور انہیں شاہ کے ذاتی محافظین اردگرد بیٹھے ہوئے مہمانوں کی خدمت میں پیش کرتے۔ یہ تمام مہمان ریاض کی مجلس عظمیٰ کی دیواروں کے ساتھ تنگ قطاروں میں بیٹھے ہوتے تھے۔ یہیں ابن سعود بھی اپنی پسندیدہ جگہ پر براجمان ہوتے تھے اور اپنی دراز قامتی کے باوصف ہر نئے آنے والے بدوی لباس پہنے ہوئے رئیس اُن کا اٹھ کر استقبال کرتے تھے۔ بادشاہ کی مسکراہٹ اس کی گرمجوشی، وسعت قلب اور فیاضی کا بیّن ثبوت تھی۔ اب یہ تمام چیزیں پیچھے رہ گئیں اور آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوئے قصۂ پارینہ بنتی گئیں۔

نومبر 1932ء کے اواخر میں مَیں بادشاہ[1] کو الوداع کہنے جدہ میں ان کے شاہی محل گیا اور عربوں کے انداز ملاقات کے مطابق ان کی پیشانی اور ناک کے اوپری حصہ کو بوسہ دیا۔ انہوں نے مجھے اپنے گلے لگاتے ہوئے کہا "میرے فرزند! تمہیں ہمارے پاس جلد واپس آنا چاہیے۔ مت بھولو، یہ تمہارا اپنا ملک ہے۔"

Marfat.com

اور اب میں جہاز میں سوار اپنے ملک سے دور جا رہا تھا۔ اچانک میں نے اپنے گلے میں کھچاؤ سا محسوس کیا اور مجھے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ میں کیوں اس ملک کو چھوڑ کر دور دراز علاقوں میں جا رہا ہوں۔

لیکن پھر ایک قدرے بھولی بسری آواز سنائی دی۔ برسوں پہلے کردستان کے ایک عمر رسیدہ شخص نے کہا تھا ''اگر پانی بے حرکت جوہڑوں میں کھڑا رہے تو یہ گندہ، کیچڑ سے لت پت اور بدبودار ہو جاتا ہے۔ اگر بہتا رہے تو یہ پاک صاف رہتا ہے۔'' اس بات نے مجھے بے چین کر دیا اور بالآخر میں نے ہندوستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت تو یہاں چند ماہ ٹھہرنے کا ارادہ تھا، لیکن مقدر کو کچھ اور منظور تھا اور یوں مجھے مہینوں کے بجائے سالوں یہاں رہنا پڑا۔

(2)

میں نے ہندوستان جانے کا فیصلہ عجلت میں نہیں کیا تھا۔ گزشتہ حج کے بعد کئی ہفتوں کی سوچ بچار کے بعد آہستہ آہستہ اس فیصلے نے حتمی شکل اختیار کی۔ اسی موقع پر ہندوستان سے آئے ہوئے بعض حجاج سے میری ملاقات ہوئی اور ان سے یہ تعلق جلد ہی دوستی میں تبدیل ہو گیا[2]۔ ہندوستان کے انہی حجاج کرام میں ایک سفید ریش اور دراز قد ڈاکٹر عبدالغنی نامی شخص بھی موجود تھا، جو اپنے علاقے میں ''استادِ افغانستان'' کی حیثیت سے معروف تھے۔ ان کا آبائی تعلق پنجاب سے تھا، انگلستان سے طب کی تعلیم حاصل کی اور لندن کے ایک معروف تدریسی ہسپتال سے انہوں نے گریجویشن کی۔ وہ اپنے علاقے میں جا کر لوگوں کی طبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے خواہشمند تھے، لیکن اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان کی زندگی میں ایک مختلف اور غیر متوقع موڑ آیا۔ انہی دنوں افغانستان کے حکمران امیر حبیب اللہ خاں[3] انگلستان کے دورے پر آئے اور عبدالغنی خاں کی ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان کی ذہانت اور متوازن شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں اپنا شخصی معالج مقرر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جلد ہی شاہ افغانستان اس نوجوان متوسل کی خداداد صلاحیتوں کا معترف ہو گیا اور انہیں علم ہوا کہ عبدالغنی خاں نہ صرف ایک ڈاکٹر ہیں بلکہ مہذب اور کثیر المطالعہ شخص ہے اور دوسروں کے ذہنوں کو متاثر کرنے کی اعلیٰ خوبیوں سے بھی متصف ہے۔ معاً امیر افغانستان کے ذہن میں یہ خیال ہوا کہ اس شخص کی صلاحیتوں کو اپنے ملک کی فلاح و ترقی کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے، چنانچہ اس نے جلد ہی انہیں اپنا ذاتی معالج مقرر کرنے کا فیصلہ ترک کر دیا اور انہیں اپنے شعبہ تعلیم کا سربراہ تعینات کیا۔ یہ بالکل ہی ایک نیا عہدہ تھا، کیونکہ قبل ازیں افغانستان میں ایسے شعبے کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

شعبہ تعلیم میں نوجوان سربراہ نے اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری میں شبانہ روز محنت کی۔ کچھ دیر بعد جب دائرہ کار وسیع ہو گیا تو اس نے امیر کی اجازت سے اپنے بڑے بھائی نجف علی کو بھی افغانستان بلا لیا اور درحقیقت یہ دونوں بھائی ہی ہیں جنہوں نے اس ملک میں جدید تعلیم کا سنگ بنیاد رکھا اور ہر صوبے کے مرکزی شہر میں پرائمری سے ہائی اسکولوں کا ایک جال پھیلا دیا۔ انہوں نے ہندوستان سے انتہائی پرکھ پڑچول سے ایسے معلمین کا انتخاب کیا جو طلبہ میں حصول علم کے جذبے کو بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان جیسے ملک میں، جہاں

138221

Marfat.com

ہر طرف جنگجو، تجّار اور سوداگر ہی نظر آتے تھے، اب تعلیم یافتہ اور مہذب افراد کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔

کچھ برسوں تک عبدالغنی کی سرگرمیاں بسلسلہ فروغ تعلیم خوش اسلوبی سے جاری رہیں۔ اس ضمن میں انہیں امیر کی اشیر باد بھی حاصل تھی اور وہ ان کوششوں کو سراہتا رہتا تھا اور اس کا نوجوان بیٹا اور مستقبل کا امیر امان اللہ خاں[4] بھی عبدالغنی کے مداحین میں شامل تھا۔

عبدالغنی خاں اور اس کے بھائی نجف خاں کی مشترکہ مساعی کے شاندار نتائج برآمد ہوئے اور گھر گھر ان کے چرچے ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ افغانستان میں جدید تعلیم سے آراستہ نوجوانوں کی کثیر تعداد ملک کے مختلف انتظامی عہدوں پر فائز ہونا شروع ہوئی اور وہ سابقہ نسلوں کے مقابلے میں بہتر طور پر ملک کا نظم و نسق چلانے لگے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مجموعی طور پر عامۃ الناس کی ذہنی سطح بھی بلند ہونے لگی، کیونکہ کابل، قندھار، مزار شریف، غزنی اور ہرات کے مدارس سے جو نئی پود فارغ التحصیل ہو کر عملی زندگی میں داخل ہوئی، وہ نہ صرف تعلیم کے عملی فوائد سے پوری طرح آگاہ تھی بلکہ نئی سوچ اور فکر کی قدر و قیمت کو بھی جانتی تھی۔ اس ذہنی ترفع کے باعث ان تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اپنی انفرادی زندگی اور اپنے سماجی ماحول کے مقاصد کی مروجہ صورتوں کے بارے میں ایسے سوالات اٹھانا شروع کر دیئے، جن کے جوابات ان کے والدین کے بتائے ہوئے جوابات سے خاصے مختلف تھے۔

تاہم ان روشن دماغ نوجوانوں کی فکر میں ابھی ناپختگی کا عنصر نمایاں تھا اور انہوں نے 'تبدیلی' کے لیے جن خیالات کا اظہار کیا، وہ قدرے بے ترتیب اور غیر واضح تھے۔ ان کے اس طرز فکر سے ملاؤں کو تشویش ہوئی، کیونکہ عرف عام میں وہی عالم فاضل اور راہنما سمجھے جاتے تھے اور مجموعی طور پر افغانی عوام کے ذہنوں پر مسلمہ طور پر انہی کی حکمرانی تھی۔ عبدالغنی خاں راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے بھی بہرہ مند تھے اور بیشتر لوگ ان کی علمیت کے قدر دان تھے؛ اس لیے وہ ان تنازعات کی شدت کو بطریق احسن کم کر دیتے تھے۔ پھر بھی روایتی علمائے کرام کے زیر اثر امیر حبیب اللہ کو 'تبدیلی' کی اس ہلکی سی لہر نے عبدالغنی خاں سے بدظن کر دیا اور یہ رویہ ان کی کوششوں اور آرزوؤں کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوا۔

امیر حبیب اللہ افغانستان جیسے قبائلی نظام میں جکڑے ہوئے اور بے آئین ملک کا مطلق العنان حکمران تھا۔ اسے ہر طرح کے کلّی اختیارات بھی حاصل تھے، لیکن پھر بھی وہ اس نوجوان پود کے ذہنی رویوں اور سوچوں سے قدرے خائف تھا۔ مزید یہ کہ اس کے بعض مشیروں نے بھی اس کے کان بھرے اور اسے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ اگر اس ''ہندوستانی ڈاکٹر'' یعنی عبدالغنی خاں کا اثر و رسوخ اور عزت و تکریم میں یونہی اضافہ ہوتا رہا تو آئندہ ''انقلابی تحریک'' امیر کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جدید سوچ کی اس قدر بے ربط لہر کو دبانے کے لیے جو حل تجویز کیا گیا وہ وہی تھا جو ایک پسماندہ ملک کے مطلق العنان حکمران سے متوقع تھا یعنی ایسے ''تخریب پسندوں'' سے نجات۔ چنانچہ ایک روز علی الصبح عبدالغنی اور اس کے بھائی کو گرفتار کر لیا گیا اور بغیر مقدمہ چلائے یا اپیل کا حق دیئے امیر کے قلعہ کے تنگ و تاریک عقوبت خانے میں بند کر دیا گیا۔ مہینوں وہ عام زندگی کی سبھی سہولتوں سے محروم وہیں پابہ

Marfat.com

زنجیر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے۔ بالآخر ان کے پاؤں سے بیڑیاں اتار کر انہیں ایک چھوٹے سے کمرے میں منتقل کر دیا گیا' جو قدرے ہوادار تھا اور اس کے ایک چھوٹے سے روشندان سے روشنی کی کرنیں چھن چھن کر آتی تھیں۔ یہیں انہوں نے اپنی زندگی کے تقریباً دس برس گزارے۔ امیر حبیب اللہ جب تک زندہ رہا' وہ دونوں بھائی پابند سلاسل رہے۔ اس دوران میں امان اللہ خاں سمیت کئی مقتدر اصحاب نے امیر سے ان کی رہائی کی درخواست کی' لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ انہیں کسی قیمت پر رہا نہیں کرنا چاہتا تھا اور وہ موت تک اپنے اس فیصلے پر قائم رہا۔

امیر حبیب اللہ کی موت اچانک اور غیر متوقع تھی۔ اس کے مقربین میں سے کسی نے اس کو قتل کر ڈالا اور یہ خبر بھی گرم رہی کہ اس کو کیفر کردار تک پہنچانے میں اس کے بیٹے امان اللہ خاں کا بھی ہاتھ تھا۔ اس افواہ میں کہاں تک صداقت ہے' کچھ کہا نہیں جا سکتا' البتہ ایک بات ضرور ہے کہ امان اللہ خاں نے مسند اقتدار پر بیٹھتے ہی عبدالغنی خاں اور نجف علی دونوں بھائیوں کو ہر طرح کے الزامات سے بری کر کے رہا کر دیا۔

عبدالغنی کو جب قید کیا گیا تو وہ تقریباً پینتیس سالہ جواں ہمت شخص تھا لیکن جب اس کے ایام اسیری ختم ہوئے تو اس کی عمر پینتالیس برس ہو چکی تھی۔ اس عرصے میں ایام اسیری کی تلخیوں اور مشکلوں کو برداشت کرتے کرتے اب وہ ایک سفید ریش شخص تھا، جس کے دونوں ہاتھ رعشہ سے مسلسل کانپتے رہتے تھے۔

(3)

1927ء میں عبدالغنی خاں فریضہ حج ادا کرنے آئے تو مکہ کے شاہی محل میں میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ داڑھی سفید تھی اور خاصے عمر رسیدہ دکھائی دیتے تھے۔ ہمیں پہلی ہی ملاقات میں اپنائیت کا احساس ہوا۔ بظاہر وہ بوڑھے نظر آتے تھے لیکن ان کا ذہن بیدار تھا اور ان کی گفتگو میں حس مزاح کی جھلک نمایاں تھی۔ غیر ہندی انداز میں خوبصورت انگریزی بولتے تھے۔ کابل کی کال کوٹھڑی میں انہیں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا' وہ ان کی قلبی اور ذہنی طمانیت کو ختم نہ کر سکے، بلکہ اس میں مرور ایام کے سبب مزید اضافہ ہوتا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ خداوند کریم کی ذات پر کامل ایمان اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کے پختہ شعور کا ثمر ہے، ورنہ سفید بالوں اور کانپتے ہاتھوں سے ان جان لیوا مصائب کو برداشت کرنا ممکن نہیں۔

عبدالغنی کی معرفت بعض ایسے ہندوستانی مسلمانوں سے ملاقات ہوئی، جو فریضہ حج ادا کرنے مکہ آئے تھے۔ ان نئے شناساؤں میں قدرے بڑی عمر کے دو سگے بھائی بھی تھے' جو اپنے ناموں کے ساتھ لفظ 'قصوری' لکھتے تھے، کیونکہ ان کا تعلق پنجاب کے شہر قصور سے تھا۔ بڑے بھائی کا نام مولانا عبدالقادر تھا' جو تحریک آزادئ ہند کے سرکردہ رہنماؤں میں سے تھے۔ اسی حوالے سے وہ برسوں قید بھی رہے۔ بعد میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ہندوستانی اہل حدیث علماء میں نمایاں مقام رکھتے ہیں اور یہی اصل وجہ تھی کہ ہم بہت جلد ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے [5]۔ میں نے 1926ء میں اسلام قبول کیا تھا، تب سے مجھے اس بات پر کامل یقین تھا کہ حضرت محمد صلعم کے پیغام کی

Marfat.com

صحیح تفہیم کے لیے فکر اسلامی کے ابتدائی شارحین یعنی ائمہ کرامؒ کی تعلیمات پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے اسلام کے دو اساسی مآخذ یعنی قرآن اور حدیث کا براہ راست اور غیر جانبدارانہ مطالعہ ضروری ہے، بالخصوص مستند احادیث کا‘ جو صحابہ کرامؓ کے توسط سے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں تک منتقل ہوئیں۔ ہندوستان کے اہل حدیث علمائے دین اسلام کے اس ماخذ ثانی پر زور دیتے تھے اور ان کے اس نقطہ نظر سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ جب بھی میرے عرب دوست میرے دینی مسلک کے بارے میں سوال کرتے تو میں جواباً خود کو اہل حدیث کہا کرتا۔ علاوہ ازیں اہل حدیث کے بنیادی تصورات اٹھارویں صدی عیسوی کے نجدی عالم دین محمد بن عبدالوہاب[6] کی تعلیمات سے بہت ملتے جلتے تھے۔ سعودی عرب کے مرکزی اور مشرقی حصوں کے علاوہ یہاں کا شاہی خاندان بھی وہابی مسلک کا پیروکار تھا۔ نتیجتاً میرے روحانی مسکن یعنی سعودی عرب اور میرے نئے ہندوستانی احباب کا یہی مسلک اہل حدیث میری پہچان کا ذریعہ بھی بن گیا۔

میرے انہی احباب نے مجھے ہندوستان چلنے کی ترغیب دی، تاکہ برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کی کثیر آبادی سے میری جان پہچان ہو جائے۔ انہی کے مسلسل اصرار پر میں اپنی نجدی بیوی منیرہ[7] اور اپنے آٹھ ماہ کے بیٹے طلال[8] کے ہمراہ بذریعہ بحری جہاز ہندوستان چل پڑا۔

ہندوستان جاتے ہوئے میں ملے جلے جذبات کا شکار تھا۔ ایک طرف تو بالکل نئے ملک کو دیکھنے کا شوقِ فراواں مجھے اُدھر کو کھینچے لیے جا رہا تھا اور امت مسلمہ کے ایک اہم طبقے کو دیکھنا بھی مقصود تھا، جس میں کچھ وقت گزارنے کا ابھی موقع نہیں ملا تھا۔ دوسری طرف مجھے یہ بھی یقین تھا کہ ہندوستان کے برطانوی حکمرانوں کو میری ہند یاترا ناپسند ہوگی اور میرے خیال میں سعودی عرب کے مفادات سے میری گہری وابستگی اور بطور یورپی نومسلم مغربی اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین کے باعث ان کا طرز عمل دوستانہ نہیں ہوگا۔ ان کی نظر میں میری حیثیت ایک ’مرتد‘ کی ہوگی، جو عرب ممالک میں ان کی پالیسی کو ہدف تنقید بناتا رہتا ہے۔ بہرحال ایک نئے اور سحر آفریں خطہ ارض کو پہلی بار دیکھنے اور وہاں بسنے والے مسلمانوں سے برادرانہ تعلقات استوار کرنے کے پُرجوش جذبے نے ان خدشات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔

(4)

غالباً تیسرے یا چوتھے روز ہندوستان کا ساحل دکھائی دیا۔ ہموار، وسیع و عریض ریتیلا علاقہ، میلا لازرد رنگ، اونچے نیچے اور چھوٹے چھوٹے درخت، بیچ بیچ میں چٹیل میدان۔ یہ تھا کراچی کی بندرگاہ کا منظر۔

ہمارا یہ جہاز جدہ سے آ رہا تھا، اس لیے واپس آنے والے حاجیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اب وہ عرشے پر ہجوم کئے کھڑے تھے اور اپنے وطن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے قرار تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ انہوں نے پہلے اس سرزمین کو نہیں دیکھا تھا۔ بحری جہازوں پر اکثر ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں، خاص طور پر ایسے موقع پر جب جہاز کسی

Marfat.com

بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتا ہے۔

لاؤڈ اسپیکروں کی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ مسافروں کو یہ ہدایت دی جا رہی تھی کہ ان کے پاسپورٹوں کی جانچ پڑتال عرشے ہی پر کی جائے گی۔ دھکم پیل نہ کریں، قطاروں میں کھڑے رہیں تا کہ باری باری ان کی سفری دستاویزات کی جانچ پڑتال کی جا سکے۔ چونکہ عرشے پر سینکڑوں کی تعداد میں مسافر موجود تھے، اس لیے میں نے جہاز سے اترنے سے قبل خود کو طویل انتظار کے لیے تیار کر لیا، لیکن میری یہ عجلت پسندی بے سود ثابت ہوئی۔ ابھی جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا ہی تھا کہ لاؤڈ اسپیکر سے مجھے یہ تعجب خیز اعلان سنائی دیا ''محمد اسد! برائے مہربانی خزانچی کے کمرے میں تشریف لے آئیے۔'' یہ اعلان سنتے ہی میں اور میری بیوی' جس نے اپنا بچہ اٹھا رکھا تھا، لوگوں کی بھیڑ میں سے راستہ بناتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کمرے کی جانب بڑھنے لگے۔ وہاں پہنچنے سے قبل ہمیں دو شخص دکھائی دیئے، جنہوں نے ڈھیلی ڈھالی شلواریں، کھلے چھوٹے کوٹ، لمبی قمیض اور سروں پر طرے دار پنجابی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ وہ حاجیوں کے درمیان اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے اور تواتر سے ''محمد اسد، محمد اسد'' نام پکار رہے تھے۔ جب میں نے بتایا کہ یہ میرا ہی نام ہے تو انہوں نے انگریزی میں خوش آمدید کہا اور دوستانہ انداز سے ملے۔ ان میں ایک مخاطب ہوا ''ہم آپ ہی کو لینے آئے ہیں۔ آپ کا سامان کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا کہ وہ کون ہیں تو انہوں نے بتایا کہ وہ ایک سرکاری دفتر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''کونسے دفتر سے؟'' میں نے سوال کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ پولیس کے دفتر سے آئے ہیں اور میری مدد کے لیے بھجوائے گئے ہیں۔ وہ لوگوں کے اس بے ہنگم ہجوم میں سے ہمارے لیے راستہ بناتے ہوئے ہمیں اپنی نگرانی میں خزانچی کے دفتر لے گئے۔ وہاں پہنچنے سے قبل ہمیں لمبی قطاروں میں کھڑے حاجیوں کی خشمگیں نظروں کا سامنا کرنا پڑا، جو معلوم نہیں کب تک اپنی باری کے انتظار میں یہاں کھڑے رہیں گے۔

دفتر میں پاسپورٹ کی جانچ پڑتال کے لیے جو افسر بیٹھا تھا، وہ خاصا نرم مزاج تھا۔ اس نے میرے پاسپورٹ پر ایک نظر ڈالتے ہی اس پر مہر ثبت کر دی اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا ''ہندوستان میں خوش آمدید! آپ کہاں ٹھہریں گے؟'' میں نے اپنے کراچی میں مقیم اس دوست کا نام اور پتہ بتایا، جہاں مجھے چند روز کے لیے ٹھہرنا تھا، بلکہ اپنے طور پر میں نے مولانا عبداللہ قصوری[9] کی لاہور کی قیام گاہ کا بھی پتہ لکھوا دیا، جہاں میری رہائش کا پہلے سے انتظام ہو چکا تھا۔ اسی اثنا میں میرا سامان بھی پہنچ گیا اور ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک گزرگاہ سے نکل کر باہر کھڑی کار تک پہنچے۔ اس سارے عمل میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگے ہوں گے اور میں بمشکل ان دونوں قصوری برادران کو عارضی طور پر الوداعی سلام کر سکا، جو اس جہاز پر میرے ساتھ جدہ سے کراچی پہنچے تھے۔

(5)

کراچی میں میرے ابتدائی چند روز خاصے مایوس کن تھے۔ مجھے اس شہر نے بالکل متاثر نہیں کیا۔ یہ شہر صاف ستھرا ضرور تھا، لیکن کسی رنگ اور مخصوص شناخت سے محروم۔ اس لیے میں نے وہاں چند روز گزارے۔ میں نے

Marfat.com

یہاں کی آب وہوا کے مطابق ہلکے کپڑے کے سوٹ بنوائے۔ کراچی پہنچنے تک میں نے عربی لباس ہی پہن رکھا تھا، کیونکہ گذشتہ چھ سال سے میں اس کا عادی ہو چکا تھا۔ کراچی میں مَیں اپنی بیوی منیرہ' بیٹے طلال اور قصوری برادران کے ہمراہ جس گھر میں بطور مہمان ٹھہرا ہوا تھا، اس کے سب لوگ ہمارے ساتھ ہی حج سے واپس آئے تھے۔ یہاں مختصر قیام میں مَیں نے دیکھا کہ دو پولیس والے ہر وقت اس گھر کے باہر کھڑے رہتے تھے۔ ان کا تعلق سی آئی ڈی سے تھا۔ وہ ہر وقت گھر کے باہر نگرانی کرتے تھے اور میں جہاں کہیں جاتا تھا، خفیہ طریقے سے میرا پیچھا بھی کرتے تھے۔ شروع شروع میں مجھے ان کی یہ حرکات ناگوار محسوس ہوتی تھیں لیکن آہستہ آہستہ میں نے ان کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چھوڑ دیا[10]۔ اس محکمہ سراغ رسانی کے متعلق تفصیلات آئندہ سطور میں درج کی جائیں گی۔

دو دن کراچی میں اپنے میزبانوں کی مہمان نوازی کا خوب لطف اٹھایا۔ اس کے بعد ہم سب بذریعہ ریل لاہور روانہ ہوئے۔ ریل گاڑی کا یہ طویل سفر علی الصبح سے شام تک جاری رہا۔ پہلے تو گاڑی دریائے سندھ کے سبز پانیوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہی، پھر ایک ایسے وسیع تر علاقے میں داخل ہوئی، جو زیادہ تر میدانی تھا اور اس میں کہیں کہیں کیچڑ کے رنگ کے غیر متمدن گاؤں نظر آتے تھے۔ جب گاڑی کسی چھوٹے اسٹیشن پر تھوڑی دیر کے لیے رکتی تو ڈھیلی ڈھالی شلواریں پہنے ہوئے مرد، شوخ رنگ کی کھلی قمیصیں اور ننگی کمر کے اوپر قدرے مختصر بلاؤز پہنی ہوئی عورتیں اور ان کے بچے کھلی کھڑکیوں کی طرف بھیک مانگنے کے لیے دوڑے آتے۔ ان بچوں کی ظاہری شباہت سے وہ غریب دکھائی نہیں دیتے تھے، بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گاڑی رکتے ہی بھیک مانگنے کے لیے اس کی جانب دوڑ پڑنا ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔

پنجاب یعنی پانچ دریاؤں کی سرزمین کے انہی گرد آلود اور ایک جیسے میدانوں میں فراٹے بھرتی ہوئی ہماری گاڑی جھٹپٹے میں لاہور پہنچی۔ یہ وہی شہر تھا، جس میں ہم نے آئندہ چند ماہ قیام کرنا تھا۔

یہاں ہمارے میزبان مولانا عبداللہ قصوری کا گھر شیرانوالہ دروازہ کے بالمقابل واقع تھا۔ فصیل شہر میں ایسے کئی دروازے تھے جن کا آہستہ آہستہ نام ونشان مٹ گیا۔ صرف اس دروازے کے کچھ آثار محفوظ رہ گئے تھے۔[11]

ظاہراً لاہور شہر، کراچی سے کسی قدر مختلف تھا۔ یہاں ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی۔ زندگی اور اس کے مختلف رنگ دکھائی دیتے تھے۔ یہاں کے لوگ سندھ کی نسبت زیادہ تنومند' دراز قد اور عورتیں زیادہ خوبصورت تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ایسی حسین خواتین دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آئیں۔ کچھ دنوں بعد مجھے پتہ چلا کہ یہ عورتیں غیر مسلم تھیں، کیونکہ بدقسمتی سے مسلمان عورتوں کی اکثریت سر سے پاؤں تک برقعے پہنے ہوئے رہتی تھیں اور ان برقعوں میں وہ چلتے پھرتے خیمے معلوم ہوتی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی ایسی مسلمان نوجوان خاتون دکھائی دے جاتی تھی، جس نے اس ناگوار خاطر برقعہ کے بغیر پنجابی انداز کا کُرتہ شلوار پہنا ہوتا تھا۔ یہاں سکھ عورتیں بھی تھیں، جو برقعہ نہیں پہنتی تھیں۔ ان کی آنکھیں سیاہ ہوتی تھیں اور ان کے لمبے بال کمر تک لٹکے ہوتے تھے۔ سکھ مرد دراز قد' داڑھی رکھے ہوئے، سر پر پگڑی باندھے اور مردانہ وجاہت کے مالک تھے۔ یہاں سرحدی علاقوں سے آئے ہوئے پٹھان بھی تھے جو اپنے رنگ

Marfat.com

ڈھنگ سے بالکل الگ نظر آتے تھے۔ لمبے کُرتوں اور شلواروں میں ملبوس اور اپنی وضع قطع کے اعتبار سے اجنبی سے لگتے تھے، لیکن بے خوف وخطر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گھومتے پھرتے یا چائے خانوں میں بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ کچھ دیر بعد میں بھی اکثر ان چائے خانوں میں بیٹھا کرتا تھا، کیونکہ یہاں میری پسندیدہ زیادہ دودھ والی لذیذ چائے مل جاتی تھی۔

آہستہ آہستہ میں اردو زبان سمجھنے لگا اور رک رک کر بولنے لگا۔ زیادہ تر ہندی مسلمان یہ زبان بولتے تھے۔ اردو میں فارسی الفاظ بکثرت استعمال کئے جاتے ہیں، اس لیے مجھے اس کے بولنے اور سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال ایران اور افغانستان میں گزارے تھے اور وہاں بولی جانے والی فارسی زبان سے میرے کان آشنا تھے۔ مجھے حیران کن کشش رکھنے والے قدیم شہر لاہور دیکھنے کا شوق تھا، چنانچہ میں ایک روز دہلی دروازے سے اندرون شہر داخل ہوگیا اور وہاں کی تنگ گلیوں اور بازاروں میں گھومتا پھرتا رہا۔ میرے دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی دکانوں کی قطاریں تھیں، جو سڑک سے زیادہ سے زیادہ ایک میٹر اونچی تھیں اور مشرق کے متعدد دوسرے شہروں کی طرح یہاں کے دکاندار بھی چوکڑی جمائے اپنے سامان میں گھسے بیٹھے تھے۔ میری دونوں طرف لوگوں کی خاصی بڑی تعداد تھی' جو کندھے مارتے، دھکے دیتے اور بآواز بلند باتیں کرتے، تیز تیز قدم اٹھاتے چلے جارہے تھے۔ سامان سے لدے ہوئے مزدور، بیل گاڑیاں، دو پہیوں والے تانگے، ہر لحہ بدلتے ہوئے لباس، چہرے اور رنگ، مرد، عورتیں، بچے، سائیکلیں اور گدھے- رنگ، آواز اور تراش خراش کا ایک بے ہنگم پن۔ مجھے یہ سب کچھ شوخ وشنگ تصویروں کا ایک مجموعہ محسوس ہوا، جسے ایک بے پرواہ مصور نے اپنے تختۂ مصوری پر اتفاقیہ طور پر ان سب کو آپس میں ملا دیا اور جنہیں بغور دیکھنے سے بھی' معلوم نہ ہو کہ ان کا مفہوم کیا ہے۔ برسوں بعد مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ہندوستانی معاشرت کا اصل چہرہ یہی ہے۔

ایک بازار سے گزرتے ہوئے اوپر جو دیکھا تو مسجد وزیر خاں کا محرابی دروازہ دکھائی دیا۔ یہ مسجد ایک خوش نصیب وزیر اور بادشاہ کے مصاحب نے تقریباً تین سو سال قبل تعمیر کرائی تھی۔ بلاشبہ یہ پُر شکوہ عمارت ہے، جس میں بہتے ہوئے رنگوں اور چمکیلی ٹائلوں کی پچی کاری نے اس کی خوبصورتی میں بیش بہا اضافہ کر دیا ہے۔ رنگین ٹائلوں کی لمبی ہموار سطح قابل دید ہے، جنہیں ماہرانہ توازن کے ساتھ آپس میں جوڑا گیا ہے۔

ہندوستان میں اکثر ایسے خوبصورت منظر کے بعد کوئی ایسا منظر سامنے آتا ہے جس سے پہلے منظر کا خوبصورت تاثر زائل ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ہے، کیونکہ اس مسجد کے بالکل سامنے کچی پکی دکانیں مٹھائی، دودھ دہی بیچنے اور سستا کھانا تیار کرنے والوں نے بنا رکھی ہیں۔ چنانچہ ان دکانوں کے سبب ایک راہگیر کے لیے اس مسجد کی تزئین وآرائش ماند پڑ جاتی ہے۔ اس مسجد کو تعمیر ہوئے صدیاں گزر گئیں، پھر بھی میرے لیے یہ ایک زندہ حقیقت تھی، جبکہ ہندوستان کی ایسی رواں دواں زندگی مجھے ایک چاند کی مانند نظر آئی، جو خود تو روشن نہیں، لیکن ایک اجنبی کے تخیلات اور تاثرات کے سورج کی روشنی اسے بھی منور کر دیتی ہے۔ میں اس دور کے ہندوستان کی واضح تصویر

Marfat.com

دیکھنے سے قاصر تھا۔ ان دنوں یہاں کے حالات زیادہ سازگار نہیں تھے۔ مزید برآں ایک وسیع وعریض رقبے پر پھیلا ہوا، اندرونی تضادات کا شکار اور متنوع روایات کا حامل یہ ملک ابھی ایک غیر متشکل کائنات سی محسوس ہوا، جس نے آگے چل کر ایک کامل صورت اختیار کرنا ہے۔[12]

(6)

چند ہفتوں کی بیکاری اور سیر سپاٹے کے بعد میں لاہور کے نہ ختم ہونے والے شور وغل سے اکتا گیا، چنانچہ میں نے یہ ضروری سمجھا کہ اپنے بعض معرض التوا میں پڑے ہوئے مضامین لکھ کر ان جرمن اخبارات کو ارسال کروں، جن کے خصوصی نمائندے کی حیثیت سے میں اس علاقے میں کام کر رہا تھا۔ اپنے میزبان عبداللہ قصوری کے گھر مجھے ہر طرح کی سہولت میسر تھی، لیکن یہاں پوری توجہ اور انہماک سے کوئی کام کرنا ممکن نہیں تھا۔ دن بھر دوستوں اور واقف کاروں کا تانتا بندھا رہتا اور ان سے طویل گفتگوؤں کا سلسلہ چلتا رہتا۔ میں ایسی مصروفیات سے کنارہ کشی کر کے کسی گوشہ عافیت کا متلاشی تھا۔

بالآخر ایک روز میں اکیلا ہی لاہور سے نکل کھڑا ہوا اور بذریعہ ریل گاڑی سیالکوٹ جا پہنچا، جو ریاست جموں کے قریب واقع ہے۔ وہاں سے بذریعہ کار وادئ کشمیر کی ترائیوں کی جانب چل پڑا۔ میرے ایک دوست نے سرینگر جانے والی سڑک پر واقع ڈاک بنگلہ میں میرے قیام وطعام کے لیے اجازت نامہ کا بندوبست کر دیا تھا۔ ایسے ڈاک بنگلے گذشتہ صدی میں ڈاک کی ترسیل کی غرض سے بنوائے گئے تھے اور اب دورے پر آئے ہوئے ضلعی افسروں کی سہولت کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ اس اجازت نامہ کی وجہ سے میں اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق کچھ روز ایک سرکاری مہمان کی حیثیت سے مقیم رہا۔ یہاں باورچی اور ذاتی ملازم کے علاوہ صاف ستھرے اور ہر طرح کے فرنیچر سے آراستہ کمرے بھی میرے زیر استعمال تھے۔ ان دنوں میں اکیلا ہی اس ڈاک بنگلہ میں تھا، اس لیے میرا سارا وقت اردگرد کے پہاڑوں میں گھومنے پھرنے اور لکھنے لکھانے میں صرف ہوتا تھا۔ ڈاک بنگلہ کے دونوں ملازم میرے کھانے پینے کا انتظام کر دیتے تھے اور اس کے علاوہ میری ہر طرح کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ ہر روز مجھے اپنے معمول کی مصروفیات کے علاوہ انہیں صرف یہ بتانا پڑتا تھا کہ دوپہر اور رات کو میں کیا کھانا پسند کروں گا۔

یہاں آنے کے دوسرے روز سہ پہر کو میں پہاڑی سڑکوں پر ایک لمبی سیر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ہوا میں خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر بکثرت چھوٹے چھوٹے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہر طرف خاموشی اور سکون تھا۔ ان خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہوا میں چلتا گیا، حتیٰ کہ زور کی بھوک محسوس ہوئی اور میں نے تیار شدہ رات کے کھانے کے لیے واپس ڈاک بنگلہ پہنچنے کا ارادہ کیا۔ اچانک مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں اور ساتھ ہی مجھے گوشت کے جلنے کی بو محسوس ہوئی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید اس پہاڑی پر کوئی گاؤں ہے یا قریب کوئی ایسی دکان ہے جہاں لذیذ پنجابی طرز کے کباب تیار ہو رہے ہیں اور جن کی خوش کن مہک میرے جیسے راہگیروں کو اپنی طرف کھینچ رہی

Marfat.com

ہے۔ چونکہ مجھے پنجابی کباب بے حد پسند ہیں، اس لیے میں اُدھر چل پڑا، جدھر سے یہ مہک آ رہی تھی۔ سڑک مڑتے ہی ذرا نشیب میں ایک پہاڑی کے پاس ہی وہ جگہ نظر آ گئی، جہاں سے کبابوں کی یہ دل لبھانے والی خوشبو آ رہی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی میں بالکل بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا، کیونکہ یہ کسی کباب فروش کی دکان نہیں تھی بلکہ یہ ایک چتا تھی۔ لکڑیوں کا ایک بڑا سا ڈھیر جل رہا تھا اور ان کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ان بلند و بالا شعلوں کے درمیان ایک لاش پڑی تھی، جو جل کر کوئلہ ہو چکی تھی اور اب اس کی صرف ہڈیاں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ کچھ لوگ اس چتا کے چاروں طرف کھڑے تھے اور ایک پنڈت ماتمی منتر پڑھ رہا تھا اور اب گوشت جلنے کی بو فضا کو بھاری کر رہی تھی۔ یہ ہندوؤں کا جنازہ تھا۔

میں یہ منظر دیکھ کر تیز تیز قدموں سے اپنے ڈاک بنگلے کی طرف واپس چل پڑا اور یہ سوچتا رہا کہ اپنے پیاروں کو یوں آگ میں بھسم اور راکھ کا ڈھیر بنتے ہوئے دیکھنا کس قدر خوفناک ہے۔ مقام شکر ہے کہ میں ہندو نہیں ہوں اور میرا موت و حیات کا تصور بالکل مختلف ہے، اتنا مختلف، جتنا دن اور رات کا فرق۔

میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میرا ہندو مذہب سے بالواسطہ رابطہ ہوا۔

(7)

ہندوستان میں میرے طویل قیام کے شروع میں مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ وسیع و عریض ملک یا براعظم بے شمار مختلف النوع نسلی گروہوں، سماجی تضادات، مختلف زبانوں (جن میں سے بعض ایک دوسری سے اتنی مختلف ہیں، جتنی روسی سے ہسپانوی) اور شدید مذہبی اعتقادات و رسومات کی آماجگاہ ہے۔ میں یہ بھی محسوس کر سکتا تھا کہ فی نفسہٖ یہ ناقابل جواب سوالات اور ناقابل حل تنازعات کی ایک الگ سی دنیا ہے۔

ہندو مذہب کی ایک خصوصیت منفی ہونے کے باوجود بہت جلد مجھ پر ظاہر ہو گئی اور یہ وہ اختلاف تھا جو مسلمانوں اور ہندوؤں میں پایا جاتا تھا۔ ایک سرخ دھاگے کی مانند یہ اختلاف لاہور کی روزمرہ زندگی میں؛ گفتگوؤں میں اور بازاروں میں ہونے والے عارضی لڑائی جھگڑوں میں واضح طور پر محسوس ہوتا تھا۔ یہ سرخ دھاگہ ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں ہر سطح پر دکھائی دیتا تھا اور اس بدشگونی کے مضر اثرات مستقبل پر پڑنا لازم تھے۔ فکر اور جذبات کی ان دو الگ الگ دنیاؤں کے آپس میں ملنے کے دور دور تک آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ایک طرف بے ڈھنگے شرک کا بول بالا تھا، جو مجرد مفروضات کی شکل اختیار کر چکا تھا، جن میں صرف ایک ٹھوس تصور مشترک تھا اور وہ تھا تناسخ الارواح کا عقیدہ، جبکہ اس کے برعکس خدا کی وحدانیت اور ایک ہی بار عطا کردہ زندگی میں سرزد ہونے والے اعمال و افعال کی اپنے پروردگار کے روبرو انفرادی جوابدہی کا تصور جزو ایمان تھا۔ مزید یہ کہ ہندومت میں ذات پات کا نظام مضبوط بنیادوں پر استوار ہے جس نے انسانی معاشرے کو مخالف گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ وہ سب ایک دوسرے کو اچھوت گردانتے ہیں، جبکہ دوسری جانب مذہب کا اخلاقی مقصد انسانوں کے مابین حقیقی برادرانہ اخوت و یگانگت قرار دیا جاتا

Marfat.com

ہے۔ یہ خدا کو خالق کائنات ماننے کے عقیدے کی دین ہے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ یہ دونوں مذاہب اپنے تصور حیات اور روحانی اقدار کے حوالے سے اس وقت تک آپس میں متحد نہیں ہو سکتے، جب تک ان میں کوئی ایک اپنے تہذیبی وجود کو ختم کر کے خود کو دوسرے مذہب میں مدغم نہ کر دے، لیکن ایسا سوچنا ممکنات کی حدود سے بہت دور ہے۔

یہاں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے ہیں۔ جس دور کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت ان کی تعداد ہندوستان کی کل آبادی کا چوتھائی حصہ تھی، لیکن اسلام کے حرکی نقطہ نظر کے باعث ہندو اکثریت کے مقابلے میں مسلمانوں کی مردانگی تاریخ کی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ صدیوں تک ہندوستان مسلمانوں کے زیر نگیں رہا اور وہ اپنی حربی قوت کے بل بوتے پر یہاں حکومت کرتے رہے، جبکہ ہندوؤں نے اپنی توجہ تجارت اور تعلیم حاصل کرنے پر مرکوز رکھی اور آگے چل کر ان کا یہ رویہ سودمند ثابت ہوا۔ مسلمان اپنے شاندار ماضی پر فخر کرتے رہے اور اسی کی یاد میں کھو گئے۔ نتیجتاً وہ متحرک نہ رہے اور اجتماعی طور پر زوال پذیر ہو گئے۔ ہندو بہ حیثیت مجموعی ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن رہے اور رفتہ رفتہ ہندوستانی معیشت کا معتد بہ حصہ ان کے تصرف میں آ گیا اور ملک کے انتظام و انصرام میں بھی ان کا عمل دخل بڑھ گیا۔ خاص طور پر برطانوی عہد میں ہندوؤں نے ہر شعبۂ زندگی میں برتری حاصل کر لی۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ تقریباً ایسے تمام سرکاری عہدوں پر، جو انگریز حکمرانوں نے مقامی لوگوں کے لیے مختص کر رکھے تھے، ہندوؤں کے قبضے میں آ گئے، جبکہ مسلمانوں کو نچلی ملازمتوں پر اکتفا کرنا پڑا۔

تاہم ہندوؤں نے خود کو کبھی بھی محفوظ نہیں سمجھا۔ ان کے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا گیا کہ جلد یا بدیر تمام عارضی سیاسی الٹ پھیر کے باوجود ہندوستان لازماً آزادی کی نعمت سے بہرہ مند ہوگا۔ یہ آزادی اقتدار اعلیٰ کی منتقلی یا برطانوی مملکت ہی میں ایک الگ ریاست کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ وہ صدیوں مسلمانوں کے محکوم رہے ہیں اور اب انہیں اس بات کا خوف تھا کہ کہیں پھر وہ مسند اقتدار پر متمکن نہ ہو جائیں اور دوسری مسلمان اقوام کی اعانت سے وہ اپنی سابقہ حاکمیت کو دوبارہ ان پر مسلط نہ کر دیں۔ اس امکان سے بچنے کے لیے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف شعوری طور پر اپنے لامحدود اقتصادی وسائل، اعلیٰ تعلیمی خصائص اور ملک کے انتظامی ڈھانچے میں اپنے اثر و رسوخ کو بطریق احسن استعمال کیا۔ انہوں نے کھلے عام ''ہندوستان، ہندوؤں کے لیے'' کا نعرہ بلند کیا، جس کا بالفاظ دیگر یہ مطلب تھا کہ مسلمان گھس بیٹھے اور ''غیر ملکی'' تھے، لیکن انہوں نے اس تاریخی حقیقت سے روگردانی کی کہ ہندوستانی مسلمانوں کی صرف معمولی سی تعداد غیر ملکی فاتحین یا مہاجرین کی اولاد تھی اور ان کی اکثریت نے کئی صدیوں کے دوران میں ہندومت ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا۔

تاریخ کے حقائق کچھ بھی ہوں، ہندوستان کے ان دو بڑے طبقوں یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان پائی جانے والی عداوت نے ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ابتدا میں یہ مخاصمانہ رویے قدرے دھیمے تھے، لیکن مغلیہ سلطنت کے انحطاط کے ساتھ ہی رفتہ رفتہ آپس میں دشمنی کے یہ جذبات مزید بھڑک اٹھے، جس کے نتیجے میں ہر جگہ خونی فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ چونکہ مسلمان اقلیت میں تھے، اس لیے

Marfat.com

انہیں ہمیشہ زیادہ جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ بلاشبہ تاریخ ہندوستان میں بعض ایسے مواقع بھی آئے کہ جب برطانوی استعماریت کے خلاف نفرت نے ان دونوں مخالف طبقوں کو ایک قومی وحدت کی شکل دے دی، مثلاً 1857ء کی جنگ آزادی (جسے انگریز غدر یا بغاوت کا نام دیتے ہیں) اور پہلی جنگ عظیم (1914ء-1918ء) کے بعد شروع ہونے والی تحریک آزادی کے طوفانی دور میں باہمی اتحاد و یگانگت کے ایسے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں، لیکن جلد ہی دیرینہ اختلافات کے باعث یہ غیر حقیقی 'ایکتا' دیرپا ثابت نہ ہوئی، کیونکہ یہ عارضی اور وقتی جذبات اور مصلحتوں پر قائم ہوئی تھی۔ شروع شروع میں مسلمانوں نے ہندوؤں سے یک جہتی اور اس کے مشترکہ مقاصد کو انتہائی جذباتی انداز میں قبول کیا، لیکن جلد ہی انہیں یہ احساس ہو گیا کہ ہندو جس ''قومی بیداری'' کا پرچار کر رہے ہیں، وہ تو قدیم ہندومت کے احیاء اور دیگر اقوام ہند کے تہذیبی آثار کی بیخ کنی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلمانوں کی اپنے دین اور شاندار تہذیبی روایات سے گہری وابستگی تھی، اس لیے وہ من حیث القوم خود کو 'ہندی' قومیت کا حصہ بنانے سے گریزاں رہے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ پہلے رسمی باہمی فرقہ وارانہ معاہدوں کے ذریعے اپنے ثقافتی وجود کو تسلیم کرایا جائے اور پھر برطانوی راج کے خلاف تحریک آزادی کے مشترکہ سیاسی محاذ میں شامل ہوا جائے۔ یوں برصغیر کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

اس وقت تک مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین زیادہ تر مخاصمت کا انداز جذباتی تھا اور یہ سماجی و معاشرتی امور تک محدود تھی، لیکن اب باہمی دشمنی کی یہ خلیج زیادہ وسیع ہو گئی۔ مسلمان اپنے مطالبات منوانے کے لیے جو یقین دہانیاں چاہتے تھے، ہندو قیادت ان سے عملاً اور صاف طور پر گریزاں تھی اور وہ یہ بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی کہ ایک تہذیبی اور قومی اقلیت کے طور پر مسلمانوں کو مساوی حقوق دیئے جا سکتے ہیں، چنانچہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے دوران میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں مفادات کی ہم آہنگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو جائے یا انہی کے تحت ایک الگ مملکت قائم ہو جائے۔ دونوں صورتوں میں خود مختار ہندوستان میں دستوری حکومت ہندو اکثریت کی ہو گی، جو مسلمانوں کے تہذیبی اور اقتصادی وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے گی۔ مسلمانوں کی یہ سوچ بالکل درست تھی، کیونکہ وہ اقلیت ہونے کے باوجود تقریباً ایک ہزار سال یہاں حکومت کرتے رہے اور اس طویل عرصے میں وہ ہندو اکثریت میں مدغم نہیں ہوئے۔ انیسویں صدی کے وسط میں انگریزوں کے برسر اقتدار آنے تک مسلمان ہی یہاں کے سیاہ و سفید کے مالک تھے اور غالب ہندو اکثریت کے باوجود انہوں نے اپنے ثقافتی اور اقتصادی وجود کو قائم رکھا، لیکن اب ہندو مستقبل کے جس ہندوستان کا خواب دیکھ رہے تھے، اس میں مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے مقابلے میں اپنی پسپائی کے آثار واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ پس سیاسی شعور کی ترقی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ان بڑھتی ہوئی مشکلات کا احساس ہونے لگا، جن کا انہیں آئندہ ہندو اکثریت کا ساتھ نباہنے میں پیش آئیں گی۔

جس وقت میں ہندوستان آیا، ان دنوں تحریک آزادی اس منزل تک آ پہنچی تھی۔ یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ

Marfat.com

مسلمانوں اور ہندوؤں کی باہمی مخالفت کا ''سرخ دھاگہ'' ملک کے سیاسی عمل کو آگے بڑھانے میں کہاں تک معاون ثابت ہو، چنانچہ اس کا جواب 1932ء کی ابتدا میں انڈین نیشنل کانگرس کے ''تحریک نافرمانی'' کے فیصلے کی ناکامی سے عیاں ہے۔ غیر متشدد ذرائع سے حکومتی نظام کو درہم برہم کرنے اور یوں انگریزوں کے حکومت سے دستبردار ہونے کے مقاصد حاصل نہ کئے جاسکے اور اس ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس تحریک میں مسلمانوں نے بالکل تعاون نہیں کیا۔ چند افراد کو چھوڑ کر مسلمان نیشنل کانگرس سے تعاون پر آمادہ نہ ہوئے، کیونکہ یہ جماعت مکمل طور پر ہندو اکثریت کی نمائندہ تھی۔ نتیجتاً ملک میں سیاسی بگاڑ اور روز افزوں اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں یہ سوچتا رہا کہ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگ موجودہ بند گلی سے باہر نکلنے اور مروجہ حقائق کا سامنا کرنے کی غرض سے کوئی مصالحانہ رویہ اختیار کریں، کیونکہ اسی طرح انہیں اپنی نسلی اور تہذیبی وحدت کے نہ ہونے کا احساس ہوگا، جو ان کے وجود کا ایک اساسی عنصر ہے اور اسی حقیقت کی روشنی میں اپنے سیاسی مستقبل کا تعین کر سکتے ہیں، لیکن چند ماہ بعد ہی میری یہ مبہم سی سوچ ایک واضح تصور کی شکل اختیار کر گئی اور ان حالات و واقعات کی سچائی اپنے تمام مضمرات سمیت کھل کر سامنے آ گئی۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

Sonntag 11. Dezember 1932 Blatt 4

Neue Zürcher Zeitung

Erste Sonntagsausgabe

Gespräch in Indien

Von Mohammad Asad (Lahore)

Lahore, im September.

سوئٹزرلینڈ کے ایک معروف جرمن اخبار کے لئے محمد اسد کا لاہور سے ارسال کردہ پہلا مضمون (ستمبر 1932ء)

Marfat.com

باب دوم

سیاحتِ ہمالیہ
(1933ء)

(1)

لاہور میں مَیں بالعموم مسجد وزیر خاں کے سامنے کھڑا رہتا اور اسے بغور دیکھتا رہتا۔ ایک روز حسب معمول میں اپنے مبہم اور غم انگیز خیالات میں محو یہاں کھڑا تھا کہ میرے ایک نوجوان مسلمان دوست نے ادھر سے گزرتے ہوئے مجھے دیکھ لیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور کہا ''میں ایک گانے والی کو جانتا ہوں جو قریب ہی رہتی ہے۔ وہ دوسری ناچنے والیوں جیسی نہیں ہے۔ تمہیں اس کو ضرور سننا چاہیے۔''

میں اس دوست کے ساتھ چل پڑا اور جب کبھی مجھ کو حقیقی زندگی کے تمام پہلوؤں سے ہندوستان کے الگ تھلگ رہنے کا احساس غالب آتا ہے تو میں اس وقت اس عجیب عورت کے متعلق سوچنا شروع کر دیتا ہوں۔

جس کمرے میں وہ عورت بیٹھی تھی، اس کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ درمیان میں کچھ سازندے جھانجھریں، پُر شور طبلے اور عجیب شکل کی ستاریں سنبھالے بیٹھے تھے۔ اس نے گانا شروع کیا۔ اس کی آواز اونچی اور گہری تھی، لیکن میں اس سے متاثر نہیں ہوا۔ اس نے شمالی ہندوستان کا ایک خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا۔ کمخواب کے لہنگے پر سنہری تاروں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی، ہلکے قرمزی رنگ کی کھلی آستینوں والی لمبی قمیض پہن رکھی تھی، اس کے سر اور کندھوں کو ایک بنارسی وضع کے شفاف اور باریک کپڑے نے ڈھانپ رکھا تھا، جو سرخ اور سنہری رنگوں کے ایک بادل جیسا نظر آتا تھا، لیکن یہ سب کچھ اس کے رقص کے مقابلے میں ہیچ تھا، جو مروجہ انداز سے بالکل الگ دکھائی دیتا تھا۔ وہ درمیانی عمر کی عورت تھی اور اس کے خدوخال مروجہ تصورِ حسن سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اس کے رخسار کی ہڈیاں ابھری ہوئیں اور ناک قدرے چپٹی تھی، لیکن اس کی آنکھیں ہو بہو بادام سے مشابہ تھیں، اور ایسی آہو چشم خواتین صرف ایشیا کے پہاڑی علاقوں میں پائی جاتی ہیں (درحقیقت مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ پیرن قبیلے سے تعلق رکھتی تھی، جس کا خانہ بدوشوں کی کسی پُر اسرار شاخ سے تعلق تھا اور اس کے لوگ ہندوستان کے دور دراز اور بلند ہموار علاقوں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں)۔ اس کی پیشانی نیچی، کشادہ اور مضبوط تھی۔ اس کے ہونٹ سرخ اور نازک تھے اور اس کا

Marfat.com

چہرہ گہری سوچوں اور نا آسودہ آرزوؤں کو ظاہر کرتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ گذشتہ مسرتوں، تلخی ایام اور ماضی وحال کی تمام حسن کاریوں کو یاد کر رہا ہے، لیکن اس کے جثے کا عجیب ترین حصہ اس کے چھوٹے اور لمبوترے ہاتھ تھے، جو آہستہ روی اور فطری ہم آہنگی سے ہوا میں لہراتے تھے۔ یہ ہاتھ اتنے نرم و نازک اور کھچے ہوئے بھی نہیں تھے، مگر وہ ہمیشہ خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔

میں اردو بولتا ضرور تھا، لیکن روانی سے نہیں اور اس میں مجھ سے غلطیاں بھی سرزد ہو جاتی تھیں۔ جو دوست مجھے یہاں لے کر آیا تھا، اس نے رقاصہ کے ساتھ طویل گفتگو میں میری خاصی مدد کی۔ میں اس خاتون کے حالات زندگی اور ظاہری رنگ ڈھنگ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں حاجی ہوں، برسوں مدینہ میں روضۂ رسولؐ کے قریب مقیم رہا ہوں، تو وہ متاثر بھی ہوئی اور حیرت زدہ بھی۔ اگرچہ ہندوستانی رقاصائیں ایک مخصوص طرز زندگی گزار رہی ہوتی ہیں، لیکن ان میں جو مسلمان ہوتی ہیں، وہ اپنے پیشہ وارانہ تقاضوں کے باوجود اپنے مذہبی اعتقادات سے گہری وابستگی رکھتی ہیں۔ عام طور پر وہ ہر نئے دن کا آغاز تلاوت قرآن سے کرتی ہیں، ماہ رمضان میں بڑی پابندی کے ساتھ روزے رکھتی ہیں۔ پھر بھی اپنی افسردگی کے احساس کے باوجود وہ اپنی حقیقی اور گذشتہ زندگی میں پائے جانے والے اختلاف سے پوری طرح واقف ہوتی ہیں۔ ان کے اس رویے کی شاید ایک وجہ یہ ہے کہ اگر وہ بظاہر اخلاقی قیود سے آزاد نظر آتی ہیں، لیکن وہ حقیقتاً عیاش نہیں ہوتیں اور کسی حد تک اپنے برتاؤ اور نسوانی عزت نفس کا خیال رکھتی ہیں۔

وہ گانے کے ساتھ کچھ کچھ رقص بھی کرتی رہی۔ یہ باقاعدہ رقص تو نہیں تھا، بلکہ وہ آگے پیچھے، دائیں بائیں رک رک کر لمبے لمبے قدم اٹھاتی۔ بازوؤں، کہنیوں اور انگلیوں کو مختلف انداز سے آہستہ آہستہ حرکت دیتی۔ ہر قدم پر اس کی چاندی کی چوڑیاں اور پازیبیں بجتیں اور جھنجھناتیں اور اس کی بوجھل بادامی آنکھیں دور کی گہرائیوں سے جھانکتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ تھک کر دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے سرہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنے دونوں سیپ جیسے سیدھے ہاتھ گہرے قالین پر رکھ دیئے۔

میرے دوست نے میری خاطر اس سے پوچھا کہ وہ کہاں پیدا ہوئی۔ اس نے جواب دیا ''میرا باپ ایک موسیقار تھا۔ ہم اکثر دیہاتوں، قصبوں اور ایسی جگہوں پر جہاں میلے ٹھیلے لگتے، گھوما کرتے تھے۔ میری ماں نے کولو (Kulu) کے میلے پر مجھے جنم دیا۔ وہاں ہندو دسہرے کا تہوار منا رہے تھے اور وہیں میری ماں کمزوری اور شدید سردی کے باعث وفات پا گئی۔ کافی عرصے بعد میرے والد نے مجھے بتایا کہ اس نے میری ماں کو ایک چراگاہ میں دفن کر دیا، جس کے قریب ہندو اپنے بتوں کے گرد چاولوں سے کشید کی ہوئی شراب پی کر ناچ رہے تھے۔ میرا باپ زار و قطار رو رہا تھا، کیونکہ وہاں کوئی ایسا شخص موجود نہیں تھا جو میری ماں کی لاش پر چند آیات قرآنی پڑھ سکے۔''

میں نے اس سے پوچھا کہ ''کولو کہاں ہے؟'' اسے کولو کے محل وقوع کا صحیح علم نہیں تھا، پھر بھی وہ کہنے لگی کہ ''کانگڑہ کی وادی کے پرے پہاڑوں میں کہیں واقع ہے۔''

Marfat.com

یوں کولو میرے تصورات میں بس گیا۔ میں نے بانسریوں اور ڈھولکیوں کے ساتھ مردوں اور عورتوں کے ایک ہجوم کو گاتے ہوئے سنا۔ ان لوگوں نے سونے چاندی کے تاروں سے تیار ریشم اور کمخواب کے لباس پہن رکھے تھے اور مختلف شکلوں کے دیوتاؤں کے چاروں طرف ناچ رہے تھے۔ یہ بلند پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک وادی تھی، جہاں تیز سرد ہوا چل رہی تھی اور صنوبر کے درخت اور چراگاہیں بکثرت تھیں۔ اسی شام کو جب میں شیرانوالہ دروازہ کے قریب واقع عبداللہ قصوری کے گھر واپس لوٹا، تو میں نے شمالی ہندوستان کا نقشہ میز پر بچھا دیا، جس میں مجھے پنجاب کے مشرقی کنارے کولو شہر کا نام مل گیا، جس کے گرد ہمالیہ کے بلند و بالا پہاڑ تھے اور وہ تبت کی سرحد سے زیادہ دور بھی نہیں تھا اور یہیں میں نے جانے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ دسہرہ کے تہوار کے چند روز بعد ہم ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

(2)

اگلے روز میں اور میرا دوست[13] لاہور سے روانہ ہوئے۔ رات کو ہم پٹھان کوٹ پہنچے۔ وہاں ریل گاڑی تبدیل کی اور پنجاب کے میدانوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے چل پڑے۔ تنگ پٹڑی پر چلتی ہوئی گاڑی صبح سویرے کانگڑہ کی وادی میں داخل ہوئی اور یہ کوہ ہمالیہ کے سلسلہ کا نقطۂ آغاز تھا۔ سرخی مائل آسمان کو چھوتی ہوئی سیاہ چوٹیاں، سبز اور سرد جنگلات، آڑے ترچھے میدان، چائے کے باغات اور گھسی پٹی چٹانوں کے اوپر بہتا ہوا پہاڑی چشمہ۔ دوپہر کو بلند سے بلند تر چٹانیں نمودار ہوئیں اور گاڑی موڑ پر موڑ کاٹتی ہوئی آہستہ روی کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد کانگڑہ کا چھوٹا سا شہر آیا اور اسی کے نام سے یہ وادی موسوم تھی۔ ذرا فاصلے پر بنے ہوئے گھر، جن کی ہموار چھتیں جھاڑیوں اور درختوں کے پتوں سے بنائی گئی تھیں، شہر سے پرے پہاڑی، نگرکوٹ کے پرانے قلعہ کے کھنڈرات باہر کو نکلتے محسوس ہوتے تھے۔ صدیوں پہلے یہ قلعہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ یہاں قیمتی پتھروں کے بنے ہوئے مجسمے رکھے تھے۔ کبھی کبھی شمالی ہندوستان کے شکست خوردہ شہزادے پناہ لینے یہاں آیا کرتے تھے۔ اسلامی قرون وسطیٰ میں ایک عظیم جنگجو بادشاہ محمود غزنوی یہاں حملہ آور ہوا۔ بتوں کی شکست و ریخت کے ساتھ ہی اس نے وہ طاقت بھی ملیامیٹ کر دی، جو خدائے واحد کے علاوہ ان بتوں کی پرستش کرتی تھی۔ اس نے پہلے ہی حملے میں یہ قلعہ فتح کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب محمود غزنوی واپس غزنی پہنچا تو اس کے فوجیوں نے بازاروں میں غلہ ماپنے والے پیمانے سے بیش بہا ہیرے جواہرات فروخت کئے اور ہندوستان کے میدانوں اور پہاڑی علاقوں سے گرفتار شدگان کو غلاموں کی حیثیت سے آٹھ آٹھ فی کس سے بھی کم قیمت پر بیچ دیا۔

جلد ہی ہم جوگندر نگر نامی گاؤں پہنچے۔ یہ ریل گاڑی کا آخری سٹیشن تھا۔ میں یہاں کے ایک ہی تنگ بازار میں گھومتا پھرتا رہا۔ اس بازار کی دونوں جانب چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ گھروں کے برآمدے اور بالکونیاں لکڑی سے بنائی گئی تھیں اور ان کی چھتیں بالکل ہموار تھیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے سوئٹزرلینڈ کے دیہاتی گھر یاد آ گئے۔ دنیا کے تمام ممالک کے پہاڑی دیہاتوں کی چھوٹی سڑکوں کی ایک ہی مہک ہوتی ہے جس میں تازہ کٹی ہوئی لکڑی، مویشیوں کے

Marfat.com

اصطبل، گیلے چمڑے اور درختوں کی ٹھنڈی مہکار بسی ہوتی ہے۔

جوگندر نگر سے کولو جانے کے دو راستے تھے۔ ایک تو درۂ بھبو (Bhabu) سے ہو کر پیدل جانا پڑتا تھا اور اس میں تین دن لگتے تھے اور دوسرا گول سڑک سے ہوتا ہوا بذریعہ منڈی (Mandi) جاتا تھا۔ یہاں بس چلتی تھی اور ایک دن میں کولو پہنچا دیتی تھی۔ چنانچہ میں نے یہی راستہ اختیار کیا۔

منڈی کوہ ہمالیہ کے مغربی کنارے پر واقع ایک نیم آزاد ریاست کا مرکزی شہر ہے۔ پہاڑوں، تنگ اور جھاگ چھوڑتے ہوئے دریاؤں کا خوبصورت چھوٹا سا مجموعہ، اترتی اور چڑھتی چھوٹی سڑکیں، پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے چوڑے گھر اور یہاں شاذ و نادر ہی گندھی ہوئی مینڈھیوں میں کوئی خوبصورت عورت دکھائی دیتی ہے۔ یہاں بہت سے چھوٹے چھوٹے مندر بھی تھے، جن کے اونچے نیچے تنگ قبے اور ادھ کھلے صحن تھے۔ ہر مندر میں عجیب و غریب شکل کا پیتل کا بنا ہوا کسی دیوتا یا گائے کا مجسمہ رکھا تھا، جس کا سر اندر کی پوتر جگہ کو جھکا ہوتا۔

لاہور کے شور شرابے اور بے سکونی کے بعد منڈی کا شہر یوں لگا جیسے میں بچپن میں سنی ہوئی پریوں کی خوش کن کہانیوں کی کسی دنیا میں آ گیا ہوں۔ یہاں بلاشبہ ہر طرف سکوت اور امن و امان کی فضا بکھری پڑی تھی۔ مکانات سادہ تھے اور کسی مکین نے ان کو سجانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جن پہاڑیوں پر یہ شہر واقع تھا، انہی کی بل کھاتی چھوٹی گلیوں کے مطابق یہ گھر تعمیر کیے گئے تھے، لیکن اس شہر کی خوبصورتی کا اصل راز یہ تھا کہ اس شہر کا کوئی چھوٹا یا بڑا گھر کسی فرد نے اپنی سماجی حیثیت کے مطابق نہیں بنایا تھا، بلکہ اسے قطعہ زمین کے حدود اربعہ کو سامنے رکھ کر تعمیر کیا گیا اور اس شہر کا سارا حسن اس حقیقت میں مضمر تھا۔ اس طرح بازار کی لمبی چوکور شہر کی اونچائی سے آہستہ آہستہ نیچے کو آتی ہے اور اس کی یہ وجہ ہے کہ پہاڑی کے اوپر خاصا ٹیڑھا اور ہموار میدان ہے اور بازار کے چاروں طرف دکانوں کی جو قطار ہے، جن میں کچھ کی چھتوں پر چوبی منارچے بنے ہوئے ہیں، وہ ایسے لگتی ہے، جیسے ہموار پیالے کے اردگرد گھیرا سا بنا ہوا ہے۔ اس گھیرے سے پرے، تینوں جانب گہرے نشیبی علاقے ہیں، جو سبز میز پوشوں سے مشابہ ہیں، جن کی جھالریں نیچے لٹک رہی ہوتی ہیں۔ یہ جھالریں یہاں کی تنگ اور سایہ دار چھوٹی سڑکیں اور گلیاں ہیں، جو بل کھاتی نیچے مڑتی ہوئی پُرشور دریائے بیاس تک چلی جاتی ہیں اور اس میز پوش کے کونوں کی سجاوٹ کے طور پر خاصے اور عجیب وضع قطع کے کئی چھوٹے چھوٹے مندر تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان مندروں کے قبے بیضوی اور مخروطی شکلوں کے ہیں اور ان سب کا رخ دریا کی جانب ہے، کیونکہ ہندو اس دریا کو مقدس سمجھتے ہیں۔ ان مندروں کے تاریک اندرونی حصوں میں دیوتاؤں کے مجسمے ایستادہ تھے، جو دریا کے تیز بہاؤ پر غور کرتے محسوس ہوتے تھے۔ ان میں ایک ہاتھی کے سر والا گنیش، دس بازوؤں والی درگا کالی اور متعدد دوسرے دیوتاؤں کے بت تھے، جن کے ناموں سے مجھ جیسا اجنبی شخص واقف نہیں تھا۔

(3)

ہم نے ایک چھوٹی سی سرائے میں رات بسر کی۔ اگلی صبح اٹھے تو فضا خنک اور شیشہ جیسی صاف ستھری تھی۔

Marfat.com

ہم منڈی سے روانہ ہوئے۔ درختوں سے پہاڑوں کی ڈھکی ہوئی سبز ترائیاں سیاح کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ دنیا نے رات کے سناٹے کو مقدور بھر اپنے اندر سمیٹ لیا تھا اور اب دن کے شور شرابے ہم سے ہم کلام ہوئے۔ دریا کے کنارے واقع ایک مندر سے گھنٹہ بجنے کی اونچی اور کانوں کے پردے پھاڑنے والی آواز سنائی دی۔ چاول کے کھیتوں میں عورتیں گا رہی تھیں، جو کھلی اور ہموار جگہوں کی طرح نیچے دریا تک پھیلے ہوئے تھے۔

یہاں سے اصل کوہ ہمالیہ شروع ہوا۔ فلک بوس پہاڑی سلسلے اور گہری وادیاں، قدرے گول اور درختوں سے ڈھکے پہاڑ، ابلتے اور وادیوں میں تیزی سے رواں دواں چشمے۔ ہندوستان کے غبار آلود میدانوں اور لامتناہی منظر تصویر (لینڈ اسکیپ)، جو وسطی ایشیائی ڈھلوانوں کی کشادگی اور عرب کے ریگستانوں کے شکوہ سے محروم ہیں، کی ویرانی کے بعد کوہ ہمالیہ کی دہلیز پر قدم رکھنا میرے لیے کسی آسمانی وحی سے کم نہیں تھا۔ ایک نہ ختم ہونے والی ہریالی، جو جنگلوں کی تاریک گھاٹیوں سے نیچے چاولوں کے کھیتوں تک پھیلتی جاتی ہے۔ سورج کی روشنی اس کو بڑھا دیتی ہے اور پانی کے سینکڑوں چھوٹے گڑھوں سے اس کی چمک میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ سبزے کی یہ چادر نیچے دور تک دریا کے کنارے پتھروں کے بیچ میں اگی ہوئی نرم و نازک زرد سبز گھاس تک پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ سبز رنگ میں اس قدر تنوع بھی موجود ہے۔

ہم نے گھنٹوں بذریعہ کار دریا سے ملحقہ بلند سڑک پر اپنا سفر جاری رکھا۔ پہاڑی ڈھلوانوں کے ساتھ یہ سڑک بھی موڑ کاٹتی رہی اور اونچے، مشکل اور خاموش مناظر فطرت سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ چاولوں کے کھیت اب غائب ہو چکے تھے۔ چھوٹی پہاڑیاں اب بلند قامت پہاڑوں کی شکل اختیار کرنے لگی تھیں اور بعض اوقات وہ اس قدر گہری اور پتھریلی دیواروں کی طرح نظر آتے تھے، جنہوں نے تیز بہنے والے دریا کی اچھلتی کودتی لہروں کو اپنی مضبوط گرفت میں لے رکھا تھا۔ اب ہماری کار ایک ایسے تنگ موڑوں والے راستے پر چل رہی تھی، جس کے ایک طرف پہاڑوں کی دیوار تھی اور دوسری طرف انتہائی گہری کھائی۔ یہ درہ منڈی اور کولو کے درمیان واقع تھا۔

اور پھر آہستہ آہستہ یہ منظرِ فطرت یوں کشادہ ہونے لگا جیسے کسی شخص کی آنکھیں گہری نیند سے وا ہوں اور وہ مکمل بیداری سے قبل وقفے وقفے سے جمائیاں لے رہا ہو۔ بظاہر ان پہاڑوں تک رسائی ممکن نہیں تھی اور اب وہ دریا سے پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ ان کا پتھریلا برہنہ پن، نباتی مٹی اور درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اب وادی چراگاہوں اور جنگلوں سے بھری ہوئی ایک وسیع و عریض سطح مرتفع کی طرح پھیل گئی اور یہاں میں نے کئی سالوں کے بعد صنوبر کے جنگلات دیکھے۔ سیاہ، سبز، بلند قامت اور گھنے، رازوں اور یادداشتوں کو اپنے اندر چھپائے ہوئے۔ ریگستانوں اور گرم خلوت گاہوں میں گزارے ہوئے سالوں کی یاد مدہم ہونے لگی اور ان کی جگہ نئے سالوں اور مدتوں سے فراموش کردہ صداؤں نے لے لی اور اپنے حیران کن قلبی تشنج کے سبب لحہ بھر کو مجھے اچانک یہ خیال آیا کہ میں دو دنیاؤں کے مابین جھول رہا ہوں اور کہیں بھی میرا گھر نہیں ہے، لیکن پھر میں نے دوبارہ سوچنا شروع کیا اور مجھے اندازہ ہوا کہ ان خوفناک جذبات کی وجہ وہ ماحول تھا، جس میں مَیں گذشتہ چند ماہ سے زندگی گزار رہا ہوں۔ یہ عجیب خطہ ارضی یعنی ہندوستان، جو

Marfat.com

اپنی ہیئت اور مفہوم کے اعتبار سے کاملاً تہی دامن ہے اور مجھے اس کا وجود غیر حقیقی سا محسوس ہونے لگا۔ دنیاؤں کے مابین ایک اور دنیا۔ میں نہ اس دنیا میں نہ اس دنیا، نہ مشرق میں نہ مغرب میں۔

ہم وادی کولو کے پہلے گاؤں کے قریب سے گزرے۔ گھروں کی چھتوں پر سلیٹیں لگی ہوئی تھیں اور وہ چائے کے کھیتوں میں گھرے ہوئے تھے۔ غصیلی آنکھوں والے چرواہے اپنے ریوڑوں کو تبت کے سرحدی پہاڑوں سے نیچے میدانوں کو لے جا رہے تھے، تاکہ ہمالیہ کی سرد ہواؤں سے محفوظ رہا جاسکے۔

جبکہ ہمارا ڈرائیور کار چلانے، ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے اور ٹائروں میں ہوا بھرنے میں مصروف تھا۔ میں سڑک سے ذرا ہٹ کر بیٹھے ہوئے چرواہوں سے گپ شپ لگانے چلا گیا۔ اس وقت وہ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں ان سے علیک سلیک کی، لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ان کے گھر لداخ کے دور دراز علاقہ میں تھے، جو کشمیر کے تبتی حصے میں واقع ہے۔ انہوں نے چھوٹے اور گھٹیا قسم کے خاکستری سفید اون کے بنے ہوئے جیکٹ پہن رکھے تھے اور ان کے پاؤں میں تسمے والے جوتے تھے۔ ان میں سے ایک چرواہے نے بغیر کچھ کہے مجھے دودھ کا بھرا ہوا لکڑی کا ایک پیالہ پیش کیا۔ اس سے مجھے وہ کردستانی لڑکا شدت سے یاد آیا، جس سے میں برسوں پہلے کردستان میں ملا تھا اور اس نے اسی طرح بغیر کوئی بات کئے مجھے ایسی ہی پیشکش کی تھی۔ حتیٰ کہ اس لداخی چرواہے کی آنکھیں بھی اس کردستانی لڑکے سے ملتی جلتی تھیں۔ بالکل ویسی ہی خوش، معصوم اچاٹ پن، حدت اور حیرت سے چھلکتی ہوئی آنکھیں۔ ہندوستان کے میدانی علاقوں میں کہیں ایسی آنکھیں دکھائی نہیں دیتیں، کیونکہ یہاں کے بچے پیدائشی عمر رسیدہ اور تیز فہم ہوتے ہیں......

سڑک مختلف لوگوں سے اٹی پڑی تھی۔ ہمسایہ دیہاتوں سے بیشتر مرد اور عورتیں دسہرہ کا تہوار منانے کولو کی طرف جا رہے تھے۔ سبھی نے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال رکھے تھے اور عمدہ ملبوسات زیب تن تھے۔ مردوں نے لداخی چرواہوں کی طرح کے لیکن اچھے کپڑے کے چھوٹے جیکٹ اور تنگ جانگیے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے سروں پر گول ٹوپیاں یا سیاہ یا تنگ کونوں والے ہیٹ تھے جو پولینڈ کے ٹاٹرا (Tatra) پہاڑوں پر بسنے والے گورالوں (Gorals) سے بہت مشابہ تھے۔ خواتین کے ملبوسات اسکاٹ لینڈ کے کوہستانی علاقوں سے مشابہت رکھتے تھے، جو زیادہ تر سیاہ اور سفید یا مختلف رنگوں سے تیار کئے جاتے ہیں، لیکن یہاں انہیں بڑی مہارت سے جسم کے گرد لپیٹ دیا جاتا ہے اور درمیان میں کس کر رسی سے باندھ دیا جاتا ہے، تاکہ یہ بلاؤز اور اسکرٹ کی طرح دکھائی دے۔ یقیناً یہ خواتین میدانی علاقوں کی عورتوں کی طرح خوش شکل نہیں۔ اکثر گھٹی ہوئی اور قوی الجثہ ہوتی ہیں۔ پھر کان اور ناک میں چاندی کے بھاری زیور بھی ان کی صورت بگاڑ دیتے ہیں لیکن ان کی جوشیلی بشاشت ان کے ایسے تمام فطری اور غیر فطری نقائص پر غالب آجاتی ہے۔ وہ بلا کی ہنسوڑ تھیں اور ان کے مرد بھی ان کے قہقہوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے دائروں میں اپنی عورتوں کے ساتھ دھما چوکڑی بھی مچاتے تھے۔ ہر عورت نے موسم خزاں کے زرد پھولوں سے خود کو سجایا ہوا تھا۔ میں نے بوڑھوں کو دیکھا، جو سڑک کی مرمت کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ٹوپیوں کے

Marfat.com

گرد پھول لگا رکھے تھے، جوان کے کانوں کے پیچھے حرکت کرتے ہوئے انتہائی خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔

(4)

بالآخر میں کولو پہنچ گیا۔ سب سے پہلے صرف ایک چراگاہ نظر پڑی، جس میں بڑی تعداد میں لوگ مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ وہ اسٹال اور خیمے نصب کر رہے تھے۔ کچھ شہتیروں اور تختوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہے تھے۔ ایک نانبائی مٹی کا تنور بنا رہا تھا۔ چینی ترکستان کے تاجر قالینوں اور کلیموں (kilims) کی بھاری گٹھڑیاں کھول رہے تھے۔ آنے والے میلے کے اسی شور شرابے سے الگ تھلگ دیودار اور صنوبر کے ہزاروں درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ پہاڑ اور آسمان کے مقابل وہ ایسے ناقابل بیان شان وشوکت سے قطار اندر قطار قدیم یونانی معبد کے ستونوں کی طرح سیدھے ایستادہ تھے۔

اس چراگاہ کے نواح میں چند گھر، ڈاک خانہ، مدرسہ، مسافروں کے لیے سرائے اور کچھ دوسری عمارتیں کھڑی تھیں۔ کولو کا اصل شہر ابھی تک نظروں سے پوشیدہ تھا۔ سہ پہر کو زیریں بازار میں گھوم پھر رہا تھا کہ کولو شہر کا سراغ مل گیا۔ میں نے ایک تنگ سی گلی دیکھی، جو اچانک اوپر چڑھتی ہوئی پہاڑی ڈھلوان کے ساتھ نیچے کو آتی ہے۔ یہیں سے کولو شہر کی حدود شروع ہوتی ہیں۔

پرانے زمانے میں پہاڑ کی لمبی اور پتلی چوٹی پر اور دیواروں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا شہر آباد ہوا، لیکن اب یہ دیواریں غائب ہو چکی ہیں اور کولو اس چوٹی کی دونوں جانب نیچے کو زین کے تھیلے کی طرح لٹک رہا ہے۔ صرف ایک گلی نما سڑک پہاڑ کے اوپر جاتی اور پھر نیچے اترتی ہے۔ پرانے اور چوبی دروازوں والے چھوٹے گھروں کی دو قطاروں کے درمیان ایک تنگ سی وادی ہے۔ ان گھروں کی جو سطح سڑک کے برابر ہے، وہاں دکانیں بنی ہیں اور دوسری منزلوں پر لکڑی کی تراشیدہ بالکونیاں بنائی گئی ہیں۔

اس سڑک پر عام بازاروں جیسا شور شرابا نہیں۔ یہ سڑک اتنی تنگ ہے کہ آمنے سامنے کی کھڑکیوں میں بیٹھے ہوئے اشخاص بآسانی آپس میں مصافحہ کر سکتے ہیں۔ پوری زندگی ایک خول میں بند ہو کر رہ گئی ہے، اس لیے کوئی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ تمام لوگ خاموش تھے۔ دکاندار بھی زمین پر چوکڑی مارے، گم سُم اور اپنی دکانوں پر بے حس و حرکت بیٹھے ہیں۔ یہ دکانیں یورپی کارخانوں کی مصنوعات کے علاوہ وسطی ایشیا کی گرد آلود اور عجیب و غریب اشیاء سے بھری پڑی ہیں جن میں یاک کی سفید گھنی دمیں بھی تھیں جنھیں ہندوستانی شہزادے تہواروں کے موقع پر اپنے اعلیٰ مرتبہ کی علامت کے طور پر سنبھالے رکھتے ہیں۔ ختان اور یارقند کے بیل بوٹوں سے سجے ہوئے نمدے کے قالین اور کاشغر کے چمکیلے رنگوں کے ریشمی ملبوسات بھی دستیاب تھے۔ چینی تانبے کا ایک پرتالوہان کی خوشبو سے معطر برتن پڑا تھا اور اس پر ہاتھ سے نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ اس کے اوپر اونی کپڑے کا ٹکڑا جس کے رنگ مدہم ہو گئے تھے، رکھا تھا اور یہ مانچسٹر جیسی کسی جگہ کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اس کے ساتھ ہی خواتین کے سرخ چمڑے کے جوتوں کا ایک جوڑا پڑا تھا،

Marfat.com

جس پر زرد ریشمی کڑھائی کا کام کیا گیا تھا۔ ایسے جوتے قرغیز کی امیر عورتیں استعمال کرتی تھیں۔ ایک دکان کے ذرا پیچھے کی طرف میں نے چترال کی بنی ہوئی زین دیکھی۔ اس کی پیتل کی موٹھ پر جو شیشہ لگا ہوا تھا، وہ چیکوسلوواکیہ کی کوئی استعمال شدہ لالٹین معلوم ہوتا تھا۔

لیکن اس کے باوجود مجھے یہاں 'آج' اور 'کل' کے مابین کسی طرح کی چپقلش کا احساس نہیں ہوا۔ وقت کی دھول میں پرانا کولو آسمان پر وقت شام نمودار ہونے والی روشنی کی طرح نمایاں ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کی طرح زندہ ہے جس کو موت نے نظر انداز کر دیا ہے۔ غالباً یہ تمام دکاندار اور راہگیر بھی اسی لیے خاموش اور کم گو تھے کہ کہیں موت کو اس شہر کی موجودگی کا پتہ نہ چل جائے۔ بہر حال یہ تو مسلمہ حقیقت ہے کہ جہاں موت نہیں، وہاں زندگی بھی نہیں ہے۔

کولو میں مومی چہرے والے لوگ بستے ہیں اور وہ ان نوجوانوں یا باتونی مزدور خواتین سے خاصے مختلف دکھائی دیتے ہیں، جو نئے زیریں بازار یا چراگاہ میں کام کر رہے تھے۔ وہ کسی ویران پتلیوں کے تماشا کی تصاویر کی طرح آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اکثر مردوں کی پیشانیوں پر برہموں جیسا زعفرانی نشان لگا ہوتا ہے، جو ان کی اعلیٰ ذات کی علامت ہے۔ عورتیں خاموش طبع اور اپنے سجاؤ کے اعتبار سے مغرور ہیں۔ اونچی آواز سے بات نہیں کرتیں۔ قہقہے نہیں لگاتیں۔ وہ خوش شکل ہیں اور بعض کا حسن تو حیران کن حد تک جذبات انگیز اور دل خراش تھا، یہاں تک کہ جب کوئی ایسی حسین خاتون قریب سے گزرتی، میں وہیں دل تھام کر رہ جاتا۔ وہ زیادہ تر اکٹھی چلتی پھرتی تھیں۔ وہ سرسراتے ریشم اور شوخ رنگوں کے لباس پہنتی تھیں اور ان کی آنکھیں ہمیشہ ویران پتلیوں کے تماشہ کی خواتین کی طرح بنا حرکت کیے آگے کی طرف دیکھتی رہتی تھیں۔

(5)

ایک سیاہ محرابی بڑا سا دروازہ کھلا تو میں نے مربع شکل کا گھاس سے بھرا ہوا میدان دیکھا، جس کے چاروں طرف چند اونچی اور نمائشی عمارتیں کھڑی تھیں۔ ان کے بیچ میں کولو کے راجا کا محل واقع تھا، جو اب اصل اختیارات سے محروم ہو چکا تھا اور صرف نام کا راجا رہ گیا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد نہ صرف کولو بلکہ لاہول (Lahool) اور سپتی (Spiti) کے ہمالیائی اضلاع، نیز شمال مغربی پنجاب کے ایک بڑے حصے پر حکمرانی کرتے رہے۔ ان کے تبت کے دلائی لامہ کے ساتھ بالواسطہ سفارتی تعلقات استوار تھے، یہاں تک کہ چینی بادشاہوں کے ساتھ بھی تحائف کے تبادلے ہوتے رہتے تھے جن سے ان دوستانہ مراسم کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تبت اور چینی ترکستان کو ہندوستان سے ملانے والی شاہراہ کولو میں سے گزرتی تھی۔ گذشتہ صدی کے وسط میں کولو پر برطانوی راج قائم ہو گیا اور اسے مملکت ہند کا حصہ بنا لیا گیا اور یوں دیگر ہندوستانی راجاؤں کی طرح کولو کا راجا بھی اپنی جدی مسند اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ پھر بھی جن دنوں میں وہاں تھا، کولو کے عوام اپنے بڑوں کی طرح راجا سے عقیدت و احترام کا رشتہ قائم رکھے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ راجا اپنے اس عظیم الشان محل میں براجمان رہا، حالانکہ اس کی دیکھ بھال میں اس کے محصولات کی تقریباً ساری آمدنی

Marfat.com

صرف ہو جاتی تھی۔

محل کے سامنے جو بلند اور قدرے وسیع جگہ تھی، وہاں مجھے کو لوشہر کا بیشتر حصہ نظر آتا تھا۔ میرے لیے عجیب ترین تاثر یہاں کی صفائی اور ستھرائی تھی، جو میدانی شہروں اور دوسرے دیہاتوں کے مقابلے میں انتہائی اچھی حالت میں تھی۔ ہر گھر کے چاروں طرف چھوٹے اور صاف ستھرے صحن تھے۔ پتھریلی اینٹوں کی چھتوں کی ڈھلوانوں پر ہزاروں کی تعداد میں مکئی کے بھٹے بڑی ہنر مندی سے سکھانے کے لیے بکھیرے گئے تھے۔ مختلف رنگوں کے گل لالہ اور گلاب کی ٹہنیوں کو کھڑکیوں میں سجایا گیا تھا۔

شام کے قریب میں ابھی سرائے واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ معاً میری نظر ایک تنگ سے بڑے دروازے پر پڑی، جو محل کے سامنے کے میدان سے بازار کے گردونواح میں واقع گھروں کی طرف جاتا تھا۔ میں اُدھر چل پڑا، لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی راستہ نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا صحن ہے جس کے چاروں طرف دیواریں اور صرف پچھلی دیوار میں ایک دروازہ ہے جس کے اوپر بزاری (bizarre) پھولوں کی شکل کے پتھر کے مجسمے تراشے گئے ہیں مثلاً کئی بازوؤں والی دیویاں، جانوروں کے سر والے دیوتا اور مرد و عورت کے ملاپ کی انتہائی تفصیل سے بنائی ہوئی قدرے عریاں تصاویر۔ صریحاً یہ ایک مندر تھا۔ اس کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ میں نے اس کے نیم تاریک اندرونی حصے پر نظر دوڑائی، لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ غیر ہندوؤں کے لیے ہندوستانی مندروں میں جانے کی سخت ممانعت تھی، پھر بھی میں اس مندر میں داخل ہونے کی اپنی شدید خواہش کو نہ روک سکا۔

کمرے کی چھت کے نیچے چھوٹی سی کھڑکی اور ادھ کھلے دروازے میں سے تھوڑی سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ سورج کو طلوع ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کمرے کا تفصیلی جائزہ مشکل تھا۔ چھت خاصی نیچی تھی۔ تانبے اور چاندی کے کچھ لیمپ زنجیروں کے سہارے لٹک رہے تھے۔ اس وقت وہ روشن نہیں تھے۔ پس منظر میں قربان گاہ جیسی کوئی جگہ دکھائی دی۔ چوکی کے اوپر لکڑی کا ایک ٹھوس اہرام مصر سے مشابہ بھاری سا ٹکڑا پڑا تھا، جس کو چاروں طرف سے کسی چمکیلی دھات (غالباً چاندی) کے دیوتاؤں کے نقابوں سے سجایا گیا تھا۔ اس کے سامنے ایک بڑا چپٹا سا پتھر کا پیالہ رکھا تھا، جس میں تھوڑا سا تیل پڑا تھا۔ اس کے درمیان ایک بچے کے بازو جتنا عمودی شکل کا پتھر (غالباً سنگ مرمر) بھی تھا۔ مجھے جلد ہی پتہ چل گیا کہ یہ لنگ ہے۔ ہندوستان میں علامتی طور پر مرد کے عضو تناسل کی پوجا کا خاصا رواج ہے، کیونکہ اسے اولاد پیدا کرنے اور نئے جنم کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ میں ہمالیہ کے اس دور افتادہ علاقے میں لنگ مندر دیکھ کر خاصا متعجب ہوا۔ ابھی میں کمروں میں پڑی ہوئی چیزوں کو تفصیل سے دیکھنے کی غرض سے دروازے کو مزید کھولنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ فی الفور میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید کسی کو معلوم ہو گیا ہے کہ ایک کافر اور غلیظ شخص مندر میں داخل ہو گیا ہے جس کی موجودگی ہی اس عبادت گاہ کے تقدس کو پامال کر دے گی۔ یہ سوچتے ہی میں جھٹ سے اندر داخل ہو گیا اور خود کو لنگ چوکے کے پیچھے ایک چھوٹے سے قبے (alcove) میں گھسیڑ لیا۔ یہاں تیل سے بھرا ہوا ایک بڑا سا پیپا پڑا تھا۔ شاید یہ متبرک تیل مندر کے چراغوں یا

Marfat.com

یہاں کے مجسموں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ اگر میں اپنے آپ کو سکیڑ کر تیل کے اس پیپے کے پیچھے بیٹھ جاؤں تو کوئی شخص بھی مجھے دیکھ نہیں سکے گا۔

ایک بوڑھا شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے لٹکتے ہوئے ایک لیمپ کو جلایا تو مجھے اُس کا چہرہ صاف طور پر دکھائی دیا۔ اس کے ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا، جو برہموں کی نشانی ہے، لیکن اس کا لباس کولو کے عام باشندوں کے لباس سے مختلف نہیں تھا۔ وہ اس مندر کا پروہت جان پڑتا تھا۔ جونہی اس نے لیمپ جلایا اور دروازے کو ذرا اور کھول دیا کہ ایک جوان عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے اپنا سر جھکایا ہوا تھا۔ پنڈت اسے ذرا کرخت لہجے میں پندو وعظ کر رہا تھا اور وہ اسے غور سے سن رہی تھی۔

اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے غور سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ قبے کی عقبی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان سا ہوا۔ صرف ایک لکڑی کی چٹخنی لگی تھی اور اس کی ایک دراڑ میں سے محل کے سامنے والا کھلا میدان نظر آیا۔ اس وقت وہاں کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہی میرے باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ جب میں نے بڑے دروازے کے کھلنے کی آواز سنی، اسی وقت میں نے آہستگی سے چٹخنی کو کھول لیا تھا۔ جونہی میں نے احتیاط سے تیل کے اس پیپے کے اوپر سے دیکھا تو وہ جوان عورت اکیلی اس الہامی علامت کے سامنے کھڑی تھی۔ پنڈت دروازہ بند کر کے باہر جا چکا تھا۔

میں انتظار کرتا رہا۔ تیل سے جلنے والے لیمپ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں مَیں نے ایک عورت کا چہرہ دیکھا۔ وہ اداس اور بظاہر غمزدہ سی دکھائی دیتی تھی۔ کچھ دیر وہ دونوں ہاتھ باندھے بے حس و حرکت کھڑی رہی، پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنے لباس کے بکسوؤں کو کھولنا شروع کیا۔ اس نے اپنی شال پرے پھینک دی اور پھر قدرے جھجکتے ہوئے اس نے اپنے باقی ماندہ کپڑے بھی اتار دیئے۔ اب وہ بالکل برہنہ حالت میں لنگ کے سامنے کھڑی کانپ رہی تھی۔ پھر وہ احتراماً گھٹنوں کے بل جھک گئی۔ میں نے اسے بانجھ عورت سمجھا، جو اب اپنی پیشانی، پستانوں اور کولہوں سے عبادت کر رہی تھی۔ بالآخر وہ زمین پر لیٹ گئی اور تواتر سے اپنا ماتھا فرش پر پڑے پتھر پر مارنے لگی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ میں نے اس کی دبی دبی رونے کی آواز بھی سنی۔ ایسی دردانگیز آواز میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس آواز میں اتنا غم، ناامیدی اور مایوسی تھی کہ مجھے سن کر اپنے دل کی حرکت رکتی سی محسوس ہوئی۔ ایک ہندو عورت کے لیے بانجھ پن بدبختی کی ایک بڑی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ ایسی عورت کی موت پر مقدس رسومات ادا کی جاتی ہیں اور یوں اسے نیا جنم لینے کے عمل سے مکتی حاصل ہو جاتی ہے۔

میں اس عورت کی آہ و زاری کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا۔ میں نے بڑی آہستگی سے چھوٹے عقبی دروازے کو کھولا اور کھلے میدان میں آ گیا۔ میں نے تیز دوڑنا شروع کر دیا، جیسے کوئی انجانا خطرہ میرا تعاقب کر رہا تھا۔ میرے قدموں کے نیچے گھاس کا ایک خالی میدان تھا جس کے اوپر موسم خزاں کا نصف چاند اپنی زرد روشنی بکھیر رہا تھا۔

Marfat.com

(6)

میں سویا ہوا تھا کہ ایک لمبی، فریاد کرتی ہوئی تُری باجے جیسی آواز نے مجھے جگا دیا۔ میں کچھ دیر بستر ہی پر بیٹھا ہوا یہ آواز سنتا رہا۔ کھڑکی کے پرے رات ابھی اپنی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر وہی بھدی اور بے گونج آواز سنائی دی۔ یوں محسوس ہوا کہ یہ آواز کسی بچے کے بڑے سے بگل سے آ رہی ہے۔ اس میں ایک شدید گونج بھی تھی اور وہ رات کو کسی سنسان گلی میں پھرنے والے بے سہارا شخص کی چیخ کی طرح کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ اس کے چند لمحوں بعد ہی اس آواز کے ساتھ بڑے بڑے ڈھولوں کی آوازیں گونجنے لگیں، جن میں صنوبر کے درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑی اترائیوں کی صدائے بازگشت بھی شامل تھی۔ آہستہ آہستہ ڈھول تاشے کی یہ آوازیں قریب آتی گئیں۔ مرلیاں سریلے انداز سے بجائی جا رہی تھیں۔ گھنٹی کی آواز ہلکی تھی اور تریئوں کی حزنیہ نوا ایک اثر انگیز اور دم بخود کر دینے والے نغمے کی شکل میں ڈھل گئی۔

میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ وادی کے دیودار درختوں پر زرد ستاروں کی روشنی پڑ رہی تھی۔ اِدھر اُدھر آگ کے چھوٹے چھوٹے الاؤ روشن تھے۔ اتنی رات گئے کچھ لوگ اگلی صبح شروع ہونے والے تہوار کے لیے خیمے نصب کرنے اور دکانیں لگانے میں مصروف تھے۔ موسیقار بھی شعلوں کی روشنی میں چراگاہ کے قریب آتے جا رہے تھے۔ مردوں اور عورتوں کی ایک لمبی قطار تھی، جن کے درمیان دو آدمیوں نے لٹھوں پر ایک دیوتا کی مورتی اٹھا رکھی تھی، جس کے گلے میں ہار ڈالے ہوئے تھے۔ یہ ایک آٹھ چہروں والی مورتی تھی، جو اوپر نیچے پڑے ہوئے چار نقابوں میں سے باہر دنیا کے چاروں کونوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ یہ ان بہت سے بتوں میں سے ایک تھا، جو رام چندر کے استقبال کے لیے اس میلے میں لائے گئے تھے۔ ہندو عقیدے کے مطابق رام اجودھیا کے راجا کا بیٹا ہے جو بالآخر کرشن کے نئے روپ میں ہندوستانی دیوتاؤں کی جنت میں داخل ہو جائے گا۔ وادی کی تمام اطراف اور سب پہاڑی راستوں سے آنے والے جلوسوں کی مرلیوں، ڈھولوں، گھنٹیوں اور تریئوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہاں ہر گاؤں کا اپنا الگ دیوتا ہوتا ہے۔

ہندوؤں کا سب سے بڑا تہوار دسہرہ ہے اور یہ تہوار رام چندر کی دنیاوی کامیابیوں کی یاد منانے کے لیے منعقد کیا جاتا ہے مثلاً کیسے اس کی مکار سوتیلی ماں نے اسے اپنے حکمران باپ کی وراثت سے محروم کرنے کے لیے سازشیں کیں، اپنی سیتا جیسی وفادار بیوی کے ساتھ چودہ سال جنگلوں میں گھومتے پھرتے گزارے، دنیا سے برائی کے خاتمے کے لیے وہ کس بہادری سے دیوتاؤں اور بھوتوں سے نبرد آزما رہا، جزیرہ لنکا (موجودہ سیلون) کے شیطان بادشاہ راون، سیتا کی محبت میں گرفتار ہوا اور اسے اغوا کر کے اپنے ملک لے گیا اور پھر کیسے رام نے انتہائی اذیت ناک مراحل سے گزر کر اپنی مغویہ بیوی کا کھوج لگایا، اسے آزاد کرایا۔ شیطانوں کی حکومت کو نیست و نابود کیا، راون کو آگ میں بھسم کیا اور بالآخر ایک نیم دیوتا کی حیثیت سے اپنی مملکت کو واپس چلا آیا۔ بے شمار معجزوں میں لپٹی یہ داستان عظیم رزمیہ تصنیف ''رامائن'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے، جو دورِ حاضر تک ہندوستانی ذہن کو ہر حقیقت سے زیادہ عزیز

Marfat.com

ہے۔

رام چندر کا زندہ روپ کرشن ہے، جو اس علاقہ میں نھورام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔کولو کا یہ سب سے بڑا دیوتا شاہی محل کے قریب واقع مندر میں براجمان ہے۔ چنانچہ مضافاتی علاقوں میں موجود تمام چھوٹے دیوتاؤں پر یہ لازم ہے کہ وہ ان دنوں میں خود حاضر ہو کر اپنے بڑے بھائی کو خراج تحسین پیش کریں۔ کہا جاتا ہے کہ پچھلے وقتوں میں تقریباً 360 دیوتا ہر سال اس تہوار کے موقع پر یہاں جمع ہوتے تھے، لیکن اب یہ تعداد کم ہو کر نوے اور سو کے درمیان رہ گئی ہے۔کولو میں منایا جانے والا یہ تہوار خاصا پُر رونق اور متاثر کن تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان سے تبت اور چینی ترکستان جانے والے تمام تجارتی راستے یہیں سے گزرتے تھے اور یوں کولو شہر ہندوستان اور ان دو منگول مملکتوں کی مشترکہ منڈی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ لہاسہ، منسروور (Mansarovar)، کاشغر، یارقند، کشمیر، لداخ بلتستان اور پامیر کے بلند و بالا علاقوں کے تجارت پیشہ لوگ اس روز تک یہاں اپنی دکانیں سجائے رکھتے اور یہ خاموش اور پُر سکون سی وادی تھوڑے دنوں کے لیے ایک ہنگامہ پرور اور بارونق تجارتی مرکز کی حیثیت اختیار کر جاتی۔

(7)

علی الصبح جب میں سرائے سے باہر نکلا، تو وسیع چراگاہ میں لوگوں کی خاصی تعداد موجود تھی اور ان کی باتوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہر جگہ گردونواح کے دیہاتوں سے آئے ہوئے مردوں اور عورتوں کی ٹولیاں گھوم پھر رہی تھیں۔ انہوں نے کھلے آسمان کے نیچے پڑاؤ ڈال رکھے تھے اور ہر ٹولی نے پُر مسرت جذبوں سے سجائے ہوئے اپنے دیوتا کو درمیان میں بٹھا رکھا تھا۔ یہ تمام دیوتا ایک دوسرے سے مختلف نہیں تھے۔ لکڑی کی چھوٹی سیڑھیوں کو گوناگوں زربفت کے پردوں، ریشمی شالوں اور پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا اور اس کے اوپر ایک عجیب و غریب چھوٹا سا مجسمہ رکھا تھا، جس کا چہرہ سادہ منقش چاندی یا سونے کے سیدھے نقاب سے ڈھانپا ہوا تھا۔ ان میں اگر کوئی دیوی یا دیوتا زیادہ عزت و احترام کا مستحق ہوتا تو اس اہتمام کے علاوہ اس کے اوپر ایک چھوٹی سی ریشمی چھتری تان دی جاتی اور یاک کی ایک یا ایک سے زیادہ کالی دُمیں لگا دی جاتیں۔ پوجا کے وقت چاندی کے دستوں میں یاک کی سفید دُموں کو دیوتا پر رکھا جاتا۔ ایک شخص اس پر خوشبویات سے بھرا ہوا پیالہ لہراتا، جبکہ دوسرا مور کے پروں سے بنے ہوئے پنکھے سے اسے ہوا دیتا رہتا۔ ترئیوں کی اداس آوازیں، ڈھولکیوں اور نقاروں کی کھڑکھڑاہٹ، بانسریوں کا ہلکا شور اور گھنٹیوں کی جھنکار بھی ساتھ ساتھ سنائی دیتی۔ پروہت اور دیگر پجاری اس مقدس دیوتا کو پرنام کرتے۔ تمام آلات موسیقی کی مخصوص آوازیں تیز سے تیز تر ہو جاتیں اور پھر اچانک، شاید کسی کے حکم سے، یہ سارا شور و غوغا ختم ہو گیا اور یوں پوجا کا یہ مرحلہ اختتام کو پہنچا۔

پوجا میں شامل سبھی عورتیں اور مرد دیوتاؤں سے زیادہ خوشنما دکھائی دے رہے تھے۔ ان سب کی گردنوں میں پھولوں کے ہار تھے اور ان کی بے تکلفانہ خوش طبعی میں آسمان پر ڈھلتے سورج کی روشنی اور صنوبر کے جنگلوں کی تازگی

Marfat.com

مزید اضافہ کر رہی تھی۔ وہ کھل کر قہقہے لگاتے، نغمہ سرائی کرتے اور بچوں کی طرح چراگاہ اور دکانوں کے اردگرد ایک دوسرے کا تعاقب کرتے تھے۔ان دکانوں میں سجا بدیسی سامان انہیں اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔

اسی وقت دو مختلف دیہاتوں سے آئے ہوئے دو دیوتاؤں کی پہلی بار'ملاقات' کرائی گئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کولو میں دسہرہ کے اس تہوار سے قبل عجیب وغریب ناموں والے ان چھوٹے دیوتاؤں کو کیوں نہیں لایا گیا۔ متعلقہ پروہتوں نے ان دونوں دیوتاؤں کے بارے میں تعارفی کلمات بھی ادا کیے۔

جیسا کہ نقرئی نقابوں میں چھپی ہوئی بڑی بڑی موچھوں اور داڑھیوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ تمام دیوتا طبقہ ذکور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر ایک کے بنفشی ریشم کا لباس زیب تن تھا، جس کو سنہری پھولوں کی کڑھائی سے سجایا گیا تھا اور اس کے ہشت پہلو سر پر یاک کی دُموں اور سنہری دھاگوں کے پھندنوں کا چھتر تھا۔ اس کے مقابل دیوی کا مجسمہ تھا، جس کی سج دھج اس قدر پُرشکوہ نہیں تھی۔ اس کا گلابی زربفت کا لباس پرانا اور فرسودہ تھا اور جگہ جگہ سے اس کی جھالروں کو آپس میں جوڑ دیا گیا تھا اور اس کے اوپر کسی چھتری کا اہتمام بھی نہیں کیا گیا تھا۔ یہ بت بانس سے بنے ہوئے الگ الگ چھوٹے پلیٹ فارم پر براجمان تھے اور ہر ایک کو دو آدمیوں نے اٹھا رکھا تھا اور پروہت اس کے جلو میں چل رہا تھا۔ دھیمی اور ایک جیسی غنائی آواز میں پنڈت اپنے دیوتاؤں کا نام لے رہے تھے (جیسا کہ میرے دوست نے ترجمہ کر کے مجھے بتایا)، ان سے منسوب اچھائیوں اور شکتیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ پھر موسیقاروں نے ڈھول اور گھنٹیاں بجانا شروع کر دیں۔ دیوی اور دیوتا نے ایک دوسرے کو سات مرتبہ دیکھا اور یوں یہ تعارفی تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔

ایک بوڑھا شخص آگے بڑھا اور مجھے بتایا گیا کہ یہ کولو کا مشہور جوتشی ہے۔ وہ دیوتاؤں کے بیچ میں کھڑا ہو گیا اور انہیں اپنے ہاتھوں سے چھوا۔ اپنا دایاں ہاتھ دیوتا پر اور بایاں دیوی پر رکھا۔ تھوڑی دیر تک وہ سیدھا اور بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ ایک کوتاہ قد، بڑی اور گہری آنکھوں والا دبلا پتلا شخص تھا۔ تمام لوگ مہر بہ لب تھے۔ جوتشی کے چہرے پر کپکپی سی دوڑ گئی۔ یہ تھرتھراہٹ اس کے جسم کے اندر سے آتی ہوئی بتدریج گاہ بگاہ اس کے ہونٹوں تک پھیل جاتی تھی، حتیٰ کہ معمولی قد وقامت کا یہ شخص سر سے پاؤں تک کانپنے لگا اور وہ تند وتیز ہوا میں ایک خشک پتے کی طرح حرکت کرنے لگا۔ اس نے بولنا شروع کیا اور اس کی آواز ان لوگوں جیسی تھی، جن پر بوجھ کے باعث کپکپی طاری ہوتی ہے یا جو قطعی خطرے کی زد میں ہوں یا مایوس اشخاص کی طرح جن کی سانسیں، سسکیوں میں دبی دبی محسوس ہوتی ہیں۔ میں ''خون کے دریا'' اور ''موت'' جیسے الفاظ کے علاوہ اور کچھ نہ سمجھ سکا، لیکن سامعین کے چہروں کے تاثرات سے واضح تھا کہ وہ غیر معمولی اور خوفناک حالات وواقعات کا ذکر کر رہا تھا۔ ان میں سے کچھ نے رونا شروع کر دیا۔ ابھی کچھ دیر قبل یہی لوگ قہقہے لگا رہے تھے اور لڑکیوں کے گرد اودھم مچا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی چھاتی پر مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھ جما رکھے تھے۔ دوسرا زخمی جانور کی طرح کراہ رہا تھا۔ جبکہ ایک اور شخص نے با آواز بلند سوال کر دیا اور اب تمام سامعین خوفزدہ چہروں سے غیب دان کے جواب کے منتظر تھے۔ وہ تیزی اور زور سے دوبارہ یوں بولنے لگا، جیسے وہ خود کو بھاری بوجھ سے آزاد کرا رہا ہے۔ اس کا چہرہ ایسی بے خودی سے ٹھٹھر گیا، جس سے وہ بچ نہیں سکتا تھا۔ سوالات اور

Marfat.com

بوڑھے شخص کے تیز تیز جوابات کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے کپکپاتے جسم نے اس کا منہ بھینچ دیا تھا، حتیٰ کہ اس کی زبان گنگ ہوگئی اور اس کی تقریر بے بس ہکلاہٹ کا شکار ہوگئی۔

دیگر حاضرین کی طرح میرا دوست بھی پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جوتشی نے ابھی ابھی ایک بڑی جنگ کی پیشین گوئی کی ہے۔ (یہ 1933ء کے موسم خزاں کا واقعہ ہے) اور مطلع کیا ہے کہ "اکتوبر 1913ء میں ایسے ہی موقع پر اس شخص نے ایک عظیم اور خونی جنگ کی پیشین گوئی کی تھی۔"

(8)

سہ پہر کو بہت سے لوگ رقص کے لیے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کھڑے ہوگئے۔ مردوں اور عورتوں نے نصف دائرہ بنالیا اور اس کے وسط میں سازندے بیٹھ گئے۔ ساز وہی تھے، جو دیوتاؤں کے جلوس میں بج رہے تھے اور موسیقی بھی ویسی ہی ایک سُری حزن انگیز تھی، لیکن تعجب ہے کہ وہ سامعین کی خوش طبعی کے لیے بجائی جارہی تھی۔

ایک حیران کن کایا پلٹ وقوع پذیر ہوئی اور وہ یہ کہ جونہی انہوں نے رام چندر کے احترام میں آخری رقص شروع کیا، تنومند کسانوں کے چہرے مہرے روکوکو (rococo) جیسی دقیانوسی شبیہوں میں تبدیل ہوتے نظر آنے لگے۔ ان کی ساری بے ساختگی ناپید ہوگئی اور تمام مردوں اور عورتوں کی حرکات نے انہیں سا کن رقص کرنے والی شکلوں میں ڈھال دیا۔ یہ انداز اٹھارویں صدی عیسوی کے کسی ماہر رقاص کے لیے پسندیدہ ہوسکتا تھا۔ وہ تال کے ساتھ تھرکتے ہوئے اپنے گھٹنوں اور چھوٹے قدموں کو ایک طرف جھکاتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ بڑی سلیقہ مندی سے اپنی پشت پر رکھتے تھے یا ریشمی رومال کے ساتھ بڑی عمدگی سے عاشقانہ چاؤ چونچلے کرتے تھے، لیکن ان کا یہ انداز اس قدر نپا تلا اور مصنوعی تھا کہ وہ نہ حقیقی نظر آتا تھا نہ خوش کن۔ یہ سارا مظاہرہ قطعی مضحکہ خیز تھا اور میرے لیے تو بالکل ہی مایوس کن اور الم ناک تھا اور وہ اس لیے کہ اس سے ہندو روح کی اپنے تمام تر اندرونی تضادات سمیت انتشاری بے چارگی عیاں ہوگئی اور اچانک مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ تریوں کی جن آوازوں نے مجھے آدھی رات کو جگا دیا تھا، ان میں ایک بے یار و مددگار شخص کی غمزدہ آواز کا تاثر کیوں پایا جاتا ہے۔ ان میں ایسی ایک سانس بھی آتی جاتی محسوس نہیں ہوتی، جو مایوسی میں آہ و بکا نہ کر رہی ہو اور اپنے وجود کے انتشار سے باہر نکلنے کی کسی خواہش کا بھی اظہار نہیں ہوتا۔ کیا انسانی روح میں کسی ایسی چیز کا امکان ہے جس کی اساطیریات خیال آفرینی کی بلند پروازی کی آئینہ دار ہو۔ ایسی خیالی اڑان جو دائرہ عقل سے باہر ہو اور جو تخیلات اور پوری نہ ہونے والی خواہشات کے ایک غیر مہذب اور زمانہ ماضی کے انتظار کا مظہر ہو؟ اگرچہ یونانیوں کے دیوتا بھی آوارہ منش تھے، لیکن آگے چل کر مورا (Moira) اور انانکے (Ananke) جیسی قوتوں کا عمل دخل رہا، ایسی قوتیں جنہوں نے ہر طرح کی خودسری کو ختم کر کے بالآخر لافانی قوانین کا اجرا کیا۔ اس کے برعکس ہندوستانی دیوتاؤں سے ایسا کوئی عمل سرزد نہیں ہوا اور انہوں نے آخر تک اپنی زور آوری کو قائم رکھا۔ وہ مسلسل اپنی خواہش کے رخ کو تبدیل کرتے رہے اور متغیر اور منتشر رنگوں کی کثرت میں مگن رہے۔ ان کی مثال کسی منطقۂ حارہ

Marfat.com

کے جنگل کی ایک رات جیسی ہے، جو ہیئیوں کی موقوفی سے نا آشنا ہے اور نہ ختم ہونے والے جنموں کے وحشیانہ پن میں خود کو ضائع کر چکی ہے۔

اب کولو کے تمام دیوتا رقص کر رہے تھے۔ وہ سب رام چندر کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے یہاں آئے تھے۔ وہ لوگوں کے کندھوں پر سوار تھے اور ان کے چاروں طرف بڑی سی متحرک لکڑی کی مچان بندی یعنی رام چندر کی رتھ تھی، جس میں پہلے ہی سے ایک بڑا دیوتا براجمان تھا۔ وہ محو رقص تھے اور اپنے لچک دار بانسوں پر ایک دوسرے کو دائیں بائیں جھلا رہے تھے۔ ان کے ملبوسات اور تزئین و آرائش کے شوخ رنگ سہ پہر کے سورج کی روشنی میں پھڑ پھڑا رہے تھے اور ہزاروں مرد اور عورتیں دور دراز سے دیوتاؤں کی اس ضیافت میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے اور انہیں اس پُر مسرت تقریب کو منانے کے لیے مکمل آزادی حاصل تھی۔ وہ دائرے میں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے رام چندر اور دوسرے دیوتاؤں کے گرد جھوم رہے تھے۔ اس چراگاہ کے ہر طرف چاول کی شراب کے ڈرم پڑے تھے اور وقفے وقفے سے کوئی بھی رقاص پل بھر کو ٹھہرتا اور ہر ڈرم کے ساتھ لٹکے ہوئے لکڑی کے پیالے میں شراب انڈیل لیتا۔ موسم خزاں کے پھولوں، رنگ اور رات کو بجنے والی ترئیوں کی غمگین آوازوں کی طرح چاول کی یہ شراب بھی دسہرہ کے اس تہوار کا حصہ تھی۔ یہ رنگ رلیاں آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے شہوت انگیزی کی صورت اختیار کر گئیں۔ رقاصوں کے گیتوں سے چنچل پن اور تندی غائب ہو گئی اور وہ سب بے مہار موج میلے سے بھری ہوئی چیخ کی شکل اختیار کر گئے۔ اس کے بعد ہر طرف ایک رحم دل رات چھا گئی۔

(9)

کولو میں یہ میرا آخری دن تھا اور میں صنوبر کے درختوں میں گھرے ہوئے ایک پرانے مندر کے وسط میں بیٹھا تھا۔ یہ مندر اس مقام سے زیادہ دور نہیں تھا، جہاں دنیا ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے شمال مشرق میں تبت کے بلند پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مشرق کی جانب بنگھل (Banghal) پہاڑوں کی مضبوط میخ کوہ ہے، جس کی ایک چوٹی کو سر کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی بلند و بالا چوٹیاں تنہائی اور ظالم تنہائی میں لپٹی محسوس ہوتی ہیں۔ ان چوٹیوں کو شاید ہی کسی انسانی پاؤں نے چھوا ہو۔ میں منالی گاؤں کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ یہاں تنہائی ضرور تھی، لیکن وہ خوفزدہ نہیں کرتی تھی۔ دیودار کے ہزاروں درخت، حیرت افزا لیکن سیدھے سادے کوہ ہمالیہ کے صنوبر کے درخت بوقت صبح آسمان پر پھیلی ہوئی ملگجی روشنی میں زمین پر گڑے ہوئے ہزاروں تیروں کی مانند دکھائی دیتے تھے۔ ہوا بالکل خاموش تھی۔ کوئی انسان اور کوئی جانور وہاں نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو صرف دیودار کے درخت اور ان کی انتہائی دوری کا احساس اور جس چھوٹے سے مندر کے سامنے میں بیٹھا تھا، وہاں بھی قبرستان جیسی خاموشی طاری تھی۔ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مندر کے اندر براجمان دیوتا کس قبیل کے ہیں، کیونکہ لکڑی کی تین چٹخنیوں سے اس کے بڑے دروازے کو مضبوطی سے بند کر دیا گیا تھا۔

Marfat.com

یہ ایک عجیب مندر تھا۔ اتنا دیدہ زیب کہ شاید ہی ہندوستان میں کسی اور جگہ اس جیسا ہو۔ ہر طرف دس قدموں سے کم مستطیل قطعات، جو دیودار کے مضبوط درختوں کی شاخوں کو کاٹ چھانٹ کر بنائے گئے تھے اور جن پر مخروطی شکل وصورت کی تین تہوں والی بلند چھت ڈال دی گئی تھی۔ دور سے یہ کسی منگول پگوڈا سے مشابہ جان پڑتے تھے۔ مندر کے نچلے حصے میں ابھرے ہوئے مجسموں پر نقاشی کی گئی تھی۔ دیوتاؤں کے قصوں پر مبنی، تراشیدہ تصاویر جن میں انہیں فانی مردوں اور عورتوں سے ملاقات کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ ڈرامائی شکلیں، جن کو اتنی مہارت اور حقیقی روپ میں بنایا گیا تھا کہ میں کچھ دیر کے لیے یہ بھول گیا کہ جو اس تمثیلی سلسلہ کے پس منظر میں ہزاروں سال کا مذہبی فلسفہ یعنی وشنو کی دیو مالا کا عمل دخل ہے۔ میں نے صرف حقیقی انسانوں کو دیکھا تھا۔ طیش اور نفسانی محبت کی تہوں میں الجھے ہوئے، خواہشوں، فتح مندی کے جذبوں اور شکستگی کے دائروں میں گھرے ہوئے۔ آج سے پانچ سو سال یا اس سے بھی پہلے جس نے یہ مندر تعمیر کیا تھا، وہ کوئی اعلیٰ پایہ کا مصور تھا، لیکن آج اس کے نام سے کوئی واقف نہیں۔ عرصۂ دراز کے بعد مجھے پتہ چلا کہ اس عظیم فن پارے کی تعمیر میں اسے خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ منالی کے جن لوگوں نے اسے یہ کام سونپا تھا، وہ اسے مکمل صورت میں دیکھ کر حسد کرنے لگے کہ وہ ایسا ہی خوبصورت شاہکار کہیں اور نہ کھڑا کر دے اور یوں اس کی اہمیت ختم ہو جائے۔ یہ خیال آتے ہی انہوں نے اس فنکار کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا لیکن انہیں دھوکا ہوا، کیونکہ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے متعلقہ اوزاروں کو استعمال کرنا سیکھ لیا اور کچھ سالوں بعد چھمب کے علاقے میں ترلوک ناتھ کے مقام پر ایک ایسا ہی چھوٹا سا مندر تعمیر کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس کے اپنے تعمیر کردہ نقش سے زیادہ خوبصورت تھا، لیکن وہ فنکار اپنے نوشتہ تقدیر کو نہ مٹا سکا، کیونکہ ترلوک ناتھ کے راجا نے بھی منالی گاؤں کے بے رحم لوگوں کی طرح اسے ہمیشہ کے لیے اپاہج کرنے کا حکم دے دیا اور اس کا بایاں ہاتھ کاٹ کر اس کی آنکھوں کی بینائی بھی چھین لی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کہانی میں کہاں تک سچائی ہے!

میں نے کائی اور صنوبر کے خشک کانٹوں پر کسی کے چلنے کی ہلکی سی آواز سنی۔ یہ ایک نوجوان عورت تھی۔ اس کے بھدے جسم کو سرخ اور بھورے رنگ کے پلیڈ (plaid) نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کا بدن جوان اور نازک تھا۔ میرے بلانے پر وہ رکی، چونکی اور آہستگی سے اپنا سر میری طرف گھمایا، بالکل پہاڑی علاقے یا جنگلی جانور کی طرح، جب وہ کسی خطرے کی بو محسوس کرتے ہیں۔ وہ گہری بڑی بڑی آنکھوں اور سرخ تھرتھراتے ہونٹوں والی خوبصورت عورت تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے لاہور کی وہ عجیب وغریب رقاصہ یاد آ گئی جو میری اس ہمالیہ یاترا کا سبب بنی۔ میں نے اس کا نام پوچھا۔ اس نے اپنا نام پلدسی (Paldassi) بتایا اور یوں ہماری گفتگو کا آغاز ہوا جو خاصی مضحکہ خیز سی لگی، کیونکہ ہم دونوں ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی (یعنی اردو) میں بات چیت کر رہے تھے۔ پھر بھی میں اتنا سمجھ گیا کہ وہ اسی مندر کے نگران پنڈت کی بیٹی ہے اور اس کا گھر نیچے وادی میں واقع ہے۔ اس نے پوچھا "کیا تم ہمارے گھر آنا پسند کرو گے؟" اس نے مجھے سنجیدہ سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں شرمیلا پن تھا نہ مسکراہٹ۔ ایک بار پھر وہ مجھے نوجوان جنگلی جانور یا ہرن جیسی دکھائی دی، جس کی پرکھ پڑچول دوسری عورتوں سے بالکل مختلف طریقے سے

Marfat.com

کی جاسکتی ہے۔

ایک بڑھیا جنگل سے برآمد ہوئی اور مندر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ جب اس نے دیکھا کہ دروازہ بند ہے، تو بغیر کچھ کہے واپس چلی گئی۔ پلدسی بڑبڑائی ''یہ ایک راہبہ ہے۔ برسوں سے ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں پہاڑی کی چوٹی پر رہتی ہے۔ مایا (maya) سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔'' اس نے میری داڑھی کی ساخت سے اندازہ لگایا کہ میں مسلمان ہوں۔ وہ کہنے لگی ''اوپر وادی میں تمہارے جیسا ایک مسلمان دیگر لوگوں کے ساتھ اقامت پذیر ہے۔'' ان پہاڑوں میں ایک زندہ مسلمان صوفی کی موجودگی کے بارے میں معلوم کر کے مَیں خاصا متعجب ہوا، لیکن پلدسی نے اس کے متعلق مزید کچھ نہ بتایا۔ اس نے صرف اس مسلمان صوفی کا نام سن رکھا تھا۔ وہ مجھے اس چوٹی کا راستہ بتانے لگی اور پھر میں اُدھر چل پڑا۔

(10)

ایک گھنٹے سے زیادہ پہاڑی ڈھلوانوں پر اونچے نیچے راستے پر چلتا رہا۔ گھسی پٹی چٹانوں کے اوپر سے ایک پہاڑی چشمہ تیز بہاؤ سے جھاگ اڑاتا رواں دواں تھا۔ بالآخر سہ پہر کو ایک چھوٹا سا گھر نظر آیا۔ یہ بے ڈھنگے طریقہ سے تراشیدہ پتھروں سے بنایا گیا تھا اور نچلی ہموار چھت باہر کو جھکی ہوئی تھی اور یوں گھر کے سامنے ایک برآمدہ سا نظر آ رہا تھا۔ دروازے کے آگے ڈنٹھلوں کی چٹائی پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہی 'مقدس شخص' جس کے متعلق پلدسی نے بتایا تھا۔

جیسا کہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ انہی صوفیاء کی طرح 'واجب التنظیم' سمجھا جاتا تھا جو اِدھر اُدھر گوشۂ تنہائی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ دنیا سے منہ موڑ کر متصوفانہ معرفت کی بھول بھلیوں میں سرگرداں رہتے ہیں، لیکن میں اب تک جن صوفیوں سے مل چکا تھا، یہ شخص ان سب سے مختلف دکھائی دیتا تھا۔ وہ کوتاہ قد و قامت اور بے حس اور بے جان خدوخال کا مالک تھا، لیکن اس کی آنکھیں بڑی پُرکشش تھیں۔ ان میں خواب اور بے خوابی کی ملی جلی کیفیات پائی جاتی تھیں اور ان میں روحانی آسودگی بھی واضح طور پر جھلکتی تھی۔

اسی رات مجھے اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا تھا کہ اس شخص کو خدا نے اس خوبی سے متصف کیا ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو ان کی حقیقی ذات سے متعارف کرا دیتا ہے اور ایسے راستے کی نشاندہی بھی کر دیتا ہے، جو صرف اور صرف انہی کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ چھ یا سات افراد ایک گروہ کی شکل میں وہاں رہائش پذیر تھے اور سب ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ایسے روحانی اجتماعات کے مقابلے میں جن کا مجھے پہلے تجربہ ہو چکا تھا، یہاں ہر ایک حقیقی اور واضح اوصاف کی شخصیت کا مالک تھا۔ ساری شام وہ روحانی پیشوا مجھے بتاتا رہا کہ اس باطنی علم تک اُس کی رسائی کیسے ہوئی۔ وہ روانی سے فارسی بولتا تھا اور عربی میں بھی معمولی سی گفتگو کر لیتا تھا، اس لیے ہم ایک دوسرے کی باتوں کو آسانی سمجھتے تھے۔ اس کی عبارت تو اس وقت من و عن ذہن میں نہیں رہی، البتہ اس کا مفہوم کچھ یوں تھا:

Marfat.com

''جیسا کہ ہمارے رسول اکرمؐ نے واضح کر دیا ہے کہ ہر انسان کو فی ذاتہٖ کامل پیدا کیا گیا ہے، لیکن زندگی کے حوادث کی وجہ سے ہم میں سے اکثر اس کاملیت سے محروم ہو جاتے ہیں اور یوں ہم اپنی روحوں کو بھی برباد کر دیتے ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب کا اصل مقصد حرکیاتی نہیں ہے۔ یعنی بتدریج کاملیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام تک رسائی کی سعی پیہم کرتے رہنا مقصد حیات نہیں، بلکہ یہ جامد ہے، یعنی اپنی ذات کا تحفظ اور اپنی پیدائش کے بعد پروردگار نے ہمیں جو صفات ودیعت کر رکھی ہیں، ان کی حفاظت اور انہیں خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے......''

(۱۱)

نماز مغرب باجماعت ادا کرنے کے بعد چھ آدمی نیم دائرے میں اس بوڑھے شخص کے اردگرد بیٹھ گئے اور ذکر شروع کر دیا۔ 'ذکر' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی یاد کرنا یا زیادہ موزوں الفاظ میں ذات خداوندی کو اپنے ذہن میں راسخ کرنا ہے۔ مجھے ''منظم تصوف'' کے ظواہر نے کبھی متاثر نہیں کیا۔ یعنی کچھ لوگ اپنے باطن کو منور کرنے کی غرض سے فیض یافتہ ہستی یعنی اپنے ''شیخ'' (لغوی اعتبار سے اس لفظ کا مفہوم ''بوڑھا شخص'' ہے) کی ہدایت اور راہنمائی کا طالب ہو اور جو اپنے پیروکاروں کو حقیقی معرفت کے راستہ (بزبان عربی ''طریقہ'') کی پہچان کرانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ تاہم میرے خیال میں بطور طریقہ ایسے اجتماعی عمل کی بنیاد یہ خام خیالی ہے کہ ''روحانی تعلیم'' کے منظم طریق کار سے ذات خداوندی کا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو یہ نظام طریقت طلباء کی اس جماعت سے مشابہ ہے، جس کو ایک استاد اس مقصد کے تحت انہیں پڑھا رہا ہے کہ وہ امتحان میں کامیاب ہو کر 'سند' حاصل کر سکیں۔ میں نے جب سے اسلام قبول کیا ہے، یہی سمجھتا ہوں کہ یہ طریق کار ایسے اصحاب کی خود فریبی کا نتیجہ ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ باطنی آگہی صرف انفرادی تلاش ہی سے ممکن ہے۔ تاریخ اسلام ایسے لاتعداد طریقوں سے بھری پڑی ہے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی دیرپا روحانی اثرات نہیں چھوڑے، سوائے اس کے کہ مسیحی گروہوں جیسے مختلف ''روحانی سلاسل'' قائم کر دیئے اور کم و بیش انہی کے اتباع میں انہوں نے بھی ترک دنیا کے تصور کو اپنایا اور ایک جماعت کی حیثیت سے ان کی اخلاقی اصلاح پر ایسے اثرات مرتب نہیں کیے، جو واضح طور پر محسوس کیے جا سکیں۔

بہرحال دنیا کے اس کونے میں پہاڑوں کی چوٹیوں اور دیودار کے جنگل کے درمیان اس چھوٹی سی جماعت کو میں نے ان صوفیانہ سلاسل سے مختلف پایا، جن کا مجھے اپنے ابتدائی ایام میں ذاتی تجربہ ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کس طرح ایک شخص کی روحانی قوت، چھ مختلف افراد کے باطن کو روشن کرتی ہے اور انہیں اصل حقیقت سے روشناس کرا دیتی ہے۔

وہ چھ آدمی ایک پھٹی پرانی چٹائی پر بیٹھے تھے۔ ایک چھوٹے سے لیمپ کی ہلکی اور ٹمٹماتی سی روشنی ان کے

Marfat.com

چہروں پر پڑ رہی تھی۔ اُن کے مرشد اُن کے روبرو سائے میں بیٹھے تھے اور دھیمی اور مترنم آواز میں وہ سورۂ فاتحہ کی تلاوت کر رہے تھے۔ جب وہ پڑھ چکے تو ان چھ آدمیوں نے ایک دوسرے کے بازو پکڑ کر آہستہ آہستہ بیک آواز ''ہُو'' کا ورد شروع کر دیا۔ یہ ایک عربی لفظ ہے جس کا مفہوم ''وہ'' ہے۔ قرآن کریم میں اللہ کے جو اسماء بیان کئے گئے ہیں، ان میں یہ آسان ترین اور طاقتور اسم ہے۔ وہ دھیمے لہجے میں ''ہُو'' کا ورد کرتے رہے اور ایک ساتھ اپنے سروں کو بھی گھماتے رہے۔ ان کے چہرے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ذات خداوندی میں استغراق کی لذتوں سے بہرہ مند ہو رہے ہیں۔

انہوں نے ''ہُو'' کے ورد کو جاری رکھا اور اس عربی لفظ کو سانس کے ساتھ پورے انہماک سے ادا کرنے کی وجہ سے ہر شخص کی باطنی کیفیت اس کے چہرے پر عیاں تھی۔ ہر ذاکر، دوسرے ذاکر سے مختلف نظر آتا تھا۔ بظاہر وہ حقیقی ذات تک رسائی حاصل کر چکے تھے اور اب وہ خود کو اس میں فنا کرنے کے عمل میں مصروف تھے۔ یہ صورت حال اس قدر واضح تھی کہ میں خود بھی اپنے اندر ہلچل سی محسوس کر رہا تھا۔ اس سے پہلے مجھے کبھی بھی ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔

(12)

میں نے ساری رات ان عجیب و غریب لوگوں کی معیت میں بسر کی۔ صبح سویرے ہم نے اکٹھے دودھ اور سیبوں کا ناشتہ کیا۔ دنیا میں ایسے سیب شاذ و نادر ہی دستیاب ہیں۔ سرخ و سبز بڑے بڑے یہ سیب اتنے رسیلے اور خوش ذائقہ تھے کہ شاید ہی کہیں اور ملتے ہوں۔ کولو کے ان سیبوں کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ ناشتے کے بعد میں ان لوگوں سے اجازت لے کر واپس چل پڑا۔

وادی میں مَیں چاول کے کھیت کے قریب سے گزرا۔ یہ چھوٹی چھوٹی تین سطحوں میں پھیلا ہوا کھیت تھا اور پورے کا پورا پانی میں ڈوبا ہوا تھا، جس میں چند عورتیں گھٹنوں گھٹنوں بمشکل چلتی ہوئی پنیری لگا رہی تھیں، جبکہ قدرے اونچی جگہ پر مرد آبپاشی کے لیے نئی کھاڑیاں بنا رہے تھے۔ عورتیں ہنستی، گاتی اور ایک دوسری پر پانی کے چھینٹے اڑا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے گھگرے قدرے اونچے کر رکھے تھے، جس سے ان کی پنڈلیاں برہنہ دکھائی دے رہی تھیں۔ نوجوان پہاڑی عورتوں کی یہ مضبوط اور گداز ٹانگیں مرد کے شہوانی جذبات کو انگیخت کر رہی تھیں۔

کولو کی سرائے میں پہنچ کر اپنا رخت سفر باندھا اور اپنے دوست کے ساتھ کولو کو خیر باد کہتا ہوا آگے چل پڑا۔ بذریعہ کار دوبارہ منڈی اور وہاں سے ریلوے کے آخری سٹیشن جوگندر نگر پہنچے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں سے دو گھنٹے بعد پٹھانکوٹ کو گاڑی چلے گی۔ چنانچہ ہم دوبارہ یہاں کے مانوس بازاروں اور گلیوں میں گھومتے پھرتے رہے۔

اس سیر گشت کے دوران میں ہمیں ایک دکان پر گرم گرم دودھ کے بڑے کڑھاؤ نظر آئے، جس کو ایک شخص بڑے سے لکڑی کے کڑچھے کے ساتھ مسلسل ہلا رہا تھا۔ اس منظر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور میری بھوک کو بھی جگا

Marfat.com

دیا۔ چنانچہ میں نے اپنے دوست سے کہا ''آؤ! دودھ کے ایک گلاس کے ساتھ بند (bun) کھالیں، تا کہ پٹھانکوٹ تک سفر آرام سے گزر جائے۔'' جونہی ہم دکان پر رکے، دکاندار نے دودھ سے بھرا ہوا لکڑی کا پیالہ پکڑا ہوا تھا اور وہ ایک آوارہ کتے کو دودھ پلا رہا تھا۔ (مجھے یہ منظر دلی طور پر اچھا لگا)۔ جب میرے دوست نے پنجابی میں اسے بتایا کہ ہم کیا چاہتے ہیں، تو اس نے اسی پیالے کو، جس سے وہ کتے کو دودھ پلا رہا تھا، پانی سے کھنگالا اور دیوار میں بنے ہوئے طاقچے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دوست سے اس اشارے کا مطلب پوچھا تو اس نے جواب دیا ''وہ ہندو ہے اور ہم ہندو نہیں، اس لیے ناپاک ہیں۔ وہ ایسے کسی برتن کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا' جس میں ہم جیسے لوگ کچھ پئیں گے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم خود طاق سے گلاس اٹھائیں اور وہ کڑچھے سے اس میں دودھ ڈال دے گا۔''

یہ سنتے ہی میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر اچھا لگا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ سے کتے کو دودھ پلایا، لیکن اس نے ہمیں ناپاک سمجھ کر خود برتن کو ہاتھ تک لگانے سے صاف انکار کر دیا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرہ بھر تامل نہیں کہ اس وقت میں شدید غصے کی وجہ سے اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں اس سے قبل یا بعد میں کبھی اس قدر طیش میں نہیں آیا تھا۔ میں نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا ''اس حرامی کو بتا دو کہ میں بھی اس جیسا ایک انسان ہوں۔ اسے کہو کہ اپنے ہاتھوں سے اس گلاس میں دودھ بھر دے، ورنہ میں اس کی دکان توڑ پھوڑ دوں گا اور سارا دودھ سڑک پر بہا دوں گا۔'' میرے غصیلے چہرے اور میرے اس تند و تیز لہجے کو دیکھ کر دکاندار تھر تھر کانپنے لگا اور اس نے طاقچے میں پڑے ہوئے گلاس کو اپنے ہاتھوں سے اٹھایا۔ میں نے اس سے گلاس چھینا، کڑچھا لیا، گلاس کو دودھ سے لبالب بھرا اور پھر اسے دودھ کے کڑھاؤ میں انڈیل دیا اور یوں سارے دودھ کو 'ناپاک' کر دیا۔ گلاس کو دور پھینکتے ہوئے میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا، جو دودھ کے پورے کڑھاؤ کی قیمت سے زیادہ تھا اور دکاندار کے کانپتے ہوئے چہرے پر دے مارا۔

ذات پات اور پاک ناپاک کے ہندو تصور سے یہ میرا اولیں مجادلہ تھا...... 14

☆ ☆ ☆

Marfat.com

باب سوم

"اسلام دوراہے پر"
(1933ء-1934ء)

(1)

1933ء کے دوران میں یعنی جب میں شیرانوالہ دروازہ کے بالمقابل ایک گھر میں رہائش پذیر تھا، مجھے بیشتر اہم مسلمان شخصیات سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہ ایک ایسے شخص سے ملنے کو بے تاب نظر آتے تھے جس نے اسلام قبول کیا تھا (ان دنوں یہ غیر معمولی واقعہ سمجھا جاتا تھا)، برسوں عرب میں مقیم رہا اور ہندوستان کی رابطہ کی زبان یعنی انگریزی سے بہتر عربی میں گفتگو کر سکتا تھا۔ یورپی سماجی اقدار کے برخلاف مسلمانوں کی یہ قدیم اور لائق عزت واحترام روایت ہے کہ وہ مہمان سے آ کر ملنے کو اپنا فرض گردانتے ہیں، چہ جائیکہ مہمان خود ان کے پاس ملاقات کے لیے حاضر ہو۔ ایسے بیشتر ملاقاتی میرے میزبان کو بتائے بغیر خود بخود ہی تشریف لے آتے تھے۔ وہ روانی سے انگریزی بول سکتے تھے، چنانچہ میرا سارا سارا دن ان سے بات چیت کرتے گزر جاتا اور یوں میں اس عجیب ملک کے مختلف معاشرتی اور سیاسی مسائل سے آگاہ ہوتا گیا۔

کچھ وقت کے بعد میرے نئے مسلمان احباب مجھے اپنے ہاں دعوتوں پر بلانے لگے اور یوں میں ان کے اہل خانہ سے بھی متعارف ہوا۔ وہ عزت واحترام سے مجھے خوش آمدید کہتے اور انتہائی لذیذ اور اعلیٰ قسم کے مغلئی کھانوں سے میری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ کھانے پکانے کے ان طریقوں کو ہندوستان میں مغل بادشاہوں نے متعارف کرایا۔ ان میں تیز مرچ مصالحے استعمال کئے جاتے اور شاید یہ یہاں کی آب وہوا سے مناسبت بھی رکھتے ہیں، لیکن اس مہمان نوازی سے بڑھ کر ان کا وہ والہانہ محبت آمیز انداز تھا، جس سے وہ مجھے ایک مسلمان بھائی کی حیثیت سے خوش آمدید کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے اس محبانہ طرز سلوک نے عرب جیسے ملک کو چھوڑنے کے غم کو بھلا دیا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ میرے ماحول کی تبدیلی کا تعلق صرف نیت سے ہے، جبکہ اس کا اساسی حصہ جوں کا توں قائم ودائم رہتا ہے۔ عرب میں مَیں اپنے بہن بھائیوں میں زندگی گزار رہا تھا اور یہاں بھی میرا یہی احساس تھا۔ ایک بار پھر مجھے گھر جیسا ماحول مل گیا اور میں بظاہر اجنبیوں میں خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتا تھا۔

Marfat.com

اسی سوچ نے مجھے یہ جرأت عطا کی کہ میں اپنے نئے احباب کی سماجی زندگی کے مستحسن پہلوؤں کی بلاخوف وخطر تعریف کرتا اور بعض ناپسندیدہ باتوں کو ہدف تنقید بناتا۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ اپنی جماعت کے تہذیبی مسائل میں میری غیر متوقع علمی دلچسپی کے آئندہ دوررس نتائج مرتب ہوں گے، جو مرحلہ وار میری تمام زندگی کی منشا اور مقصد کو بدل کر رکھ دیں گے۔

جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے، میں اپنے گردونواح میں وقوع پذیر حالات وواقعات کے ظاہری پہلوؤں سے زیادہ متاثر ہوا اور اس شدید اثر پذیری کی جھلک میری تحریروں میں بھی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ جب بھی میں نے اپنی سیر وسیاحت کے کسی نئے رخ کو بیان کیا ہے، چاہے اس کا تعلق عرب کے ریگستان، ایرانی شہر کے کسی بازار یا تہران کے ماہ محرم کے ڈرامائی ماتمی جلوس کی تفصیلات فراہم کرنے سے ہو، ہر جگہ رنگ ونور، حرکت اور اشکال کی مسلسل تبدیلیوں نے مجھے اتنی مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا کہ میرا وہ تجربہ خود ہی میری بیان کردہ تفصیلات میں ڈھل گیا اور میں اسے پوری شرح وبسط کے ساتھ اپنے قارئین تک منتقل کرسکا اور شاید یہی وجہ تھی کہ جرمن پریس میں میری ابتدائی شہرت ایسی ہی خصوصیات کے حامل سیاحتی نامہ نگار کی حیثیت سے ہوئی۔ اب لاہور میں اپنے دوستوں میں رہتے ہوئے مجھے پھر سابقہ سوچ نے جکڑ لیا کہ میں یہاں کے لوگوں کی زندگی اور اپنے گرد رونما ہونے والے واقعات کا مسلسل اور بنظر غائر مشاہدہ کرتا رہوں۔ میں نے اپنے بعض پنجابی دوستوں کے سروں پر خوبصورت پگڑیاں بندھی ہوئی اور پھر بآسانی انہیں اتارتے ہوئے دیکھا۔ مجھے نفیس اور چست اچکن اور جودھپوری پائجامہ پہنے ہوئے نظر آئے اور چند دنوں بعد انہوں نے اپنے ان ملبوسات کو یورپ کے بے ہیئت لباسوں میں تبدیل کرلیا۔ خواتین نے اپنے روایتی ملبوسات یعنی شلوار، قمیض اور ساڑھی کو کسی حد تک تبدیلیوں سے بچائے رکھا، لیکن وہ بھی وقت کے تیز دھارے کے ساتھ ساتھ آدمیوں کی طرح اپنے سامان آرائش اور روزمرہ زندگی کو مغرب کے آداب واطوار کے سانچوں میں ڈھالنے لگیں۔ ان سب سے بڑھ کر میرے لیے جو بات تکلیف کا باعث تھی، وہ یہ کہ اپنے معاشرتی سیاق وسباق میں غلط اور صحیح چیزوں کے جانچنے کے پیمانے اور معیار بھی تیزی سے تبدیل ہونے لگے۔ مختصراً مجھے صاف نظر آنے لگا کہ مسلمان معاشرہ نہ صرف اپنی ظاہری زندگی میں بلکہ اپنے زاویہ نگاہ اور مقاصد میں بھی، آہستہ آہستہ ایک غیر ملکی تہذیبی ریلے کے نیچے بہتا چلا جارہا ہے۔ مجھے اپنے جبلی علم کے بل بوتے پر پورا یقین ہوگیا کہ یہ رجحان بڑھتے بڑھتے مسلمانوں کی بے مثل اور قیمتی سماجی اور آگے چل کر ان کی روحانی زندگی کو لازماً فنا کی منزل تک پہنچا دے گا۔ اسی سوچ نے میرے اندر ایک شدید خواہش یا جذبہ پیدا کردیا کہ میں مسلمانوں کو تقلید مغرب کے اس تباہ کن رجحان سے بچا سکوں۔

(2)

انہی دنوں پنجاب میں مسلمانوں کے پہلے رفاہی ادارے انجمن حمایت اسلام نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور

Marfat.com

مجھے لوگوں سے خطاب کرنے کی دعوت دی جس میں مَیں اپنی تبدیلی مذہب کی روداد بیان کروں۔ میں نے اس شرط پر یہ دعوت قبول کر لی کہ میں اگر مناسب سمجھوں تو اس میں تھوڑی بہت ترمیم کرنے کا مجھے اختیار حاصل ہو۔ انجمن کی انتظامی مجلس نے بغیر کسی دقت کے میری یہ شرط مان لی۔ بالآخر یہ طے پایا کہ میں ایک دن چھوڑ کر دو لیکچر دوں گا۔ ان میں سے پہلا لیکچر میں نے اپنی عمومی عادت کے برخلاف تحریر کیا اور مسلم ہائی اسکول (لاہور) کے بڑے ہال میں سینکڑوں حاضرین کی خدمت میں پیش کیا۔ اس میں ایک دوسری سے برسرپیکار دو تہذیبوں کی بنیادی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا گیا۔ ان میں ایک تو اسلامی تہذیب تھی، جو اپنے مخصوص نظریے پر قائم ہے جبکہ دوسری یورپ کی عملیتی (pragmatic) تہذیب ہے، جو قرون وسطیٰ کی مسیحیت اور رومن کلچر کے اتصال سے معرض وجود میں آئی اور اس کے روح و جسم کا ثنوی تضاد تاریکی اور روشنی کی علامتوں میں ظاہر ہوا۔ میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآنی تعلیمات میں حیات انسانی کے جس افادی پہلو کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ذات خداوندی سے منسلک ہے اور یہ مغربی تہذیب کے نقطہ نظر سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، جس کا محور و مرکز انسان اور صارف ہے۔ یہ تہذیب مدتوں پہلے روحانی اقدار سے اپنا تعلق منقطع کر چکی ہے اور اپنے ملاحظات میں خدا کے وجود کو خارج کر چکی ہے۔

دوسرے لیکچر میں اس بات پر زور دیا گیا کہ تقلید کا یہ انداز تمام تخلیقی صلاحیتوں کا خطرناک دشمن ہے اور کسی دوسری تہذیب کے مقاصد، ظاہری اشکال اور دیگر پہلوؤں کی بلا سوچے سمجھے پیروی کا یہ مطلب ہے کہ مسلمان اپنے مذہب اسلام کے اس کردار کی نفی کر رہے ہیں، جو اس نے تہذیب کو معرض وجود میں لانے اور پھر اسے قائم رکھنے میں ادا کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس وقت دنیائے اسلام دوراہے پر کھڑی ہے۔ ایک راہ تو انہیں تہذیبی تکمیل اور دوسری تباہی کی جانب لے جا رہی ہے۔ ابھی مسلمانوں کے پاس اتنی مہلت ہے کہ وہ اپنے لیے صحیح راہ کو منتخب کر لیں۔

میرے ان دو لیکچروں نے پہلے لاہور کے مسلمانوں اور پھر ان کے دوسرے مراکز میں جھیل کی سطح آب پر پھیلتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لہروں کی طرح ایک جنبش سی پیدا کر دی۔ لوگ بڑی تعداد میں میرے پاس آنے لگے اور دہلی، بمبئی اور مدراس میں بھی خطاب کرنے کی درخواستیں کرنے لگے۔ میرے لیے ان تمام دعوتوں کو قبول کرنا ممکن نہیں تھا، اس لیے میں نے ایک اور راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ یہ تھا کہ ان دونوں لیکچروں کو قطع و برید اور اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کرا دیا جائے۔ یوں کسی بھی اسلامی موضوع پر میری اولیں کتاب ''اسلام دوراہے پر'' 1934ء کے آغاز میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔[15]

(3)

یہ ایک مختصر سی کتاب تھی، کیونکہ اس وقت تک بطور مذہب اور سماجی پروگرام اسلام کی مبادیات کا مجھے جو ادراک حاصل ہوا تھا، اس کو بالاختصار سو صفحات میں سمونے کی کوشش کی تھی۔ بظاہر یہ کتاب موقع محل کے عین مطابق منظر عام پر آئی اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہی مانگ اس قدر بڑھ گئی کہ اسی سال یعنی 1934ء ہی میں اس کوئی بار

Marfat.com

شائع کرنا پڑا۔ تقریباً ایک سال بعد ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا مسلمان اس کتاب کا مطالعہ کر چکا تھا، یا اس کے بارے میں سن چکا تھا۔ یقیناً میرے قارئین کے ردعمل مثبت نہیں تھے۔ مغرب کے تعلیم یافتہ بیشتر یہ جان کر ورطۂ حیرت میں پڑ گئے کہ میں نے مسلمان معاشرہ کی ''مغرب پرستی'' کے رجحان کو کس شدت کے ساتھ رد کیا ہے اور ان تمام اقدام کو مخالفانہ حملے کا ہدف بنایا ہے، جو ''ترقی'' کے نام پر کیے جا رہے تھے۔ اس کے برعکس میرے قدامت پرست پڑھنے والوں اور بالخصوص مذہب کے خود ساختہ نگہبان یعنی ملاؤں نے تقلید کے متعلق میرے مخالفانہ نظریات کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ میرے نقطہ نظر کے مطابق اولیں ادوار کے علمائے اسلام نے جو مذہبی تعبیرات و تشریحات کی تھیں، انہی کی پیروی اور آنکھیں بند کر کے انہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا تقلید ہے، جبکہ میں ہر دور کے مسلمانوں کے لیے آزاد خیالی، اجتہاد کی ہمہ وقت ضرورت کا قائل ہوں۔ میرے ایک بذلہ سنج دوست نے یوں تبصرہ کیا کہ ''محمد اسد بیک وقت دو محاذوں یعنی ملاؤں اور مسٹروں سے نبرد آزما ہے۔''

میرے اس دوست کا نام چودھری الٰہی بخش تھا[16]۔ وہ ریٹائرڈ سیشن جج تھے اور میرا ان کے گھر اکثر آنا جانا تھا۔ ان کی بیوی انتقال کر چکی تھی اور ان کے بچے (غالباً دو بیٹیاں) شادی شدہ تھے اور اپنے اپنے گھروں میں بخوشی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا آرام دہ بنگلہ لاہور کی ایک ایسی سڑک پر واقع تھا، جس کے دونوں جانب درختوں کی لمبی قطار تھی۔ وہ اس گھر میں اکیلے رہتے تھے۔ گھریلو کام کاج کے لیے دو ملازم موجود تھے۔ وہ اکثر اپنے دوستوں کی دعوتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک روز انہوں نے شام کو اپنے گھر آنے کو کہا اور مجھے بتایا کہ ''ڈاکٹر محمد اقبال میرے ہاں تشریف لائیں گے اور میں چاہتا ہوں کہ تم ان سے ضرور ملو۔''

اس وقت ہندی مسلمانوں میں محمد اقبال کا نام جادوئی تاثیر کا حامل تھا۔ بطور شاعر اور فلسفی ان کا شہرہ عام تھا۔ چھوٹا بڑا، مرد عورت ان کی شاعری کا پرستار تھا۔ ان کے لیے اقبال ایک ایسی غیب دان ہستی کا نام تھا، جو مسلمانوں کی زندگی کی اصل حقیقت کے محاسن و معائب، تسامحات اور اس کی اعلیٰ توانائیوں سے کماحقہٗ آگاہ تھی۔ میں خود بھی ایسے نابغۂ روزگار سے ملاقات کا متمنی تھا۔ ویسے حقیقت بھی یہی تھی کہ میں نے جب سے سرزمین ہند پر قدم رکھا تھا، میرے کان ان کے نام سے آشنا تھے، لیکن بدقسمتی سے مجھے ابھی تک ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میونخ میں فلسفہ کے طالب علم رہے اور لندن کی بار کونسل میں بھی مدعو کیے گئے، لیکن مدت ہوئی انہوں نے وکالت کا پیشہ ترک کر دیا اور اب اپنا سارا وقت شاعری، غور و فکر اور اپنے احباب و مداحین کے ساتھ اسلام کے بارے میں بحث و تمحیص کے لیے وقف کر دیا ہے۔

میری توقعات نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ جب میں شام کو الٰہی بخش کے گھر کی بیٹھک میں داخل ہوا، اس وقت اقبال ہر عمر کے درجن بھر اصحاب میں گھرے ہوئے قالین پر بیٹھے تھے اور پرسکون خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے میری آمد نے ان کی توجہ میں خلل ڈالا، لیکن باہمی تعارف کے کچھ لمحات کے بعد اقبال نے اپنی گفتگو کو وہیں سے شروع کیا، جہاں سے چھوڑا تھا۔ سامعین پھر ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے۔ جہاں تک مجھے یاد

Marfat.com

پڑتا ہے، اس وقت وہ اسلامی تاریخ کے کسی پرانے دور کا ذکر کر رہے تھے اور اس شاندار دور کا زمانہ حاضر کے زوال پذیر دور سے موازنہ بھی کرتے جا رہے تھے۔ ان کا انداز تخاطب ثقہ اصحاب کے بجائے ایسے اساتذہ جیسا تھا، جو ہر بات آسان پیرائے میں اپنے طالب علموں کو سمجھا رہا ہو۔ وہ فرش پر چوکڑی جمائے بیٹھے تھے۔ دیوار کے ساتھ رکھے سرہانے سے ٹیک لگا رکھی تھی اور دھیمی آواز میں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ سامعین ان کی گفتگو پورے انہماک اور دلچسپی سے سن رہے ہیں۔ اچانک انہوں نے اپنی گفتگو روک کر مجھے مخاطب کیا کہ "میں آپ کی کتاب "اسلام دوراہے پر" پڑھ چکا ہوں اور آپ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ مجھے پسند ہے۔ صرف مجھے آپ کے تصور اجتہاد سے کچھ اختلاف ہے۔ یقیناً اجتہاد فی نفسہٖ اہم اور مفید ہے، لیکن جس انحطاطی دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس میں یہ قدرے خطرناک ہے۔ میری رائے میں اس سے اسلام میں نظریاتی اور فروعی اختلافات میں اضافہ ہوگا۔ اس سے ذہنی وفکری انتشار بڑھے گا اور بالآخر اس سے ہمارے معاشرتی ڈھانچہ کا تانا بانا بکھر کر رہ جائے گا......"

مجھے اقبال کے اس نقطہ نظر کو من وعن تسلیم کرنے میں قدرے تامل تھا، چنانچہ میں نے قدرے پُر زور انداز میں کہا "لیکن ڈاکٹر اقبال! کیا آپ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ وہ اصحاب جو خود کو مسلمان معاشرہ کی ترقی کا اہل سمجھتے ہیں اور اس کے لیے اجتہاد کو لازمی عنصر قرار دیتے ہیں، کیا ان کے بغیر مسلمان تہذیبی بنجرپن کی اتھاہ گہرائیوں میں نہیں گریں گے یا وہاں سے باہر نکلنے کے امکانات معدوم نہیں ہو جائیں گے؟ میرا پختہ یقین ہے کہ آپ کا مؤقف درست نہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں یہ دور انحطاط ہے، لیکن ہم جیسے لوگوں کو چاہیے کہ اس وقت ہم اپنے نظریہ حیات کا از سر نو جائزہ لینے کی جرأت کا مظاہرہ کریں، قطع نظر اس بات کے کہ ماضی کی مسلمان نسلوں نے اسلامی مسائل کو حل کرنے کی غرض سے کیا اقدام کیے۔ اگر ہم ایک الگ جماعت کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں یا اپنے تہذیبی زوال پر قابو پانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو ہمیں اپنی لغزشوں کی پرواہ کیے بغیر اجتہاد ہی کے راستہ پر چلنا پڑے گا، چاہے ہمارے ملاّ حضرات اس کو پسند کریں یا نہ کریں۔ ہمیں اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیں یہ فکر کرنی چاہیے کہ کہیں ہم جامد نہ ہو جائیں۔"

میری یہ باتیں سن کر اقبال کے مداحین مہر بہ لب ہو گئے، کیونکہ ان کے لیے اقبال جیسے عظیم شاعر اور فلسفی سے یوں کھلے عام اور شدت سے اختلاف کرنے کی جرأت کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ان میں سے اِکّا دُکّا اصحاب جواب دینے پر آمادہ نظر آتے تھے، لیکن اقبال نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اطمینان سے بیٹھے رہے۔ اقبال کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، جو اس بات کا ثبوت تھی کہ بظاہر انہوں نے میری قدرے تلخ باتوں کا برا نہیں منایا۔ بالآخر انہوں نے کہا "اے میرے جوان دوست! ہم کسی اور موقع پر اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔ کیا آپ کل میرے گھر تشریف لا سکتے ہیں؟"

یوں میری اس عظیم شخص سے دوستی کا آغاز ہوا۔ ایسی دوستی، جو چار سال بعد ان کی وفات (1938ء) تک قائم رہی۔

Marfat.com

مجموعہ احادیث کا آج تک کسی نے ترجمہ نہیں کیا۔ آپ یہ کام کیوں نہیں کرتے؟ ذرا سوچیں کہ اس ملک میں لاکھوں مسلمان انگریزی جانتے ہیں، لیکن وہ عربی سے ناواقف ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو لوگوں تک حضور اکرمؐ کی آواز پہنچا سکتے ہیں۔ کوشش تو کر کے دیکھئے۔"

اقبال کے اس مشورہ کے بعد میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے پیشہ صحافت کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کرلیا اور "صحیح بخاری" کے انگریزی ترجمہ مع حواشی پر کام شروع کر دیا۔[17]

(5)

بہت جلد مجھے اس بات کا احساس ہو گیا کہ میرے لیے فی الفور پیشہ صحافت سے کنارہ کشی ممکن نہیں۔ میں سوئٹزرلینڈ کے اخبار "Neue Zürcher Zeitung" کے نمائندے کی حیثیت سے یہاں کام کر رہا تھا اور یہی میری آمدنی کا واحد ذریعہ تھا۔ اگر میں اس اخبار سے اپنا تعلق ختم کر دیتا تو میرے پاس اور کوئی ایسے ذرائع آمدن نہیں تھے کہ میں اپنا اور بیوی بچے کا پیٹ پال سکتا[18]۔ علاوہ ازیں میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مولانا عبدالقادر قصوری جیسے مہمان نواز شخص کے گھر ہی پر مستقلاً پڑا رہوں۔

آخر بڑی سوچ بچار کے بعد میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا اور میرے خیال میں وہی اس دبدھا سے نکلنے کا مناسب حل تھا۔ محمد اقبال کے صائب مشورہ کے بعد میں نے اپنا اخلاقی فرض سمجھا کہ میں اپنے علم و دانش اور ادبی تجربے کو اپنے ہم مذہبوں تک حضور اکرمؐ کی آواز پہنچانے کے لیے وقف کر دوں۔ یقیناً یہ میرے مسلمان بھائیوں کا بھی فرض ہے کہ وہ میرے اس منصوبے کو آگے بڑھانے میں میرا ہاتھ بٹائیں۔

میں نے اپنے تمام دوستوں کے ساتھ اس مسئلہ پر گفتگو کی اور وہ ضروری مالی وسائل کی فراہمی کے بارے میں مجھ سے متفق تھے۔ ان میں سے ایک دوست نے تجویز پیش کی کہ اس ضمن میں موزوں ترین شخص نظام حیدر آباد دکن ہے، جو ہندوستانی ریاستوں کے تمام حکمرانوں میں امیر ترین اور ذی اختیار ہے۔ نیز اسلام کے متعلق علمی کاموں کی بھی وہ بڑھ چڑھ کر سرپرستی کرتا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ مجھے اس فیاض حکمران کو اپنا تعارف کرانے میں کسی طرح کی دقت پیش نہیں آئے گی۔ وہ یقینی طور پر میرے منصوبے میں دلچسپی لے گا اور اس کے لیے مناسب مالی وسائل کا بھی بندوبست کر دے گا۔

اصولاً مجھے یہ تجویز پسند آئی، لیکن میں فوراً نظام سے رابطہ قائم کرنے کے حوالے سے قدرے متردد تھا اور چاہتا تھا کہ اس سے قبل میں ان کی خدمت میں اپنے منصوبے کو کسی شکل میں پیش کروں۔ یوں وہ میری اہلیت اور قابلیت کا صحیح اندازہ کر سکیں گے۔ بالفاظ دیگر میں چاہتا تھا کہ پہلے میں بطور نمونہ اس ترجمہ کا کچھ حصہ مع حواشی مطبوعہ صورت میں انہیں ارسال کروں اور پھر ان سے مالی اعانت کا مطالبہ کیا جائے، لیکن اس میں یہ مشکل درپیش تھی کہ نظام کو "صحیح بخاری" کے ابتدائی یا دوسرے ابواب کا جو انگریزی ترجمہ ارسال کیا جائے گا، اس کی طباعت کے اخراجات

Marfat.com

کہاں سے مہیا ہوں گے۔ بظاہر یہ تصور کسی منچلے کی ذہنی اڑان سے مشابہ تھا، لیکن اس مسئلہ پر میں بھی اپنی ہٹ کا پکا تھا۔

اس مرحلہ پر میرے پرانے دوست مولانا عبدالقادر قصوری (عبداللہ کے بڑے بھائی) نے ایک نئی راہ سجھائی۔ وہ نہ صرف معدودے چند ''قوم پرست'' مسلمان راہنماؤں میں نمایاں مقام رکھتے تھے، بلکہ جماعت اہل حدیث کے ممتاز علماء میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ خود بھی ''صحیح بخاری'' کے اولیں انگریزی ترجمہ میں خصوصی دلچسپی لے رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ جماعت اس منصوبے میں ضرور معاونت کرے گی۔ دہلی کے پھاٹک حبش خاں کے علاقے میں اس جماعت سے تعلق رکھنے والے امیر ترین تجارت پیشہ احباب رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے چند روز میں ان سے رابطہ قائم کیا اور مجھے دہلی آنے کا دعوت نامہ موصول ہوگیا۔

میں نے شاید اب تک پھاٹک حبش خاں جیسا قدیم محلہ نہیں دیکھا تھا۔ یہاں اتنی تنگ گلیاں تھیں کہ ان میں سے دو اشخاص دوش بدوش نہیں گزر سکتے تھے۔ یہاں گھروں کی بیرونی دیواریں بالکل عام سی تھیں، لیکن ان کے صحنوں کے چاروں طرف انتہائی قیمتی قالینوں سے آراستہ و پیراستہ کمرے تھے۔ صاف ستھرے، اعلیٰ تزئینی سامان سے سجائے گئے کمرے مکانداروں کی ثروت مندی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ اسی علاقہ میں ایک لکھ پتی یا کروڑ پتی شخص بھی رہائش پذیر ہے۔ بلاشبہ ہندوستان میں امیر ترین اور بااثر مسلمان اسی محلہ میں بستے ہیں۔

میں یہیں اپنے نئے مخلص دوستوں میں سے ایک دوست کے ہاں بطور مہمان ٹھہرا۔ مولانا عبدالقادر قصوری نے انہیں پہلے ہی سے میرے ''صحیح بخاری'' کے منصوبے کی اطلاع دے رکھی تھی۔ میں نے انہیں خود بھی اس منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اس کی انجام دہی کے لیے میری تین ضرورتیں تھیں۔ اول: اس منصوبے کے ابتدائی مراحل میں میرے اخراجات کا انتظام، دوم: اس ترجمہ کے لیے عربی کتب کا ایک چھوٹا سا کتب خانہ اور سوم: انگریزی اور عربی ٹائپ کی خریداری، کیونکہ دہلی اور پنجاب میں کسی بھی پریس میں ان دونوں زبانوں کا ٹائپ دستیاب نہیں تھا۔

پھاٹک حبش خاں کے تاجروں نے میری توقعات سے بڑھ کر تعاون کیا اور تمام ضروری وسائل بعجلت ممکنہ فراہم کر دیئے۔ نصف گھنٹے میں انہوں نے باہمی صلاح مشورہ سے ایک فنڈ کا اہتمام کر دیا، جو میرے آئندہ چھ ماہ کے ذاتی اخراجات کو بطریق احسن پورا کر سکتا تھا۔ انگلستان سے ٹائپ کی خریداری اور درآمد کے لیے ایک اور فنڈ قائم کر دیا اور جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے، تو اس کے لیے میرا میزبان مجھے ایک ایسے کمرے میں لے گیا جو ایسی کتابوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس نے اس ذخیرہ سے ضرورت کی ہر کتاب استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ بلاشبہ میرے میزبان کے اس کتب خانے میں میری تمام مطلوبہ کتابیں دستیاب تھیں۔ مجھے جب اور جہاں بھی ان کی ضرورت پڑتی تھی، انہوں نے ترسیل کا انتظام کر دیا تھا۔ 18[1]

میری تمام پریشانیاں دور ہوگئیں۔ اب میں نے اگلا قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا اور وہ ایسی جگہ کا انتخاب تھا، جہاں آنے والے دنوں میں آرام سے رہ سکوں اور اس کے گرد و نواح کا ماحول بھی خوشگوار ہو۔ بالآخر میں نے کشمیر کو منتخب کیا۔ میں نے ابھی تک یہ علاقہ دیکھا نہیں تھا، لیکن کشمیر ہمیشہ میری خوابوں میں بسا ہوا تھا۔ میں نے کولو میں جو

ص 63/

Marfat.com

(4)

اقبال کو اندرونی طمانیت حاصل تھی اور یہ ایک ایسی خوبی تھی، جو انہیں سب سے نمایاں کرتی تھی۔ وہ مکمل طور پر اپنی ذات پر اور اپنے مالک حقیقی کی عنایات پر مطمئن تھے۔ وہ ایک ایسے شخص تھے جن کا شیوہ ہمیشہ نرم گفتاری اور خوش گفتاری تھا۔ ان کے ہونٹوں پر ہر وقت ہلکی سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، جو ان کے چہرے کو روشن کیے رکھتی تھی۔ وہ بہت کم مسکراتے تھے، لیکن ان کی مسکراہٹ میں عیاری اور شدید نفرت یا تعصب کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا۔ اسی لیے ہر کوئی بخوبی سمجھ سکتا تھا کہ کیوں لوگ اتنی کثیر تعداد میں نہ صرف ان کی عزت بلکہ ان سے دلی محبت کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ان کو سننے والا ہر شخص یہ تاثر لیتا تھا، جیسے ساری دنیا میں وہی شخص ان کے لیے اہم ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے جاننے والے تمام لوگ ان کی باتیں ذوق وشوق سے سنتے تھے۔ ان کے معاصرین میں یہ خوبی کسی اور کو حاصل نہیں تھی۔

اقبال نے اپنے مطالعہ کے لیے جو کمرہ مخصوص کر رکھا تھا، اس کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک روز میں یہیں موجود تھا اور اقبال حقہ کی نال منہ میں دبائے، دیوار کے ساتھ سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ میں ان سے مخاطب ہوا ''آج مسلمانوں کو ایک پیغمبر کی ضرورت ہے، کیونکہ وہی ان میں نئی زندگی کی روح پھونک سکتا ہے اور انہیں حالیہ جمودی حالت سے باہر نکال سکتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ حضور اکرمؐ کی ذات خاتم الانبیاء ہے اور اب ان کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوسکتا۔ رسول پاکؐ مدینہ میں مدفون ہیں اور ہم ان کی آواز تک نہیں سن سکتے۔''

اقبال نے فوراً میری بات کاٹی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمانے لگے ''ہم آج بھی ان کی آواز سن سکتے ہیں، بشرطیکہ ہم سننا چاہیں۔ یہ آواز زندہ ہے اور اسے ہر کوئی سن سکتا ہے، باوجودیکہ وہ مدینہ میں اپنی لحد مبارک میں محو استراحت ہیں۔''

میں نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا تو انہوں نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا ''حضور اکرمؐ کی آواز ان احادیث مبارکہ میں گونج رہی ہے، جو ہم تک پہنچی ہیں اور جنہیں ہم مستند مجموعوں میں پڑھ سکتے ہیں۔''

میں نے جواباً عرض کیا ''لیکن ان احادیث کو کتنے لوگ پڑھ سکتے ہیں، ہندوستان میں عربی جاننے والے مسلمان کتنی تعداد میں ہوں گے، جو حضور اکرمؐ کے ان فرمودات کو پڑھ اور سمجھ سکیں۔ بامر مجبوری ہمیں انہی ملاؤں سے رجوع کرنا پڑتا ہے، جن کی عربی دانی کا چرچا ہے، لیکن یہ ملا صرف اپنے پیروکاروں کو وعظ سنا سکتے ہیں، لیکن ان کی راہنمائی کرنے سے معذور ہیں۔''

اقبال نے اپنے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے فرمایا ''اسد صاحب! کیا آپ خود یہ کام نہیں کر سکتے؟''

میں نے حیرت سے جواب دیا ''بھلا میں کیا کرسکتا ہوں؟''

اقبال نے جواب دیا ''آپ کچھ احادیث کا بزبان انگریزی ترجمہ کر سکتے ہیں مثلاً ''صحیح بخاری'' کا۔ اس

Marfat.com

وقت گزارا تھا، اس کے بعد تو اپنے اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کی خواہش مزید بڑھ گئی۔

(6)

مجھے سرینگر روانہ ہونا تھا، تا کہ وہاں پہنچ کر کرایے پر کوئی مناسب گھر تلاش کر سکوں۔ انہی دنوں چودھری الٰہی بخش نے مجھے اپنے گھر دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ جب میں واپس آنے لگا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا ''اسد صاحب! میں آپ کو ایک مضحکہ خیز چیز دکھانا چاہتا ہوں۔ ذرا اس کو دیکھ لیجئے۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے مجھے ایک کھلا ہوا لفافہ پکڑا دیا۔ دیکھا تو اس میں چار صفحات پر مشتمل ایک پمفلٹ تھا۔ اس کے پہلے صفحہ پر موٹے الفاظ میں بزبان انگریزی لفظ ''پاکستان'' لکھا تھا اور رحمت علی نامی شخص کے دستخط تھے۔ میں نے خاموشی سے اسے اول تا آخر پڑھا۔ اس میں شمال مغربی ہندوستان کے ان علاقوں کو ہندوستان سے الگ خود مختار ملک کا تصور پیش کیا گیا تھا، جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس علیحدہ اسلامی مملکت کا نام 'پاکستان' تجویز کیا گیا تھا اور یہ نام پنجاب، افغان صوبہ (جو برطانوی راج میں شمال مغربی سرحدی صوبہ کے نام سے موسوم تھا) کشمیر اور سندھ کے ابتدائی حروف اور بلوچستان کے آخری حروف کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔[19]

یہ چند صفحات پڑھ کر میں دم بخود رہ گیا اور مجھے اچانک اسی سے ملتا جلتا تصور یاد آ گیا جو برسوں پہلے جمال الدین افغانی نے پیش کیا تھا یعنی کراچی سے دہلی اور ہمالیہ کے مشرقی جانب لکیر کھینچ کر ہندوستان کو مسلمانوں اور ہندوؤں میں تقسیم کر دیا جائے۔

میں نے پوچھا ''یہ رحمت علی کون ہے؟'' الٰہی بخش نے ہنستے ہوئے جواب دیا ''وہ کیمبرج میں طالب علم ہے۔ کیا آپ نے کبھی تقسیم ہند جیسی مضحکہ خیز بات سنی ہے؟ کیسی بیہودہ سوچ ہے؟''

میں بے ساختہ بول پڑا ''نہیں، چودھری صاحب! یہ بیہودہ بات نہیں ہے۔ یہ تو اب نوشتۂ دیوار ہے۔ ایسی حقیقت، جیسے اس وقت آپ اور میں یہاں کھڑے ہیں۔''

لیکن میرے بزرگ دوست یہ بات سن کر مسکرائے اور کہنے لگے ''آپ ابھی اس ملک میں نو وارد ہیں۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو رحمت علی کی اس تجویز کے ناممکن ہونے کا پتہ چل جائے گا۔ یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ خیال ہے۔''

چند روز بعد میری اپنے ایک اور دوست سر سکندر حیات خاں[20] سے ملاقات ہوئی۔ 1930ء کی دہائی کے اوائل میں جو گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس میں برطانوی حکومت نے صوبوں میں محدود خود مختاری دے دی تھی اور اب سکندر حیات پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ وہ انہیں ملتے رہتے تھے اور ان سے اچھے دوستانہ مراسم تھے۔ ایک خاص موقع پر میں نے ان سے چودھری رحمت علی کی مذکورہ تحریر کا ذکر کیا، جو وہ پہلے ہی پڑھ چکے تھے۔ انہوں نے میرے جذباتی الفاظ کو بڑے صبر و تحمل سے سنا، پھر حقے کی نال کو ایک طرف کیا اور اپنا سر ہلایا ''میرے دوست! آپ ابھی ہندوستان میں نئے نئے آئے ہیں۔ آپ ابھی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ٹھنڈے دماغ سے سوچیں تو

Marfat.com

آپ کو اندازہ ہوگا کہ تقسیم ہند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بالکل ممکن نہیں، یقین رکھیں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' میں نے دلیرانہ انداز میں جواب دیا ''نہیں، سردار صاحب! صرف میں ہی اکیلا غلطی پر نہیں ہوں۔ پاکستان معرض وجود میں آئے گا اور ہم دونوں اسے دیکھیں گے۔''

لیکن سکندر حیات میرے دوست چودھری الٰہی بخش کی طرح مسکراتے رہے۔ اس وقت ہم دونوں سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اب سے چند سالوں بعد وہ تحریک پاکستان کے ایک سرگرم رکن ہوں گے۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

باب چہارم

سنہری دور
(1934ء-1937ء)

(1)

جب ہم لاہور سے کشمیر منتقل ہوئے، موسم گرما پورے عروج پر تھا۔ میدانی علاقے گرمی کی شدید لہر کی لپیٹ میں تھے اور بذریعہ کار راولپنڈی تک کا سفر ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا، لیکن جونہی کار مری کے پہاڑوں کی اونچی نیچی اور بال پن کی طرح بے شمار موڑ کاٹتی ہوئی سڑک پر رواں دواں ہوئی، تو ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا سا محسوس ہوا اور یوں لگا جیسے کوہ ہمالیہ نے یہ کسی اور دنیا سے ہمارے لیے بھیجا ہے۔ مٹی میں اٹے ہوئے میدان پیچھے رہ گئے اور پہاڑی ڈھلوانوں اور شفاف چٹانوں کا وسیع سلسلہ شروع ہوگیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے سفر کے بعد ہم مری پہنچے، جو سطح سمندر سے سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہاں ایک ہی بڑی سڑک ہے، جس پر لاتعداد درخت سایہ کئے ہوئے تھے۔ اس سڑک کے دونوں جانب چھوٹے بڑے ہر انداز کے بنگلے اور دکانیں موجود تھیں، جہاں زیادہ تر وہی لوگ اپنی ضرورت کا سامان خریدتے تھے، جو پنجاب کے سلگتے موسم گرما کے چند مہینے گزارنے کے لیے یہاں آئے تھے۔

یہاں کے ڈاک بنگلہ میں کچھ وقت گزارنے کے بعد ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ایک اونچے درہ کو عبور کرتے ہی تا حد نظر پھیلی ہوئی وادی کشمیر شروع ہوگئی۔ اس وسیع وعریض وادی میں دریائے جہلم باوقار خاموشی سے بہتا ہے۔ یہاں جھیلوں کے کناروں پر درختوں اور پھولوں کی لمبی قطاریں نظر آتی ہیں۔ اس حسین وجمیل وادی کو دیکھ کر مجھے فارسی کا ایک پرانا شعر یاد آگیا، جس میں کشمیر کے بارے میں شاعر نے بڑے مناسب طریقے سے اپنے اور کسی حد تک میرے جذبات کی بھی ترجمانی کی ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

یعنی اگر زمین پر کہیں جنت ہے، تو وہ یہیں اور صرف یہیں ہے۔

اس سے پہلے یا بعد میں مجھے اتنا حسین اور ہر اعتبار سے مکمل ارضی منظر دیکھنے کو نہیں ملا اور کشمیر جیسی خوشگوار

Marfat.com

آب وہوا کا بھی دوبارہ تجربہ نہیں ہوا۔ حقیقتاً یہ خوابوں کی ایسی دنیا ہے، جو شاید ہی کہیں اور پائی جاتی ہو۔

بہت سے رہائشی بجرے دریائے جہلم کے کنارے بندھے کھڑے تھے۔ اس کے پانی سے اِدھر اُدھر جھیلوں کا وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور انہی سے دریا آگے کو جاری وساری تھا۔ سورج میں دریا اور جھیلوں کا پانی چمک رہا تھا اور اس کی تہہ پر لہریں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ جھیلوں میں مصنوعی اور متحرک جزیرے نقطوں کی مانند دکھائی دیتے تھے۔ ناگر موتھا کے بڑے بڑے چبوتروں کو مٹی سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ وہاں پھول اور سبزیاں بکثرت اگائی گئی تھیں۔ مرد اور عورتیں ان کی دیکھ بھال کرتی تھیں کیونکہ ان کے لیے پانی کے یہ وسیع ذخیرے فطرت کے عطیات میں سے تھے۔ چھوٹی اور لمبوتری 'شکارا' کشتیاں، جنہیں مرد لمبے بانسوں سے بڑے متوازن طریقے سے دھکیل رہے تھے، آہستہ آہستہ جزیرے سے دریا کے کنارے کی طرف آرہی تھیں۔ ان کشتیوں پر پھلوں اور سبزیوں کے علاوہ گاتی ہوئی خواتین بھی ہوتی ہیں اور جیسا کہ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ ان کی مدھر آواز میں تازگی اور وجدانی تاثر نے کشمیر کے موسم گرما کو مزید دلکش بنادیا ہے۔ ان دنوں جھیل اور دریا کا چمکیلا پانی عجیب منظر دکھاتا ہے اور ہمالیہ کی عظیم برف پوش چوٹیاں شمال تک اس وادی کا احاطہ کرتی ہیں۔ دراصل یہ پندرہ ہزار فٹ اونچی دیوار کا کام دیتی ہے۔

میں نے ایک رہائشی بجرا کرایے پر لیا اور لب دریا مستقل گھر میں منتقل ہونے تک اس میں مقیم رہا۔ یہ گھر تین سادہ، آرام دہ اور فرنیچر سے آراستہ کمروں پر مشتمل تھا۔ باورچی خانہ الگ، کشتی پر تھا اور اس کی ملکیت ایک شادی شدہ جوڑے کے پاس تھی۔ بیوی ہمارے لیے کھانا تیار کردیتی تھی اور اس کا شوہر ہرفن مولا شخص تھا۔ ہر طرح کی سہولیات سمیت اس گھر کا کرایہ شہری ہوٹل کے کمرے کے ایک دن کے کرایے سے بھی کم تھا۔

ہمارے رہائشی بجرے کو مضبوط رسوں کے ساتھ باندھا گیا تھا اور یہاں سے نیچے پیدل دس منٹ کے فاصلے پر سرینگر تھا۔ چنانچہ اگلے دن صبح سویرے میں اس شہر کی سیاحت کو نکل پڑا۔

سرینگر ایک خوبصورت شہر ہے۔ اس کی گلیاں تنگ، مکانات پرانے، لکڑی اور اینٹوں کے بنے ہوئے، قدرے ڈھلوانی چھتیں اور ان پر ہلکی سی مٹی کی تہہ، ان چھتوں پر رنگین پھول اور خودرو جنگلی گھاس۔ بلاشبہ یہ ایک منفرد اور خوبصورت منظر تھا۔

(2)

میرے پاس کشمیر کی ایک معروف ترین شخصیت میر واعظ[21] کے نام تعارفی خط تھا۔ درمیانی عمر، سیاہ داڑھی، توانا چہرہ، سر پر پگڑی، پشمینہ کا نرم وگداز چوغہ زیب تن اور شائستہ اطوار کی حامل شخصیت! اس وقت وہ قالین پر بیٹھے تھے۔ اٹھے اور ایک دیرینہ دوست کی طرح بغلگیر ہوئے۔ مجھے جلد پتہ چل گیا کہ جس پُر تپاک انداز سے انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا، وہ کشمیری مسلمانوں کی زندگی کا معمول ہے۔

ہم فارسی میں گفتگو کرتے رہے، کیونکہ وہ روانی سے یہ زبان بول سکتے تھے۔ رسمی آداب ملاقات اور معمول

Marfat.com

کے سوالات کے بعد انہوں نے پوچھا "آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟" اور جب میں نے بتایا کہ فی الحال کرایے کے ایک رہائشی ہجرے میں مقیم ہوں تو انہوں نے قدرے درشتی سے کہا "آپ کو سیدھے میرے گھر آنا چاہیے تھا۔ اس میں خاصی گنجائش ہے اور اس کے دروازے میرے دوستوں کے لیے ہمیشہ کھلے ہیں۔" یہ جاننے کے بعد کہ میری بیوی اور بچے بھی میرے ساتھ سرینگر آئے ہیں، انہوں نے ہم سب کو شام کے کھانے کی دعوت دی۔ میں نے ان کی مخلصانہ دعوت کو قبول کر لیا اور کہا کہ میں سہ پہر کو ان کو بھی ساتھ ہی لیتا آؤں گا۔ انہوں نے مجھے سختی سے منع کر دیا اور منیرہ اور طلال کو اپنے گھر لانے کے لیے اپنے بیٹے کو بھیج دیا۔

تھوڑی دیر بعد کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ میر واعظ نے انہیں مجھ سے ملوانے کے لیے بلایا تھا۔ ان کی بیگمات میزبان کی خواتین سے ملنے اندر چلی گئیں۔ جب میری بیوی اور بیٹا وہاں پہنچے تو وہ بھی زنان خانہ کو چلے گئے اور پھر وہاں سے ہنسنے ہنسانے اور قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔

اسی اثناء میں چائے آ گئی۔ تمام لوگ قالین سے ڈھکے ہوئے فرش پر بیٹھے تھے۔ میں زندگی میں پہلی بار کشمیری چائے کے ذائقہ سے آشنا ہوا۔ میر واعظ کے ایک بیٹے نے میری موجودگی میں یہ چائے تیار کی۔ میں جیسی چائے کا عادی تھا، یہ اس سے بالکل مختلف تھی۔ سبز چوری چائے کی پتیوں کو تانبے کے ساوار میں ابلتے ہوئے گرم پانی میں کشید کیا گیا اور پھر گاڑھے، گرم اور ملائی دار دودھ سے اسے پتلا کیا گیا۔ عام چینی کے بجائے اس میں نمک استعمال ہوا اور ہر مہمان کے پیالے میں اوپر مکھن کی ٹکیا رکھ دی گئی۔ میں نے جھجکتے ہوئے پیالہ ہونٹوں سے لگایا، لیکن پھر مزے مزے سے چسکیاں لیتے ہوئے اسے خالی کر دیا۔ تب سے یہ نمکین اور مکھن والی کشمیری چائے میرے پسندیدہ مشروبات میں شامل ہو گئی۔

شام کا کھانا تھوڑے وقت میں تیار کیا گیا، پھر بھی یہ صحیح معنوں میں شاندار دعوت تھی۔ بھیڑ کی لمبی لمبی چانپیں، جن کو بڑی عمدگی سے کوئلوں کی آگ پر بھونا گیا تھا، اور اس کے ساتھ پُر لطف زعفرانی پلاؤ، جو ذائقے میں ایرانی پلاؤ سے کم نہیں تھا، جس میں جگہ جگہ بادام اور خشک خوبانی، بیچ میں تیز مرچوں والے کوفتے اور ایک طرف گرم گرم چٹنی۔ بہت سی اقسام کے کباب بھی اور ان کے ساتھ خوبانی کی چٹنی اور خوب جما ہوا میٹھا دہی۔ ان کے ساتھ بھورے رنگ کی بڑی بڑی روٹیاں۔ برسوں پہلے ایران اور افغانستان میں ایسی روٹیاں کھائی تھیں۔ اس کے بعد یہیں دیکھنے کو ملیں۔ ان پُر تکلف لوازمات کے ساتھ ایسی خوشبودار مٹھائی کھلائی گئی جو پورے ہندوستان میں کہیں اور دستیاب نہیں۔ مجھے یوں لگا کہ اگر میں شاعر ہوتا تو اس کشمیری دعوت پر آسانی ایک نظم قلمبند کرتا۔

(3)

چند روز میں میر واعظ کے ایک قریبی دوست نے ہمارے لیے علیحدہ گھر کا بندوبست کر دیا۔ یہ سرینگر سے ذرا باہر ایک وسیع بنگلہ تھا۔ اس کے تمام کمرے ضروری فرنیچر سے آراستہ اور ارد گرد قسم قسم کے پھولوں سے لدا ہوا چھوٹا سا

Marfat.com

باغ اور اس کے وسط میں رات کی رانی کے گھنے جھنڈ، جس کے پھولوں کی سہانی مہک رات کو عجیب وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔

اس گھر میں مَیں نے ''صحیح بخاری'' پر جم کر کام شروع کر دیا۔ دہلی میں مجھے جو کتابیں تحفتاً دی گئی تھیں، ان کے لیے ایک بڑھئی سے شیلف بنوائے۔ ان کتابوں میں لغات (جن میں اہم ترین بائیس جلدوں پر مشتمل ''لسان العرب''22 بھی تھی)، قرآنی تفاسیر، احادیث کے مختلف خلاصے اور متعدد کتب رجال شامل تھیں۔ اب میں اس کام کے لیے ہر اعتبار سے کمربستہ تھا، جس کے لیے مجھے آئندہ چند برس مختص کرنا تھے اور جس کو نپٹانے کے لیے اپنی تمام مصروفیات تج کر دلجمعی اور استغراق سے کام کرنا تھا۔ احادیث کا ترجمہ وتشریح تو روز کا معمول تھا۔ میرے گرد وپیش کے پُرلطف مناظر اور کشمیر کی فرحت بخش آب وہوا میرے روز کے اس کام میں ممد ومعاون ثابت ہوئی اور اب میں طباعتی سہولتوں کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

اس وقت میرے ذہن پر اپنا پرنٹنگ پریس لگانے کی دھن سوار تھی تاکہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے ''صحیح بخاری'' کا پہلا حصہ شائع کر دیا جائے۔ میرا ارادہ اس حصے کو نظام حیدرآباد دکن کی خدمت میں پیش کرنا تھا اور اس طرح انہیں یہ بتانا مقصود تھا کہ جس کام کو میں نے اپنے ذمہ لیا ہے، اس کی مجھ میں کس قدر استعداد ہے۔ مزید یہ کہ انہیں یہ نمونہ دیکھ کر اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ تکمیل کے بعد اس منصوبے کی شکل وصورت کیا ہوگی۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر میں ترجمہ وتشریح کے ساتھ اصل عربی متن کی طباعت کے لیے بھی ایسا طریقہ کار اختیار کرنا چاہتا تھا جو اس سے پہلے ہندوستان میں متعارف نہیں ہوا، یعنی ہر حدیث کے اصلی متن کو اس کی اسناد (حضور اکرمؐ سے لے کر امام بخاری تک احادیث کے معتبر راویوں کے اسمائے گرامی) سے الگ طبع کیا جائے۔ ''صحیح'' کی سابقہ اشاعتوں میں اسناد اور متن کو غیر منقطع ترتیب سے درج کیا جاتا تھا اور انہیں علیحدہ علیحدہ درج کرنے کا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا تھا۔ مزید برآں ''صحیح بخاری'' کی ہر حدیث میں تحویلات کی بھرمار ہے۔ چنانچہ یہ امور اس بات کے متقاضی تھے کہ ان احادیث کی تفہیم کے لیے وسیع تجربے اور عالمانہ فراست کی ضرورت ہے۔ اپنے مستقبل کے قارئین کی سہولت کے لیے مطالعہ حدیث کی تاریخ میں پہلی بار یہ فیصلہ کیا کہ نہ صرف ٹائپ کے مختلف سائزوں کے ذریعے اسناد اور متن کے فرق کو سامنے لایا جائے بلکہ توضیح وتشریح کے لیے ایک واضح طریقہ بھی متعارف کرایا جائے۔ احادیث کے متن کے حوالے سے اس نئے طریق کار کے بارے میں ابھی تک کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔

مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ کسی بھی تجربہ کار پریس کے لیے ان تصریحات سمیت اس دو زبانی مسودے کی طباعت آسان کام نہیں تھا۔ کشمیر جیسے علاقے میں تو یہ اور بھی مشکل دکھائی دیتا تھا۔ میرے یہ خدشات اتنے بے بنیاد بھی نہیں تھے۔ سرینگر میں جو چند مطابع تھے، میں وہاں اکثر جاتا اور ان کے طباعتی معیار کی جانچ پڑتال کرتا رہا۔ ان میں ایک مطبع بھی ایسا نہیں تھا جو میرے طے کردہ معیاروں پر پورا اترتا ہو، لیکن مجھے کشمیر ہی میں یہ کام کرنا تھا، کیونکہ میں نے جہاں تک ممکن ہو سکا، یہیں رہنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ بالآخر میں نے اپنا الگ چھوٹا سا پریس لگانے کا حتمی

Marfat.com

فیصلہ کرلیا۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ اس ضمن میں مجھے جن مشکلات کا سامنا کرنا تھا، ان کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے پہلے ہی بیرون ملک سے عربی اور رومن ٹائپ منگوانے کا اہتمام کرلیا تھا اور اب وہ ٹائپ پہنچنے ہی والا تھا۔ فی الحال جس چیز کی مجھے اشد ضرورت تھی، وہ پلیٹن پریس تھا، لیکن میں اپنے محدود مالی وسائل کے باعث اسے خرید نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے دہلی میں اپنے اہل حدیث احباب سے رجوع کرنا مجھے پسند نہیں تھا، کیونکہ مجھے ایک عربی مقولہ یاد تھا: ''دوست کو شہد کی طرح استعمال کیجیے، تم اسے انگلیوں سے چاٹ سکتے ہو، لیکن اس کے لیے تمہیں اپنے ہاتھ کبھی استعمال نہیں کرنا چاہئیں۔''

بالآخر ادھر اُدھر پوچھ گچھ کے بعد میرے ذہن میں اس مشکل کا ایک یہ حل آیا اور وہ یہ کہ میں سرینگر کے ایک دوست پرنٹر سے ماہانہ کرایہ پر پلیٹن پریس یعنی پاؤں سے چلنے والی پرنٹنگ مشین حاصل کروں۔ اس پر کام کرنے والے کاریگروں کو میں خود ملازم رکھوں۔ ان کی تنخواہ بھی میں اپنی جیب سے ادا کروں۔

چند دنوں بعد اپنے بنگلے کے نچلے کمروں میں یہ پلیٹن پریس نصب کر دیا گیا اور میرے مہیا کردہ نقشے کے بعد بڑھئی نے ٹائپ جوڑنے اور اسے بحفاظت رکھنے کے لیے لکڑی کے تختے بنا دیے۔ اس کے بعد مجھے ایک ایسے حروف کار (کمپوزیٹر) کی تلاش میں لاہور جانا پڑا، جو ان خطوط پر کام کر سکے، جیسا میں نے سوچ رکھا تھا اور غیر معینہ مدت کے لیے کشمیر میں قیام کر سکے۔

لاہور میں میرا ایک دوست میری اس تلاش میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کا نام محمد حسین بابری تھا۔ ''بابری'' ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے بانی بابر کی یاد دلاتا ہے، کیونکہ اس کے آباؤ اجداد اس مغل بادشاہ کے سلاح دار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے خاندان کے لوگ نسل در نسل فن آہنگری سے منسلک رہے۔ محمد حسین خود بھی ٹائپ رائٹر کا تجربہ کار مستری تھا۔

میرے تمام دوستوں میں اس جیسا بے لوث اور مخلص انسان کوئی نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ہر ایک کے دکھ بانٹنے کو مستعد اور ہر ممکنہ طریقے سے اس کی مدد کے لیے سرگرم عمل رہتا تھا۔ ہماری دوستی کی مدت پچاس سال سے زیادہ ہے۔ اس عرصے میں میری زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے اور تین براعظم میرا مسکن رہے، لیکن اس کے باوجود ہماری دوستی اس کی وفات (1980ء بعمر پچاسی سال) تک قائم و دائم رہی۔[23]

کمپوزیٹر کو تلاش کرنے میں مجھے محمد حسین بابری ہی سے رابطہ کرنا پڑا۔ وہ ایک شخص کو جانتا تھا، جو میری ضرورتوں کو پورا کر سکتا تھا۔ حال ہی میں وہ ایک معروف طابع کی ملازمت سے فارغ ہوا تھا اور ان دنوں بیکار تھا۔ محمد حسین بابری نے اس کا پتہ چلایا اور اسے ڈھونڈ کر میرے پاس لے آیا۔ ادھیڑ عمر، پکی داڑھی اور درمیانی قد و قامت کے اس شخص کا نام عبدالحق تھا اور اسے عربی اور انگریزی کمپوزنگ میں مہارت حاصل تھی۔ جب اسے کشمیر میں چند ماہ گزارنے کا علم ہوا تو وہ فوراً راضی ہو گیا، کیونکہ گرم علاقوں میں رہنے والوں کے لیے کشمیر جیسے سرد اور صحت افزا مقام کی

Marfat.com

بڑی کشش ہوتی ہے۔

لاہور کے مختصر قیام کے دوران میں مَیں نے کاغذ کے ایک مقامی تھوک فروش کو مطلوبہ کاغذ کا آرڈر دے دیا اور یہ بڑے بڑے پیکٹوں میں سرینگر ارسال کر دیا گیا۔ جب میں کمپوزیٹر کے ساتھ واپس پہنچا اور اس کو ایک بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرانے کا بندوبست کر دیا، تو کاغذ اور ٹائپ دونوں پہنچ چکے تھے اور چند روز بعد ٹائپ جوڑنے اور استعمال کے بعد اسے الگ رکھنے کے تختے بھی تیار ہو گئے اور یہ سارا طباعتی سامان میرے پلیٹن پریس سے ملحقہ اپنے ہی گھر میں رکھ دیا گیا۔

اس اثناء میں میرے منصوبے یعنی ''صحیح بخاری'' کے انگریزی ترجمہ و تشریح کے پہلے حصہ کا مسودہ تیار ہو گیا اور اس مجموعہ احادیث کے اولیں انگریزی ترجمہ کی طباعت کی تیاریاں بھی مکمل ہو گئیں۔

(4)

1934ء کے گرما اور خزاں کے دونوں موسم ناقابل تغیر معمولات زندگی کی نذر ہو گئے۔ ناشتے کے بعد صبح کا بیشتر وقت اپنے کام میں مشغول رہتا اور سہ پہر کو ترجمہ اور تشریحات کے لیے مختص تھا۔ بیچ بیچ میں مختصر وقت کے لیے پریس کے بھی چکر لگا لیتا۔ یوں عبدالحق کے کام کی نگرانی بھی ہو جاتی اور ایک دن پہلے کے نکالے ہوئے پروفوں کو بھی پڑھ لیتا۔ سہ پہر سے ذرا پہلے ٹہلنے کو بھی نکل جاتا۔ بالعموم میں نے اپنی چہل قدمی کے لیے نہر کے دونوں کناروں کو منتخب کر رکھا تھا۔ یہ ان نہروں میں سے ایک تھی جو کشمیر کی وادی کو آڑے ترچھے طریقے سے قطع کرتی ہیں۔ واپس آ کر رات کا کھانا کھاتا، دوستوں سے ملتا اور سو جاتا۔ کبھی کبھار میں سرینگر کے پُررونق بازاروں میں گھومنے کے لیے نکل جاتا۔ یہاں کے لوگوں سے میری خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ خاص طور پر میں کچھ وقت کے لیے ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک قالین فروش کی دکان پر ضرور بیٹھتا تھا۔ چھوٹی قد و قامت، سیاہ داڑھی، دائیں ہاتھ کا کچھ حصہ مفلوج اور کشمیر کے واقعات اور لوگوں کے بارے میں بے انتہا معلومات رکھنے والا یہ شخص اب میرا دوست بن چکا تھا۔ ہم اکٹھے سبز چائے نوش جان کرتے اور دنیا کے ہر مسئلہ پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا۔

موسم خزاں گزرا تو موسم سرما شروع ہوتے ہی برفباری شروع ہو گئی۔ وادی کشمیر کی ہریالی برف کی دبیز تہہ میں چھپ گئی۔ پیدل چلنے والوں کے قدم برف کی اس بُھربُھری تہہ پر چٹخنے لگے۔ موسم گرما اور پت جھڑ کے موسموں کے بگلوں کے بجائے اب پہاڑی کوؤں کے جھنڈ منڈلانے لگے۔ انھی دنوں ''صحیح بخاری'' کے میرے انگریزی ترجمے کے حصہ اول کا سرورق طبع ہوا۔ پہلے دو حصے یعنی ''وحی کا آغاز کیسے ہوا؟'' اور ''کتاب ایمان'' پر مشتمل تھے اور باہر کے صفحے پر ''سرینگر، کشمیر 1935ء'' چھپا ہوا تھا۔

جنوری کی اس یادگار شام کو میرے گھر پر ایک چھوٹی سی ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ قالین پر سفید میز پوش بچھا کر اس کے گرد میر واعظ، محمد حسین بابری، عبدالحق، میں اور میری بیوی بیٹھ گئے اور سب مل کر پروردگار سے دست بدعا

Marfat.com

ہوئے، جس نے مجھے رسول اکرمؐ کی احادیث کو ان لوگوں تک پہنچانے کی استطاعت بخشی، جو ان کے مفاہیم سے ناواقف تھے۔

(5)

یہاں میں ایک دریافت کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں، جو میرے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ممکن ہے اسے دریافت نو کا مقام حاصل نہ ہو، لیکن میرے لیے ہے اور ابھی تک میں اپنے مؤقف پر قائم ہوں۔

جب میں ''صحیح بخاری'' جیسی لافانی کتاب کے ترجمہ وتشریح میں منہمک تھا، مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ احادیث اور قرآن کی عربی زبان میں فرق پایا جاتا ہے۔ اول الذکر میں اس صحرائی ماحول کی پاکیزگی اور شدت منعکس ہے، جس میں حضور اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کی ولادت ہوئی اور پرورش پائی، جبکہ قرآن کی عربی عجیب روشنی سے منور ہے، جو اس کے نورانی صفحات ہی سے بکھرتی ہے اور اس پر وقت اور ماحول کے اثرات دور دور تک دکھائی نہیں دیتے۔ اس کے الفاظ میں تہ در تہ معانی کی جو کائنات مخفی ہے، وہ کسی انسان کے طرز کلام سے ماورا ہے، لیکن اس کے باوجود وہاں تک انسان کی متلاشی روح کی رسائی ممکن ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے، جو حضور اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ کی روزمرہ گفتگو میں ناپید ہے، باوجودیکہ اس پر کلاسیکیت کا عنصر غالب ہے اور اس کے لسانی ڈھانچے اور اسلوب بیان پر عجمی اثرات نہیں پڑے تھے۔ مختصراً اظہار کے یہ دونوں پیرائے ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ کوئی حقیقی عالم حضور اکرمؐ کے بلند مرتبہ ارشادات کو قرآن کے کسی حصے سے گڈمڈ نہیں کرسکتا۔

(6)

نظام حیدرآباد سے ملاقات کی ایسی صورت نکل آئی، جو میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی۔ ایک روز مجھے ایک جلاوطن افغان شہزادے نے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ وہ کشمیر کے مہاراجہ کے سرکاری مہمان کی حیثیت سے سرینگر میں اپنی جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا۔ اس کے باپ ایوب خاں نے 1880ء میں برطانوی فوج کے خلاف میوند کی یادگار جنگ لڑی تھی، جس میں انگریزوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی، لیکن افغانستان کی زمام اقتدار روس کے قبضے میں نہ آسکی۔ اس ناکامی کے باعث اب میرے میزبان کے اپنے آبائی وطن واپس جانے کا امکان نہیں تھا[24]۔ تاہم افغانستان سے اس کا گہرا جذباتی تعلق قائم تھا اور جب میں نے 1925ء میں اپنی سیاحت افغانستان کا تفصیل سے ذکر کیا، تو وہ ہمہ تن گوش سنتا رہا۔ گفتگو کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ اس نے انہی دنوں کا تحریر کردہ میرا افغانستان پر ایک مضمون پڑھا تھا، جو Frankfurter Zeitung کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا عنوان ''سرکش نوجوان کی ریاست'' تھا، جس میں افغانی سیاست کے بعض خصائص کی وضاحت کی گئی تھی[25]۔ وہ افغان شہزادہ میری اس تحریر کا بڑا معترف تھا اور اس کے خیال میں یہ ''افغانستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی پر مبنی برحقیقت تبصرہ ہے'' اور مغربی

Marfat.com

اخبارات میں ایسے بے لاگ تجزیئے بہت کم دکھائی دیتے ہیں (وہ تینوں مغربی زبانیں یعنی انگریزی، فرانسیسی اور جرمن روانی سے بول سکتا تھا)۔ اس کے یہ تعریفی کلمات نے حاضرین دعوت پر خوشگوار اثر مرتب کیا۔ مہمانوں میں ایک بوڑھے خوش وضع حیدر آبادی نواب بھی تشریف فرما تھے۔ اس وقت ان کا نام میرے ذہن سے اتر گیا ہے، بہر حال وہ مُصر رہے کہ میں حیدر آباد ضرور جاؤں اور نظام سے ملوں۔ انہوں نے بتایا کہ دنیائے اسلام میں کہیں بھی کسی اہم کام کا ڈول ڈالا جائے، وہ اس کی مالی اعانت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ میں نے عرض کیا کہ "میں تو صرف حیدر آباد دیکھنا اور اس کے حکمران سے اپنا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔" نواب صاحب بے ساختہ بول پڑے "یہ تو معمولی بات ہے۔ میں آپ کو اُن کے نام خط لکھ دوں گا اور آپ کے آنے کی پیشگی اطلاع بھی کر دوں گا۔ یقیناً وہاں آپ کا ایک معزز مہمان کی حیثیت سے استقبال کیا جائے گا۔"

نواب صاحب کی اس یقین دہانی کے ایک ہفتہ بعد میں اس گاڑی میں سوار ہو گیا، جسے شب و روز کا ایک طویل سفر طے کر کے حیدر آباد پہنچنا تھا۔

(7)

حیدر آباد دکن ہندوستان کی تمام مسلمان ریاستوں میں سب سے بڑی اور امیر ترین ریاست تھی۔ اس کے صدر مقام کا نام بھی حیدر آباد ہے اور اس کی شہرت بھی چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ایک وسیع، سلیقے سے تعمیر کردہ اور سفید عمارتوں کا شہر تھا۔ جدید طرز کی بلند و بالا عمارتیں دکھائی نہیں دیتی تھیں، لیکن مغل طرز تعمیر کی سرکاری اور نجی عمارتیں بکثرت تھیں اور ان کی نیچی سفید دیواروں کے پیچھے پھولوں کے باغات عجب بہار دکھاتے تھے۔ صاف ستھری سڑکوں کے دو رویہ درخت قطار اندر قطار کھڑے دعوت نظارہ دیتے تھے۔ ہندوستان میں ایسے خوبصورت اور دلکش مناظر خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہندوستان کے بیشتر قصبوں اور شہروں کے برعکس یہاں آوارہ پھرتی ہوئی دبلی پتلی گائیں نظر نہیں آتی تھیں۔

ریلوے اسٹیشن پر دو آدمیوں نے میرا استقبال کیا۔ ان کے سروں پر سفید پگڑیاں تھیں اور کمر بند لگائے ہوئے تھے۔ وہ سرکاری مہمان خانہ کے ملازمین تھے، جو پہلے سے میری آمد سے مطلع تھے۔ وہ مجھے بذریعہ کار میری عارضی منزل کی جانب لے گئے۔

میں نے اپنا سوٹ کیس کھولا اور "صحیح بخاری" کے حصہ اول کا مطبوعہ نسخہ باہر نکالا۔ اس پر مراکشی چمڑے کی جلد چڑھائی گئی تھی اور اس پر سنہرے حروف میں "عزت مآب نظام حیدر آباد کی نذر" کی مہر ثبت تھی۔ ابھی میں یہ نسخہ دیکھ ہی رہا تھا کہ اونچی پگڑی اور سفید وردی میں ملبوس ایک نوجوان افسر نمودار ہوا اور مجھے مطلع کیا کہ نظام صاحب چائے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ محل لے جانے کے لیے کار پہلے سے میرے انتظار میں کھڑی تھی۔

محل، نظام صاحب کی باقاعدہ رہائش گاہ نہیں تھا۔ وہاں پہنچتے ہی میری نظر ایک اونچی سفید دیوار پر پڑی اور

Marfat.com

اس کے پیچھے باغ میں گھری ہوئی سادہ سی تین منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ دولت مند ہندوستانی اکثر ایسی عمارتوں کو بطور اقامت گاہ استعمال کرتے ہیں۔ حیدر آباد میں ایسی عمارت کو محل کے بجائے کوٹھی کہا جاتا ہے یا دوسری عمارتوں سے ممتاز کرنے کے لیے اسے ''کنگ کوٹھی'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

جس دیوان خانہ میں نظام نے میرا استقبال کیا، وہ خاصا بڑا اور اس کی چھتیں اونچی تھیں۔ دیواریں مطلا لہریا کام سے مزیّن تھیں۔ لوئی کوینزے (Louis Quinze) طرز کی بغیر گدیوں کے کرسیاں، صوفے اور چھوٹی میزیں پڑی تھیں۔ کمرے میں سب سے قیمتی چیز وہ شاندار ایرانی قالین تھے، جنہوں نے دیواروں تک فرش ڈھانپ رکھا تھا۔

نظام اکیلے صوفہ پر بیٹھے اپنی انگلیوں میں رکھی عنبریں تسبیح پھیر رہے تھے۔ جب میں اندر داخل ہوا، وہ اٹھے اور مجھے خوش آمدید کہا۔ پھر مجھے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں کے درمیان ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی، جس کے اوپر کا حصہ شیشے کا تھا۔ اس وقت ان کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ درمیانی قد و قامت کے کمزور سی جسامت کے شخص تھے۔ ان کا شمار دنیا کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ شاید وہ ان میں بھی سر فہرست تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے خاکستری رنگ کی گھسے کالروں والی اچکن پہن رکھی تھی۔ سر پر سرخ ترکی طربوش تھی، جس کے کناروں کا رنگ پسینے کی وجہ سے مٹیالا سا ہو گیا تھا۔ میرے لیے ان کی یہ ظاہری حالت تعجب خیز نہیں تھی، کیونکہ میں پہلے سے جانتا تھا کہ مال و دولت کی اتنی ریل پیل کے باوصف ان کی شہرت بطور ایک 'کنجوس' حکمران کے تھی۔ وہ انتہائی خلیق اور سادہ اطوار کے مالک تھے۔ دھیمی آواز میں انگریزی بولتے تھے۔ بہت کم مسکراتے تھے۔ ہر مسلمان میزبان کی طرح میرا حال احوال پوچھتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے امید کا اظہار کیا کہ میرا سفر زیادہ تکلیف دہ نہیں رہا ہوگا۔ میرے سامنے والی میز پر چائے کے کپ اور پلیٹیں پہلے سے رکھ دی گئی تھیں۔ فوراً ایک پگڑی والا ملازم بڑی سی چائے دانی لے کر آیا اور پہلے نظام اور پھر میرے کپ میں چائے ڈال دی۔ ایک اور ملازم نے مجھے چھوٹے کیک اور بسکٹوں سے سجائی رکابی پیش کی۔ میں نے ایک کیک اٹھایا، لیکن نظام نے ہاتھ کے اشارے سے کچھ لینے سے انکار کر دیا۔ ملازم میری کرسی کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔ جونہی میں نے کیک ختم کیا، اس نے دوبارہ رکابی میرے آگے بڑھا دی۔ میں نے کچھ اور لینے سے معذرت کر لی اور وہ ملازم پھر سے میری کرسی کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ نظام نے اسے ماتھے پر تیوری چڑھا کر دیکھا، لیکن جب کیک بردار ملازم اشارہ کا مفہوم سمجھ نہ سکا، تو انہوں نے خفگی سے اردو میں کہا ''انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ وہ کچھ اور نہیں لیں گے۔'' یہ سنتے ہی وہ ملازم چپکے سے کھسک گیا۔ کیا نظام کو یہ خوف دامنگیر تھا کہ میں اپنا ذہن بدل کر دوسرا کیک ہڑپ کر جاؤں گا؟[26]

(8)

مجھے جلد ہی اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ نظام دکن کی فراخدلانہ اعانت کے بغیر میں اپنے منصوبے کو

Marfat.com

پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکوں گا۔ یقیناً وہ جُوَرس انسان نہیں تھے، بلکہ ایک انوکھی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اسلام سے حقیقی محبت کرنے والے مسلمان تھے۔

نظام سے ملاقات کے اگلے روز میں اس ریاست کے وزیراعلیٰ اور حیدرآباد کی بااثر ورسوخ شخصیت سر اکبر حیدری سے ملا[27]۔ وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ کوتاہ قامت، کھری کھری سفید داڑھی، سر کے بال سفید، خوبصورت سیاہ آنکھیں اور گٹھا ہوا جسم۔ جب میں ان کی بیٹھک میں داخل ہوا، وہ بہت سے مردوں اور عورتوں میں گھرے ہوئے تھے۔ وہیں مسز حیدری[28] بھی موجود تھیں، جنہوں نے آزادی نسواں کی راہ کو جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کیا تھا (وہ ہندوستانی مسلمانوں کی اشرافیہ کی پہلی خاتون ہیں جس نے برقع اوڑھنا ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا اور دوسری خواتین کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب دیتی رہیں)۔ انہی خواتین میں ترکی کی دو شہزادیاں، دُرِ شہوار[29] اور نیلوفر[30] بھی تشریف فرما تھیں۔ یہ دونوں سلطنت عثمانیہ کے آخری خلیفہ عبدالمجید[31] کی بھتیجیاں تھیں اور وہ نظام کے دو بڑے بیٹوں سے رشتہ ازدواج میں منسلک تھیں۔ ان میں بڑی یعنی دُرِ شہوار حیدرآباد ریاست کے ولی عہد کی بیوی جیسی حسین وجمیل خاتون میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ سرو قد، پُر وقار چال، ماہ کامل جیسا دمکتا یونانی چہرہ (ظاہراً یہ ہیر کیشیائی بزرگ عورتوں سے نسلی نسبت کا اثر ہے)۔ دوسری شہزادی یعنی نیلوفر بھی ویسی ہی خوش شکل خاتون تھی۔ مرد حاضرین میں شہزادہ پرنس خان موجود تھے، جو سلطان عبدالمجید ثانی کے پوتے اور سلطنت عثمانیہ کی بحالی کی صورت میں (اگر یہ ممکن ہو) اس کے دوسرے ولی عہد تھے[32]۔ وہ ایک دراز قد، عمر تقریباً چالیس سال، صحت مند، خوش وضع اور (جیسا کہ مجھے برسوں بعد معلوم ہوا) انتہائی ذہین اور نابغہ روزگار شخص تھا۔

ان تعارفی ملاقاتوں اور چائے کے بعد سر اکبر حیدری الگ سے بات کرنے کے لیے مجھے اپنے مطالعہ گاہ میں لے گئے۔ وہاں انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کا خط بھی انہیں مل چکا ہے، جس میں انہوں نے میرے مسئلہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے[33] اور پھر انہوں نے اس کے مناسب حل کی یقین دہانی کرائی۔ چند روز بعد اکبر حیدری نے مجھے مطلع کیا کہ نظام نے انہیں ایک خطیر رقم میرے نام جاری کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ جتنی رقم منظور کی گئی، اس میں ایک چھوٹا مکمل پریس بآسانی خریدا جا سکتا تھا۔ اکبر حیدری نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ ”آپ بیرون ملک سے جو کچھ منگوانا چاہتے ہیں، منگوا لیجیے اور ارسال کنندگان کو کہہ دیجیے کہ ان کے بل مجھے بھجوا دیں۔“

یہ سب کچھ میری توقعات سے بڑھ کر تھا۔ ابھی کچھ مزید پیش رفت بھی ممکن تھی۔ مجھے سہ ماہی مجلّہ ”اسلامک کلچر“ کی ادارت کی پیشکش ہوئی۔ مجھ سے پہلے اس کے مدیر مارماڈیوک پکتھال[34] تھے، جو حال ہی میں اپنے مدیرانہ فرائض سے سبکدوش ہوئے تھے، تاکہ وہ اپنا پورا وقت قرآن کے انگریزی ترجمہ کے لیے وقف کر سکیں۔ اس رسالے کے مدیر کی اسامی کی خاصی معقول تنخواہ تھی۔ تین مہینوں میں ایک بار شائع ہوتا تھا، اس لیے اس کو مرتب کرنے کے لیے کچھ وقت نکال سکتا تھا۔ تاہم میں نے اس شرط پر یہ عہدہ قبول کیا کہ میں اپنا ادارتی کام لاہور ہی میں انجام دوں گا۔ چونکہ مجھے اپنا نیا پریس اس شہر میں قائم کرنا تھا، اس لیے میں نے تجویز کیا کہ یہ مجلّہ بھی وہیں سے طبع کرایا جائے۔ میری

Marfat.com

ان دونوں تجاویز کو سر اکبر حیدری نے بلاتوقف منظور کرلیا[35]۔

(9)

سرینگر واپسی کے بعد میں نے صورت حال کا بغور جائزہ لیا۔ نہ صرف میرے ذاتی مطبع کا انتظام ہو گیا، بلکہ مجھے اتنی آمدنی کا بھی یقین دلا دیا گیا، جو مجھے میری تمام تر صحافتی سرگرمیوں سے نجات دلانے کا باعث ہوگی۔ ویسے بھی میں ان مصروفیات سے تنگ آ چکا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں سرینگر میں نیا مطبع قائم کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس فیصلے کی بنیادی وجہ تکنیکی کے علاوہ مالی بھی تھی۔ چھاپہ خانہ کو کامیابی سے چلانے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی وہ کشمیر میں دستیاب نہیں تھیں، مثلاً طباعت سے متعلقہ سیاہیاں، کاغذ اور روزمرہ استعمال کی سینکڑوں چیزیں۔ ان میں ہر چیز بیرون ملک سے درآمد کرنا پڑتی اور پھر اس پر کشمیر میں منگوانے کے الگ محصولات بھی ادا کرنا پڑتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مطبع کے لیے مستقل کارکنوں کے علاوہ ایک ماہر اور تجربہ کار مکینک کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے، ایسے تمام افراد کو میدانی علاقوں سے لانا پڑتا اور پھر ان کو سرینگر لانے اور یہاں ان کے قیام وطعام کے لیے زرکثیر صرف کرنا پڑتا۔ ان وجوہ کے باعث میں نے طوعاً وکرہاً یہ مطبع لاہور میں قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

بہت جلد محمد حسین بابری کے تعاون سے نئے چھاپہ خانہ کے لیے لاہور میں ایک موزوں جگہ مل گئی۔ دو بڑے اور روشن کمروں پر مشتمل یہ عمارت ایک بغلی سڑک پر واقع تھی۔ کرایہ بھی مناسب تھا اور وہاں ہر کوئی آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ بیرونی دیوار پر سائن بورڈ نصب کر دیا، جس پر سیاہ اور زرد حروف میں ''عرفات پریس'' لکھوایا گیا۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ ان دنوں میں اپنا الگ سے ماہنامہ نکالنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا، جس کا نام ''عرفات'' طے شدہ تھا، کیونکہ یہ مکہ کے اس میدان کی یاد دلاتا ہے، جہاں ہر سال لاکھوں حجاج کرام جمع ہوتے ہیں اور یہ مسلم امت کے اتحاد کی علامت ہے۔ ویسے بھی ہر مسلمان انفرادی طور پر ایسے اتحاد و یگانگت کو فروغ دینے کا پابند ہے۔ اس وقت میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ تقریباً دس سال بعد میری یہ امید برآئے گی اور ماہنامہ ''عرفات'' منصۂ شہود پر آ جائے گا۔ برسوں بعد ''عرفات'' نام کے رسائل وجرائد کا سیلاب امڈ آیا، لیکن میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ کسی رسالہ کا یہ نام سب سے پہلے میں نے ہی سوچا تھا۔[36]

اس دوران میں عرفات پریس کے قائم ہونے کے آثار بڑھتے گئے۔ ایک آنکھوں کو لبھانے والا خودکار پلیٹن پریس پہنچ گیا اور اسے نصب بھی کر دیا گیا۔ کمپوزنگ کے لیے جو تختے بنوائے گئے تھے، وہ سرینگر سے یہاں پہنچ گئے اور ٹائپ جوڑنے کے مخصوص ڈبے بھی نئے رومن اور عربی ٹائپ سے بھر دیئے گئے۔ ایک ماہر پرنٹر اور عبدالحق کی معاونت کے لیے ایک زائد کمپوزیٹر کی خدمات بھی حاصل کر لی گئیں۔ ایک نوجوان اینگلو انڈین طالب علم بھی انگریزی پروف خوانی کے لیے مل گیا۔ (عربی پروف میں خود پڑھتا تھا) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لاہور کے ایک معروف ناشر اور

Marfat.com

کتب فروش سے میرا باقاعدہ معاہدہ بھی طے پا گیا کہ آئندہ برسوں میں ''صحیح بخاری'' کی جتنی اقساط طبع ہوں گی، وہ ان کی تقسیم اور فروخت کا ذمہ دار ہوگا۔[37]

(10)

تقریباً دو ماہ میں لاہور اور سرینگر کے درمیان ہفتہ وار چکروں میں رہا۔ یہ انتہائی تکلیف دہ دور تھا، کیونکہ ہر بار آنے جانے میں تین دن ضائع ہو جاتے اور یوں ترجمہ شدہ مسودے کی ترتیب و تہذیب کے لیے مخصوص وقت نصف رہ جاتا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ زیادہ دیر کے لیے یہ نظام الاوقات قابل عمل نہیں ہوگا۔ مزید برآں میرے لیے ایک پولیس اہل کار وبال جان بن گیا تھا جو لاہور اور سرینگر کے میرے ان پھیروں میں سائے کی طرح میرا پیچھا کرتا تھا۔

جب سے میں سرینگر میں خاموشی سے رہائش پذیر تھا، میں اس ناگوار تجربے سے درگزر کرتا رہا۔ بظاہر مقتدر اصحاب کا خیال تھا کہ کشمیر میں میری موجودگی کم و بیش ان کے لیے ضرر رساں نہیں اور میں بھی دیگر سیاحوں کی طرح یہاں چھٹیاں گزارنے آیا ہوں، لیکن لاہور اور سرینگر کے میرے لگاتار چکروں نے ان کے شکوک و شبہات کو دوبارہ زندہ کر دیا اور انہوں نے پھر سے ویسی ہی کارروائی شروع کر دی، جو وہ میرے مولانا عبداللہ قصوری کے گھر قیام کے دوران میں کیا کرتے تھے یعنی جب بھی میں اپنی گردن گھماتا یا باہر کہیں گھوم پھر رہا ہوتا، خفیہ پولیس کا کوئی نہ کوئی شخص کچھ فاصلے پر کھڑا نظر آتا۔[38]

ایک دفعہ مجھے مدراس کا سفر کرنا پڑا۔ مجھے وہاں ایک لیکچر کی دعوت دی گئی تھی۔ اس دوران میں یہ ''سائے'' میرا تعاقب کرتے رہے (وہ تبدیل ہوتے رہتے تھے، کیونکہ سی آئی ڈی والے یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح میں انہیں پہچان نہیں سکوں گا)۔ واپس چلتے ہوئے یہ خیال آیا کہ چند روز دہلی میں ٹھہروں اور اپنے احباب سے ملتا چلوں، لیکن تین روزہ سفر میں مجھے اندازہ ہوا کہ ان میل ملاقاتوں میں میرا خاصا وقت ضائع ہوگا، اس لیے میں نے دہلی ٹھہرنے کے بجائے سیدھا لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے بھی مجھے گاڑی بدلنے کے لیے دہلی ٹھہرنا تھا۔ میں نے ٹکٹ بھی دہلی تک کا خریدا تھا۔ ٹکٹ کلکٹر نے مجھے یہ بتا کر پریشان کر دیا کہ میری گاڑی کے دہلی پہنچنے اور لاہور کے لیے گاڑی روانہ ہونے میں صرف دس منٹ کا فرق ہے۔

جونہی گاڑی دہلی کے ریلوے سٹیشن پر رکی، میں جلدی سے اترا اور کسی قلی کو ڈھونڈنے بے صبری سے پلیٹ فارم پر نظر دوڑائی تو میں نے اپنے سابقہ تجربے کے سبب اپنے ''سائے'' کو فوراً پہچان لیا۔ میرے آواز دینے پر وہ رکا اور قدرے تعجب سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا ''کیا تمہارا تعلق سی آئی ڈی سے ہے؟ کیا تم میرا پیچھا کر رہے ہو؟'' اس نے گھبراہٹ میں ہکلاتے ہوئے جواب دیا ''صاحب! مجھے معاف کر دیجیے، میں تو اپنا فرض نباہ رہا ہوں۔'' میں نے اس کی معذرت پر دھیان دیئے بغیر اسے جلدی جلدی بتایا کہ ''مجھے لاہور کے لیے گاڑی پکڑنا ہے اور ٹکٹ بھی خریدنا ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ کیا تم لاہور والی گاڑی کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں میرا سامان رکھوا دو گے۔''

Marfat.com

اس نے کہا ”ہاں جناب! ضرور رکھوا دوں گا۔“

میں پلیٹ فارم پر دوڑتا ہوا ٹکٹ گھر پہنچا۔ ٹکٹ لے کر ہانپتا ہوا واپس آیا تو لاہور جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ سیکنڈ کلاس کے خالی ڈبے کے سامنے سی آئی ڈی کا کارندہ میرا منتظر تھا۔ ہم دونوں جونہی کود کر ڈبے میں داخل ہوئے، گاڑی چل پڑی۔ میرا سوٹ کیس پہلے سے اوپر ریک میں رکھ دیا گیا تھا اور بڑے سلیقے سے میرا بستر بھی بچھا ہوا تھا۔ یوں ریل کے ڈبے میں میرے بسہولت سفر کا اہتمام کیا گیا۔ یہی نہیں، بلکہ میرے ”فرض شناس پیروکار“ نے کاغذی کپ میں گرم گرم چائے بھی پیش کی، جو وہ چند منٹ قبل اسٹیشن ہی سے خرید کر لایا تھا۔ یوں ہم اکٹھے بیٹھے گپ شپ لگاتے رہے کہ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو میرا ”سایہ“ مجھے اکیلا چھوڑ کر تیسرے درجے کے ڈبے میں جا بیٹھا۔

ممکن ہے، ایسا دل خوش کن واقعہ کبھی کبھار وقوع پذیر ہوتا ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سی آئی ڈی کے عملے کی اس مسلسل نگہداشت سے میرا ناک میں دم آ چکا تھا اور میں روز روز کے اس جھنجھٹ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا، بشرطیکہ ایسا ممکن ہوتا۔ بالآخر میں نے اپنے دوست اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ سکندر حیات خاں[39] سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا تو انہوں نے وزارت داخلہ (دہلی) کے نام ایک تعارفی خط دیا۔ تقریباً دو ہفتوں بعد دہلی گیا اور نائب سیکرٹری داخلہ سے ملا۔ وہ انگریز تھا اور سی آئی ڈی کا محکمہ اسی کی ماتحتی میں تھا۔ میں نے اسے اپنی پریشانی بتائی اور وضاحت کی کہ میرے دیگر تحفظات کے علی الرغم یہ بے تکی سی بات ہے کہ خفیہ پولیس کا ایک سپاہی میرے پیچھے لگا رہے، جسے پہچاننے میں مجھے ذرہ بھر تامل نہیں ہوتا۔ ”کیونکہ میں جب چاہوں‘ خود کو اس کی نگہداشت سے بآسانی بچا سکتا ہوں۔ میں کسی بھی دوست کے گھر کے سامنے کے دروازے سے داخل ہو کر پچھلے دروازے سے باہر نکل سکتا ہوں اور یوں میرا ”سایہ“ قیامت تک اسی گھر کے سامنے کھڑا میرا انتظار کرتا رہے گا۔“

اس نائب سیکرٹری نے جھنجھلاہٹ سے طنزیہ لہجے میں جواب دیا ”آپ درست کہتے ہیں، لیکن آپ کو ان کم تنخواہ پانے والے سپاہیوں کا اپنے چاک و چوبند گسٹاپو کے ایجنٹوں سے موازنہ نہیں کرنا چاہیے۔“ میں نے جواباً عرض کیا ”کیا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میرے جیسا ایک یہودی النسل شخص شاید ہی نازیوں کے موجودہ سیاسی کھیل کا حصہ بن سکے۔ معلوم نہیں‘ آپ کس چیز سے خوفزدہ ہیں؟“ یونہی سوال و جواب کا سلسلہ چلتا رہا، بالآخر انگریز افسر نے مسکراتے ہوئے آپس میں ”شریفانہ معاہدہ“ کی تجویز پیش کی ”اگر آپ لاہور سے باہر جانے سے قبل ہمیں زبانی یا تحریراً اطلاع دینے کا وعدہ کریں تو ہم اس مسلسل نگرانی کو ختم کر دیں گے۔“ میں نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور یوں اس دن سے مجھے اپنے ان ”متعاقبین“ سے نجات حاصل ہو گئی۔

(11)

1936ء کے اواخر تک یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی کہ نازی حکومت ”ناپسندیدہ افراد“ کو

Marfat.com

جرمنی سے دیس نکالا دینے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کرنے کا تہیہ کیے بیٹھی ہے اور ان کا پہلا ہدف یہودی ہوں گے۔ میں اپنے والد، ہمشیرہ اور سوتیلی والدہ اور ویانا میں مقیم اس کے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھا۔ ہٹلر کے توسیع پسندانہ عزائم کے پیش نظر آسٹریا محفوظ ملک نہیں تھا، اس لیے میں اپنے ان قریبی اعزہ کو کسی محفوظ جگہ بھجوانا چاہتا تھا۔ جب سے میں نے اسلام قبول کیا تھا، میرے والد نے مجھے خط تک نہیں لکھا تھا، لیکن میری ہمشیرہ نے جو اس دوران میں قانون کی سند حاصل کر کے اپنے والد کی وکالت میں ہاتھ بٹا رہی تھی، مجھ سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا اور گاہے بگاہے مجھے خط لکھتی رہتی تھی۔ میں نے اپنی بہن اور اس کے توسط سے والد کو آمادہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ وہ آسٹریا چھوڑ کر میرے پاس ہندوستان آجائیں۔ ابتدا میں میرے والد نہیں مانتے تھے، لیکن جب انہیں یقین ہو گیا کہ میری تبدیلیٔ مذہب نے ان کے ساتھ میری فطری محبت کو ذرہ بھر متاثر نہیں کیا، تو پدری شفقت نے ان کے درشت رویے میں نرمی پیدا کر دی اور وہ مجھے خط لکھنے لگے۔ میرے اصرار کے باوجود وہ میرے اس خدشے کو ہمیشہ رد کر دیتے تھے کہ آسٹریا کو نازی ازم سے کوئی خطرہ لاحق ہے اور وہ اپنی آزادی سے دستبردار ہونے اور اپنے گھر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنے کے متعلق سوچنے کے بھی قائل نہیں تھے۔ امتداد زمانہ کے باعث میری پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔[40]

جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا، میں تو اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ سرینگر میں میرا استقلال رہنا ممکن نہیں۔ ''صحیح بخاری'' کے مسودات کی طباعت اور ''اسلامک کلچر'' کے ادارتی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے لاہور ہی موزوں جگہ ہے، چنانچہ میں نے وہیں نقل مکانی کے لیے رخت سفر باندھنا شروع کر دیا۔

(12)

ایک سال قبل یعنی 1935ء میں میری ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی، جو میرے محبوب ترین دوستوں میں شمار ہوتا ہے اور یہ پُر خلوص دوستی اس کی وفات تک جوں کی توں قائم رہی۔ میرے اس عزیز دوست کا نام چودھری نیاز علی تھا، جنہوں نے چورانوے سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے محکمہ آبپاشی میں انجینئر تھے۔ برسوں حکومت پنجاب میں ملازم رہے اور اس عرصے میں وہ نہریں بنوانے اور صوبے کے آبپاشی نظام کو مقدور بھر ترقی دینے میں کوشاں رہے۔ جب میری ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو وہ اپنی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر پٹھانکوٹ کے قریب جمال پور میں اپنی وسیع زرعی اراضی کو ترقی دینے میں شبانہ روز محنت کر رہے تھے۔ وہ پھلوں کی کاشت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ترش پھلوں کی شجرکاری اور ان کی دیکھ بھال میں پنجاب بھر میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ علاوہ ازیں انہوں نے کئی نئے بدیسی پھلوں (مثلاً ایچی، کیوی اور خرمالو) کو بڑی کامیابی سے اپنے علاقے میں متعارف کرایا اور یوں دوسرے کاشتکاروں کے لیے بڑی مارکیٹوں کے دروازے کھول دیئے۔ اپنی ان پیشہ وارانہ مصروفیات کے علاوہ انہیں تبلیغ اسلام اور فکر اسلامی کی نشر و اشاعت سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اس مقصد کے لیے انہوں

Marfat.com

نے ''دارالقرآن'' کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا اور اپنی جاگیر کی متعدد عمارتیں اس ادارے کو وقف کر دیں۔ انہی وقف کردہ عمارات میں ان کی اپنی وسیع و عریض قلعہ نما رہائش گاہ بھی شامل تھی جو پختہ اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھی اور اس کے گرد بڑا سا صحن چھوڑا گیا تھا۔

جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی، ان کی عمر پچپن سال کے لگ بھگ ہوگی۔ کوتاہ قامت، ٹھنٹھ سے، نسبتاً کم عمری کے باوجود سر کے بال برف جیسے سفید، پُرجوش اور ہمیشہ نت نئی راہیں تلاش کرنے کی دھن میں رہتے تھے۔ جونہی انہیں پتہ چلا کہ میں سرینگر چھوڑنے اور لاہور کے قریب کسی جگہ ڈیرہ جمانے کا ارادہ رکھتا ہوں، انہوں نے مجھے جمال پور منتقل ہونے کی صلاح دی اور یہ بھی تجویز پیش کی کہ میں ان کے گھر کے پہلو میں اپنا الگ سے گھر بنالوں اور اس کے گرد ایک خوبصورت پھلوں کا باغ لگالوں۔

چودھری نیاز علی نے جس خلوص اور محبت سے یہ پیشکش کی، اس نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ میں نے سنجیدگی سے اسے قبول کرنے کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا، کیونکہ جمال پور، لاہور سے زیادہ دور نہیں تھا، لیکن چودھری صاحب کی تجویز میں صرف ایک کمی تھی اور وہ تھی جمال پور کی آب وہوا، جو لاہور کی نسبت قدرے کم معتدل تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں موسم گرما میں وہاں کام نہیں کر سکوں گا اور یوں سال کا دوتہائی حصہ ضائع ہو جائے گا۔ ''صحیح بخاری'' پر مجھے ابھی برسوں کام کرنا تھا، اس لیے میں نے چودھری نیاز علی صاحب سے مستقل طور پر جمال پور نقل مکانی کرنے سے معذرت کرلی، باوجودیکہ میں قلبی طور پر وہیں کھچا چلا جا رہا تھا۔[41]

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے سرینگر سے ایبٹ آباد منتقلی کا فیصلہ کرلیا۔ یہ چھوٹا سا شہر شمال مغربی سرحدی صوبہ کے ضلع ہزارہ میں واقع ہے۔ سطح سمندر سے چار ہزار فٹ بلند وادی پر واقع ہونے کے باعث اس کی آب و ہوا خاصی معتدل ہے، لیکن اس شہر کو بطور مستقل اقامت گاہ منتخب کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ایبٹ آباد اس شہر سے نزدیک تھا، جہاں عرفات پریس قائم کیا گیا تھا۔ بذریعہ کار یہاں سے پانچ یا چھ گھنٹوں میں لاہور پہنچا جا سکتا تھا اور اس طرح ہر ہفتے میرے آنے جانے میں جو تین دن ضائع ہو جاتے تھے، ان میں خاصی کمی ہو جائے گی۔

بالآخر چودھری نیاز علی نے بہ دل نخواستہ میرے فیصلہ پر آمنا صدقنا کہہ دیا اور میں کشمیر جنت نظیر جیسی پسندیدہ سرزمین سے نقل مکانی کر کے اپنے اثاث البیت سمیت ایبٹ آباد پہنچ گیا۔

یہاں ہمارا گھر سرینگر والے گھر سے چھوٹا تھا۔ یہاں کوئی میر واعظ بھی نہیں تھا جو ہمیں پُرتکلف ضیافت پر اپنے گھر بلائے اور کبھی کبھار ہمیں بھی میزبانی کا شرف بخشے۔ کوئی ایسا کشمیری دکاندار بھی نہیں تھا، جو ہماری سبز چائے سے تواضع کرے یا بندوقوں اور بادشاہوں کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔ ایبٹ آباد ایک چھوٹا سا صوبائی شہر تھا اور یہاں بمشکل کسی سے گفتگو کا موقع ملتا تھا۔ اگر آپ شمال مشرق میں واقع کوہ سیاہ کی جانب سے آنے والے کارواں کے ساتھ آئے ہیں اور پشاور اور راولپنڈی جا کر کھالیں اور اُن بُنے قالین فروخت کرنے کے لیے اٹھائے پھر رہے ہیں، تو پھر شاید آپ سے کوئی بات چیت کرے۔ شہر سے باہر چاروں طرف تاحد نظر مکئی کے کھیت پھیلے ہوئے تھے،

Marfat.com

ان میں گیدڑ آزادانہ گھومتے پھرتے اور تمام رات چیختے چلاتے رہتے تھے۔

بظاہر یہاں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی، جو آپ کے دامنِ دل کو کھینچ سکے، البتہ ایبٹ آباد کام کرنے کے لیے مناسب ترین جگہ تھی۔ یہاں میں نے دلجمعی سے کام کیا۔ "صحیح بخاری" کا دوسرا حصہ طبع ہو گیا۔ تیسرے اور چوتھے حصے کے مسودات مکمل کر لیے گئے اور پانچواں حصہ تکمیل کے آخری مرحلہ تک پہنچ گیا۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

باب پنجم

خنک سال
(1938ء-1945ء)

(1)

جب بھی میں لاہور آتا، ڈاکٹر محمد اقبال سے ملنے ضرور جاتا۔ ان ملاقاتوں میں پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے امکانات پر گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ ہم دونوں اس نئی اسلامی مملکت کے قیام کے پُر جوش حامی تھے۔ اقبال ان مسائل سے کما حقہٗ آگاہ تھے، جن سے اس نوزائیدہ ملک کو نبرد آزما ہونا تھا۔ اقبال اپنے ایام جوانی میں اور حصول تعلیم کے زمانہ میں ایک جوشیلے قوم پرست جیسے جذبات رکھتے تھے۔ اس دور میں انہوں نے ''ہندوستان ہمارا'' جیسی جوشیلی نظم قلمبند کی تھی، جو اس وقت سے اب تک مقبول قومی ترانہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اسی اثنا میں اقبال اپنے قوم پرستانہ تصورات سے کنارہ کش ہو گئے اور ماورائے قومیت پر مبنی امت مسلمہ کے تصور کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ بعد میں ان کا یہی شدید جذبہ پاکستان کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ کیونکہ میرے ذاتی نظریات اور رجحانات بھی یکساں تھے، اس لیے ہم دیر تک ایسے لائحہ عمل پر گفتگو کرتے رہتے، جو مستقبل میں قائم ہونے والی اس مملکت کے انتظام وانصرام کے لیے ضروری سمجھے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے مابین یہ موضوع بھی زیر بحث رہتا تھا کہ کس طرح اپنے سیاسی رہنماؤں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ کھل کر مشترکہ مؤقف کی حمایت کریں۔ میں نے بہت سے ایسے مضامین سپرد قلم کیے جن میں یہ صراحت کی گئی کہ پاکستان کیوں ناگزیر ہے۔ میری یہ تمام تحریریں یورپ کے مختلف رسائل واخبارات میں شائع ہوئیں۔ ان میں سے بعض کا اردو ترجمہ لاہور کے ایک مقبول روزنامہ میں بھی شائع ہوا[42]۔ علاوہ ازیں میں نے اس موضوع پر لاہور اور دہلی کے علمی اجتماعات میں کئی لیکچر بھی دیئے۔

ان دنوں یعنی 1938ء میں اقبال کی صحت تیزی سے بگڑنا شروع ہوگئی۔ ایک روز میں اپنے پریس میں بیٹھا پروف خوانی کر رہا تھا کہ اچانک میرا ایک دوست دوڑتا ہوا آیا اور مجھے اقبال کے انتقال کی پُر ملال کی خبر سنائی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ دل ہلا دینے والی اس خبر نے میرے جذبات واحساسات پر کتنا گہرا اثر کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے میرے گرد تاریکی کے بادل چھا گئے ہیں۔

Marfat.com

جب میں اقبال منزل پہنچا، تو وہاں اقبال کے شیدائیوں کی کثیر تعداد پہلے سے موجود تھی۔ ہم میں سے کسی کو اقبال کی اس دائمی مفارقت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہم سب اُن کے بستر مرگ کے قریب خاموش کھڑے تھے۔

اقبال آنکھیں موندے بستر پر سیدھے لیٹے تھے۔ ان کے چہرے پر مکمل آسودگی کے آثار نمایاں تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری فکر میں غلطاں ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا اور مجھے ذاتی طور پر یوں لگا جیسے وہ کسی وقت بھی اپنی آنکھیں کھولیں گے اور کہیں گے کہ "میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔" اقبال پہلے شخص ہیں، جنہوں نے غیر مبہم سیاسی اصطلاحات میں شمالی ہند میں پاکستان کے نام سے ایک علیحدہ مسلم ریاست کا تصور پیش کیا اور پھر عمر بھر اپنے ہی بنائے ہوئے اس خاکے میں رنگ بھرتے رہے۔ ممکن ہے، ان کے اس تصور پر عظیم مسلمان مفکر جمال الدین افغانی کے بعض سیاسی تصورات کا اثر پڑا ہو۔ اقبال ہی وہ شخص ہیں، جنہوں نے بالواسطہ یا بلا واسطہ کیمبرج کے نوجوان طالب علم چودھری رحمت علی کو تحریک دی کہ وہ ان کے اس نظریے کو کاغذ پر منتقل کریں اور آئندہ قائم ہونے والی اسلامی ریاست کے لیے لفظ "پاکستان" تجویز کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال پوری دنیا میں "پاکستان کا باپ" کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

اقبال کا جنازہ اثر انگیز تھا۔ لاہور میں شاید ہی ایسا غم انگیز منظر دیکھنے میں آیا ہو۔ ان کے تابوت کو بڑے بڑے بانسوں سے مضبوطی سے باندھا گیا تھا اور انہیں چالیس افراد (دونوں جانب سے بیس بیس) نے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ کندھا دینے والے یہ لوگ وقفے وقفے سے تبدیل ہو جاتے تھے، کیونکہ ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ وہ اقبال کے اس سفر آخرت میں ان کے تابوت کو کندھا دینے کا اعزاز حاصل کر سکے۔ تقریباً دو لاکھ افراد یعنی لاہور کی کم و بیش تمام مردانہ آبادی اقبال کے جنازے کے ساتھ چل رہی تھی۔ ان کے گھر سے بادشاہی مسجد، جس کے بڑے دروازے کے قریب انہیں دفن کرنا تھا، کا فاصلہ تقریباً ایک میل تھا۔ تنگ راستوں سے گزرتا ہوا یہ سوگوار انبوہ کثیر کئی گھنٹوں پیدل چلنے کے بعد وہاں تک پہنچا۔ بادشاہی مسجد اور قلعہ لاہور کے درمیان ایک وسیع جگہ پر اقبال کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ چند ماہ بعد یہاں ایک پختہ مقبرہ تعمیر کر دیا گیا۔ 43

(2)

کچھ وقت گزرنے کے بعد یورپ سے ایک منحوس خبر سنائی دی اور وہ یہ کہ ہٹلر نے آسٹریا پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ اس واقعہ سے جو خطرناک تباہی ہونا تھی، وہ ہر کوئی طبعی طور پر محسوس کر سکتا تھا۔

اپنے والد، بہن اور سوتیلی والدہ کو ویانا سے ہندوستان بلانے کی میری خواہش مایوسی کا شکار ہو چکی تھی۔ اب میرے والد بھی اپنا ملک چھوڑنے پر رضامند ہو چکے تھے۔ ہزاروں پناہ گزین، جن میں اکثریت یہودیوں کی تھی، جرمنی سے ہجرت کر رہے تھے۔ اندریں حالات میرے ان اعزہ کے لیے دوسرے ممالک کا ویزا حاصل کرنا انتہائی مشکل تھا۔ ہندوستان کا ویزا تو ویسے بھی ناقابل حصول تھا کیونکہ یہاں کی سیاسی صورت حال لحہ بہ لحہ تبدیل ہوتی رہتی تھی۔

Marfat.com

حسبِ معمول میرے احباب نے میری اس پریشانی کو دور کرنے کی غرض سے دستِ تعاون بڑھایا۔ ان میں ایک جسٹس دین محمد تھے جو ان دنوں پنجاب ہائی کورٹ میں چیف جسٹس کے اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے 44۔ انہوں نے مجھے ایک خط پیش کیا جس میں یہ مرقوم تھا کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کی نگہداشت کے لیے میری بہن کی خدمات بطور ''آیا'' حاصل کی ہیں۔ اس خط پر ہائی کورٹ کی مہر ثبت تھی اور میری بہن کو پورا یقین تھا کہ اس خط کے مندرجات کی بدولت وہ ویانا کے برطانوی قونصل خانے سے ویزا حاصل کر لیں گی۔ میں نے فوراً یہ خط اپنی بہن کو ارسال کر دیا۔ والد کے لیے ایسے مصنوعی ''تقرر'' کی دستاویز قابلِ عمل نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے اعلیٰ منصب پر فائز ہر واقف کار سے مسلسل رابطے کیے کہ وہ میری مساعی کو کامیاب بنانے میں میری اعانت کریں۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار سکندر حیات نے بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے ذاتی طور پر سیکرٹری داخلہ (نئی دہلی) سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ وہ ذاتی طور پر ممنون ہوں گے، اگر میرے والد اور میری سوتیلی والدہ کو اپنا ملک چھوڑنے کا ویزا دے دیا جائے اور بذریعہ ٹیلی گرام ویانا میں برطانوی سفارت خانے کو بھی اس سے مطلع کر دیا جائے۔

میں نے فوراً والد کو خط لکھا اور ان کو تاکید کی کہ وہ برطانوی سفارت خانہ جا کر اپنا اور اپنی بیوی کے پاسپورٹ پر ویزا لگوائیں اور آسٹریا سے ہجرت کرنے میں تاخیر نہ کریں۔ چند روز بعد میری بہن کا خط موصول ہوا، جس نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ اس میں اطلاع دی گئی تھی کہ چیف جسٹس کا ''مراسلہ تقرر'' کہیں گم ہو گیا ہے۔ میرے لیے یہ خبر پروانۂ مرگ سے کم نہ تھی۔

اسی روز میں نے اپنے دوست چیف جسٹس سے ان کے خط کی نقل لے کر بذریعہ ایکسپریس ڈاک ویانا بھجوا دی اور ساتھ ہی والد صاحب کو ٹیلی گرام دی کہ وہ اس ''مراسلہ تقرر'' کے پہنچنے کا انتظار نہ کریں اور فوراً اٹلی پہنچ کر میری بہن کا انتظار کریں، جو ویزا لگواتے ہی وہاں چلی آئے گی۔ والد صاحب کو بذریعہ ٹیلی گرام اپنے حتمی فیصلے سے مطلع کیا کہ وہ اپنی بیٹی کو لیے بغیر ویانا نہیں چھوڑیں گے۔

یہ مراسلت اگست 1939ء کے اواخر میں ہوئی۔ چند روز بعد دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ ویانا میں برطانوی سفارت خانہ اور قونصلیٹ بند ہو گیا اور وہاں سے ویزوں کا حصول ناممکن ہو گیا۔ یہاں مجھے بھی میرے آسٹرین پاسپورٹ کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا اور ایک ''غیر ملکی دشمن'' کی حیثیت سے نظر بند کر دیا گیا۔

میں مطالعہ گاہ میں بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا کہ اچانک ایک باوردی پولیس انسپکٹر آ دھمکا اور میری گرفتاری کا وارنٹ دکھایا۔ میں اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا، کیونکہ نازیوں کے خلاف میرا موقف واضح تھا اور میرے لیے یہ واقعہ قطعی طور پر غیر متوقع تھا۔ انسپکٹر نے مجھے ایک مطبوعہ فہرست دکھائی جو ظاہر ہے ہفتوں پہلے تیار ہوئی ہوگی۔ اس فہرست میں سب سے اوپر میرا نام موجود تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں پولیس انسپکٹر کے ہمراہ چل دیا۔ جب میں گھر سے باہر نکل رہا تھا، میری بیوی اور سات سالہ بیٹا طلال روتے ہوئے بآوازِ بلند احتجاج کر رہے تھے۔ بوڑھے ملازم نے میرے سر پر قرآن رکھتے ہوئے میری سلامتی اور بخیریت واپسی کی دعا کی۔ مجھے منیر کو صرف اتنا بتانے کی مہلت دی گئی کہ وہ فوراً

Marfat.com

چودھری نیاز علی کو یہ ساری صورت حال سے آگاہ کر دے اور پھر جمال پوران کے پاس چلی جائے۔ انسپکٹر نے قدرے نرم لیکن تحکمانہ لہجے میں اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔

(3)

پولیس کی گاڑی میرے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ راولپنڈی پہنچے اور مجھے پولیس ہیڈ کوارٹرز لے جایا گیا، جہاں کچھ ''جنگی قیدی'' پہلے سے موجود تھے۔ ان تمام لوگوں کے پاس جرمن یا آسٹرین پاسپورٹ تھے۔ مجھے ان کے ساتھ قطار میں کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔ یہاں ان گرفتار شدگان کے ناموں کا اندراج ہو رہا تھا۔ اپنی باری آنے پر میں بھی اس کمرے میں داخل ہونے ہی والا تھا، جس میں پولیس سپرنٹنڈنٹ اندراجات کر رہا تھا کہ میرے جوتے کے تسمے ڈھیلے ہو گئے۔ یہ سوچ کر کہ قطار بے ترتیب نہ ہو جائے، میں نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے آدمی کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور خود جھک کر تسموں کو دوبارہ مضبوطی سے باندھ لیا۔ اگر یہ رکاوٹ پیش نہ آتی تو میرا نمبر 621 ہوتا، جو اب میرے پچھلے شخص کو مل گیا، جبکہ مجھے اس سے اگلا نمبر یعنی 622 دیا گیا۔ اس وقت میرے لیے نمبروں کی یہ تبدیلی معمول کی کارروائی سے سوا کچھ نہ تھی، لیکن کئی ماہ بعد احمد نگر کے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں جہاں ہزاروں غیر مسلموں میں میں اکیلا مسلمان تھا، میرا ایک نظر بند دوست اور ویانا کے مصور لانگ ہامر (Langhammer) بوقت حاضری میرا نمبر 622 سنتے ہی اچانک بول اٹھا ''اسد! کیا تمہیں اس نمبر کی اہمیت معلوم نہیں؟ یہ ہجرت کا سال ہے، جب تمہارے رسولؐ مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے تھے، کتنی حیرت کی بات ہے کہ ہم میں صرف ایک ہی جنگی قیدی مسلمان ہے اور اسے یہی نمبر دیا گیا ہے۔''

اس وقت مجھے یاد آیا کہ اگر میرے تسمے ڈھیلے نہ ہو جاتے تو مجھے 621 ہی نمبر ملتا۔ کیا یہ پروردگار کے عظیم احسان کی علامت نہیں کہ بطور نظر بند مجھے وہ نمبر عطا ہوا، جو تاریخ اسلام میں ایک اہم موڑ قرار دیا جاتا ہے۔

بلاشبہ یہ ایک حوصلہ افزا علامت تھی اور میں اس کی سخت ضرورت محسوس کر رہا تھا، کیونکہ جب سے مجھے ایبٹ آباد سے گرفتار کر کے نظر بندوں کے کیمپ میں لایا گیا، میں خود کو اندھیروں میں بھٹکتا ہوا مسافر سمجھنے لگا تھا، لیکن اس واقعہ کے بعد مایوسیوں کے بادل چھٹ گئے اور میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میری نظر بندی کی مدت طویل ہے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ میں اپنے والد، بہن اور سوتیلی والدہ کو اس بات پر آمادہ کرنے میں ناکام رہا کہ وہ آسٹریا سے کوچ کر جائیں، ورنہ وہ سب ہلاک کر دیئے جائیں گے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا، جیسا میں سوچ رہا تھا۔ برسوں بعد ریڈ کراس کے توسط سے معلوم ہوا کہ میرے والد تریسین شٹٹ (Theresienstadt) کے نظر بندوں کے کیمپ میں 1941ء یا 1942ء میں (عمر ستر سال) فوت ہو گئے اور میری بہن اور سوتیلی ماں کسی نامعلوم تاریخ کو اوش وتس (Auschwitz) کے گیس چیمبر میں سسک سسک کر دم توڑ گئیں۔ صرف میرا سوتیلا بھائی مارٹن گرفتار ہونے سے بچ گیا اور آسٹریا سے نکل گیا۔ بعد میں وہ برطانوی فوج میں ملازم ہو گیا اور اب انگلستان میں

Marfat.com

پُرسکون زندگی گزار رہا ہے۔

(4)

اب تک نظر بندوں کی تعداد سات سو تک پہنچ گئی تھی۔ ان سب کو ایک خصوصی ٹرین میں بٹھا کر راولپنڈی کے عارضی کیمپ سے بمبئی کے قریب احمد نگر کے مستقل کیمپ میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ ان میں اکثریت جرمنوں کی تھی اور اطالویوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ہم تین دن اور دو راتیں سفر میں رہے۔ تیسرے درجے کے مقفل ڈبوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مھکے ہوئے بیٹھے تھے۔ ہر ڈبے میں دو مسلح محافظ یوں بندوقیں تانے کھڑے تھے، جیسے ہم جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ گاڑی مختلف اسٹیشنوں پر رکتی ہوئی آگے بڑھتی رہی، کہیں ایک گھنٹہ سے بھی زیادہ ٹھہرتی اور بعض اسٹیشنوں پر ہمیں فوجی طرز کا کھانا دیا جاتا یعنی روٹی کے ساتھ سبزیوں کا گاڑھا سوپ جو ایک بڑے کڑھاؤ میں سے بڑے چمچوں کے ذریعے نکال کر چھوٹے برتنوں میں ڈال دیا جاتا۔ ہر اسٹیشن پر مقامی لوگ بڑے تجسس کے ساتھ ہمیں یوں گھورتے جیسے ہم خطرناک مجرم ہیں۔ جہاں گاڑی رکتی، پولیس گارڈ اپنی بندوقیں تانے ہر ڈبے کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے۔ دوران سفر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ دن رات سخت بنچوں پر بیٹھے رہنے سے ہم تھک کر چُور چُور ہو گئے تھے۔ اتنی جگہ ہی نہیں تھی کہ کمر سیدھی کر سکتے یا دو چار قدم سے زیادہ چل سکتے۔

احمد نگر کے جس علاقے میں کیمپ قائم کیا گیا، کسی زمانے میں وہ فوجی تنصیبات کے لیے مخصوص تھا۔ اس کیمپ کے چاروں طرف آہنی تاروں کی اونچی اور مضبوط دوہری باڑھ لگائی گئی تھی۔ پچاس میٹر کے فاصلے پر پہرے کے لیے لکڑی کی برجیاں بنائی گئی تھیں، جن میں ہندوستانی سپاہی اسلحہ سمیت کھڑے ہوتے۔ ہر بیرک میں ساٹھ یا ستر لوہے کے پلنگ، جن پر سخت گدے رکھے تھے۔ ایک ہندوستانی باورچی اپنے دو معاونین کے ساتھ تین بیرکوں کے قیدیوں کے لیے کھانا تیار کرتا۔ ہمیں جو نقد رقم دی جاتی، وہ روزمرہ کے مصارف اور باورچی خانہ کے اخراجات پر خرچ ہو جاتی۔ یہاں صرف یہ آزادی حاصل تھی کہ ہم اس بجٹ میں جو چاہیں کھانا پکوا سکتے تھے، چنانچہ ہر بیرک کے مکینوں نے تین یا چار افراد کی ایک منتخب کمیٹی بنا رکھی تھی، جو باورچی خانہ کے سبھی معاملات کی نگرانی کرتی تھی۔

ان دنوں احمد نگر کے کیمپ میں نظر بندوں کی تعداد تین ہزار کے قریب تھی، جو نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان اور انڈونیشیا سے یہاں لائے گئے تھے۔ ان میں بیشتر جرمنی اور اطالوی کثیر القومی کمپنیوں مثلاً سیمنز، اگفا، بائیر یا فیٹ کے نمائندے تھے اور یہ سب نازی تھے یا فاشسٹ۔ ہم میں سے تقریباً ایک سو کے لگ بھگ قیدی نازیوں اور فاشسٹوں کے مخالف تھے، جو آپس میں مل جل کر، لیکن دوسروں سے الگ تھلگ رہتے۔ ہمارے گروپ کے زیادہ تر افراد جرمنی اور آسٹریا سے تعلق رکھنے والے پناہ گزین تھے، لیکن جرمنوں اور اطالویوں کی خاصی بڑی تعداد غیر یہودی سوشلسٹوں اور آزاد خیال لوگوں پر مشتمل تھی، جنہوں نے اپنے آبائی ملک سے مہاجرت کو ضروری سمجھا۔ کیمپ کے ایک کونے کی دو بیرکوں میں ہم لوگ ہی اقامت پذیر تھے۔

Marfat.com

ہماری آمد کے فوراً بعد ہمیں روزمرہ کے معمولات سے آگاہ کر دیا گیا، جن پر ہم نے پابندی سے عمل درآمد کرنا تھا۔علی الصبح چھ بجے بگل بجتے ہی ہم اٹھ جاتے۔ نہانے دھونے اور کپڑے تبدیل کرنے کے لیے پندرہ منٹ دیئے جاتے اور پھر روزانہ حاضری کے لیے ایک جگہ اکٹھے ہوتے تھے۔ ہر ایک کا نمبر بولا جاتا اور وہ جواباً اونچی آواز سے اپنی موجودگی کا ثبوت دیتا۔اس کے بعد ایک فوجی سارجنٹ ہماری جسمانی صحت مندی کے لیے مختلف مشقیں کراتا اور پھر ہم رات نو بجے تک اپنی مرضی کے مالک ہوتے تھے اور جیسے چاہتے اپنا وقت گزارتے۔ جونہی دوبارہ بگل بجتا، ہم اپنی بیرکوں میں واپس چلے جاتے۔ایک گھنٹے بعد آخری اعلان کیا جاتا اور اس کے ساتھ ہی بتیاں بجھادی جاتیں۔

روزمرہ کے یہی معمولات دنوں نہیں بلکہ مہینوں جاری رہے۔ یہاں میرے پاس ایسی کتابیں دستیاب نہیں تھیں، جو ''صحیح بخاری'' کے میرے منصوبے میں مفید ثابت ہوتیں۔ ویسے بھی ستر آدمیوں سے بھری ہوئی بیرک میں کوئی ڈھب کا کام کرنا ممکن نہیں تھا۔

پت جھڑ کے بعد موسم سرما شروع ہو گیا۔ بیرونی دنیا میں ''مصنوعی جنگ'' زوروں پر تھی۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا ابتدائی دور تھا اور دونوں فریق کسی سنجیدہ لڑائی جھگڑے کے بغیر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ساز باز کر رہے تھے۔ ہمیں پڑھنے کو اخبار دیئے جاتے جو فرداً فرداً پڑھے جاتے اور پھر مختلف موضوعات پر گرما گرم بحثیں چلتیں۔ میرے بہت سے ساتھی قیدیوں کو یقین تھا کہ جنگ بہت جلد ختم ہو جائے گی اور وہ مستقبل کے منصوبے بناتے رہتے۔ میں اس قدر رجائیت پسند نہیں تھا۔ مجھے کامل یقین تھا کہ میرے ایام اسیری خاصے طویل ہوں گے اور جب میں یہ سوچتا کہ جن متحارب قوتوں سے مجھے ہمدردی ہے اور انہوں نے ہی مجھے نظر بند کر رکھا ہے، تو میرا یہ یقین مزید پختہ ہو جاتا۔اس کے برعکس میرے نازی ساتھیوں کو یہ علم تھا کہ انہیں قیدی بنانے والے ان کے دشمن ہیں اور انہیں اتحادی ممالک (جرمنی، اٹلی اور جاپان) کی فتحمندی کا پورا یقین تھا۔ان کے اسی تیقن نے زمانہ اسیری کے تلخ ایام کو آسان کر دیا تھا اور وہ بڑے سکون اور بعض اوقات جوش و جذبے سے ان مصائب کا سامنا کر رہے تھے۔ مزید یہ کہ ان میں اکثر خاصے دولتمند تھے اور شراب نوشی پر کثیر روپیہ لٹا چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کیمپ کی نگرانی پر مامور برطانوی افسروں کے لیے ''کھلا گھر'' کا اہتمام کر دیا۔ یہ امر باعث تعجب ہے کہ یہ افسر اپنی باری آنے پر ایسے لوگوں کا میزبان بننے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے، جو ان کے ملک کے دشمن تھے۔ وہ نازی قیدیوں سے کھلے عام ملتے جلتے اور اکثر سکاچ کے ایک یا دو گلاس پینے ان کے پاس بیٹھ جاتے۔ جن بیرکوں میں نازیوں اور فاشسٹوں کے مخالفین تھے، وہاں یہ سہولتیں میسر نہیں تھیں، کیونکہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، ان کے مالی وسائل محدود تھے اور اس وجہ سے گارڈ کے افسران ان سے ملنے بہت کم آتے اور اگر آتے تو ایک سرسری سا جائزہ لے کر چلے جاتے۔

کرسمس کے موقع پر کیمپ کا نازی حصہ بہت غل غپاڑا مچاتا۔ عرصہ دراز سے اس تہوار کا مذہبی پہلو مفقود ہو چکا ہے اور تمام مغربی معاشرے اس تقریب کا یہ رخ فراموش کر چکے ہیں، لیکن جرمن ایک جذباتی قوم ہے، اس لیے میرے خیال میں ان میں کرسمس اور قومی جوش و جذبہ آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ "Silent Night, Holy

Marfat.com

"Night" جیسے گیت غیر محسوس انداز سے "Horst Wessel" اور "The Night of the Lord Knives" میں جذب ہو گئے ہیں اور وفور شوق سے آنسوؤں میں ڈھل گئے ہیں۔ الکحل اور نازیوں سے عمومی نفرت نے ان جذبوں میں مزید شدت پیدا کر دی۔ وہ ہماری بیرکوں کے سامنے کھڑے ہو کر گالیاں اور دھمکیاں دیتے اور ہمیں "غداران وطن" کے طعنہ سے نوازتے۔ انہیں نازیوں کی فتح کا پورا یقین تھا، اس لیے وہ ہمیں دھمکاتے کہ نازیوں کے کامیاب ہوتے ہی وہ ہمیں پھانسیوں پر لٹکا دیں گے۔

کرسمس کی شام کو وہ نشے میں دھت ہوتے۔ بعض چیزیں ان کے اشتعال کو بڑھا دیتیں مثلاً جرمن روسی معاہدہ، جس کا مقصد یورپ کو دو حصوں میں تقسیم کرنا تھا اور دونوں میں ان کا اثر برابر برابر ہوگا۔ اس معاہدے کے تحت پولینڈ بھی دو حصوں میں بٹ جائے گا اور اس کی خود مختارانہ حیثیت ختم ہو جائے گی۔ ایسی خوش آئند اطلاعات نازی قیدیوں کو مزید بھڑکا دیتیں اور وہ ہم "غداروں" کی بیرکوں کے سامنے آ کر ہمیں جہنم واصل کرنے کی سناؤنی دے جاتے۔ ان کی تعداد تین ہزار کے قریب تھی، جبکہ نازی مخالف گروپ اندازاً ایک سو افراد پر مشتمل تھا۔ اس وقت گارڈ کے افسران بھی کہیں نظر نہیں آتے تھے، شاید وہ اپنی رنگ رلیوں میں مگن ہوں گے۔ بڑھتے ہوئے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے ہمارے نازی مخالف گروپ نے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ان سے ٹکرا جانے کی ٹھان لی۔ ہم نے فوجی چارپائیوں کے آہنی پائے الگ کیے اور ان سے جنونی حملہ آوروں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ تعداد میں ہم سے زیادہ تھے اور اگر انہوں نے اتنی زیادہ نہ پی ہوتی تو وہ بآسانی ہم پر حاوی ہو سکتے تھے، لیکن نشے کی ایسی حالت میں ان کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا بھی مشکل تھا۔ چنانچہ اس کے بعد جو گھمسان کا رن پڑا تو بہت سے حملہ آور شدید زخمی ہوئے۔ ان میں سے ایک کی آنکھ ضائع ہو گئی اور کئی اپنی ٹانگیں اور بازو تڑوا بیٹھے۔ ہمارے آدمیوں میں صرف ایک شدید زخمی ہوا اور چند کو معمولی خراشیں آئیں۔ یہ کسی معجزہ سے کم نہیں۔

بالآخر ہندوستانی فوجیوں کا ایک دستہ برطانوی افسر کی سربراہی میں ڈلکی چال چلتا ہوا آیا اور متحارب گروہوں کو الگ الگ کیا۔ چند دنوں بعد ہماری اور ان کی بیرکوں کے درمیان آہنی تاروں کی ایک اور باڑھ کا اضافہ ہو گیا اور اس طرح نازیوں اور فاشسٹوں کے الگ احاطے معرض وجود میں آ گئے اور پھر ہماری نظر بندی کے بقیہ سال ایسے ہی گزرے۔

(5)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نازی مخالف گروہ کی مایوسی بڑھتی گئی۔ 1940ء کے موسم بہار اور موسم خزاں میں جرمنوں کی فتوحات نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ بالخصوص ناروے پر قبضہ، فرانس کی شکست، اطالیہ کا نازی جرمنی سے اتحاد، انگلستان پر ہوائی حملے (1941ء)، روس پر نازیوں کی بظاہر کامیاب مہم جوئی، قفقاز اور بحر احمر تک ان کی فوجوں کی فتح مندانہ پیش رفت۔ ان سب کامیابیوں سے ہمیں بھی جرمنی کے فاتح ہونے کا یقین ہونے لگا۔ بالخصوص

Marfat.com

یہودی پناہ گزینوں کے لیے یہ فتح پیغام مرگ سے کم نہیں ہوگا۔ بہتوں نے خودکشی کی کوشش کی اور ہمارے گروپ کے بعض متوازن سوچ والے افراد نے انہیں موت کے منہ میں جانے سے بچایا۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں نے اپنا توازن بگڑنے نہیں دیا۔ میں جانتا تھا کہ نازیوں کی فتح سے مسلمان اقوام نوآبادیاتی نظام سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جو جدوجہد کر رہی ہیں، وہ ختم ہو جائے گی اور میرا ذہن ایسی ہزیمت کو قبول نہیں کرتا تھا۔ مجھے پختہ یقین تھا کہ دنیائے اسلام کے تابندہ مستقبل کی آمد آمد ہے۔ اگر نازی کامیاب ہو گئے تو ایسے مستقبل کے ظہور پذیر ہونے کے امکانات معدوم ہو جائیں گے۔ اس لیے نازی ازم کو ہر صورت میں ناکام ہونا چاہیے۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ میرے اس یقین کی کوئی منطقی بنیاد تھی یا نہیں، لیکن یہ بات میرے ذہن میں راسخ ہو گئی تھی اور یہی میری طمانیت کی اصل وجہ تھی۔ میں اپنی آزادی سے محروم ہو چکا تھا اور اب ہزاروں غیر مسلمانوں میں اکیلا مسلمان ہونے کے ناطے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا تھا، لیکن اس مایوسی اور تنہائی میں بھی میرا یہی یقین جذباتی طور پر میرا سب سے بڑا سہارا تھا۔

ان نامساعد حالات میں میری ان لوگوں نے بڑی مدد کی، جو ہمیں کھانے پینے کا سامان فراہم کرتے تھے۔ کراچی کی ایک مسلمان فرم کو یہ کام سونپا گیا تھا۔ اس فرم کو جو خاندان چلا رہا تھا، اس کے بعض افراد سے میں جنگ سے قبل سرسری طور پر مل چکا تھا، لیکن وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے اور انہوں نے میری نظر بندی کے ابتدائی دنوں ہی میں مجھ سے اپنی شناسائی سے مطلع کر دیا تھا۔ جب بھی ان میں کوئی کیمپ میں آتا (انہیں اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے یہاں آنے جانے کی آزادی حاصل تھی)، وہ مزے مزے کی چیزیں مجھے دے جاتے، تا کہ میں ہر روز ایک جیسے کھانوں سے اکتا نہ جاؤں۔ ان چیزوں کو میں اپنے ساتھی نظر بندوں کے ساتھ مل کر کھایا کرتا۔ ہر سال ماہ رمضان میں مَیں پابندی سے روزے رکھتا تھا، اس لیے وہ ہر روز افطار کے لیے لذیذ کھانوں کی ایک ڈش بھجوایا کرتے تھے، جنہیں ہم پانچ چھ قیدی اکٹھے کھایا کرتے تھے۔

میرے زمانہ اسیری میں جن مسلمانوں نے میری افسردگی کو کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، وہ کیمپ کے محافظ سپاہی تھے۔ اگرچہ ہمیں آہنی باڑھ کے قریب جانے یا محافظوں سے بات کرنے کی سخت ممانعت تھی، لیکن میرے سمیت وہ مسلمان سپاہی اس پابندی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور ہر روز گھنٹوں اردو میں بات چیت کرتے تھے۔ ان کا اور ان کے افسران کا پنجاب رجمنٹ سے تعلق تھا۔ وہ مجھے اپنا مسلمان بھائی سمجھتے تھے اور اپنے افسران بالا کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے پیشکش کی کہ اگر میں کیمپ سے فرار ہونا چاہوں تو وہ میری ہر ممکن طریقے سے اعانت کر سکتے ہیں۔ ان میں ایک نے تو رائفل دینے کی بھی ہامی بھر لی، تا کہ بوقت ضرورت میں اپنا دفاع کر سکوں۔ تاہم میرا فرار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، کیونکہ میں ہندوستان میں اپنی زندگی اور اپنے مقصد حیات یعنی قیام پاکستان سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ان دنوں اس نئی اسلامی ریاست کے قیام کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے ان مسلمان سپاہیوں کے مثالی تعاون کا شکریہ ادا کیا اور انہیں یقین دلایا کہ ہم جلد آزاد انسانوں کی طرح ایک آزاد ملک میں ملیں

Marfat.com

گے۔ ان شاء اللہ۔

مسلمان بھائیوں کی اس بے لوث محبت اور خلوص نے مجھے ذہنی سکون کی دولت سے نوازا اور میرے باطن میں امید کی ایسی جوت جگادی کہ میں نے مستقبل کو دیکھنا شروع کر دیا۔ میری نظر بندی کے تیسرے سال مجھے مخاصمانہ ''تفتیش'' کا نشانہ بنایا گیا اور دیر تک یہ سلسلہ چلا۔ اس دوران میں مَیں ذہنی اور جذباتی طور پر پریشان رہا، لیکن ان مسلمان ساتھیوں کی تشفی آمیز استعانت نے پاسنگ کا کام کیا۔

(6)

اس تفتیش کا اصل مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ جنگی قیدیوں میں کونسے بے ضرر ہیں اور حکومت کے لیے دردسر نہیں بنیں گے، ان کو رہا کر دیا جائے، لیکن جن کے ''خطرناک'' ہونے کا ذرہ بھر امکان ہے، انہیں جنگ کے اختتام تک یونہی قید میں رکھا جائے۔

ان تفتیش کنندگان میں پہلا چیکوسلواکیہ کا پناہ گزین تھا، جس کا نام وائسکو چل (Wycocil) تھا۔ وہ برسوں سے ہندوستان میں مقیم رہا۔ قومیت کے اعتبار سے وہ جرمن تھا اور جرمن زبان پر کامل دستگاہ رکھتا تھا، اس لیے اس کو زیادہ تر جرمنی اور آسٹریا سے تعلق رکھنے والے مسلمہ نازی مخالف نظر بندوں کی تفتیش کی ذمہ داری سونپی گئی۔

جب میری باری آئی اور مجھے کیمپ کمانڈر کے دفتر لے جایا گیا تو وائسکو چل نے بڑی طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ میرے سلام کا جواب دیا۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ اسے پہلے سے میرے خلاف اکسایا گیا تھا اور وہ مجھ سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی اور وہ بلاشبہ ذہین شخص تھا۔ میری ''مسل کارکردگی'' پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد اس نے مجھ سے میری جائے ولادت کے بارے میں سوال کیا، حالانکہ وہ میرے تمام کوائف کو پہلے سے جانتا تھا۔ میں نے بتایا ''لووو (Lwów) یا لیمبرگ (Lemberg)، جیسا کہ آسٹرو ہنگیرین بادشاہت کے دور میں کہا جاتا تھا۔ یہ آسٹریا کے صوبہ گالیشیا (Galicia) کا صدر مقام تھا۔''

وائسکو چل نے بناوٹی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا ''اوہ! اب تو یہ شہر روس میں شامل ہو چکا ہے۔ آپ تو اب خوش ہوں گے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟'' دراصل وہ بے ڈھنگے پن سے کمیونزم سے میری ہمدردیوں کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔

اس احمقانہ تبصرے نے مجھے تیغ پا کر دیا اور میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ''جناب وائسکو چل! میں اتنا ہی خوش ہوں جتنا آپ پراگ پر جرمن قبضے سے خوش ہیں۔'' یہ سنتے ہی اس کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ میرے اس جواب کے بعد اس کا رویہ مزید سخت اور معاندانہ ہو جائے گا، لیکن اس وقت میرے ہاتھ سے دامن احتیاط چھوٹ چکا تھا۔ اس کے بعد وہ بے ربط اور طنزیہ سوالات پوچھتا رہا اور میں ان کا روکھے پن سے جواب دیتا رہا۔ انٹرویو ختم ہوا تو مجھے یقین تھا کہ وائسکو چل کی رپورٹ میں مجھے خطرناک ترین مجرم قرار دیا جائے گا۔

Marfat.com

میری اس بے اعتنائی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ بہت سی ذی اختیار مسلمان شخصیات نئی دہلی کے مجاز حاکمان سے میری رہائی کی سفارش کر رہی ہیں۔ میرے ان سفارشیوں میں وزیر اعلیٰ پنجاب سردار سکندر حیات اور وائسرائے کی کابینہ کے رکن قانون سر محمد ظفر اللہ خاں (جو بعد میں پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ تعینات ہوئے) قابل ذکر تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ان دو حضرات کی کوششیں ضرور بارآور ثابت ہوں گی، لیکن جلد ہی یہ عقدہ کھل گیا کہ میری یہ سوچ غلط تھی۔ یہ تمام سفارشیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں اور میں بدستور نظر بندی کی تکالیف برداشت کرتا رہا۔ کئی سال بعد جب میں پاکستان کی وزارت خارجہ میں مشرق وسطیٰ کے شعبہ کا سربراہ مقرر ہوا، تو ظفر اللہ خاں نے نئی دہلی میں سیکرٹری داخلہ سے میرے بارے میں سفارشات کی روداد سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ حکومت ہند کو میرے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی، مگر میری نظر بندی کا حکم لندن کی وزارت داخلہ نے جاری کیا تھا۔ ظفر اللہ خاں، برطانوی راج کے بہی خواہوں میں سے تھے اور حکومت ہند کے ایک عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ انہوں نے میری مسل مجھے دکھائی، جس کے مطابق میں نے سعودی عرب میں تیل کی تلاش کا ٹھیکہ برطانوی کمپنی کی پیشکش کو مسترد کرا کے امریکی کمپنیوں کے ایک گروپ کو دلوا دیا تھا۔ یہ انتہائی لغو بات تھی۔ اگرچہ یہ بات میرے علم میں تھی کہ ان دنوں امریکیوں کو یہ سہولت دینے کے لیے مذاکرات ہو رہے ہیں، لیکن ان میں مَیں نے کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کیا تھا۔ ازاں بعد جب آرامکو بھی معرض وجود میں آ چکی تھی، مجھے معلوم ہوا کہ یہ مراعات حاصل کرنے میں امریکی گروپ کامیاب ہو گیا ہے۔ تاہم نئی دہلی کے دفتر امور داخلہ میں محفوظ میری مسل میں یہ واضح طور پر درج تھا کہ میں ہی برطانوی مفادات کو شدید نقصان پہنچانے کا ذمہ دار ہوں، اس لیے برطانیہ کے دشمنوں میں میرا نام سرفہرست تھا (اگر یہ الزام درست ہوتا، تو میں اس وقت کروڑ پتی شخص جیسی زندگی گزار رہا ہوتا)۔

چنانچہ ظفر اللہ خاں اور سکندر حیات مجھے نظر بندی سے رہائی دلوانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جونہی مجھے ان کی ناکامی کا علم ہوا، میں نے سیکرٹری امور داخلہ سے براہ راست رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس ضمن میں ہمارے کیمپ کے نرم مزاج برطانوی سربراہ نے میرا خط متعلقہ محکمے تک پہنچانے کی ذمہ داری قبول کر لی۔

میں نے اپنے خط میں سیکرٹری امور داخلہ سے صاف صاف یہ استفسار کیا تھا کہ "کیا آپ مجھے نازی یا کمیونسٹ سمجھتے ہیں؟ اگر آپ کے خیال میں مَیں نازی ہوں، تو یہ بات محل نظر ہے کہ ایک شخص جس کی پیدائش یہودی گھرانے میں ہوئی اور جسے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی نازی اسے یہودی ہی سمجھتے ہوں، اسے نازی سمجھا جائے۔ رہی بات کمیونسٹ ہونے کی، تو کیا سمجھتے ہیں کہ کوئی مسلمان بقائم ہوش و حواس کمیونزم سے اپنا ناطہ جوڑ سکتا ہے، جو بنیادی طور پر مذہب کی نفی کرتا ہے اور کلی طور پر ہر اس بات کا مخالف ہے، جس کی اسلام تلقین کرتا ہے! اور اگرچہ میرے کچھ دوستوں نے آپ کے دفتر میں اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ "آگ کے بغیر دھواں نہیں اٹھتا" تو کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ میرے مسئلہ کے بارے میں آپ کو کس طرح کا دھواں اٹھتا ہوا نظر آتا ہے؟" میں نے اپنے خط میں بعینہٖ یہی الفاظ تو استعمال نہیں کیے تھے، لیکن ان کا مفہوم کچھ ایسا ہی تھا۔

Marfat.com

ہفتوں گزر گئے، لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ آخر کار ایک روز مجھے کیمپ کمانڈر کے دفتر سے بلاوا آیا اور بتایا گیا کہ سیکرٹری امور داخلہ نے یہ حکم نامہ جاری کیا ہے کہ آئندہ میرا کوئی خط ان کو نہ بھجوایا جائے۔

(7)

1942ء میں ہمارا کیمپ احمد نگر سے صوبہ بمبئی کے ایک اور شہر دیولالی (Deolali) منتقل ہو گیا۔ اس منتقلی کی کوئی وجہ تو نہیں بتائی گئی، لیکن میرے خیال میں یہ کسی جنگی حکمت عملی کا نتیجہ تھی۔ احمد نگر کا شہر ہر طرح کے فوجی مقاصد کو کما حقہٗ پورا کرتا تھا اور اسے صرف ایک نظر بندی کیمپ کے لیے استعمال کرنا درست نہیں تھا۔

دیولالی کیمپ، احمد نگر کے کیمپ سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں پختہ بیرکوں کے بجائے صرف خیمے تھے۔ بڑے سے شامیانے کے نیچے ہر ایک خیمہ میں چار لوہے کے پلنگ رکھے تھے۔ باہر لمبی میزیں اور لکڑی کی کرسیاں پڑی تھیں، تاکہ ہم وہاں بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھا سکیں۔ یہاں بھی نازیوں اور فاشسٹوں کے مخالفین اور نازیوں کے کثیر التعداد حمایتی گروہ کے بیچ میں آہنی باڑھ لگا دی گئی تھی، تاکہ ہم کسی وقت آپس میں گتھم گتھا نہ ہو سکیں۔ ویسے دوسری جانب سے مسلسل گالیاں اور دھمکیاں دی جاتی تھیں۔

احمد نگر کی طرح یہاں بھی کھانے پینے کی اشیاء کی فراہمی اسی کراچی کی فرم کو تفویض کی گئی تھی۔ میرے لیے یہی دیولالی میں ٹھنڈی ہوا کا ایک خوش کن جھونکا تھا۔ اس کے علاوہ کیمپ کی یہ تبدیلی خاصی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ احمد نگر کی پختہ بیرکوں کی بجائے یہاں ہم ڈھیلے ڈھالے خیموں میں مقید تھے اور جب مون سون کا موسم شروع ہوا تو زندگی مزید تلخ ہو گئی۔ موسلا دھار بارشوں سے خیموں کا جالی دار کپڑا پھٹ جاتا اور پانی مسلسل مکینوں پر ٹپ ٹپ گرتا رہتا۔ ہر خیمہ کے نیچے کی زمین دلدل کی صورت اختیار کر جاتی اور رات کو ہمیں اپنے کپڑے اور جوتے رسیاں باندھ کر اپنے سروں کے اوپر لٹکانے پڑتے تاکہ انہیں بھیگنے سے بچایا جا سکے۔ اکثر قیدی سردی اور نمونیے کا شکار ہونے لگے۔ شاید ہی کوئی شخص اعصابی درد سے محفوظ رہا ہو۔ کھانسی کا تو یہ حال تھا کہ ہر طرف سے دن رات لوگوں کے کھانسنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ صورت حال کسی حد تک بہتر ہو گئی۔ کیمپ کے افسروں نے ہر خیمے کے اوپر موٹی ترپالیں ڈلوا دیں جن سے بارش کے دوران میں پانی کا ٹپکتے رہنا بند یا بہت کم ہو گیا۔ ہر خیمے کے نیچے کی زمین پر بجری ڈال دی گئی تاکہ وہ کیچڑ کی شکل نہ اختیار کر لے۔ اس کے باوجود مون سون کی شدید بارشوں میں دیولالی کیمپ کو طوعاً و کرہاً برداشت ہی کیا جا سکتا تھا، ورنہ یہاں نظر بندی ایک ایسا خوفناک خواب تھی، جس میں تشویش، اذیت اور بے بسی کا احساس ہوتا تھا۔

جون کے وسط میں مون سون کا موسم ختم ہوا اور آہستہ آہستہ زندگی آسان سے آسان تر ہونے لگی۔ یہاں کچھ نئے جنگی قیدی بھی آ گئے اور ان کی آمد میرے لیے امید کی کرن ثابت ہوئی، جن کے ساتھ عقلمندانہ طور پر گفتگو کی جا

Marfat.com

سکتی تھی، ورنہ یہاں تو میرے سب نظر بند ساتھی شکایتیں کرتے، یاد ماضی میں گم رہتے، یورپ میں چھوڑے ہوئے اثاثوں کا ذکر کرتے اور اپنی حالیہ محرومیوں کا ذکر لے کر بیٹھ جاتے۔

یہ نو وارد گروہ دس یا بارہ جرمن یسوعیوں کا تھا، جو جنوبی ہندوستان میں مسیحیت کی تبلیغ میں مصروف تھے، لیکن اب انہیں یورپ میں جنگ کی خطرناک صورت حال اور برما تک جاپانی فوجوں کی پیش قدمی کے بعد "خطرناک" سمجھ کر نظر بند کر دیا گیا۔ یہ سب تعلیم یافتہ لوگ تھے اور علمی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان سے گفتگو سے طبیعت بہل جاتی تھی۔ اپنے دکھ درد، مسائل اور مصائب کا ذکر کم ہوتا اور یہ ایک ایسی تبدیلی تھی، جس کا مجھ پر مثبت اثر ہوا۔ نظر بندی کے گذشتہ دو سالوں میں مجھے اس کمی کا بری طرح احساس ہوتا تھا، اس لیے میں اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

یسوعیوں کی اس جماعت کا مسلمہ سربراہ شہزادہ لیوون شٹائن (Löwenstein) تھا، جو بویریا کے ممتاز ترین خاندانوں میں سے ایک خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ غالباً یہ خاندان وٹلز باخ (Wittelsbach) کے شاہی گھرانے جتنا پرانا تھا، مگر ہابس برگ (Habsburg) سے تو یقیناً قدیم تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ذہنی افق اوسط پادری کی نسبت خاصا وسیع تھا، اسی لیے مذہبی فلسفہ اور دور حاضر کے پیدا کردہ متعدد سوالات پر ان سے بات چیت ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جلد ہم میں دوستی کا محکم رشتہ استوار ہو گیا۔ دونوں تقریباً ہم عمر تھے اور دنیا کا بیشتر حصہ دیکھ چکے تھے، چنانچہ ہم شامیانے کے نیچے چائے پیتے ہوئے یا کیمپ کی باڑھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گھنٹوں گفتگو کرتے رہتے تھے۔

یہ جانتے ہوئے کہ مجھے ہر طرح کی مذہبی فکر سے گہری دلچسپی ہے، میرے اس یسوعی دوست نے مجھے کیتھولک چرچ کی تاریخ پر ایک ضخیم کتاب پڑھنے کے لیے دی۔ آٹھ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کو میں نے دو ہفتوں میں ختم کر لیا۔ اس کتاب سے مجھے تاریخ کے ایک عجیب و غریب واقعہ کا علم ہوا۔

ٹائیٹس (Titus) کے ہاتھوں یروشلم کی بربادی سے کچھ عرصہ پہلے اس شہر کے بشپ نے ایک خواب دیکھا، جس میں آنے والی تباہی کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ عوام الناس کو اس آفت سے بچانے کے لیے بشپ نے مردوں، عورتوں اور بچوں کے اس چھوٹے سے گروہ کو اردن کے ایک دور افتادہ مشرقی علاقے میں بھجوا دیا۔ اس جماعت نے دو سو سال سے زائد عرصہ وہیں گزارا اور اس دوران میں باقی دنیا سے ان کا مکمل قطع تعلق رہا۔ دھیرے دھیرے حالات تبدیل ہوئے، فلسطین شہر مسیحیوں کے لیے پناہ گاہ بن گیا اور یہ مختصر سی جماعت واپس یہیں آباد ہو گئی۔ اب انہیں احساس ہونے لگا کہ ان کے اعتقادات ان مسیحیوں سے مختلف ہیں، جو سابقہ دو صدیوں میں فلسطین ہی میں سکونت پذیر رہے۔ یہ لوگ تثلیث پر محکم ایمان رکھتے تھے اور مسیحؑ کو مجسم خدا یا خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے، جبکہ وہ لوگ، جو اپنی رضا کارانہ جلاوطنی سے واپس آئے تھے، حضرت عیسیٰؑ کو ایک فانی انسان، ان سے پہلے پیغمبروں کی طرح ایک پیغمبر مانتے تھے۔ انہیں خدا نے مبعوث کیا تھا اور ان کی بعثت کا مقصد لوگوں تک خدا کی وحدانیت کا پرچار کرنا اور انہیں خدا کی بتائی ہوئی صراط مستقیم کی جانب رہنمائی کرنا تھا۔

Marfat.com

میرے زیر مطالعہ مذکورہ تاریخی کتاب کے مطابق یہ ''انحراف'' اس گروہ کے مسیحیت کے دیگر پیروکاروں سے صدیوں بالکل الگ تھلگ رہنے کا نتیجہ تھا اور اس طرح مسیحی ایمانیات کے مرکزی عقیدے سے ان کا تعلق منقطع ہو گیا۔ تاہم اس کتاب کے مطالعہ کے بعد میں نے جو نتیجہ اخذ کیا، وہ اس کے برعکس تھا یعنی یہ فلسطینی مسیحی تھے جو پولینی روحانیت سے متاثر ہوئے اور غالباً اس دور کے مقبول متھرائی (Mithraistic) عقائد کا بھی انہوں نے اثر قبول کیا۔ نتیجتاً مسیح نے انہیں خدا کی وحدانیت کی جو راہ سجھائی تھی، اس سے وہ منحرف ہو گئے اور تثلیث کے عقیدے کو اپنا لیا، جبکہ وہ مختصر جماعت جس نے مشرقی اردن کے دور دراز علاقے میں سالہا سال جلاوطنی کی زندگی گزاری اور ہر طرح کی فکری لہروں سے خود کو محفوظ رکھا، وہ خدا کی ماورائی وحدانیت کے بنیادی عقیدے ہی کو مانتے رہے۔ ایک سو سال بعد اسکندریہ کے بشپ آریوس (Arius) نے اس عقیدے کو تسلیم کرنا ضروری سمجھا، جس کو کلیسائی مؤرخین پہلے ''آرمنی بدعت'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

میرے مضبوط عقیدے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ تاریخ میں ایسے رہنماؤں یا سورماؤں کی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں، جنہوں نے اپنے بعد آنے والے پیروکاروں کے ذہن میں ذات باری تعالیٰ کے تصور کو راسخ کیا، لیکن کسی ایسے شخص کی مثال نہیں ملتی جسے پہلے ملکوتی صفات کا مالک سمجھا گیا ہو اور بعد میں اسے فانی انسان کی سطح پر لا کر اس کو 'ذلیل' کیا گیا ہو۔

ایک روز میں اس کتاب کے بعض مندرجات کے حوالے سے شہزادہ لیوون شٹائن سے بحث کر رہا تھا کہ میں نے اس جماعت کا حوالہ دیا جو اردن کے دور دراز علاقے میں طویل مدت گزار کے واپس آئی تھی اور اس کے بارے میں اپنی تاویل بھی پیش کی۔ اس نے فوراً میری توضیح کو رد کر دیا اور اسے دور کی کوڑی لانے کے مترادف سمجھا۔ اس اختلاف نظر کے باوجود ہم ایک دوسرے کی ذہنی راست بازی کو بنظر استحسان دیکھتے تھے۔ ہم نے دینی موضوعات پر اپنی بحثوں کا سلسلہ جاری رکھا اور اس سے ہم دونوں لطف اندوز ہوتے رہے۔

ایک بار میرے اس یسوعی دوست نے کہا ''اسد! تمہیں معلوم ہے کہ تم پیدائشی یہودی تھے اور تم اپنے مذہب سے غیر مطمئن تھے۔ تمہارے لیے موزوں ترین راستہ تو یہی تھا کہ تم مسیحی ہو جاتے، لیکن تم نے اسلام کو منتخب کیا۔'' یہ سن کر میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا ''ابھی سب کچھ ضائع نہیں ہوا، اگر آپ میرے ایک سوال کا تسلی بخش جواب دے دیں تو میں اب بھی مسیحیت کو اپنانے کے لیے تیار ہوں۔ اگر ایسا ہوا، تو میں اگلے اتوار کو آپ کے ساتھ گرجا جاؤں گا اور بپتسمہ لے لوں گا۔'' لیوون شٹائن نے اشتیاق سے پوچھا ''وہ سوال کیا ہے؟'' میں نے کہا ''کیا آپ مجھے تثلیث کا مفہوم بتا سکتے ہیں؟''

وہ دیر تک سوچتا رہا اور پھر گویا ہوا ''یہ ایمان کا ایک راز ہے اور اسے الفاظ کے پیرائے میں بیان نہیں کیا جا سکتا، لیکن اگر آپ حقیقی ایمان کی دولت سے بہرہ مند ہو جائیں، تو آپ کا قلب خود بخود اس کی حقیقت کو جان لے گا۔''

میں نے جواباً عرض کیا ''یہی وجہ تھی کہ میں مسیحی کے بجائے مسلمان ہو گیا۔ آپ کا مذہب کہتا ہے کہ پہلے

Marfat.com

ایمان لاؤ اور تمہاری سمجھ میں مذہب آ جائے گا، جبکہ اسلام کہتا ہے پہلے اپنی عقل استعمال کرو، کیونکہ یہی تمہیں ایمان کی طرف لے جائے گی۔“

یوں یہ بحث ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ پھر میرے دوست نے مجھے تبدیلی مذہب کے بارے میں قائل کرنے کی کوشش نہیں کی، البتہ اس سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہ آیا۔

(8)

مجھے براہ راست سیکرٹری داخلہ سے رابطہ کرنے سے منع کر دیا گیا تھا، اس لیے میں نے اس سے بہتر راستہ نکال لیا۔ میں نے ایک طویل خط کیمپ کمانڈنٹ کو لکھا اور ذاتی طور پر ان کو یہ خط دیتے ہوئے عرض کیا کہ اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو اس کے مندرجات سے سیکرٹری داخلہ کو مطلع کر دیں۔ اس خط میں ”افسران بالا“ کے غور و خوض کے لیے ایک واضح تجویز پیش کی گئی تھی۔

دراصل میری تجویز یہ تھی کہ مجھے جنگ میں بالواسطہ شرکت کا موقع دیا جائے، تاکہ میں اس میں فعال کردار ادا کر سکوں۔ میں نے انہیں تفصیل سے برسوں پہلے کی سنوسی تحریک اور اس کے مرحوم رہنما سید احمد شریف کا ذکر کیا۔ 1931ء میں عمر المختار (جو سائرے نیشیا (Cyrenacia) میں مقیم تھا) کے پاس میری سربراہی میں وفد بھیجا گیا۔ اس کی ناکامی کا بھی ذکر کیا۔ سنوسیوں کے ساتھ میرا تعلق کبھی منقطع نہیں ہوا اور جنگ شروع ہوتے ہی میری نظر بندی تک بذریعہ خطوط اس تحریک کے سربراہوں سے میرا رابطہ قائم رہا۔ سنوسی لیبیا پر اطالیہ کے قبضے پر سخت مخالف تھے اور نازی فاشسٹ معاہدہ کے بعد اب وہ جرمنوں سے بھی نفرت کرتے تھے، اس لیے وہ برطانیہ کو مصر میں نجات دہندہ کی حیثیت سے تسلیم کرتے تھے[45]۔ میں نے اپنے خط میں یہ تجویز کیا کہ سنوسیوں سے میرے گہرے روابط، زیادہ تر میری دسترس اور سائرے نیشیا میں میرے سابقہ تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے اطالوی افواج کے عقب میں گوریلا جنگ کو منظم کرنے، مقامی آبادی کو گاہے بگاہے اپنے دفاع کے لیے تیار کرنے اور دشمن کو رسد پہنچانے کے راستوں میں واقع تمام کنوؤں کو تباہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ ایسے کاموں کو بجالانے میں میری جان کو بیسیوں خطرات درپیش ہوں گے، لیکن میں نہ صرف سنوسیوں کی معاونت کے لیے ہمہ وقت آمادہ تھا، بلکہ نازی ازم اور فاشزم کے خلاف اتحادیوں کی جدوجہد میں کچھ نہ کچھ حصہ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس طرح میں کسی حد تک اپنے خاندان کے بہیمانہ قتل کا بدلہ بھی چکا سکتا تھا۔

مختصراً یہی میری تجویز تھی، جسے میں اپنی جانب سے بتوسط کیمپ کمانڈنٹ حکومت ہند کو یا، اگر ممکن ہو، تو لندن کے دفتر جنگ کو بھجوانا چاہتا تھا۔ مجھے جلد ہی پتہ چل گیا کہ میرا خط متعلقہ محکمہ کو بھجوا دیا گیا ہے اور اب میں چند ہفتوں بعد اگلے مرحلہ تفتیش کا انتظار کرنے لگا۔

اس دفعہ سوال و جواب کا مرحلہ وائسکو چل کے طرز سلوک سے مختلف تھا۔ ایک تفتیش کنندہ کے بجائے چھ یا

Marfat.com

سات آدمیوں پر مشتمل ایک گروپ کیمپ کے کمانڈنٹ کے دفتر میں میز کے ارد گرد بیٹھ گیا۔ جیسا کہ ان کے سوالات سے اندازہ ہوا، ان میں بعض حکومت ہند کے نمائندے، دو کا تعلق اسکاٹ لینڈ یارڈ کی خصوصی شاخ (شعبہ سیاسی امور) سے تھا اور میرے ساتھ والی کرسی پر صدر نشین بیٹھے تھے، جنہیں سب لوگ کرنل ہمیلٹن کے نام سے بلاتے تھے۔ وہ یقیناً برطانیہ کی خفیہ سروس کا رکن تھا۔

ان تفتیش کنندگان کے اِدھر اُدھر کے سوالوں کے بعد کرنل ہمیلٹن نے پولش زبان میں سوال کیا "Wy gavaritie pa rusku?" ''کیا تم روسی سمجھتے ہو؟''

میری ولادت اور پرورش پولش بولنے والے شہر لیووو (Lwów) میں ہوئی تھی (میری والدہ کی زبان بھی پولش تھی)۔ میں یہ زبان بول نہیں سکتا تھا، البتہ روسی زبان سے قریبی لسانی تعلق رکھنے کے باعث میں تھوڑی بہت سمجھ لیتا تھا۔ کرنل ہمیلٹن نے جو حیران کن سوال پوچھا تھا، اس کو سمجھنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کی طرف منہ موڑ کر انگریزی میں جواب دیا ''میں روسی نہیں بول سکتا۔''

اب تک کے سوال و جواب سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کو شک ہے کہ میرا ذہنی جھکاؤ اشتراکیت کی طرف ہے یا میں اشتراکی ایجنٹ ہوں۔ چند ہفتے قبل وائسکو چل کے تحقیر آمیز سوالات کا یہی مقصد تھا اور اب کرنل ہمیلٹن کے کھرے کھرے سوال کا بھی صریحاً یہی مقصد تھا کہ کسی نہ کسی طرح میرا اشتراکیت سے ناطہ جوڑ کر اپنے افسران بالا کے شک کو یقین میں بدل دیا جائے۔ سچ پوچھیے تو میری نظر بندی کی اصل وجہ یہی تھی۔ مجھ پر ان کا یہ شک کسی حد تک حیران کن تھا، کیونکہ اب روس، برطانیہ اور امریکہ کا اتحادی بن چکا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے اطلاع ملی کہ جہاں تک برطانیہ کی ''اشرافیہ'' کا تعلق ہے، وہ اب اشتراکیت سے زیادہ نازی جرمنی سے خائف ہے۔ اس ''طبقہ خواص'' کے کچھ برطانوی افسران، جن کے ساتھ گاہے بگاہے میری گپ شپ ہوتی رہتی تھی، ایسی خبریں سن کر خوش ہوتے تھے کہ جرمنوں نے تمام یوکرین پر قبضہ کر لیا ہے اور قفقاز تک پہنچ گئے ہیں۔ ایک دفعہ ان میں سے ایک شخص نے کہا ''ہمیں ان کی طرف سے لڑنا چاہیے، نہ کہ ان کے خلاف۔''

(9)

نظر بندی کے خنک سال گزرتے چلے گئے۔ دیولالی میں ایک سال گزارنے کے بعد ہمارا کیمپ یو پی کے صوبہ کے شہر ڈیرہ دون منتقل ہو گیا، لیکن روزمرہ کے معمولات زندگی جوں کے توں رہے۔ نازیوں کے مخالف جنگی قیدی آہستہ آہستہ رہا ہوتے گئے، لیکن میرے سمیت جن نظر بندوں کو ''خطرناک'' سمجھا جاتا تھا، وہ پس دیوار زنداں ہی رہے۔ 1943ء کے اواخر یا 1944ء کے آغاز میں افسران کے عمومی رویے میں بہتری کے آثار نظر آنے لگے، جب پونا کے نزدیک پہاڑیوں میں پورندھر (Purandhar) کے مقام پر ایک ''فیملی کیمپ'' قائم کر دیا۔ وہ قیدی جن کے بال بچے تھے، انہیں وہاں ساتھ رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس وقت تک منیرہ اور طلال جمال پور میں چودھری نیاز

Marfat.com

علی کے ہاں مقیم رہے اور اب ہم تینوں پورندھر کیمپ میں اکٹھے رہنے لگے۔

سابقہ تین کیمپوں کی نسبت یہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ پورندھر ایک ''پیرول کیمپ'' تھا یعنی ہم کسی قسم کی فوجی مشق کے پابند نہیں تھے، لیکن ہمیں یہاں سے بھاگنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں آہنی باڑھ کے احاطے، مسلم محافظ اور بیرکیں نہیں تھیں۔ ان کے بجائے ہم بنگلوں میں رہتے تھے (جنگ سے قبل پورندھر موسم گرما کا تفریحی مقام تھا)، جہاں وہ بال بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں ماہانہ الاؤنس بھی ملتا تھا۔ چھوٹے موٹے سیر سپاٹے کے لیے ہمیں کیمپ سے باہر جانے کی بھی اجازت تھی، بلکہ کیمپ کمانڈنٹ کی خصوصی اجازت سے کبھی کبھار ہم پونا بھی چلے جاتے تھے۔ کمانڈنٹ بھلا مانس اور آزاد خیال آئرش تھا، اس لیے یہ اجازت بآسانی مل جایا کرتی تھی۔

طلال کی عمر اب بارہ سال ہوگئی تھی، اس لیے اسے پنج گنی (Panjgani) کے انگریزی اسکول میں بطور اقامتی طالب علم بھجوا دیا گیا۔ یہ اسکول بذریعہ کار چند گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔ ہر ہفتے کے اخیر میں وہ ہمارے پاس چھٹی گزارنے آجاتا تھا۔

یہاں سب کچھ تھا، لیکن خوشی نام کی چیز عنقا تھی۔ ہر طرح کی سہولتیں حاصل تھیں، لیکن حقیقی آزادی سے محروم تھے۔ میں قیدی تھا اور مجھے دوسروں کا ہر حکم ماننا پڑتا تھا اور ایسی اطاعت میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ مزید یہ کہ نظر بندی کے دوران میں منیرہ اور میں ایک دوسرے سے کھچے کھچے رہنے لگے تھے۔

1945ء کا سال شروع ہوگیا، اپریل کا مہینہ آگیا۔ نازی جرمنی ڈھیر ہوگیا اور اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ تمام اتحادی ممالک میں ڈی ڈے (D-day) بڑے جوش وخروش سے منایا گیا، لیکن میں نظر بند ہی رہا۔ پورندھر کے پیرول کیمپ میں مَیں اکیلا رہ گیا۔ اب میرے پاس پڑھنے کو کتابیں تھیں، لیکن اتنی نہیں تھیں کہ میں ''صحیح بخاری'' پر اپنے رُکے ہوئے کام کو آگے بڑھا سکتا۔ یہاں بے مقصد پڑا ہوا اپنا وقت ضائع کرتا رہا۔

بالآخر 14 دسمبر 1945ء کو مجھے کمانڈنٹ کے دفتر بلایا گیا اور مجھے آزادی کا پروانہ دیا گیا۔ دو روز بعد ہم (یعنی میں، میری بیوی اور بیٹا) وہاں سے روانہ ہوئے اور بذریعہ ریل پونا سے بمبئی، پھر پنجاب اور سیدھے جمال پور، چودھری نیاز علی کے گھر پہنچے۔ یہاں آتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ جنگ شروع ہوتے ہی جب مجھے گرفتار کیا گیا، اس کے فوراً بعد میرے پرانے مخلص دوستوں نے میرا عرفات پریس، کتب خانہ اور مسودات محفوظ رکھے تاکہ میں واپس آتے ہی اپنا کام شروع کردوں۔ یوں لگا، جیسے میں پھر سے اپنے گھر آگیا ہوں۔[46]

☆ ☆ ☆

Marfat.com

باب ششم

تقسیم ہند
(1946ء-1947ء)

(1)

جس دنیا میں مَیں اب لوٹ کے آیا، وہ ویسی نہیں تھی جیسی میں یکم ستمبر 1939ء کو چھوڑ کر گیا تھا۔ برطانوی راج آخری دموں پر تھا۔ نئی دہلی اور لندن کے مابین مذاکرات ہو رہے تھے۔ وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن حکومت کی باگ ڈور عارضی حکومت ہند کو پکڑانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ یہ حکومت نیشنل کانگرس کے ارکان پر مشتمل تھی اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کے ساتھ ان کا ایک ڈھیلا ڈھالا معاہدہ بھی تھا۔ یہ تکلیف دہ سمجھوتہ لاہور کے جلسہ عام (1940ء) میں منظور کردہ قرارداد پاکستان کا نتیجہ تھی، جس میں ہندوؤں کی غالب اکثریت کے ملک میں پاکستان کے نام سے ایک علیحدہ ریاست کی تشکیل کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

بطور خود مختار ملک قیام پاکستان کا فیصلہ آنکھ جھپکتے نہیں کیا گیا تھا۔ مہینوں نہیں برسوں مسلم لیگ کے رہنما محمد علی جناح ہندو قیادت کو یہ باور کراتے رہے کہ ہندوستانی وفاق کے اندر مسلمانوں کے لیے الگ خود مختار ریاستوں کے حق کو تسلیم کر لیا جائے، جن میں شمال مغرب میں پنجاب، سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور کشمیر، جبکہ شمال مشرق میں بنگال اور آسام کے مسلمانوں کے اکثریتی علاقے شامل ہوں گے۔ انڈین نیشنل کانگرس نے اس تجویز کو بلا شرط مسترد کر دیا، بالخصوص مہاتما گاندھی غیر منقسم ہندوستان کے سخت اصول پر کاربند تھے۔ 1940ء میں مسلم لیگ نے متفقہ طور پر مکمل خود مختار پاکستان کے قیام کا حتمی فیصلہ کیا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھی اسے ناپسندیدگی سے منظور کر لیا اور برطانوی حکومت کو بھی یہ مطالبہ تسلیم کرنے کا مشورہ دیا، جبکہ گاندھی نے قیام پاکستان کو ''بھارت ماتا کی چیر پھاڑ'' سے تعبیر کیا۔ چھ سال نظر بند رہنے کے بعد جب میں رہا ہو کر آیا، تو اس وقت ہندوستان کے سیاسی حالات اسی ڈگر پر چل رہے تھے۔

مسلمانوں کا جوش و خروش دیدنی تھا، نہ صرف ان علاقوں میں جنہیں مجوزہ پاکستان کا حصہ بننا تھا، بلکہ پورے ہندوستان میں۔ صدیوں بعد وہ پہلی بار اسلامی ریاست کو قائم کرنے کے لیے سرگرم عمل ہوئے تھے۔ ایسی

Marfat.com

ریاست جس کی بنیاد قومی یا نسلی رشتوں پر نہیں، بلکہ عوام الناس کی اپنے مذہب سے رضا کارانہ وابستگی اور نظریہ حیات پر رکھی جائے گی۔ ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے سے بالکل ناآشنا تھے، سڑکوں پر وفور جذبات سے آپس میں بغلگیر ہوتے تھے۔ انہیں ابھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ حصول آزادی کی اس کٹھن راہ میں جانوں کے نذرانے بھی پیش کرنا پڑتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ ایسی قربانی کے لیے تیار تھے۔

اندریں حالات میں نے تحریک پاکستان میں تحریراً اپنا فرض ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ یعنی مجوزہ پاکستان جن نظریاتی اصولوں پر قائم ہوگا، ان کو صفحہ قرطاس پر پوری شرح وبسط کے ساتھ سامنے لایا جائے۔

یوں ماہنامہ ''عرفات'' کا اجراء ہوا۔ اس مجلّہ کا لکھاری، ناشر اور طابع ایک شخص ہی تھا، کیونکہ برسوں سے وہ ایسے رسالے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اس کا خواب حقیقت بن کر ''عرفات'' کے اولیں شمارے کی صورت میں سامنے آیا۔[47]

(2)

قید سے رہائی کے بعد ابتدائی چند ماہ میں اپنے بیوی بچے سمیت چودھری نیاز علی کے ہاں جمال پور ہی میں رہائش پذیر رہا۔ ان کی جاگیر اتنی وسیع تھی اور ان کے گھر کے اتنے کمرے تھے کہ ہم سب کو وہاں رہنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی، لیکن میرے لیے جو بات اہم تھی، وہ ملکیت کا احساس تھا۔ میرے میزبان اور میں خود بھی اپنے آپ کو اس گھر میں ''مہمان'' نہیں سمجھتا تھا۔ یوں فی الواقع یہ میرا اپنا ہی گھر تھا، جہاں میرے جانے اور ٹھہرنے پر کوئی قدغن نہیں تھی اور جو میں چاہتا، بلا روک ٹوک کرسکتا تھا۔

سب سے پہلے میں ''صحیح بخاری'' کے معرض التوا میں پڑے ہوئے منصوبے کو نئے سرے سے شروع کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ میری تمام کتابیں خانوں میں ترتیب سے رکھی تھیں۔ تمام مسودات احتیاط سے بحفاظت پڑے تھے۔ اس وسیع وعریض جاگیر میں اتنی عمارتیں خالی پڑی تھیں کہ ان میں کہیں بھی آسانی پریس لگایا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے لاہور میں ضروری عملے کا بندوبست کیا جاسکتا تھا[48]۔ اس کے باوجود میں قدرے تذبذب کا شکار تھا۔ میں نے بلاتاخیر ماہنامہ ''عرفات'' نکالنے کا تہیہ کرلیا، کیونکہ میرے خیال میں اس کے توسط سے مجوزہ پاکستان کے نظریاتی مسائل کو بالصراحت پیش کرنے میں مدد ملے گی۔ کیا میں بیک وقت ان دونوں منصوبوں کو شروع کرسکتا تھا؟

ماہنامہ ''عرفات'' دیگر رسائل سے بالکل مختلف تھا۔ مروجہ جرائد میں بالعموم کئی مصنفین کی نگارشات کو شائع کیا جاتا ہے، لیکن یہ رسالہ ''خودکلامی'' تھی یعنی یہ صرف میرے ہی خیالات کا ذریعہ اظہار تھا اور میری تحریروں کا اصل مقصد۔ میں چاہتا تھا کہ دور حاضر کے تغیر پذیر حالات کے تناظر میں بعض شرعی مسائل کے حل کے لیے اجتہادی نقطہ نظر کو فروغ دیا جائے۔ نظر بندی کے دوران میں میرے پاس ایسے خیالات کے سوا کچھ نہیں تھا اور انہی کے بارے میں سوچنے سے مجھے کچھ ذہنی سکون ملتا تھا۔ خاصے غور وخوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ حقیقی شریعت ہمارے علمائے

Marfat.com

دین کی سابقہ نسلوں کے موضوعی قیاسی استدلال اور استخراجات کے بوجھ تلے دب گئی ہے اور اس کی اصل غرض و غایت کی شناخت ہی مشکل ہو گئی ہے۔ میری رائے میں صدیوں سے مسلمانوں کے زوال پذیر ہونے کا بھی یہی بڑا سبب ہے۔ ادق متکلمانہ تہوں کو کھرچنے سے شریعت کی حقیقی سادگی اور اختیارات کو منظر عام پر لایا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے احیائے نو کے لیے یہ ناگزیر شرط ہے۔ علماء اور اہل فکر کو اسی بنیادی مسئلہ کی طرف متوجہ کرنا اور اپنی پرانی علمی کوتاہیوں کے گہرے مطالعہ اور پھر انہیں دور کرنے کا احساس دلانا ضروری ہے۔ خاص طور پر ابتدائی علمائے دین کے فقہی مباحث اور ان کے فتاویٰ کی اندھی تقلید کے خطرات سے مسلمانوں کو بچانا ہے۔ میرے رسالے کا بنیادی مقصد یہی تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا میں اکیلے اپنی منزل مقصود تک رسائی حاصل کر سکتا ہوں اور کیا میں ''صحیح بخاری'' پر اپنے زیر تکمیل منصوبے کو بھی ساتھ ساتھ آگے بڑھا سکوں گا؟ جواب یقیناً نفی میں تھا۔ اب یہ فیصلہ کرنا باقی تھا کہ ان دو میں سے کس کو ترجیح دی جائے؟

میں نے فیصلہ کیا کہ ''عرفات'' کو ترجیح دی جائے اور ''صحیح بخاری'' کے ترجمہ و تشریح کو ایک ڈیڑھ سال کے لیے مؤخر کر دیا جائے۔ میں غیر معینہ عرصے کے لیے ''عرفات'' کو جاری رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ پاکستان کے مستقبل قریب میں قائم ہونے کے امکانات بڑھتے جا رہے تھے، اس لیے میں اپنے مجلّہ کے ذریعے اس امکان کو جلد از جلد حقیقت کا روپ اختیار کرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ دراصل یہ رسالہ آزادی کے متوالوں کو ابھارنے والی آواز تھی۔ میں تو یہ آواز سن چکا تھا اور اب یہ عام لوگوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔

(3)

یہ احمقانہ بات لگتی تھی کہ پہلے اپنا پریس لگایا جائے اور پھر ماہوار رسالہ چھپوانے کے لیے عملہ بھی بھرتی کیا جائے، جبکہ ایسے کام کے لیے لاہور میں ایک معروف پریس موجود تھا۔

''عرفات'' (ذیلی عنوان ''فکر اسلامی پر ماہانہ تنقید و تبصرہ'') کا پہلا شمارہ ستمبر 1946ء کو شائع ہوا اور اس کے سینکڑوں نسخے ہندوستان کے چیدہ چیدہ مسلمانوں کو ارسال کیے گئے اور انہوں نے اس کے مندرجات کو پسند کیا۔ اس سال کے آخر تک یہ مجلّہ خود کفیل ہو گیا۔

ستمبر کے شمارے کا خاص موضوع یہ سوال تھا ''کیا مذہب قصہ پارینہ ہے؟'' میں نے اس کا جواب نفی میں دیا اور یہ واضح کیا کہ پوری انسانی تاریخ میں مذہب کلچر کو بروئے کار لانے والی مضبوط ترین قوتوں میں شامل رہا اور اخلاقیات اور پاک دامنی کا واحد معلومہ ماخذ ہے۔ تاہم میں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اسلام نہ صرف کلچر کو پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے بلکہ اس کا زندگی بخش تصور کائنات ہمیشہ انسانی ذہن اور علم کی ترویج میں متوازن اور مثبت جزو رہا ہے۔ اس طرح اسلام وقت اور حالات زمانہ کے لازمی مقتضیات کے مطابق انسانی معاشرے کی صورت گری میں ممد و معاون ثابت ہوا ہے۔ اس حوالے سے اسلام مذہبی عقیدہ کے تمام مظاہر میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے اور فی

Marfat.com

نفسہٖ وقت کی قید سے ماورا ہے۔

تاہم میرے خیال میں اسلام اس وقت تک اپنے جائز کردار کو برقرار نہیں رکھ سکا، جب تک اس کی روحانی ساخت اور دنیاوی ''پروگرام'' اس کے پیروکاروں کی عملی زندگی کا حصہ نہیں بن گیا۔ اسلام کے لافانی قانون (یعنی شریعت) کے بنانے کی ضرورت کا احساس سوجھ بوجھ رکھنے والے ہر بالغ نظر مسلمان کو ہے۔

''عرفات'' کے اگلے پانچ شماروں میں مکمل طور پر ایک کٹھن مسئلہ کو زیر بحث لایا گیا یعنی قانون اسلام کو کس طرح مسلمانوں کے لیے اجتماعی طور پر قابل فہم بنایا جائے؟ مئی 1947ء کے شمارے میں ''پاکستان سے ہمارا مطلب کیا ہے؟'' کے زیرعنوان ایک اہم مضمون شائع کیا گیا جس میں یہ واضح کیا گیا کہ قیام پاکستان کے پس منظر میں کونسا 'حقیقی' مقصد کارفرما ہے، جو مسلمانوں کو معاشی مواقع کے حصول یا سرکاری عہدوں پر تعیناتی سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا اور سیاسی اشکال، قوانین اور سماجی اداروں کو روح اسلام کے مطابق تشکیل دینا ہے۔ مختصراً ہمارا مطمح نظر تقریباً ایک ہزار سال بعد پہلی حقیقی اسلامی ریاست کا قیام تھا۔

اس انداز فکر کے منطقی تسلسل میں ''عرفات'' کا جولائی 1947ء (یوم آزادی سے ایک ماہ پہلے شائع ہوا) کے شمارے میں ایک طویل مضمون بعنوان ''اسلامی دستور کی جانب'' شائع ہوا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، یہ ان اصولوں کا ایک خاکہ پیش کرنے کی پہلی کوشش تھی، جن کو ہر اس ریاست کے دستور کا لازمی حصہ بنا چاہیے، جو 'اسلامی' ہونے کی دعویدار ہے اور اس وقت میری کسی پیش بندی کے بغیر یہ مضمون جدید دنیائے اسلام میں سیاسی فکر کی ترقی کی جانب پہلا قدم تھا۔

(4)

موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ سے بچنے کے لیے میں نے ڈلہوزی کے مقام پر ایک بنگلہ کرایے پر لے لیا۔ یہ گورداسپور ضلع میں ایک پہاڑی تفریح گاہ ہے اور جمال پور میں چودھری نیاز علی کی جاگیر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ مئی 1947ء کے آغاز میں میں یہاں عارضی طور پر منتقل ہو گیا۔

چند ماہ پیشتر حکومت برطانیہ نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن[49] کی مشاورت سے مشہور قانون دان سر سائرل ریڈکلف کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ ملک کی ظاہری فرقہ وارانہ ہیئت کے مطابق اسے تقسیم کرنے کی تجویز پیش کریں۔ بالفاظ دیگر مغرب میں اضلاع پنجاب اور مشرق میں بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس لیے انہیں پاکستان میں شامل کر دیا جائے اور ہندوؤں کے اکثریتی علاقوں کو ہندوستان ہی میں رہنے دیا جائے۔ بنگال میں ایسی تقسیم نسبتاً آسان تھی اور یہاں کسی سنجیدہ تنازعہ کا امکان نہیں تھا، لیکن جہاں تک پنجاب کا تعلق تھا، سائرل ریڈکلف نے ایک علاقے میں تمام فرقہ وارانہ حقائق کو پس پشت ڈالتے ہوئے تقسیم کا من مانا فیصلہ مسلط کر دیا۔ یہ علاقہ گورداسپور کا ضلع تھا، جہاں مکمل طور پر مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اگر یہ ضلع کلیتاً پاکستان کو دے دیا جاتا، تو ریاست جموں و کشمیر کے ساتھ

Marfat.com

ہندوستان کے تمام زمینی رابطے منقطع ہو جاتے۔ ویسے بھی یہاں کا ہندو حکمران مہاراجا ہری سنگھ ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ کر چکا تھا، باوجودیکہ یہاں کی آبادی کا بڑا حصہ مسلمان تھا، جبکہ سولہ فیصد ہندو جموں اور صرف سات فیصد کشمیر میں رہتے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس کے المناک نتائج کی پرواہ کیے بغیر اس یک طرفہ فیصلے کو منظور کر لیا۔ اس وقت یہ خبر گرم تھی کہ ریڈ کلف کو انڈین نیشنل کانگرس نے مہاراجہ کی اشیرباد سے ایک خطیر رقم بطور رشوت پیش کی تھی۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے، ان تمام سازشوں کا ہمیں علم نہیں تھا۔ ڈلہوزی کی مسلمان آبادی اور گرمیوں کے موسم میں یہاں آئے ہوئے سیاحوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ضلع گورداسپور (جس میں ڈلہوزی شہر واقع تھا) لازماً پاکستان کی حدود میں شامل ہوگا۔ مگر 14 اگست کی شام کو حتمی تقسیم سے چند گھنٹے قبل، ہم یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے کہ پولیس کا ایک ہندو سپرنٹنڈنٹ ڈلہوزی کی میونسپل بلڈنگ پر ترنگا لہرا رہا ہے۔ پھر بھی ہم میں بہتوں کا یہ خیال تھا کہ سپرنٹنڈنٹ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا یوم آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی یہ کسی ہندو کی ذاتی خواہشات کا مظہر ہے۔ ہمیں اس وقت تک یہ معلوم نہیں تھا کہ نامور ماہر قانون سر سائرل ریڈ کلف کتنے بڑے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔[50]

(5)

اسی شام میں حسب معمول اپنے بیٹے طلال (جو اس وقت پندرہ سالہ نوجوان تھا) کو لے کر ڈلہوزی کی پہاڑیوں پر سیر کرنے نکلا۔ جب ہم رات گئے واپس آ رہے تھے تو ہم نے اچانک بازار کی جانب سے گولی کی سنسناتی ہوئی آواز سنی اور پھر گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ بلاشبہ یہ فساد شروع ہونے کی علامت تھی۔

کوئی مسلمان یوں گولیاں نہیں برسا سکتا تھا، کیونکہ ان میں کسی کے پاس کوئی بندوق وغیرہ نہیں تھی۔ چند روز پہلے جن کے پاس قانوناً اسلحہ تھا، ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ پھر سے رجسٹریشن کے لیے تھانوں میں جمع کرا دیں۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ معمول کی کارروائی ہے اور ایک دو روز میں یہ جمع کردہ اسلحہ انہیں لوٹا دیا جائے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا، کم از کم مسلمانوں کو ان کا اسلحہ واپس نہیں کیا گیا۔

میں اور طلال ڈلہوزی کے بالائی علاقے کی تاریک اور سنسان گلیوں سے گزرتے ہوئے جلد اپنے بنگلہ کی طرف جا رہے تھے تاکہ اسے ان بلوائیوں سے محفوظ رکھا جا سکے کہ ہماری نظر سڑک کے بیچ میں خون سے لت پت ایک شخص پر پڑی۔ ہم قریب گئے اور اسی وقت دو اور آدمی بھی وہاں آ گئے۔ میں انہیں جانتا تھا۔ وہ دونوں کینیڈا سے تعلق رکھتے تھے اور کسی بین الاقوامی تنظیم نے انہیں خلق خدا کی خدمت کے لیے یہاں بھیجا تھا۔ ہم سب خون میں لتھڑے ہوئے اس شخص کو دیکھ رہے تھے۔ اسے بڑی بے رحمی سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا اور وہ گوشت، خون اور ہڈیوں کا ایک ڈھیر سا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے جسم پر آخری بار غیر معمولی طور پر پٹھوں کے اکڑنے اور ڈھیلے ہونے کی صورت نظر آئی اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ کینیڈین کی بیٹری کی روشنی مقتول کے چہرے پر پڑی تو میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ مسلمان تھا اور موسم گرما میں آنے والے سیاح جن گھروں میں ٹھہرتے تھے، ان میں کسی گھر کا باورچی تھا۔

Marfat.com

وہ سیدھا سادہ اور بے ضرر انسان تھا، پھر اسے کیوں قتل کیا گیا؟

ہم اپنے بنگلے کی جانب سرپٹ دوڑے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ طلال کی والدہ اور ہمارا ایماندار کشمیری ملازم بیٹھک میں دبکے اور سہمے سہمے بیٹھے ہیں۔ میں بیوی کو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ ہم تینوں یعنی طلال، ملازم اور میں نے اپنے کمرے میں رات بھر پہرہ دینے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے پاس سوائے ایک پرانی فوجی تلوار کے اور کچھ نہیں تھا، جو یہاں کا کوئی سابقہ رہائشی چھوڑ گیا تھا۔ تلوار کے علاوہ لکڑیاں کاٹنے کی ایک کلہاڑی بھی تھی، لیکن ان دستی ہتھیاروں سے بڑھ کر جو خطرے کی بات تھی، وہ اس کمرے کی بیرونی دیوار تھی۔ اس کے بیشتر حصے پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ قدآدم فرانسیسی کھڑکیاں، جو برآمدے کی طرف کھلتی تھیں، اوپر سے نیچے تک شیشہ لگا ہوا، تاکہ سورج کی روشنی اندر آسکے اور ان پر کوئی پردہ بھی نہیں تھا۔

باہر سے ہمیں کوئی بھی دیکھ سکتا تھا، اس لیے میں نے تمام روشنیاں بجھا دیں اور ہم سب اندھیرے میں چوکنا بیٹھے رہے۔ گولیوں کی آوازیں قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھیں اور ان کے ساتھ ہذیانی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کسی وقت بھی حملے کا خطرہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ تاہم کسی نے ہم پر حملہ نہیں کیا۔ گولیوں اور چیخیں بھی آہستہ آہستہ کم ہو گئیں۔

صبح ہوئی تو ہم بے خوابی اور رات بھر ذہنی تناؤ میں مبتلا رہنے کے باعث تھک کر چُور ہو چکے تھے۔ ہمیں کچھ کھانے تک کا ہوش نہیں رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص دوڑتا ہوا ہمارے گھر آیا۔ یہ میرے ایک لاہوری دوست کا گھریلو ملازم تھا اور وہ ہمارے پڑوس ہی میں رہتا تھا۔ وہ ایک ضروری پیغام لے کر آیا کہ ہم اپنا ضروری سامان باندھ کر اس کے مالک کے گھر چلے آئیں۔ یہ ڈلہوزی کا سب سے بڑا گھر تھا، جہاں بہت سے مسلمان گھرانے اپنی جانوں کی حفاظت کے لیے جمع ہو چکے تھے۔

چنانچہ ہم نے فوراً اس پیغام پر عمل شروع کر دیا۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکا، سامان سوٹ کیسوں میں بند کیا اور ویران گلیوں سے ہوتے ہوئے اپنے دوست کے گھر پہنچے جو مردوں، عورتوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کم از کم ان کی تعداد ایک سو تو ہو گی۔ وہ تمام رات اس پناہ گاہ میں رہے۔ گھر میں کھانے پینے کی جو چیزیں میسر تھیں عورتوں نے ان سے جلدی جلدی ناشتہ تیار کیا۔ یہ سب کے لیے ناکافی تھا، لیکن بھوکوں کے لیے ایک نوالہ بھی کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

ہمارے میزبان رحیم اللہ نے تھانے فون کرنے کی کوشش کی، لیکن اُدھر سے کوئی اٹھا نہیں رہا تھا، شاید تاریں کاٹ دی گئی تھیں۔ کسی نے کہا "یہ راشٹریہ سیوک سنگھ ہے۔" ہم سب جانتے تھے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ یہ ہندو انتہا پسندوں کا ایک متعصب گروہ تھا، جنہوں نے ہر قیمت پر بھارت ماتا کی "چیر پھاڑ" کو روکنے کی دھمکی دے رکھی تھی۔ [51] بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ تقسیم ہند سے پہلے بھی انہوں نے لاہور اور امرتسر کے دیہی علاقوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔ اس بہیمانہ عمل میں سکھوں نے پورا پورا تعاون کیا اور وہ اب پھر کرپانوں سے مسلمانوں کا خون

Marfat.com

بہانے میں مشغول تھے۔تاہم مسلمانوں نے بھی جواباً جہاں ممکن ہوا، ہندوؤں اور سکھوں کو قتل کرنا شروع کر دیا اور پھر مغربی اور مشرقی پنجاب کے سرحدی علاقے پر تباہی اور موت کے بادلوں کے نیچے چھپ گئے۔

رحیم اللہ کے گھر میں جو ہتھیار تھے، وہ پناہ لینے والوں نے اٹھا لیے،لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔صرف دو پستولیں تھیں، ایک چھوٹی خود کار اور دوسری اعشاریہ بائیس فلوبرٹ پستول۔ان کے علاوہ ایک پرانی وضع کی بندوق تھی جو ہمارے میزبان کے دادا کی ملکیت تھی اور اس کی رجسٹریشن بھی نہیں کرائی گئی تھی۔ یہ بندوق کار آمد ضرور تھی لیکن اس کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔اس کا گھوڑا زنگ آلود اور اس کا پچھلا حصہ شکستہ تھا اور اس کو تار کے ساتھ نالی تک باندھا گیا تھا۔صرف پانچ یا چھ کارتوس باقی رہ گئے تھے۔ مجھے شک تھا کہ یہ پرانی بندوق فائرنگ کا دھچکا برداشت کر سکے گی یا گھوڑا دباتے ہی پلٹ جائے گی۔تاہم ایک پرانی ضرب المثل کے مطابق ''فقیر انتخاب نہیں کر سکتے'' مجبوراً اسی پرانی بندوق سے مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔

اس دن کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا،سوائے دور سے بندوق چلنے کی اِکا دُکا آوازوں اور زیریں ڈلہوزی کے بازار سے گاہے بگاہے شور وغل کے۔لیکن جونہی رات کا اندھیرا چھایا، ہم نے بعض انسانی سایوں کو حرکت کرتے دیکھا، جو باغ کے نیچے ڈھلوان پر جھاڑیوں میں دبے پاؤں چلے جا رہے تھے۔کبھی کبھار دبی آواز میں کسی کے رونے کی بھی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ بلاشبہ ہم چاروں طرف سے محاصرے میں تھے۔ہم تینوں آتشیں اسلحہ لیے رات کا بیشتر حصہ کھڑکیوں کے قریب بیٹھے رہے۔باری باری سے ہم ایک دوسرے کو آرام کے لیے وقفہ دیتے تھے۔

یہ ایک بھیانک رات تھی۔گھپ اندھیرے کمرے کی کھڑکیوں کے پاس پیٹ کے بل لیٹے تھے اور ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں کسی متحرک شے کا جائزہ لے رہے تھے۔ باہر سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔صرف بندر حسب معمول مکان کی ٹین کی چھت پر اچھل کود رہے تھے۔بہت سے ننھے منے پیروں کے اِدھر اُدھر پھدکنے کی آواز، کبھی کبھار تیز گہری چیخ، دوستانہ ننھی آوازیں، مہربان چھوٹے جانور یعنی یہ بندر جو اپنی تفریح طبع میں مگن رہتے اور بسا اوقات تھوڑی سی کھانے پینے کی کوئی چیز چرا کر کھا جاتے۔

رات کے تین بجے میں نے باغ کے نچلے حصے سے ایک اکھڑ اور دبی سی آواز سنی۔گھر کے قریب بلند پہاڑی سے فوراً بآواز بلند جواب دیا گیا۔خدشہ تھا کہ میری بندوق کہیں پھٹ نہ جائے، میں نے نشانہ باندھا اور گھوڑا دبا دیا۔توپ کے گولے کی طرح ایک دھڑاکے کی آواز گونجی اور اس کی واپس آتی ہوئی آواز نے مجھے پچھاڑ دیا۔باہر سے ایک گرجدار آواز آئی اور پھر پُراسرار خاموشی چھا گئی۔کیا میرا نشانہ ٹھیک لگا یا چوک گیا؟ میں نہیں جانتا،لیکن اس کے بعد رات کے بقیہ حصے میں کوئی متحرک چیز دکھائی نہ دی اور نہ کوئی آواز ہمیں سنائی دی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ محاصرہ اٹھا لیا گیا تو میں نے اپنے ساتھی سے خود کار پستول لیا، اپنی سفید قمیض کے اوپر کوٹ پہنا اور خاموشی سے صحن کا ایک چکر لگانے کے لیے باہر نکلا۔کوئی حملہ آور نظر آیا، نہ اس کی آواز سنائی دی۔

سورج طلوع ہوتے ہی باغ کے نشیبی علاقے سے گرجدار آواز سنائی دی اور وہ ایک نوجوان برطانوی افسر

Marfat.com

کی تھی۔ اس نے پوچھا ''کیا سب ٹھیک ٹھاک ہے؟'' وہ گورکھا سپاہیوں کے ایک فوجی دستے کا افسر تھا۔ یہ فوجی اب جھاڑیوں میں کھڑے نظر آ رہے تھے۔ وہ ہمیں رہا کرانے یہاں آئے تھے اور انہی سے ہمیں پتہ چلا کہ رات کو اکثر مسلمانوں کو ڈلہوزی کے نچلے علاقے میں ذبح کر دیا گیا۔

(6)

آٹھ یا دس لاریاں ہمیں اور ڈلہوزی کے دوسرے مسلمانوں کو لاہور لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ ہماری جان و مال کی حفاظت کی غرض سے گورکھا سارجنٹ اور اس کے ساتھ چند افراد دو جیپوں پر سوار تھے۔ ہمارا تمام منقولہ سامان کھلے ٹرکوں پر رکھ دیا گیا اور اس کے اوپر ہم سب یعنی مرد، عورتیں اور بچے ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے سمٹے سمٹائے بیٹھے تھے۔ یوں یہ بدرقہ (convoy) گورکھوں کی دو جیپوں کی نگرانی میں روانہ ہوا۔ آہستہ آہستہ یہ قافلہ پہاڑی سڑک کے موڑ کاٹتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس سڑک کے دونوں طرف اونچی نیچی پہاڑی سلسلے اور ڈھلوانوں پر گہری کھائیاں تھیں۔

بدرقہ ہر زمینی پلی نلیا (culvert) پر رک جاتا اور گورکھا سپاہی اس کے نچلے حصے کا بغور جائزہ لیتے کہ وہاں کسی نے کوئی دھماکہ خیز چیز نہ رکھ دی ہو، کیونکہ جیسا کہ انہوں نے بتایا کہ راشٹریہ سیوک سنگھ والوں نے سوگند اٹھا رکھی ہے کہ وہ ہمیں زندہ سلامت یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔ بہرکیف وہاں سے ایسا کوئی آتشگیر مادہ نہیں ملا، لیکن اس سے بھی بدتر صورت حال کا سامنا کرنا پڑ گیا۔

ہمارے بدرقہ کی چند اگلی لاریاں سڑک کا ایک موڑ کاٹ رہی تھیں کہ اچانک دو گھسی پٹی چٹانیں اوپر تلے لڑھک کر نیچے آ رہیں۔ بحمد للہ ہم ان کی زد میں نہیں آئے۔ صریحاً یہ گھات لگا کر ہم پر حملہ کیا گیا تھا۔ ہمیں بہت سے لوگ پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے نظر آ رہے تھے جو ایسی ہی چٹانیں لڑھکانے کو تیار بیٹھے تھے۔ جب ایسی مزید چٹانیں لڑھکتی ہوئی نیچے آنے لگیں تو ہمارے ساتھی گورکھوں کا سر گھوم گیا اور وہ اپنی رائفلوں سے اوپر کھڑے حملہ آوروں پر گولیاں برسانے لگے۔ ان کو ہدف تو ضرور بنایا گیا تھا، لیکن ان کا زندہ سلامت رہنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ وہ اپنی سمت آنے والی چٹان کے اوپر سے اچھل گئے اور وہ ہماری لاریوں کی چھتوں سے ہوتے ہوئے نیچے کھائی میں جا گرے۔ اس کے بعد چٹانیں لڑھکانے کا یہ سلسلہ رک گیا اور یوں یہ خطرناک حملہ ناکام ہو گیا۔

ہمارا قافلہ رواں دواں رہا اور راستے میں ہم پر کوئی اور حملہ نہیں ہوا۔ سہ پہر کو ہم لاہور پہنچ گئے۔

(7)

لاہور میں افراتفری کا عالم تھا۔ مسلمان مہاجرین کثیر تعداد میں ہر روز نہیں بلکہ ہر ایک گھنٹے بعد ہندوستان سے پہنچ رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر مفلوک الحال اور بیماریوں سے نڈھال تھے۔ ان میں وہ زخمی لوگ بھی تھے جو فرقہ

Marfat.com

وارانہ فسادات کا نشانہ بنے اور زخموں سے کراہتے ہوئے یہاں تک پہنچے۔ ڈاکٹروں، ہسپتال کی نرسوں اور عملہ صفائی کے علاوہ سینکڑوں کارکنوں نے رضا کارانہ طور پر دن رات ان بیماروں کی تیمارداری کی اور جو چل پھر سکتے تھے، ان کے لیے خوراک اور رہائش کا بندوبست کیا۔

مغربی پنجاب کی حکومت ابھی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہی تھی۔ فوج بھی اتنی نہیں تھی کہ وہ نئی سرحدوں کی حفاظت کر سکتی اور پنجاب کی پولیس اور کانسٹیبلری کے کاموں میں ہاتھ بٹا سکتی۔ ہندوؤں اور سکھوں کے چلے جانے سے ان کی اپنی تعداد خاصی کم ہو گئی تھی۔ اس بنا پر امن وامان کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ تقسیم ہند سے ذرا پہلے ہندوستان کی عبوری حکومت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو (جن کے پاس محکمہ دفاع بھی تھا) نے خاص مقصد کے تحت مسلمان فوجی یونٹوں کو ان علاقوں سے، جنہیں پاکستان کا حصہ بننا تھا، تبدیل کر کے جنوبی ہند کے صوبہ مدراس اور ریاست ٹراونکور بھجوا دیا تھا، اس لیے اب پاکستان میں فوجیوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب رہ گئی تھی۔ مزید یہ کہ مہاجرین کے جتھے دونوں جگہوں سے آ جا رہے تھے، اس لیے سڑکوں پر چلنے والی گاڑیاں بھی کم پڑ گئیں۔ ہندوستان سے آنے والے تھکے ہارے اور پریشان حال مسلمان میلوں چل کر پہنچ رہے تھے اور شہر میں مختلف مقامات پر قائم کردہ کیمپوں میں عارضی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ بیماروں اور شدید زخمیوں کو رضا کار ہنگامی صورت حال سے نپٹنے کے لیے عارضی ہسپتالوں میں لے جا رہے تھے۔

میں نے چودھری نیاز علی اور اُن کے بڑے خاندان کا پتہ لگانے کی بہت کوشش کی۔ آخری بار میں نے انہیں ڈلہوزی جاتے ہوئے جمال پور میں دیکھا تھا۔ ان کی خیریت کے بارے میں سخت مضطرب تھا۔ بدحواسوں جیسی میری پوچھ گچھ بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ میں نے یہ فرض کر لیا کہ وہ ابھی جمال پور میں گھرے ہوئے ہیں اور یہ علاقہ اب مشرقی پنجاب کا حصہ بن چکا ہے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اُن کی جاگیر میں دیگر مسلمان بھی رہتے تھے۔ حیدرآباد دکن کے نوجوان عالم دین مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے پیروکار بھی وہیں تھے، جنہوں نے بعد میں تحریک احیائے دین کو فروغ دینے کے لیے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی۔ اگر انہیں پاکستان نہیں لایا گیا تو وہ یقیناً فسادات کی نذر ہو جائیں گے۔[52]

میں ایک ایسے شخص سے ملنے گیا جو لاہور کی بے ہنگم ٹریفک کے نظام کا مدارالمہام تھا۔ میری طرح وہ بھی علامہ محمد اقبال کے بے تکلف احباب میں شامل تھا اور مجھ سے ان کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ ان کا نام خواجہ عبدالرحیم تھا۔[53]

مجھے وہ ایک سرکاری دفتر میں مل گئے۔ وہ مشتعل لوگوں کے ہجوم میں پھنسے بیٹھے تھے، جو ان سے کار یا لاری یا بیل گاڑی مہیا کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ خواجہ عبدالرحیم ان کے تمام مطالبات پورا کرنے کا یقین دلا رہے تھے۔ دائیں بائیں چلتے ہوئے انہیں کبھی نرم لہجے میں اور کبھی غصے سے سمجھانے کی کوشش کرتے لیکن انتہائی ابتر صورت حال کو سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔

Marfat.com

اس بے قابو ہجوم کی دھکم پیل میں سے گزرتے ہوئے میں نے عبدالرحیم کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کر دیا۔ دوسروں کو چپ کراتے ہوئے میں نے انہیں چند لاریاں اور فوجی حفاظتی دستہ مہیا کرنے کی درخواست کی تاکہ جمال پور میں پھنسے ہوئے لوگوں کو بچایا جا سکے۔ میری طرح خواجہ عبدالرحیم بھی ان اصحاب کو بخوبی جانتے تھے۔ انہوں نے مایوسانہ لہجے میں گرجتے ہوئے جواب دیا ''اگر میرے پاس کوئی ٹرانسپورٹ ہی نہ ہو تو میں آپ کو کہاں سے دے سکتا ہوں۔ کیا آپ نہیں دیکھ رہے کہ میں کسی کی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔''

میں نے اصرار کیا ''مجھے ہر صورت میں مطلوبہ چیزیں چاہئیں۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا، جب تک میری ضرورت پوری نہیں ہوتی۔''

یہ تُو تکار جاری رہی۔ دونوں بے چینی سے اِدھر اُدھر چلتے رہے، میز پر مکّے مارتے رہے اور ایک دوسرے کو گالیاں بھی دیتے رہے۔ اس سے پہلے کہ ہم دست بہ گریباں ہو جاتے، اچانک خواجہ عبدالرحیم بولے ''تھوڑی دیر انتظار کرو۔ میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔'' انہوں نے ٹیلی فون اٹھایا اور کسی سے بات کی۔

میں کامیاب رہا۔ مجھے مونسپل کمیٹی کی بسیں لے جانے کا تحریری حکم نامہ مل گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ سہ پہر کو حفاظتی دستے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

اگلے روز صبح سویرے میں جمال پور روانہ ہو گیا۔ میرے ہمراہ تین بسیں اور چار مسلح پنجابی پیادہ فوجی بھی تھے، جو دنیا میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ میری بچاؤ مہم آگے بڑھ رہی تھی۔

(8)

ایک دفعہ پھر میں دشمنوں کے علاقے میں داخل ہو رہا تھا۔ گورداسپور کے نزدیک سرحدی چوکی پر ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ کچھ دیر پہلے پاکستان اور ہندوستان کے متعلقہ افسران کے درمیان معاہدہ طے پا گیا تھا جس کے تحت مہاجرین ایک دوسرے کے ملک میں بغیر روک ٹوک آ جا سکتے تھے۔ پھر بھی ہندوستان کے سرحدی محافظ دستے ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھتے رہے۔ انہیں یقین دلا دیا گیا تھا کہ ہمارے پاس محافظ فوجی دستے کے قانونی اسلحہ کے علاوہ اور کسی قسم کا ممنوعہ اسلحہ نہیں ہے۔

جب ہم جمال پور، چودھری نیاز علی کے علاقہ میں پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ کم از کم ایک ہزار مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں نے ان کے قلعہ نما صحن میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ اپنا سب کچھ لٹا کر گرد و نواح کے دیہاتوں سے یہاں یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ کوئی بندۂ خدا انہیں پاکستان لے جائے گا۔ میں جو تین بسیں ساتھ لایا تھا، وہ اتنی بڑی تعداد کے لیے ناکافی تھیں، لیکن میں نے ان کے ترجمان سے وعدہ کیا کہ میں لاہور پہنچتے ہی میں ان کی محفوظ نقل مکانی کا انتظام کر دوں گا (بعد میں یہ لوگ پاکستانی فوجی دستے کے ساتھ بحفاظت لاہور پہنچ گئے تھے)۔

میں یہ جان کر مطمئن ہو گیا کہ چودھری نیاز علی، ان کے خاندانی افراد اور ان کے رفیق کار ابوالاعلیٰ مودودی

Marfat.com

مع اپنے ساتھیوں کے ان خونریز ہنگاموں سے محفوظ رہے۔ میری تین بسوں میں انہیں لے جانے کے لیے جگہ بن سکتی تھی، بشرطیکہ وہ صرف اپنا ضروری سامان ساتھ لے جائیں۔ ان میں بعض تو بسوں کی چھت پر بھی بیٹھنے کو تیار ہو جاتے۔ میں نے انہیں روانگی سے قبل واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ وہ اپنے پاس کوئی اسلحہ نہیں رکھیں گے (مولانا مودودی کے ساتھی جمال پور سے چند رائفلیں اور چھوٹی بندوقیں لے آئے تھے)، کیونکہ ہندوستان کا سرحدی عملہ بسوں کے کونے کونے کی تلاشی لیتا تھا۔

سورج ڈھلنے سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہم نے اپنی واپسی کا سفر شروع کیا۔ یہ تینوں بسیں آدمیوں اور ان کے سامان سے اوپر تک لدی ہوئی تھیں۔ ہر بس کی چھت پر بھی خاصی تعداد میں لوگ بیٹھے تھے۔ میں اگلی بس میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور ہمارے محافظ سپاہی مہاجرین ہی میں سمٹے سمٹائے بیٹھے تھے۔

سرحد عبور کرنے سے ذرا پہلے ایک شخص نے ہمیں روکا۔ وہ سڑک کے بیچ میں کھڑے کھڑے اشاروں سے کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ایک سفید ریش بوڑھا سکھ اپنا بازو اوپر اٹھائے بآواز بلند ہمیں رکنے کے لیے منت سماجت کر رہا تھا۔

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈرائیور نے آواز دی ''نہیں، ہمیں رکنا نہیں چاہیے۔ ممکن ہے یہ شخص اچانک حملہ کرنے کے لیے گھات میں بیٹھا ہو۔'' لیکن میں نے کچھ کچھ اندازہ لگا لیا کہ اس کا خدشہ درست نہیں کیونکہ اس بوڑھے سکھ کے ارادے خطرناک دکھائی نہیں دیتے تھے۔ میری سوچ درست تھی۔

جونہی تین بسوں پر مشتمل ہمارا یہ قافلہ رکا، وہ بوڑھا سکھ قریب آیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا ''سنو! میرے گھر میں ایک مسلمان خاندان چھپا بیٹھا ہے۔'' اور پھر اس نے ہمیں بتایا کہ ''وہ مسلمان اسی کے گاؤں کے رہنے والے تھے اور جب تقسیم سے ایک روز قبل مار دھاڑ اور قتل و غارت گری شروع ہوئی تو وہ اپنی جانیں بچانے اس کے ہاں آ گئے۔ تین دن اور تین راتیں میں نے انہیں اپنے گھر میں پناہ دی اور میرے چاروں بیٹے گھر کے سامنے تلواریں نکالے پہرہ دیتے رہے لیکن اب ہمارے لیے انہیں زیادہ دیر محفوظ رکھنا ممکن نہیں، کیونکہ اس گاؤں کے دوسرے سکھ غصے سے بے قابو ہوتے جا رہے ہیں کہ میں نے ان کے دشمنوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ ان کے ارادوں کو بھانپ کر میں نے اس مسلمان خاندان کو اپنے کماد کے کھیت میں چھپا رکھا ہے۔ کرپا کیجئے اور انہیں اپنے ساتھ لے جائیے۔ میرے لیے انہیں مزید چھپائے رکھنا ممکن نہیں۔''

ڈرائیور پس و پیش کرتے ہوئے کہنے لگا ''ہم انہیں کیسے لے جا سکتے ہیں؟ تمام بسیں تو پہلے ہی چھتوں تک بھری پڑی ہیں۔'' لیکن میں نے اس کے احتجاج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نیک خصلت عمر رسیدہ سکھ سے اس مسلمان خاندان کو لانے کے لیے کہا۔ چند منٹوں بعد وہ سب لوگ پہنچ گئے۔ تین آدمیوں کے علاوہ ایک عورت، جس نے ایک بچے کو اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اس قدر خوفزدہ تھے کہ ان سے بولا بھی نہیں جاتا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ ہماری تین بسوں میں ان کے لیے کیسے جگہ بنائی گئی۔ میں نے اس بوڑھے نیک دل سکھ کا شکریہ ادا کیا اور اس کے لیے دیر تک دعا کرتا

Marfat.com

رہا۔ اس کے بعد ہم پھر اپنی منزل مقصود کی جانب چل پڑے۔

(9)

ہندوستان کی سرحدی چوکی پر پہنچتے ہی مجھے ایک چونکا دینے والی حیرت انگیز اطلاع ملی۔ مولانا مودودی کے ایک رفیق کار نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا کہ میرے منع کرنے کے باوجود وہ اور اس کے بعض ساتھی اپنی رائفلیں اور چھوٹی بندوقیں قالین میں چھپا کر لے آئے ہیں اور یہ قالین ایک بس میں منوں سامان کے نیچے دبا پڑا ہے۔

میں یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ اگر تلاشی لی گئی اور یہ آتشیں اسلحہ مل گیا تو میری یہ ساری دوڑ دھوپ بیکار ہو جائے گی۔ اس صورت میں سرحدی گارڈ ہم سب کو روک لیں گے اور مہاجرین کو پاکستان جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس وقت ہم سرحدی چوکی کے بالکل سامنے کھڑے تھے، اس لیے بندوقوں کو کہیں باہر بھی نہیں پھینک سکتے تھے۔

مجھے سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے سر پر دھوپ سے بچانے والا ایک ہیلمٹ مضبوطی سے جمایا اور ہندوستانی چوکی کے سامنے پڑی ہوئی میز کی جانب قدم قدم چلنے لگا۔ میرا چہرہ مہرہ، سر اور داڑھی کے بالوں کا رنگ ایسا تھا کہ کسی کو میرے یورپین ہونے کا شک نہیں ہو سکتا تھا۔

میں ہندوستانی سپاہیوں سے خوش اخلاقی سے ملا اور ان سے بڑے نرم لہجے میں گفتگو کرتا رہا۔ میں نے انہیں انجمن ہلال احمر کے سوئٹزرلینڈ کے نمائندے کا تاثر دیا اور کسی بھی ہندوستانی نے میرے شناختی کاغذات کا مطالبہ نہیں کیا۔ میں نے انسانیت سوز مظالم پر غم وغصہ کا اظہار کیا، لٹے پٹے مہاجرین زاروقطار روتے ہوئے جو شکایات کر رہے تھے، ان کا بھی ذکر کیا اور ان کے ظالمانہ طرز سلوک کی بھی سرزنش کی۔

ہندوستانی سارجنٹ اور اس کے ساتھیوں نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور مجھے چائے کی دعوت دی۔ ہم کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے شدید بے چینی کی حالت میں جلدی جلدی چائے پی کہ انہوں نے مجھے دوسرا کپ پیش کر دیا۔ کسی نے بسوں کی تلاشی کے بارے میں نہیں سوچا اور تھوڑی دیر بعد مجھے سرحد پار کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ہم آگے بڑھے اور چند منٹوں میں ہم سرحد پار کر گئے اور ہندوستان ہمارے بہت پیچھے رہ گیا۔ یوں میری زندگی کا ایک باب ختم ہوا، لیکن بڑی تلخ یادوں کے ساتھ۔

کچھ ہفتوں بعد مجھے پتہ چلا کہ جمال پور میں میرے کتب خانے کو لوٹ مار کرنے والے سکھوں نے تباہ و برباد کر دیا۔ میری تمام عربی کتب (جنہیں غالباً لوٹ مار کرنے والوں نے ''ناپاک'' سمجھا ہو) ''صحیح بخاری'' کے مسودات (تقریباً دو تہائی حصہ ابھی غیر مطبوعہ تھا) کے احمقانہ غم وغصہ اور غارت گری کا شکار ہو گئے اور میری برسوں کی محنت ضائع ہو گئی۔

لاہور واپس آنے کے چند روز بعد میں دریائے راوی کے کنارے کنارے چہل قدمی کر رہا تھا۔ مون سون کی بارشیں ختم ہو چکی تھیں لیکن اس کی لہروں میں تلاطم کے آثار موجود تھے۔ ہر طرح کا کاٹھ کباڑ پانی میں بہتا جا رہا تھا۔

Marfat.com

درختوں کی ٹوٹی شاخیں، لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے، چیتھڑے اور کاغذات۔ مجھے خیال آیا کہ اگر کسی بہتے ہوئے کوڑا کرکٹ میں مسودے کا کوئی حصہ محفوظ رہ گیا ہو تو میں اس کے ہلکے نیلے رنگ سے پہچان لوں گا، کیونکہ میں لکھتے ہوئے ایسا ہی کاغذ استعمال کرتا تھا۔ چنانچہ اسی ہلکے نیلے رنگ کے بہت سے بکھرے ہوئے کاغذ نظر آئے، جو دریائے راوی کی سطح آب پر تیزی سے بہتے چلے جا رہے تھے۔

(10)

لاہور اس سے پہلے کبھی اتنے انتشار و بدنظمی کا شکار نہیں ہوا تھا۔ مہاجرین کی مسلسل اور تکلیف دہ آمد کے ساتھ ساتھ پورے شہر میں ہوشربا افواہیں گرم تھیں۔ خاص طور پر ناگزیر ہندوستانی حملے کی خبر تو ہر جگہ گردش کر رہی تھی۔ امرتسر کی جانب سرحد تقریباً چار میل کے فاصلے پر تھی اور یہ کہا جاتا تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان نظر نہ آنے والی لکیر پر ہندوستانی فوجی دستے جمع ہو رہے ہیں۔ ہمارے کچھ لوگ ابھی تک خوشیاں منا رہے تھے، جبکہ بیشتر خوفناک اندیشوں میں مبتلا تھے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، ان دنوں پاکستان کے پاس کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی۔ بلوچ رجمنٹ کی ایک بٹالین اور آٹھویں پنجاب رجمنٹ کی ایک کمپنی کے علاوہ باقی تمام مسلمان فوجی ابھی تک جنوبی ہند میں پھنسے ہوئے تھے۔

ہندوستان کے مخاصمانہ عزائم کے بارے میں دہشتناک افواہوں کے علاوہ لاہور بے یقینی اور قیاس آرائی کے جھکڑوں کی زد میں تھا۔ شہریوں کی کثیر تعداد پاکستان کی سرکار پر معترض تھی اور اسے ذاتی مقام و منصب میں ترقی کا زینہ قرار دیتے تھے۔ لوگ سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کی غرض سے ساز باز کرتے پھرتے تھے اور ہر شخص حکومتی انتظام و انصرام کو مستحکم بنیادوں پر استوار ہونے سے قبل اپنے لیے کوئی سرکاری ملازمت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ کمینگی عروج پر تھی، لیکن ایثار ذات کے ایمان افروز مناظر اور واقعات کی بھی کمی نہیں تھی۔ خوشی، خوف اور لالچ حیران کن حد تک آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔

اس پریشان کن صورت حال میں مغربی پنجاب کے نئے وزیر اعلیٰ نواب آف ممدوٹ نے جن کی صاف گوئی کے سبھی معترف تھے، مجھے بلایا اور روز افزوں افراتفری کے سدباب کے لیے تعاون کی پیش کش کی، چنانچہ ریڈیو سے ہر روز میری تقریر نشر ہونے لگی۔ میری یہ تمام ریڈیائی تقاریر کا عنوان تھا ''تمام مسلمانوں کے لیے دعوت عام۔''

ہر صبح میں ایک سرکاری دفتر میں اپنے ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جاتا۔ سخت محنت اور جانکاہ کوشش سے انگریزی میں اپنی تقریر کو آخری شکل دیتا اور پھر دوپہر کو یہ تقریر نشر ہو جاتی۔ فوراً اس کو اردو میں منتقل کیا جاتا اور شام کی نشریات میں یہ اردو ترجمہ بھی نشر ہو جاتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میری یہ تقاریر لوگوں کی ہمت اور حوصلہ بڑھانے میں کس قدر ممد و معاون ثابت ہوئیں، لیکن میرے بعض دوستوں نے بتایا کہ ان تقریروں نے لوگوں میں امید کی کرن پیدا کرنے اور ان کی ہمتوں کو بڑھاوا دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔[54]

Marfat.com

اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے علاوہ میں ہر روز بیسیوں رضا کاروں کے ساتھ ہندوستان سے آنے والے ہزاروں مہاجرین کو بنیادی ضروریات زندگی فراہم کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ایک روز ہمیں مشرقی پنجاب (ہندوستان) کے شہر فیروز پور کے اسٹیشن ماسٹر کا ٹیلی فون موصول ہوا۔اس نے اطلاع دی کہ مقررہ پروگرام سے ہٹ کر ابھی ابھی مہاجر عورتوں کی ایک گاڑی روانہ ہوئی ہے اور وہ چند گھنٹوں میں قصور کی سرحد پر پہنچ جائے گی۔میں نے جلدی جلدی لاریوں کا انتظام کیا اور رضا کاروں کو ان پر سوار کر کے قصور کی طرف روانہ ہو گیا۔

قصور پہنچا تو وہاں میرے انتہائی مخلص اور پرانے دوست مولانا عبداللہ قصوری اور ان کے بیٹے محمد علی قصوری[55] سے ملاقات ہوئی۔ہم سب ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ایک گھنٹے بعد وہ گاڑی بھی پہنچ گئی۔اس میں ہر عمر کی کم از کم دو سو عورتیں تھیں اور یہ دیکھ کر ہم سب کے اوسان خطا ہو گئے کہ یہ سب مادرزاد برہنہ تھیں۔وہ تمام مسلمان خواتین تھیں جو زیادہ تر خود کو سر سے پاؤں تک برقعہ میں چھپائے رکھتی تھیں۔کچھ خواتین برقعہ نہیں اوڑھتی تھیں،لیکن انہوں نے شرم و حیا اور ضبط نفس کے نسوانی ماحول میں پرورش پائی تھی،اور اب انہیں گاڑی سے اسی برہنہ حالت میں نیچے اتارا جا رہا تھا،جس میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ان میں نوجوان،ادھیڑ عمر،عمر رسیدہ عورتیں اور نابالغ لڑکیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔

ہمارے پاس ان کا تن ڈھانپنے کے لیے اتنی تعداد میں کمبل بھی نہیں تھے۔رضا کاروں نے اپنی قمیضیں اور کوٹ اتار کر ہندوؤں کی بربریت اور وحشی پن کا نشانہ بننے والی سسکیاں بھرتی ہوئی ان عورتوں کی برہنگی کو چھپانے کی کوشش کی،لیکن ان کی تعداد بھی اتنی نہیں تھی کہ تمام عورتوں کے تن ڈھانپ سکتے۔مجبوراً ہم نے ان مصیبت زدہ عورتوں کو بعجلت ممکنہ لاہور کے ہسپتالوں اور عارضی پناہ گاہوں میں پہنچایا۔یہ میری زندگی کے انتہائی کربناک تجربات میں سے ایک تھا۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

باب ہفتم

احیاءِ ملتِ اسلامیہ
(1947ء-1950ء)

(1)

اکتوبر 1947ء کی صبح کو نواب آف ممدوٹ نے مجھے اپنے دفتر بلایا۔ اس وقت ان کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ دراز قد، صحت مند، خاموش طبع اور صاف ستھرے ذہن کے مالک تقسیم ہند سے قبل وہ ایک چھوٹی سی ریاست یا بالفاظ دیگر جاگیر کے کرتا دھرتا تھے۔ یہ جاگیر سترہویں صدی عیسوی میں ایک مغل حکمران نے دی تھی۔ نواب صاحب تحریک پاکستان کے اکابرین میں شامل رہے اور اپنی ذاتی دولت کا بڑا حصہ اس تحریک کی نذر کر دیا۔ یہ جاگیر مشرقی پنجاب میں واقع تھی، چنانچہ تقسیم کے وقت اسے ہندوستان ہی میں چھوڑ آئے اور لاہور آ کر یہاں ایک متوسط درجے کے گھر میں سکونت پذیر ہو گئے۔[56] ان کی وفاداری اور راست بازی کے پیش نظر محمد علی جناح نے پاکستان کے قائم ہوتے ہی انہیں مغربی پنجاب کا پہلا وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ اس بنا پر انہیں قائداعظم کے قریب ترین رفقاء میں شمار کیا جانے لگا۔

جونہی میں ان کے دفتر میں داخل ہوا، ممدوٹ صاحب رسمی تکلفات کی پرواہ کئے بغیر کہنے لگے ''اسد صاحب! میرے خیال میں اب ہمیں نظریاتی مسائل کو حل کرنے کے لیے کوئی ٹھوس اقدام اٹھانا چاہئیں۔ آپ نے ان کے بارے میں تقریراً اور تحریراً بہت کچھ کیا۔ اب آپ کیا تجویز کرتے ہیں؟ کیا ہمیں وزیر اعظم سے رجوع کرنا چاہیے؟''

کئی روز سے مجھے ایسے سوال کا انتظار تھا، چنانچہ میں نے پہلے ہی سے اس کا جواب سوچ رکھا تھا۔

''ابھی مرکزی حکومت نے ان مسائل کا ذکر نہیں کیا، اس لیے نواب صاحب! آپ ہی اس ضمن میں پہل کیجئے۔ میری رائے میں آپ ہی کو پنجاب میں ایک ایسا خصوصی ادارہ قائم کرنا چاہیے، جو ان نظریاتی مسائل کو زیر بحث لا سکے، جن کی بنیاد پر پاکستان معرض وجود میں آیا ہے۔ خدا نے چاہا تو آئندہ حکومتِ کراچی بھی اس اہم فریضے کی جانب متوجہ ہو گی۔ اس وقت وہ اپنی خارجہ پالیسی کو تشکیل دینے میں مصروف ہے۔ ان حالات میں شاید وزیر اعظم یا قائداعظم

Marfat.com

اِدھر زیادہ توجہ نہ دے سکیں۔''

نواب صاحب فوری قوت فیصلہ کی صلاحیت کے مالک تھے، چنانچہ انہوں نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے پوچھا ''آپ کے اس مجوزہ ادارے کا کیا نام ہونا چاہیے؟''

میں نے جواباً عرض کیا ''اس کا نام ''محکمہ احیاء ملت اسلامیہ'' مناسب رہے گا، کیونکہ اس سے ہمارے مقصد کی بھرپور ترجمانی ہوگی، یعنی صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنی معاشرتی زندگی اور فکر کی تعمیر نو۔''

ممدوٹ صاحب نے بلاتوقف کہا ''بالکل درست۔ ایسا ہی ہوگا۔ آپ اس ادارے کے قیام کا منصوبہ اور اس کے اخراجات کا ایک تخمینہ تیار کیجئے۔ آپ کو سرکاری طور پر اس ادارے کا ناظم مقرر کیا جاتا ہے اور آپ کی ماہوار تنخواہ شعبۂ اطلاعات کے ناظم جتنی ہوگی۔ مجھے امید ہے، آپ اسے قبول کرلیں گے۔''

مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی فیصلہ ہو جائے گا، لیکن نواب آف ممدوٹ کے فیصلوں کا یہی انداز تھا۔

چند دنوں کے اندر اندر اس ادارے کا رسمی میمورنڈم تیار ہو گیا۔ اس کے اخراجات کے تخمینے پر بحث ہوئی۔ شعبہ مالیات کے سربراہ کے صلاح مشورے سے یہ منظور ہو گیا اور سرکاری اطلاع نامہ بھی جاری کر دیا گیا۔ یوں دیکھتے دیکھتے محکمہ احیاء ملت اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔ پوری اسلامی دنیا میں یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلا ادارہ تھا۔

میں نے لاہور کے بعض معروف علمائے دین بالخصوص امیر جماعت اہل حدیث مولانا داؤد غزنوی[57] سے رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ایسے دو اصحاب کے نام بتائیں جو میرے تحت کام کر سکیں، عربی اچھی جانتے ہوں اور میری آئندہ کی تجاویز کو عملی شکل دینے میں جن ضروری حوالوں کی ضرورت پڑے، انہیں احادیث کے ضخیم مجموعوں میں سے تلاش کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ جلد ہی ایسے دو نوجوان اور باصلاحیت علماء دستیاب ہو گئے اور انہیں یہ کام تفویض کر دیا گیا[58]۔ علاوہ ازیں مجھے پنجاب یونیورسٹی کے ایک پُرجوش طالب علم کی جز وقتی خدمات بھی حاصل ہو گئیں[59]۔ دفتر کے دیگر انتظامی اور مالیاتی امور کو بحسن وخوبی نپٹانے کے لیے مجھے اپنے قریبی دوست ممتاز حسن کا تعاون حاصل تھا، جو مغربی پنجاب کے شعبہ مالیات کے ایک اہم عہدے پر فائز تھے اور بعد میں اس کے سربراہ مقرر ہو گئے۔[60]

(2)

اب میں باقاعدہ طور پر سرکاری ملازم تھا، اس لیے مجھے دورویہ درختوں کے ایک خوبصورت علاقہ چمبہ ہاؤس میں بلاکرایہ گھر بھی مل گیا (یہ لین مہاراجا آف چمبہ کے نام سے موسوم تھی۔ یہ ریاست کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع تھی اور تقسیم ہند سے پہلے مہاراج کا یہاں محل تھا)۔ اس گھر کے اردگرد چاروں طرف چھوٹا سا باغ تھا۔ یہ ایک تجارت پیشہ ہندو کی ملکیت تھا، جو ہندوستان ہجرت کر گیا تھا۔ ممکن ہے، وہاں اسے کسی ایسے مسلمان کا گھر مل گیا ہو، جو اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان آ گیا ہو۔ نظر بندی کیمپ سے میری رہائی کے بعد میرا بیٹا طلال کیتھولک اسکول میں

Marfat.com

بطور اقامتی طالب علم زیر تعلیم تھا۔ یہ لاہور کا اعلیٰ ترین ادارہ تھا، جس کو آئرلینڈ کے ڈومینیکن چلا رہے تھے۔ اب میں اپنی بیوی کے ساتھ لاہور ہی میں مستقلاً رہائش پذیر تھا، اس لیے طلال اس گھر میں منتقل ہوگیا اور یہیں سے ہر روز اسکول جانے لگا۔ اب میرے لیے یہ نئی صورت حال خاصی اطمینان بخش تھی۔

30 جنوری 1948ء کی صبح کو میں دفتر جانے کے لیے بذریعہ کار گھر سے نکل ہی رہا تھا (میں نے ایک متروکہ کار اپنے نام الاٹ کرالی تھی) کہ میری اپنے ہمسائے اور دوست سر سکندر حیات خاں کے بھتیجے سردار شوکت حیات[61] سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اس وقت خاصے پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے بتایا ''میں نے ابھی ریڈیو پر یہ خبر سنی ہے کہ گاندھی[62] کو قتل کر دیا گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ قاتل کوئی مسلمان نہیں ہے۔''

میں اس کی پریشانی میں برابر کا شریک تھا۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ اگر قتل کرنے والا مسلمان ہوتا، تو ہندوستانی حکومت اپنی مسلمان رعایا کے ساتھ کیا سلوک کرتی، لیکن چند گھنٹوں بعد آل انڈیا ریڈیو نے واضح بیان جاری کر دیا کہ گاندھی کا قاتل راشٹریہ سیوک سنگھ کا رکن ہے۔ یہ انہی متعصب ہندوؤں کی جماعت تھی، جس نے ڈلہوزی کے مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔

(3)

محکمہ احیاء ملت اسلامیہ کا کام آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ ہم زکوٰۃ اور عشر کے اہم موضوع[63] پر پورے انہماک سے تحقیق کر رہے تھے، کیونکہ کسی بھی اسلامی مملکت میں شرعی اعتبار سے محصولیات کی بنیاد انہی دو پر ہے۔ ابھی تلاش و تفحص کا یہ مرحلہ طے ہو رہا تھا کہ ممدوٹ صاحب نے دوبارہ اپنے دفتر بلایا۔ میرے داخل ہوتے ہی وہ حسب معمول کسی تکلف کے بغیر گویا ہوئے ''میں نے ابھی ابھی آپ کا مضمون ''اسلامی دستور سازی کی جانب' پڑھا ہے، جو ''عرفات'' کے تازہ شمارے میں شائع ہوا ہے۔ آپ انہی خطوط پر قدرے شرح و بسط کے ساتھ ایک میمورنڈم تیار کیجئے۔ میں اسے مغربی پنجاب کی حکومت کی جانب سے شائع کراؤں گا اور اس کو دیکھ کر ممکن ہے، مرکزی حکومت بھی اس جانب متوجہ ہو۔' چنانچہ 1948ء میں میرا یہی انگریزی مضمون مع اردو ترجمہ مغربی پنجاب کی حکومت کی زیر نگرانی طبع ہوا[64]۔ کچھ ہفتوں بعد وزیر اعظم کی جانب سے مجھے کراچی آنے کا پیغام موصول ہوا۔

یہ میری لیاقت علی خاں[65] سے پہلی ملاقات نہیں تھی۔ میں قیام پاکستان سے قبل ان سے گاہے بگاہے ملتا رہتا تھا۔ ان سے جب بھی گفتگو کا موقع ملتا وہ کھلے ذہن اور پوری توجہ سے میری باتیں سنتے اور ساتھ ساتھ متواتر سگریٹ نوشی کرتے رہتے (میں نے جب بھی انہیں دیکھا، انہوں نے اسٹیٹ ایکسپریس کے پچاس سگریٹوں کا پیکٹ ہاتھ میں پکڑا ہوتا یا ان کے میز پر پڑا رہتا)۔ اس ملاقات میں بھی وہ سگریٹ سے سگریٹ سلگائے جا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی سگریٹ پیش کیا، چائے منگوائی اور مجھے اسلامی دستور پر قدرے تفصیل سے لکھنے کا عندیہ دیا۔ ہماری ابتدائی دو ملاقاتوں میں بھی وہ اس اہم مسئلہ پر سنجیدگی سے گفتگو کرتے تھے۔ انہوں نے سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا

Marfat.com

''لیکن ہم اس موقع پر خود دستور سازی کا عمل شروع نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ کشمیر پر ہندوستان نے قبضہ کرلیا ہے اور ہمارے پٹھان بھائیوں کی سرینگر پر قبضہ کرنے کی کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ یہ بھی امر مسلمہ ہے کہ فوجی اعتبار سے ہندوستان ہم سے بہت مضبوط ہے۔ ہم تو ابھی حکومتی مشینری کے کل پرزے درست کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کے لیے وقت اور سعی پیہم کی ضرورت ہے۔ ہم ایک ساتھ سارے کام شروع نہیں کر سکتے۔ میں مانتا ہوں کہ دستور سازی کا عمل اہم اور دوررس نتائج کا حامل ہے، لیکن اسے بھی فی الحال مؤخر کرنا پڑے گا۔

میں وزیر اعظم کی اس گفتگو سے متاثر ہوا، کیونکہ انہوں نے بلا تکلف حکومت کو درپیش تمام مسائل کا کھل کر اظہار خیال کیا۔ میں جانتا تھا کہ میری طرح وہ بھی پاکستان کے اسلامی تشخص کو اجاگر کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے، لیکن ابھی حالات حاضرہ کے دباؤ کے تحت ادھر توجہ دینے سے گریز کر رہے تھے۔ میں نے ان کے مؤقف سے اتفاق کیا اور بوقت رخصت انہوں نے مجھے کہا ''فی الحال ہمیں خود کو اس مسئلہ پر سوچ بچار کرتے رہنا چاہیے۔''

اس کے بعد کابینہ کے سیکرٹری چودھری محمد علی 66 سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور مجھے اندازہ ہوا کہ حکومت کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ان میں سب سے بڑا مسئلہ معاشی استحکام کا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ قائد اعظم نے امیر ترین مسلمان حکمران نظام حیدر آباد دکن سے درخواست کی ہے کہ وہ پاکستان کو سونے چاندی کی شکل میں چند لاکھ پاؤنڈ سٹرلنگ ادھار دیں اور انہیں اپنے نام پر ہی بنک میں جمع کرا دیں، تاکہ پاکستانی کرنسی کو تحفظ مل سکے، لیکن نظام دولت کے انبار کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے قائد اعظم کی درخواست کو رد کر دیا۔ چند ماہ بعد ہی ہندوستان نے حیدر آباد ریاست کی خود مختار حیثیت ختم کر کے اسے اپنے ملک کا حصہ بنالیا اور نظام کے سونے چاندی کے تمام ذخیرے بھی ہندوستانی حکومت کے تصرف میں چلے گئے۔ نظام کے ساتھ ساتھ اس کی آل اولاد اور پاکستان بھی ہمیشہ کے لیے ان خزانوں سے محروم ہو گئے۔

جب میں چودھری محمد علی سے گفتگو کر رہا تھا، معاً مجھے نظام کے ذاتی خزینوں کی یاد آ گئی۔ 1939ء میں دوسری بار حیدر آباد گیا تھا اور اس وقت ریاست کے وزیر مالیات نے مجھے اس خزانے کا صرف ایک حصہ دکھایا تھا۔ متعدد کمروں میں قطار اندر قطار صندوق رکھے تھے اور یہ سب سونے اور قیمتی پتھروں سے بھرے پڑے تھے۔ ہیرے جواہرات سے بھرے لوہے کے تھال فرش پر رکھے تھے۔ مال و دولت کا ایک ناقابل یقین اور مردہ ڈھیر، جو ایک فانی شخص کی مریضانہ اور عجیب و غریب حرص کا نمونہ تھا۔ 67

(4)

لیاقت علی خاں نے اپنی گفتگو میں آزادئ کشمیر کی جس جدوجہد کا ذکر کیا تھا، وہ ہمیشہ میری اور ہر پاکستانی کی سوچ پر غالب رہی ہے۔ اس کی جغرافیائی، نسلی اور مذہبی وضع قطع کے باعث اس حسین و جمیل سرزمین کو لازماً پاکستان

Marfat.com

کا حصہ بنتا تھا۔ یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہے۔ تمام بڑے دریا (سندھ، جہلم اور راوی) مغربی پنجاب کی زمینوں کو سیراب کرتے ہیں اور یہاں کی معیشت کا انحصار مکمل طور پر انہی دریاؤں پر ہے۔ ہندوستانی حکومت اور مہاراجا کے مابین اقرارنامہ کی وجہ سے ریڈکلف نے صریحاً دھوکے بازی سے مسلمانوں کی اکثریت کا ضلع گورداسپور ہندوستان کے حوالے کر دیا اور ریڈکلف کی یہ 'نوازش' تقسیم ہند کے طے شدہ بنیادی اصول کی خلاف ورزی تھی اور اسے کوئی پاکستانی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس وقت پاکستان اپنی سربریدہ فوج کے سبب ہندوستان سے جنگ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا، اس لیے قائداعظم نے کسی فوجی مداخلت کے امکان کو بالکل رد کر دیا۔ حکومت پاکستان کی اس واضح پالیسی کے بعد صوبہ سرحد اور افغانستان کے ملحقہ علاقہ کے پٹھانوں کے قبائل پاکستان کے نام پر کشمیر کو فتح کرنے چل پڑے۔

اکتوبر 1947ء کو قبائلیوں نے حملہ کر دیا۔ محسود، وزیری اور آفریدی قبیلوں کے بڑے بڑے جتھوں نے کشمیر کی سرحد عبور کر کے بارہ مولا اور مظفر آباد پر بلا مقابلہ قبضہ کر لیا۔ سرینگر کے اردگرد جو فوج تعینات تھی، اس میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ انہوں نے بھی بغاوت کر دی اور پٹھان بھائیوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر آگے بڑھنے کو تیار ہو گئے۔ قبائلیوں کی پیش قدمی جاری تھی اور سرینگر تک پہنچنا انہیں آسان دکھائی دے رہا تھا، لیکن اس دوران میں ایک تکلیف دہ واقعہ رُونما پذیر ہو گیا۔ یہ قبائل اپنی صدیوں پرانی غارت گری کی جبلت پر قابو نہ پا سکے اور سرینگر کی جانب قدم بڑھانے کی بجائے انہوں نے مظفر آباد کے شہریوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ دو دن لوٹ مار کا یہ بازار گرم رہا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا، جسے ان قبائلیوں نے ضائع کر دیا، چنانچہ اس عرصے میں ماؤنٹ بیٹن اور جواہر لعل نہرو[68] کی ملی بھگت سے جوابی حملے کے انتظامات مکمل کر لیے گئے۔ نئی دہلی میں برطانوی فوج کے تعاون سے ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل فوجی دستوں کو جلدی جلدی منظم کیا گیا۔ انہیں ہتھیار فراہم کئے گئے اور ایک ہلکے توپ خانہ کا بھی انتظام کر دیا گیا، تاکہ وہ سرینگر پر قبضہ کر کے وہاں کے ہوائی اڈے کو بھی اپنے دائرہ اختیار میں لے آئیں۔ فوجی اور غیر فوجی جہازوں کے ذریعے ہندوستانی فوج کی خاصی بڑی تعداد کو سرینگر پہنچا دیا گیا، جہاں سے وہ ریاست کشمیر کے دوسرے حصوں پر بھی اپنا تسلط جما لیں۔ آہستہ آہستہ پٹھانوں کو نکال باہر کیا گیا اور ان کا جذبہ جہاد مدہم پڑتے پڑتے ختم ہو گیا۔

تاہم کشمیر کی جنگ ختم نہیں ہوئی۔ نئے قبائلی مجاہد اور ناگزیر طور پر پاکستانی فوج کے دستے بھی اس جنگ میں شامل ہو گئے۔ ہندوستان نے ~~اکثر~~ آدھے کشمیر پر قبضہ جمائے رکھا اور سرحد کے ساتھ ساتھ دور تک پناہ گاہیں اور خندقیں بنا لیں۔ آج تک ہندوستان کشمیر کے اس حصہ پر قابض ہے، جو گلگت سے لداخ اور کارگل کے برفانی پہاڑوں تک پھیلا ہوا ہے۔

بالآخر پاکستان مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں لے گیا، جہاں استصواب رائے کی قرارداد منظور کی گئی، جو اس علاقے کی قسمت کا فیصلہ کرے گی۔ حکومت ہندوستان نے اس قرارداد کو بڑی بے دلی سے قبول کیا، کیونکہ یہ کھلی ہوئی

Marfat.com

حقیقت تھی کہ اس قرارداد پرعمل درآمد کا نتیجہ پاکستان کی فتح ہوگا۔ چنانچہ ہندوستان حیلے بہانے سے بار بار اس مسئلہ کو ملتوی کرتا رہا۔ اب یہی مسئلہ کشمیر پاکستان اور ہندوستان کے اچھے ہمسایہ ممالک جیسے تعلقات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن چکا ہے۔ دونوں ملکوں کے سپاہی خندقوں میں بیٹھے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔

ستمبر 1948ء میں مون سون کی بارشیں رکتے ہی میں نے کشمیر محاذ پر جانے کا فیصلہ کرلیا۔

(5)

مغربی پنجاب کے فوجی افسران نے مجھے ایک جیپ اور دو سپاہی بطور محافظ مہیا کر دیئے اور میں کوہ ہمالیہ کی جانب روانہ ہوگیا۔ مری کے بعد سڑک تنگ اور ڈھلوانی ہوتی گئی۔ کہیں کہیں اسے تھوڑا سا چوڑا کیا گیا تھا، تاکہ وہاں سے مقابل سمتوں سے آنے والی دو گاڑیاں گزر سکیں۔ اس سڑک پر ہندوستان کے جنگی جہاز اچانک یلغار کرتے اور مشین گنوں سے گولیاں بھی برساتے تھے، اس لیے ہم رات کو روشنی کے بغیر سفر کرتے تھے۔ ہماری رفتار سست تھی۔ پہاڑ اور ڈھلوان کے درمیان سرکتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے اور کبھی کبھی چند لمحات کے لیے جیپ کی بڑی بتیاں جلا لیتے تھے۔

ہم مظفرآباد کے اردگرد چکر لگاتے ہوئے سورج طلوع ہونے سے پہلے بلند و بالا برف پوش چوٹیوں میں واقع پہلی فوجی چوکی تک پہنچ گئے۔ وہاں سے ہم پیدل چلتے ہوئے فوج کے ایک سپاہی کی رہنمائی میں اونچی نیچی ڈھلوانوں سے گزرتے ہوئے خاصی بلندی پر آ گئے۔ یہاں ایک چرواہے کی پرانی سی جھونپڑی تھی، جو اب فوجیوں کو اسلحہ بھجوانے کے لیے بطور ڈاک چوکی استعمال کی جارہی تھی اور محاذ پر لڑتے ہوئے جو فوجی زخمی ہو جاتے تھے، انہیں ابتدائی طبی امداد بھی یہیں فراہم کی جاتی تھی۔

یہ جھونپڑی پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ اس کی چھت پتھریلے ٹکڑوں اور درختوں کی ٹہنیوں سے تیار کی گئی تھی اور یہ چٹان کی دو عمودی دیواروں کے درمیان شگاف میں واقع تھی۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو یہ جھونپڑی سپاہیوں سے بھری پڑی تھی۔ کچھ ابھی اگلے محاذ کے مورچوں سے واپس آئے تھے اور کچھ وہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ نچلی چھت کے وسط میں پیرافین کا ایک لیمپ لٹک رہا تھا اور اس کی مدھم سی روشنی کئی چارپائیوں پر پڑ رہی تھی۔ چارپائی مخصوص پاکستانی بستر ہے، جو لکڑی اور انتڑ چھال کی رسیوں سے بنایا جاتا ہے۔ ان چارپائیوں پر زخمی سپاہی آرام کر رہے تھے۔ کمپنی کا طبی عملہ یہاں ان کا عارضی علاج معالجہ کر رہا تھا اور یونہی گاڑی پہنچتی، انہیں نیچے وادی میں قائم کردہ ہسپتال پہنچا دیا جاتا۔ یہاں دو آدمیوں نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ ساتھ ساتھ پڑی ہوئی دو چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ شدید زخمی تھے اور ان کے بچنے کی امید بہت کم تھی۔ اس کے باوجود وہ ہشاش بشاش اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ میرے جیسے کمزور دل شخص کے لیے یہ عجیب و غریب منظر تھا۔ ان میں ایک کہنے لگا ''یار! میں تمہیں بہت جلد دوزخ میں ملوں گا۔'' اور دوسرے نے جواب دیا ''نہیں، ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے۔

Marfat.com

اگر ہم مر گئے تو یہ شہید کی موت ہوگی، کیونکہ ہم نے اللہ کی راہ میں جان قربان کی ہے۔'' اسی لمحے سیکٹر کمانڈر کا بھیجا ہوا ایک ماتحت افسر آیا اور ہمیں مورچوں کی طرف لے گیا۔

میری سمجھ سے باہر ہے کہ کس طرح برف سے ڈھکی زمین پر دستی بیلچوں سے یہ مورچے بنائے گئے۔ یہ اتنے گہرے تھے کہ میرے جیسا دراز قد شخص سر اور کندھوں کو جھکائے بغیر بآسانی ان میں چل پھر سکتا تھا۔ وہاں جگہ جگہ جال کے نیچے مشین گنیں نصب تھیں، جن کے بیرل عمودی پوزیشن میں تھے اور وہ اس لیے کہ دشمن کے جہاز نچلی پرواز کرتے ہوئے جو حملے کرتے تھے، ان سے ان مورچوں کو محفوظ رکھا جائے۔ اس وقت یہاں بالکل خاموشی تھی، البتہ فوجی جوان تیار کھڑے تھے۔ بیشتر سپاہی آرام سے بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے یا سگریٹ نوشی کر رہے تھے، جبکہ کچھ اپنی بندوقوں کی نالیاں صاف کرنے میں مصروف تھے یا کارتوس لگانے والی پیٹیوں کی مرمت کر رہے تھے۔ اس سیکٹر کے تمام فوجی پنجابی تھے اور ان کا تعلق جہلم اور راولپنڈی سے تھا۔ یہ اعلیٰ قسم کے انسان ہیں۔ دراز قد، دبلے پتلے، بعض چہرے مہرے یونانی دکھائی دیتے ہیں۔ فوراً مجھے یاد آیا کہ سکندر اعظم اور اس کے وارثوں کی کئی نسلیں پنجاب کے اسی علاقے میں مستقلاً اقامت پذیر رہیں۔ ممکن ہے یہ لوگ انہی سے نسلی تعلق رکھتے ہوں۔

میں تقریباً ایک گھنٹہ سیکٹر کمانڈر سے گفتگو کرتا رہا۔ وہ ایک نوجوان میجر تھا۔ میں نے اس کے ساتھ چائے پی۔ وہ اور اس کے فوجی ساتھی مجھ جیسے ایک ایسے مہمان سے مل کر بہت خوش ہوئے جو ان کے بلند حوصلوں کا معترف تھا اور ان کے اس جذبے کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا، جس کے تحت وہ ملکی سرحدوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ میں نے انہیں مغربی پنجاب کے وزیر اعلیٰ اور ان کے توسط سے پاکستانی لیڈروں کی نیک خواہشات پہنچائیں۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں بلکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ دنیا میں پنجابی فوجیوں کا کوئی ثانی نہیں اور وہ اپنے فوجی اوصاف جن سے وہ خود کماحقہٗ آگاہ نہیں، کی اس قدر افزائی کو خوش دلی سے قبول کرتے ہیں۔

میں پہلی بار ان اگلے مورچوں تک آیا تھا اور یہاں کے ماحول نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں نے خود سے یہاں دوبارہ آنے کا وعدہ کر لیا۔

(6)

اب مجھے صحیح تاریخ کا تو علم نہیں، لیکن غالباً دسمبر 1948ء یا 1949ء کے اوائل میں مجھے غیر متوقع طور پر یہاں آنے کی دعوت موصول ہوئی۔

ایک روز لاہور کے سب سے بڑے کتب فروش کی دکان میں نئی مطبوعات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ میری نظر میجر جنرل حمید[69] پر پڑی۔ وہ بھی میری طرح ایسی کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔ لاہور کی بیشتر نامور شخصیات کی طرح میں انہیں بھی جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے (اس وقت ان کی عمر چالیس سے کچھ زیادہ تھی)، لیکن وہ کشمیر کے محاذ پر ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ میں نے انہیں پوچھا کہ وہ لاہور میں کیا

Marfat.com

کر رہے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ ''محاذ جنگ کی گھن گرج سے دور چند روز کے لیے تعطیلات گزارنے یہاں آیا ہوں اور کل صبح واپس جارہا ہوں۔'' انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی جو میرے لیے خاصی پُرکشش تھی، لیکن میں اتنی جلدی اپنے محکمہ احیاء ملت اسلامیہ کے کاموں کو یکلخت چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے جواباً عرض کیا ''ابھی نہیں، لیکن ہفتے عشرے میں ایسا ممکن ہے۔''

جنرل حمید کہنے لگے ''ٹھیک ہے۔ اگلے ہفتے ضرور آجائیے۔ میں روانگی سے قبل جہلم سے محاذ کشمیر تک آپ کے لیے گاڑی اور حفاظتی دستے کا انتظام کردوں گا۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کی آمد پر میں کہاں ہوں گا۔ میں سیکٹر کمانڈروں میں کسی ایک کے نام آپ کو خط دے دوں گا اور وہ آپ کو ہر طرح کی سہولت مہیا کردے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اسے پسند کریں گے۔''

(7)

ایک ہفتہ بعد میں جیپ میں سوار جہلم سے مشرق کی جانب جارہا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا۔ وہ پنجاب کی آٹھویں رجمنٹ میں دفعدار تھا۔ دوسرا فوجی پیچھے جیپ کے فرش پر تختوں پر مشین گن جمائے بیٹھا تھا۔
اس دفعہ ہمارا رخ پہاڑوں کی جانب نہیں تھا۔ ہماری سڑک آہستہ آہستہ دلکش مناظر سے گزرتی ہوئی کشمیر کے صوبہ پونچھ تک جاتی تھی۔ موصولہ اطلاعات کے مطابق تقریباً ایک لاکھ ہندوستانی فوجی وہاں قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔

پنجاب اور کشمیر کی برائے نام سرحد عبور کرتے ہی ہم پاکستانی فوج کے پڑاؤ پر جا پہنچے۔ یہاں سینکڑوں خیمے نصب تھے اور پیدل فوج کی خاصی بڑی تعداد بھی موجود تھی۔ یہ لشکرگاہ صوبہ پونچھ ہی کا حصہ تھی اور بھاری مشین گنیں اور چھوٹی توپیں اس کی حفاظت کے لیے لگائی گئی تھیں۔ بظاہر ہندوستانی فوج کوئی بڑا حملہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھی، اسی لیے یہاں کا عمومی ماحول قدرے پُرسکون تھا، البتہ کیمپ میں فوجیوں اور اسلحہ کی نقل وحرکت میں ڈسپلن کی کمی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ یہاں میں نے پٹھان سکاؤٹوں کے کچھ گروہ بھی دیکھے، جو اپنی پوشاک یعنی ڈھیلی شلوار کرتہ اور پگڑی سے بالکل الگ تھلگ نظر آتے تھے۔ سینوں پر کارتوسوں سے بھری ہوئی چمڑے کی پیٹیاں، کندھوں پر لٹکتی ہوئی بندوقیں اور کمربند میں خنجر۔ ان ہتھیاروں سے لیس جان کی پرواہ نہ کرنے والے یہ جنگجو اب حقیقی فوجی ضابطوں کے آہستہ آہستہ پابند ہوتے جارہے تھے۔ (درحقیقت اس وقت پاکستان کے سرحدی محافظ یہی قبائلی پٹھان تھے، جنہوں نے قیام پاکستان کے بعد ابتدائی سالوں کے دوران میں انتہائی مؤثر کردار ادا کیا)۔
مجھے سیدھے سیکٹر کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل یعقوب خاں[70] کے خیمے میں لے جایا گیا۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے۔ غالباً اس وقت ان کی عمر پینتیس سال ہوگی۔ انہوں نے میرا پُرتپاک طریقے سے استقبال کیا ''آپ میرے خیمے ہی میں رہیں گے۔ مجھے امید ہے آپ یہاں خوش رہیں گے۔''

Marfat.com

یعقوب خاں ہندوستان کی امیر ترین اور انتہائی اہم شمال مغربی مسلم ریاست رامپور (جواب ہندوستان میں ضم ہو چکی ہے) کے موروثی وزیر اعظم کے فرزند ہیں۔ وہ بڑے مہذب، دلکش اور خوش مزاج شخص ہیں، اس لیے ہم جلد ہی ایک دوسرے سے 'بے تکلف' ہو گئے۔ یہاں میں یہ بتا تا چلوں کہ فاصلوں کے باوجود ابھی تک ہماری دوستی میں فرق نہیں آیا۔ کئی سال بعد وہ جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ پھر وہ سفیر پاکستان کی حیثیت سے واشنگٹن میں تعینات ہوئے اور بالآخر ضیاء الحق نے انہیں اپنا وزیر خارجہ کا قلمدان سونپا۔

لیفٹیننٹ کرنل یعقوب خاں نے بتایا ''میجر جنرل حمید آپ سے فوری ملنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میں آپ کو کل صبح سویرے ان کے ہیڈ کوارٹر روانہ کر دوں گا۔'' میں نے ان کی تجویز سے اتفاق کیا، کیونکہ اس طرح میں یہاں کے محاذ کی صورت حال کا بھی سرسری جائزہ لے لوں گا۔

رات کا کھانا سادہ، لذیذ اور پُر تکلف تھا۔ دیر تک سگریٹ نوشی اور چائے کے دور چلتے رہے۔ اس کے بعد میں سونے چلا گیا۔

اگلے روز علی الصبح میں تیار ہو گیا۔ سینکڑوں فوجیوں کے ساتھ نماز فجر ادا کی۔ یعقوب خاں کے ساتھ ڈبل روٹی، نمکین پنیر اور چائے کا ناشتہ کیا اور ان سے عارضی رخصت لے کر اسی جیپ پر اور انہی محافظوں کے ساتھ ہیڈ کوارٹر کی جانب روانہ ہو گئے۔

ایک گھنٹہ بعد وہاں پہنچے۔ اس وقت میجر جنرل حمید اپنے افسروں سمیت صوبہ پونچھ کے ایک بڑے نقشے کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں نے ان کی محویت دیکھ کر ذرا پیچھے ہٹنا چاہا تو انہوں نے مجھے روکتے ہوئے کہا ''نہیں، آپ مت جائیے۔ آپ سے ہماری کوئی راز داری نہیں۔ درحقیقت آج میں آپ کو کچھ اور رازوں سے مطلع کروں گا۔''

اس کے بعد میجر جنرل صاحب نے مجھے اپنی جیپ میں بٹھا لیا اور ہم پونچھ اور ہندوستان سے ملحقہ سرحدی علاقے کی طرف چل پڑے۔

(8)

کچھ دیر ہماری جیپ شمال کی طرف چلتی رہی۔ چند میلوں کے بعد مغرب کی جانب مڑ گئی اور پھر بڑے سے نصف دائرے میں ذیلی سڑکوں سے ہوتی ہوئی پھر بڑی سڑک پر آ گئی۔ پونچھ کا شہر پیچھے رہ گیا۔ اب نظروں سے بھی اوجھل ہو چکا تھا۔ شاید اس نصف دائرے کے درمیان میں کہیں تھا۔

سڑک پر آمد و رفت کم تھی۔ ادھر اُدھر فوجی ٹولیوں میں سڑک کے کنارے بیٹھے وقت گزار رہے تھے۔ ایک بار مخالف سمت سے آتی ہوئی ایک فوجی گاڑی ہمارے پاس سے گزری۔ دائیں جانب دور فاصلے پر میں نے ایک گھنا جنگل دیکھا، لیکن وہاں بھی کوئی چلتا پھرتا نظر نہیں آتا تھا۔ یہاں سے آگے بڑھے تو میجر جنرل صاحب نے میری طرف منہ پھیرا اور پوچھا ''کیا آپ نے اس جنگل میں کوئی دلچسپ چیز دیکھی؟'' میں نے جواب دیا ''کچھ خاص نہیں۔ صرف

Marfat.com

درخت ہی تو ہیں۔''

میجر جنرل صاحب مسکرائے ''آپ کو دیکھنا چاہیے تھا۔ اس چھوٹے سے جنگل میں پاکستان کے توپخانہ کا نصف حصہ چھپا بیٹھا ہے۔ جو سڑک پونچھ اور اس سے آگے جاتی ہے، وہ مکمل طور پر ہماری زد میں ہے اور جب ہم کل حملہ کریں گے، پونچھ میں مقیم ہندوستانی فوجوں کا دونوں اطراف سے رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ چونکہ ہمارا توپخانہ ان سے بدرجہا بہتر ہے، اس لیے وہ مزاحمت نہیں کر سکیں گے۔ وقت کی کمی کے باعث انہیں کمک بھی نہیں پہنچ سکے گی۔ ہم نے اب اپنے تمام فوجی دستوں کو یہاں تعینات کر دیا ہے۔ ان حالات میں ہندوستانی فوج ہتھیار ڈال دے گی یا تہس نہس ہو جائے گی۔ اس کے بعد ہم سرینگر کی طرف پیش قدمی کریں گے۔ ان شاء اللہ ہمارے لیے اب یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔''

میجر جنرل حمید کی اس پُر امید گفتگو میں کوئی مبالغہ بھی نہیں تھا۔ جونہی ہم واپس ہیڈ کوارٹر پہنچے، انہیں ایک شدید دھچکا محسوس ہوا۔ اسی شام افواج پاکستان کے کمانڈر انچیف کے توسط سے انہیں وزیر اعظم لیاقت علی خاں کا بذریعہ تار ایک خفیہ پیغام موصول ہوا کہ اگلے روز حملے کا پروگرام منسوخ کر دیا جائے۔

کئی ہفتوں بعد مجھے اصل صورت حال کا علم ہوا۔

ہندوستان کی اعلیٰ فوجی کمان کو جونہی پاکستانی فوج کے اس متوقع حملہ کا پتہ چلا، اس نے فوراً اپنے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کو تمام صورت حال اور اس کے مضر اثرات سے آگاہ کر دیا۔ پنڈت صاحب نے اسی وقت برطانوی وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی 71 سے فون پر رابطہ قائم کیا اور ان پر زور دیا کہ پاکستان کو ہر قیمت پر اس حملے سے روکنا ہوگا، کیونکہ اتنے مختصر وقت میں ہندوستان کے لیے بذریعہ جہاز پونچھ کمک پہنچانا بھی ممکن نہیں۔ اگر انہیں پاکستانی افواج سے ہزیمت اٹھانا پڑی تو وہ احتجاجاً دولت مشترکہ کی رکنیت چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے (کہیں اور کا اشارہ روس کی جانب تھا)۔ اگر پاکستان کو اپنا حملہ منسوخ کرنے پر آمادہ کر لیا جائے اور ضلع پونچھ ہندوستان ہی کا حصہ رہے، تو وہ یعنی پنڈت صاحب اگلے سال کشمیری عوام کو استصواب رائے کا حق دے دیں گے۔

تمام رات نئی دہلی اور لندن کے درمیان ٹیلی فون کی تاریں بجتی رہیں۔ وزیر اعظم ایٹلی کو ہندوستان جیسا بڑا ملک ہاتھ سے نکلتا دکھائی دینے لگا۔ اس نے فوراً لارڈ ماؤنٹ بیٹن (جو 1948ء کے آخر میں ہندوستان کے گورنر جنرل کے عہدے سے مستعفی ہو کر اب انگلستان میں اپنی گذشتہ کامیابیوں پر شاداں و فرحاں زندگی گزار رہے تھے) سے مشورہ کیا اور کہا کہ برصغیر کے امور مختلفہ کے تجربہ کار ماہر کی حیثیت سے وہ نہرو کی تشویش دور کرنے کی کوشش کریں اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ چند گھنٹوں بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کے وزیر خارجہ محمد ظفر اللہ خاں کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ پنڈت صاحب نے کشمیری عوام کو حق رائے دہی کا یقین دلایا ہے اور ایٹلی نے بھی اس حملے کی منسوخی کے لیے ذاتی طور پر درخواست کی ہے۔ اس وقت لیاقت علی خاں سوئے تھے۔ ظفر اللہ نے انہیں جگا کر یہ پیغام پہنچایا اور انہیں ایٹلی کی معروضات پر خصوصی توجہ دینے کی استدعا کی۔

Marfat.com

اثر ورسوخ کے ان الجھیڑوں میں ظفر اللہ خاں[72] نے جو کردار ادا کیا، اس کی تفہیم کے لیے ان کے سابقہ واقعات اور مخصوص وفاداریوں کا مختصراً تذکرہ ضروری ہے۔ وہ جماعت احمدیہ کے سرگرم رکن تھے۔ تمام مسلمان اس جماعت کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ اس جماعت کے بانی قادیان کے مرزا غلام احمد تھے، جو ایک عالم دین کی حیثیت سے مشہور تھے، لیکن بعد میں ان کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں اور جس کام کو حضور اکرمؐ نامکمل چھوڑ گئے تھے، اس کی 'تکمیل' کے لیے انہیں مبعوث کیا گیا ہے۔ یہ ایک دعویٰ ہے جس کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے چاہے وہ سنی ہیں یا شیعہ، قطعی طور پر مسترد کر دیا۔ نص قرآنی سے یہ بالکل واضح ہے کہ حضور اکرمؐ خاتم الانبیاء ہیں اور ان کے بعد کوئی پیغمبر کرۂ ارض پر مبعوث نہیں ہوا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ نبوت اسلام کے بنیادی عقیدے کی نفی ہے، اس لیے وہ اور ان کے پیروکار اسلام کی حدود سے باہر ہیں۔ ہندوستان کے برطانوی حکمران تحریک احمدیت کو بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے، کیونکہ مرزا غلام احمد قادیانی[73] نے اپنے پیروکاروں کو ہمیشہ برسر اقتدار اسلامی یا غیر اسلامی حکومت کی اطاعت اور فرمانبرداری کی سخت تاکید کر رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ برطانوی حکومت کے مقتدر اصحاب جماعت احمدیہ کے اراکین کی ہر طرح سے حمایت کرتے تھے۔ سر محمد ظفر اللہ خاں بھی ایک بااثر شخص تھا اور غلام احمد قادیانی سے گہری عقیدت رکھتا تھا، اس لیے وہ تمام عمر انگریزوں سے زیادہ برطانیہ کے خدمت گزار رہے۔

ظفر اللہ خاں باصلاحیت وزیر خارجہ تھا اور لیاقت علی خاں بھی اس کی خوبیوں کے معترف تھے۔ مزید یہ کہ وہ کشمیر میں استصواب رائے کرانے کے بارے میں نہرو کے وعدہ پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ انہیں توقع تھی کہ جس مسئلہ نے عرصۂ دراز تک پاکستان کی توانائیوں کو ضائع کر دیا ہے، اس کا کوئی مستقل اور پائیدار حل تلاش کیا جانا چاہیے۔ یہی سوچ کر انہوں نے پاکستانی افواج کو پونچھ سے ہٹا کر بین الاقوامی سرحد پر بھجوانے کا حکم دے دیا۔ یہ خطرہ ٹلتے ہی نہرو فوری استصواب رائے کرانے کے وعدے سے منحرف ہو گیا اور یہ مسئلہ کشمیر غیر معینہ عرصہ کے لیے معرض التوا میں ڈال دیا گیا۔

یہ اتنا بڑا قومی المیہ تھا کہ جس کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی۔ پونچھ میں ہندوستانی افواج نے خود کو مضبوط کر لیا، جبکہ پاکستان نے ایک نادر موقع کھو دیا، جو قوموں کی زندگی میں کبھی کبھار آتا ہے۔

وزیر اعظم کا حکم نامہ پونچھ کے گرد و نواح میں تعینات پاکستانی فوجیوں پر بم بن کر گرا۔ جب انہیں علم ہوا کہ حملہ منسوخ کر دیا گیا ہے، بہت سے افسر اور عام لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ کشمیر کو ہندوؤں کے تسلط سے آزاد کرانے اور اسے پاکستان کا حصہ بنانے کا انہوں نے جو خواب دیکھا تھا، وہ چکنا چور ہو گیا۔ کوئی سنجیدہ شخص یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ یہاں مستقبل بعید میں بھی کشمیریوں کو موعودہ حق رائے دہی مل جائے گا۔

میجر جنرل حمید نے خود کو ہیڈ کوارٹر میں بند کر لیا۔ کئی مہینے میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کے بعد وہ فوج سے مستعفی ہو گئے۔

Marfat.com

جنوبی اسپین کے پہاڑی علاقے کے ایک گاؤں میں بیٹھا یہ سطور لکھ رہا تھا (17 اگست 1988ء) کہ مجھے فون پر اطلاع دی گئی کہ صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق[74] ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔

اس المناک خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا، کیونکہ میں ان سے محبت کرتا تھا۔ وہ میرے ذاتی دوست تھے۔ گذشتہ سالوں میں پاکستان میں جن قائدین نے زمام حکومت سنبھالی، وہ ان سب میں بہتر تھے۔ ایماندار، طاقتور، طبعاً منکسر المزاج، محب وطن اور اسلام کا شیدائی، جو اس ملک کی اساس ہے۔ ضیاء الحق نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ محمد علی جناح کے انتقال کے بعد ایسا ممتاز رہنما برسر اقتدار نہیں آیا۔ اب وہ بھی ایک دردانگیز حادثے کا شکار ہو گئے۔ جب سے میں نے یہ اندوہناک خبر سنی ہے، مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ان کی موت قطعاً 'حادثہ' کا نتیجہ نہیں، بلکہ ان لوگوں نے انہیں ایک سوچی سمجھی سازش سے ہلاک کیا ہے، جو افغان مجاہدین کے ساتھ ان کے اشتراک عمل سے نالاں تھے اور اسلامی طرز حیات کو فروغ دینے کے لیے ان کی مخلصانہ کوششوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

باب ہشتم

وزارتِ خارجہ: شعبہ مشرق وسطیٰ
(1949ء-1951ء)

(1)

جنوری 1948ء کو لیاقت علی خاں نے مجھے دوبارہ کراچی بلایا۔ اس دفعہ وہ میری تجاویز پر جرح کرنے کے بجائے اپنی کوئی تجویز پیش کرنا چاہتے تھے۔ ''آپ پاکستان کے ان معدودے چند لوگوں میں سے ہیں جو مشرق وسطیٰ کے حالات و واقعات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ آپ کو عربی اور فارسی پر کامل دسترس حاصل ہے۔ ہمیں اپنی وزارت خارجہ میں آپ جیسے شخص کی ضرورت ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ اس میں شامل ہوں اور وقتی طور پر احیاء ملت اسلامیہ کی موجودہ ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں۔ کیا آپ میری اس تجویز پر غور کریں گے؟''

چونکہ یہ تجویز پاکستان کے وزیر اعظم نے پیش کی تھی، اس لیے یہ بآسانی رد نہیں کی جاسکتی تھی۔ بلاشبہ احیاء ملت اسلامیہ کے ادارے سے میں جذباتی طور پر منسلک تھا، لیکن لیاقت علی خاں کی پیش کردہ تجویز کی اہمیت کا بھی مجھے پورا احساس تھا۔ مشرق وسطیٰ کے بارے میں پاکستان کی پالیسیوں کا ابھی کوئی راستہ متعین نہیں ہوا تھا۔ ان میں کسی واضح مقصد کا بھی فقدان تھا۔ ہم مذہبی اور اخلاقی طور پر آزادی کی ان تحریکوں کی حمایت کے پابند تھے، جو ان ممالک میں بیرونی استعماریت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے چل رہی تھیں۔ اس کے علاوہ ہم کسی قطعی جہت کے بغیر اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ مشرق وسطیٰ کے متعلق پاکستان کی ڈانواں ڈول خارجہ پالیسی کی تشکیل میں کوئی قابل قدر خدمت بجالانا میرے لیے اعزاز بھی تھا اور اس دور کی اشد ضرورت بھی۔ مزید برآں یہ کہ میں نے اپنی زندگی کے چند سال اس علاقے میں گزارے تھے، اس لیے میں وہاں کے لوگوں کے احساسات اور خواہشات سے بخوبی واقف تھا۔ اس پیشکش میں میرے لیے کشش کا ایک اور پہلو بھی مخفی تھا اور وہ یہ کہ یہاں کے لوگوں سے میرا رابطہ بحال ہو جائے گا اور مجھے پہلے کی نسبت زیادہ بڑے پیمانے پر اور زیادہ مدت کے لیے کام کے مواقع میسر ہوں گے۔ احیاء ملت اسلامیہ کے ادارے سے میرا جذباتی لگاؤ تھا، کیونکہ یہ میری سوچ کا مظہر تھا۔ اب اس ادارے کی بنیادیں مستحکم ہو چکی تھیں اور

Marfat.com

اس نے اپنے لیے راہ عمل متعین کر لی تھی۔ میں نے اس ادارے کے اغراض و مقاصد کی روشنی میں جو لائحہ عمل طے کر دیا تھا، وہ ہر آنے والے کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتا تھا۔

(2)

اس پس منظر میں مَیں نے لیاقت علی خاں کے مشورے پر وزارت خارجہ، جو ابھی اپنے تشکیلی دور سے گزر رہی تھی، میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جو شخص اس وزارت کو منظم کر رہا تھا، وہ سر ٹرانس کریگ۔کوین[74a] (Sir Terence Creagh-Coen) نامی آئرلینڈ کا باشندہ تھا، جو انڈین سول سروس کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھا، لیکن تقسیم کے بعد اس نے پاکستان آنے کو ترجیح دی۔ میری اس سے ابتدائی گفتگو ہوئی اور اس نے بتایا کہ موجودہ قوانین کی رو سے مجھے پہلے سول سروس کمیشن کو انٹرویو دینا پڑے گا۔ یہ ایک رسمی کارروائی ہو گی، لیکن اس کی بجا آوری لازمی ہے۔
انٹرویو کی مقررہ تاریخ کو میں ایک کمیشن کے سامنے پیش ہو گیا۔ اس کے صدر نشین مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ کے بھائی حسن سہروردی[75] تھے۔ وہ پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں تاریخ کے استاد تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور وسیع المطالعہ شخص تھے۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وزارت خارجہ میں ملازمت کے آٹھ یا دس امیدوار پہلے سے وہاں موجود تھے۔ وہ سب جوان تھے۔ حسن سہروردی انہیں باری باری بلاتے اور ہر ایک سے جغرافیہ اور جدید تاریخ کے بارے میں سوالات کرتے۔ میں اپنی ہنسی نہ روک سکا، جب انہوں نے ایک امیدوار سے یہ سوال کیا ''حبشہ کے صدر مقام کا نام کیا ہے؟'' امیدوار سوال سن کر پریشان ہو گیا اور خاموش رہا۔ سہروردی صاحب نے مجھے ایک نظر دیکھا اور پھر اگلے امیدوار کو بلایا اور سوال پوچھا ''کیا آپ فرانس کے آخری بادشاہ کا نام بتا سکتے ہو؟'' ایک بار پھر خاموشی۔ دیر تک یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہا۔ نوجوان امیدوار ایسے سوالات کا صحیح یا غلط جواب دیتے یا پھر بالکل خاموش رہتے اور سہروردی صاحب ہر امیدوار کے نام کے سامنے اپنی مختصر رائے لکھتے جاتے۔

بالآخر میری باری آئی۔ پروفیسر سہروردی صاحب مسکرانے لگے ''اسد صاحب! میں آپ کی شہرت سے متاثر ہوں، اس لیے آپ سے ایسے بچگانہ سوالات نہیں کیے جائیں گے۔ تاہم فارم پُر کرنے کی غرض سے سوال پوچھنا ضروری ہے۔ کیا آپ یورپی سیاست پر اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ یعنی سات سالہ جنگ کے اختتام اور نپولین کے دور کے بعد یورپ کی سیاست میں کیا اتار چڑھاؤ رونما ہوئے؟''

سکول کے زمانے سے میرا یہ پسندیدہ موضوع تھا، سو میں اس پر بولتا چلا گیا اور کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں انٹرویو کے بجائے کہیں لیکچر دے رہا ہوں۔ میں نے اپنی گفتگو ختم نہیں کی تھی کہ سہروردی صاحب بیچ میں بول پڑے ''ٹھیک ہے۔ آپ انٹرویو میں کامیاب ہو گئے ہیں۔'' فارغ ہونے کے بعد وہ مجھے ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے ''اس سال جو امیدوار سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوئے ہیں، ان میں مَیں نے آپ کا نام سرفہرست رکھا

Marfat.com

ہے۔''

چند روز بعد وزارت خارجہ کے ایک برآمدے میں میری ملاقات کریگ کوین سے ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ مجھے وزارت خارجہ کے افسروں میں تیسرے نمبر پر رکھا گیا ہے۔ پہلے نمبر پر مستقل سیکرٹری اور دوسرے پر جائنٹ سیکرٹری کے نام ہیں اور وہ انڈین سول سروس کے سابقہ ملازمین ہیں۔ انہوں نے مزید بتایا ''لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ذی اختیار لوگ میری اس ترتیب سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں تمہاری جلد کا رنگ تمہارے لیے نقصان دہ ثابت نہ ہو۔''

سو ایسا ہی ہوا۔ سول سروس کے بہت سے لوگ، جن کا رنگ مجھ جیسا سفید نہ تھا اور جن کا انڈین سول سروس سے سابقہ تعلق کا حوالہ موجود تھا، مجھ سے بڑے عہدوں پر تعینات کر دیئے گئے۔

(3)

وزارت خارجہ میں شمولیت کے تھوڑی دیر بعد مستقل سیکرٹری اکرام اللہ، جو ملنسار، سادہ لوح اور میرے ہی ہم عمر تھے، نے اطلاع دی کہ وزیر اعظم کے حکم پر مجھے شعبہ مشرق وسطیٰ میں ڈپٹی سیکرٹری کا عہدہ تفویض کیا گیا ہے۔ ان دنوں وزارت خارجہ کا صدر دفتر کراچی میں کلفٹن کے قریب تھا، چنانچہ مجھے یہاں ایک بڑا سا خوشنما دفتر دیا گیا۔ ایک نوجوان اور باصلاحیت پرسنل اسسٹنٹ کو بھی میری معاونت کے لیے مقرر کیا گیا، جو ملحقہ چھوٹے کمرے میں اپنے دفتری فرائض سرانجام دیتا تھا۔

میرے شعبہ کا تعلق پوری عرب دنیا بشمول شمالی افریقہ اور ایران سے تھا۔ میرے اس علاقے کے بارے میں واضح تصورات تھے اور انہی کو ایک سرکاری پالیسی کی حیثیت سے اپنایا جا سکتا تھا۔

دفتر میں بیٹھتے ہی میں نے خلیج فارس کا ایک بڑا سا نقشہ منگوایا اور اسے دیوار پر لگوا دیا۔ یہ نقشہ اتنا بڑا تھا کہ اس نے دیوار کا بیشتر حصہ ڈھانپ دیا۔

اسی وقت میں وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں کے لئے ایک مفصل اور واضح میمورنڈم تیار کرنے میں مصروف ہو گیا، جس میں مروجہ سرکاری پالیسیوں پر بے لاگ تنقیدی تبصرہ کیا گیا تھا۔ میری یہ تحریر خفیہ دستاویزات کے زمرے میں آتی تھی۔ میں نے یہ میمورنڈم خود ٹائپ کیا۔

میری تجاویز کا خلاصہ درج ذیل ہے:

پاکستان قطعی طور پر نظریاتی بنیاد پر معرض وجود میں آیا ہے۔ مطالبہ پاکستان کرنے والوں نے قوم و نسل کے مروجہ تصورات کا اتباع نہیں کیا، بلکہ مشترکہ مذہبی اور تہذیبی روایات کی پاسداری کے لیے علیحدہ وطن کی مانگ کی تھی۔ اس بنا پر انہیں اجتماعی طور پر دنیائے اسلام کے متعلق ایک ٹھوس پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ پالیسی فی نفسہٖ اس بنیادی ضرورت سے متصادم ہوتی، تو پاکستان نظریاتی ہم آہنگی سے محروم ہو جاتا اور یوں اس کے قیام کا جواز ختم

Marfat.com

ہو جاتا۔ میں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس سلسلہ میں ہماری کلّی ناکامی نے ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ ہم اپنے بڑے دشمن ملک ہندوستان سے زک اٹھاتے جا رہے ہیں اور کشمیر جیسے اہم علاقے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اس ناکامی کا توڑ کرنے کے لیے ہمیں دو رخی پالیسی اپنانا پڑے گی۔ اول یہ کہ ہمیں فوراً عرب ممالک کے اشتراک سے مسلمانوں کی اقوام متحدہ جیسی تنظیم قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دینی چاہئیں اور دوم یہ کہ ہمیں ممکن حد تک خلیج فارس کے علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا چاہیے، کیونکہ سیاسی اور معاشی لحاظ سے ہمارے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بننے والا ہے۔ جنگ عظیم دوم کے اختتام پر برطانیہ نے خلیج فارس سے اپنی فوجیں نکال لی تھیں۔ یہاں برطانیہ کے سائے سے مرعوب ہونے کے بجائے ہمیں آگے بڑھ کر اس علاقے میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لینا چاہئیں۔ مزید برآں میں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اب برطانیہ تھک کر چُور ہو گیا ہے اور وہ امریکہ کا حاشیہ بردار بننے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں کیا ہمارے لیے یہ سودمند نہیں ہو گا کہ ہم براہ راست امریکہ سے تعلقات استوار کر لیں۔ امریکہ اپنے سیاسی اور فوجی مفادات سے صرف نظر کرتے ہوئے خلیج فارس پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کرے گا، اس لیے وہ ''آزاد دنیا'' کے مفادات کی خاطر پاکستان کی ان کوششوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گا۔ مختصراً ہمیں غلاموں کا غلام بننے سے گریز کرنا چاہیے اور براہ راست قوت کے اصل ماخذ تک رسائی حاصل کرنی چاہیے۔

میں نے میمورنڈم کے سرورق پر ''وزیر اعظم کے ملاحظہ کے لیے'' لکھ دیا اور ''انتہائی خفیہ'' دستاویز کی حیثیت سے سرکاری ضابطے کے مطابق مستقل سیکرٹری کے ذریعے بھجوا دیا۔

اگلی صبح اکرام اللہ[76] نے مجھے اپنے دفتر ملنے کو کہا۔ جونہی ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا، وہ بولے ''میں نے آپ کا میمورنڈم پڑھ لیا ہے اور مجھے ذہنی طور پر جھٹکا سا محسوس ہوا ہے۔ اسد! آپ نے وزیر خارجہ پر ہی نہیں بلکہ ان کے توسط سے وزیر اعظم کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔''

میں نے جواباً عرض کیا ''ٹھیک ہے۔ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ کوئی محکمانہ کارروائی کریں گے یا اس کو گستاخی سمجھ کر کوئی سزا تجویز کریں گے۔ براہ مہربانی آپ اسے وزیر خارجہ کو بھجوانے میں ذرہ بھر تامل نہ کیجیے۔''

اکرام اللہ نے دستخط کرتے ہوئے متنبہ کیا ''جو ہو گا، اس کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے۔''

دو دنوں کے بعد مجھے پتہ چلا کہ ظفر اللہ خاں نے میری تنقید کا برا نہیں منایا، بلکہ جیسا انہوں نے مجھے بعد میں خود بتایا کہ انہوں نے میری معروضات سے اتفاق کیا اور میرے میمورنڈم کو وزیر اعظم کے پاس بھجوا دیا اور میں نے اس کی کئی نقلیں تیار کر کے ان پر ''ضروری مطالعہ کے لیے'' وزارت خارجہ کے تمام شعبوں کے سربراہوں کو ارسال کر دیں۔

Marfat.com

(4)

بالآخر لیاقت علی خاں نے مجھے ان تجاویز پر تبادلہ خیال کے لیے بلوایا۔

انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے گفتگو کا آغاز کیا ''اسد! آپ نے ہم پر سخت تنقید کی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے میز پر پڑے میرے میمورنڈم کی طرف اشارہ کیا۔ میں خاموش رہا۔ انہوں نے اپنی گفتگو جاری رکھی ''آپ جانتے ہیں کہ آجکل اس خطہ زمین کے حوالے سے بڑے وسیع پیمانے پر گفت وشنید ہو رہی ہے؟''

وہ ان مذاکرات کی جانب اشارہ کر رہے تھے جو ان دنوں ہمارے اور امریکہ، برطانیہ، ترکی، ایران اور عراق کے مابین ہو رہے تھے، جن کا مقصد روس کو جنوب مغرب کی طرف سے محصور کرنا تھا۔ شریک ممالک نے اس کو ''بغداد پیکٹ'' کا نام دے رکھا تھا اور میں ہمیشہ اس معاہدے کو بیکار محض سمجھتا تھا۔ اس معاہدے میں پاکستان کے لیے کئی خطرات پوشیدہ تھے، کیونکہ اس سے روس کھل کر ہماری مخالفت پر تل جائے گا اور نتیجتاً وہ ہمارے بڑے دشمن یعنی ہندوستان سے کوئی معاہدہ کر لے گا، جو ہمارے لیے خاصا نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اس وقت تک اس قدر اہم معاہدے پر اپنے نقطہ نظر کے کھلے اظہار کے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ اب وزیراعظم نے خود ہی یہ ذکر چھیڑ دیا تو میں نے موقع غنیمت جان کر بڑے وثوق سے اپنا مؤقف تفصیلاً بیان کر دیا (تاہم یہ معاہدہ نا تمام رہا اور بعد میں بہت جلد اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا)۔ 77

لیاقت علی خاں حسب عادت بڑے صبر وتحمل سے میری گفتگو سنتے رہے اور میں بولتا چلا گیا۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ کوئی تبصرہ کیے بغیر پھر میرے میمورنڈم میں پیش کردہ تجاویز کو پڑھنے لگے۔

''آپ کے خیال کے مطابق ہمیں خلیج فارس کے معاملات کو زیر غور رکھنا چاہیے اور وہاں اپنا سیاسی اور معاشی اثر ورسوخ استعمال کرنا چاہیے، لیکن آپ شاید نہیں جانتے کہ اس وقت ہمیں کن معاشی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے؟ ہم صنعتی میدان میں ابھی بالکل نو وارد ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ ہماری کرنسی بھی ابھی مشکوک ہے اور وہ کسی مستحکم سہارے کے بغیر ابھی ڈانواں ڈول ہے۔ ہم ہندوستانی روپے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان سیاسی اور معاشی اعتبار سے خلیج فارس میں روز بروز اپنا اثر ورسوخ بڑھاتا جا رہا ہے۔ ہم مضبوط کرنسی کے بغیر کس طرح وہاں اپنے دائرہ اثر کو وسعت دے سکتے ہیں؟''

میں نے جواب دیا ''سر! میری رائے ہے کہ ہمیں اقتصادی تعاون کے لیے امریکہ کی جانب رجوع کرنا چاہیے۔ اگر ہم امریکنوں کو خلیج فارس میں پاکستان کے 'حقیقی' اثر ورسوخ کے بارے میں قائل کر لیں اور یہ ثابت کر سکیں کہ ہمارے سیاسی اثرات کی یہ توسیع ''معاہدۂ بغداد'' جیسے بعید از حقیقت تصور کا صحیح معنوں میں نعم البدل ثابت ہوگی تو مجھے پورا یقین ہے کہ امریکہ لازماً ہماری کارروائیوں کی حمایت کرے گا۔ ہماری طرح امریکہ روس کی بھی خلیج فارس کے گرم پانیوں تک رسائی کا ہر ممکن طریقے سے راستہ روکنا چاہتا ہے۔ اگر اس کے لیے فوجی کے بجائے سیاسی ذرائع بروئے کار لائے جائیں تو پاکستان اور امریکہ دونوں کے لیے فائدہ مند ہوگا۔''

Marfat.com

وزیر اعظم کچھ دیر کے لیے خاموش رہے اور پھر کہنے لگے ''آپ کی یہ بات لائق توجہ ہے۔ ہم اس پر غور کریں گے۔ اب آپ کی دوسری تجویز کو زیر بحث لاتے ہیں یعنی لیگ آف مسلم نیشنز۔ کیا آپ اس کے بارے میں مزید وضاحت کر سکتے ہیں؟''

چونکہ ہمیشہ سے یہ میرا پسندیدہ موضوع رہا، اس لیے مجھے پوری شرح وبسط کے ساتھ اس کے مالہ و ماعلیہ پیش کرنے میں دقت محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے مشرق وسطیٰ کے غیر متحدہ ممالک کی کمزوریوں اور اس علاقے میں پاکستان کی قدر و منزلت کا حوالہ دیا۔ پاکستان دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت تھی، اس لیے ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور صدیوں کے سیاسی زوال کے بعد خوابیدہ مسلمانوں کو بیدار کریں۔

آخر میں مَیں نے عرض کیا ''اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں عربوں کو اور بالخصوص مصر پر یہ واضح کر دینا چاہیے کہ ہمارا مطمح نظر دنیائے عرب کی رہنمائی کرنا نہیں۔ یہ قائدانہ حق صرف مصر کو حاصل ہے، کیونکہ دنیائے عرب میں یہی ملک سب سے بڑا اور ترقی یافتہ قرار دیا جاتا ہے۔ اہل مصر کو اپنی اس حیثیت کا احساس ہے، اس لیے ممکن ہے کہ وہ ایسی قیادت کو قبول نہ کریں، جو ان کے مقام و مرتبے کو خطرے میں ڈال دے۔ پھر بھی ہمیں ان کو قائل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہماری نظر میں وہی دنیائے عرب کی قیادت کے اہل ہیں۔ پاکستان کی ایسی کوئی خواہش نہیں، سوائے اس کے کہ مسلمانوں کی سیاسی کوششوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔''

(5)

چند روز بعد وزیر اعظم نے تجویز کیا کہ مجھے جتنی جلدی ممکن ہو سکے، مشرق وسطیٰ کا سرکاری دورہ کرنا چاہیے اور مسلمان ممالک کی مشترکہ تنظیم کے بارے میں ہر ملک کے ردعمل کا الگ الگ جائزہ لینا چاہیے۔ اس تجویز کو سن کر میرا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ مجھے یاد نہیں کہ زندگی میں مجھے کبھی اتنی خوشی نصیب ہوئی ہو۔

سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ پاسپورٹ افسر کو فوراً پاسپورٹ تیار کرنے کی ہدایت دی۔ اس نے پوچھا ''یہ وضاحت فرمائیے کہ اس میں آپ کی کونسی قومیت کا اندراج ہوگا؟''

میں نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا ''پاکستانی، اور کونسی؟''

''لیکن سر! ابھی تک پاکستانی قومیت نام کی کوئی چیز معرض وجود میں نہیں آئی۔ شہریت کا ایک بل قومی اسمبلی میں زیر بحث ہے اور اس کے منظور ہونے میں مہینوں گزر جائیں گے۔ اس اثنا میں ہم نے برطانیہ سے ایک غیر رسمی معاہدہ طے پایا ہے، جس کے مطابق ہر نئے پاسپورٹ پر ''برطانوی شہری'' لکھنے کا اختیار دیا گیا ہے۔''

میں نے کہا ''یہ کیا حماقت ہے۔ میں کبھی برطانوی شہری نہیں رہا اور اب بھی مجھے اس شہریت کی کوئی ضرورت نہیں، میرے پاسپورٹ پر لکھئے 'پاکستانی شہری'۔''

''میں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ غیر قانونی بات ہے۔ کیا میں آپ کے پاسپورٹ پر ''آسٹرین شہریت'' لکھ سکتا

Marfat.com

ہوں؟''

میں نے کہا کہ ''یہ تو اور زیادہ احمقانہ حرکت ہوگی۔ میں حکومت پاکستان کے سرکاری نمائندے کی حیثیت سے اس دورے پر جا رہا ہوں۔ اگر میرے پاس کسی دوسرے ملک کا پاسپورٹ ہوگا تو دیکھنے والا کیا سمجھے گا؟''

بہر حال یہ مسئلہ کئی روز تک زیر بحث رہا اور میں بے سروپا باتیں سن سن کر تنگ آ گیا۔ بالآخر میں نے وزیر اعظم کے ذاتی معاون کو فون کیا اور ان سے عرض کیا کہ ''براہ مہربانی وزیر اعظم سے میری فوری ملاقات کرا دیجئے۔''

کچھ دیر بعد میں لیاقت علی خاں کے دفتر پہنچا اور انہیں اپنی مشکل سے مطلع کیا۔ انہوں نے اپنے سیکرٹری کو کہا کہ فوراً پاسپورٹ آفیسر کو بلائیں۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوا۔ وزیر اعظم نے انہیں جلد پاسپورٹ بنانے کا حکم دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اس پر ''پاکستانی شہری'' کی مہر ثبت کرے۔

اس طرح مجھے پہلا پاسپورٹ حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا جس پر ''پاکستانی شہری'' لکھا گیا تھا۔

(6)

اس تفتیشی سفر پر روانگی سے قبل میں نے پاکستان میں تین عرب ممالک کے سفارتی نمائندوں (مصر اور سعودی عرب کے سفراء اور شام کے مختار کل وزیر) سے تبادلہ خیال کیا۔ جب سے میں وزارت خارجہ میں ملازم ہوا تھا، میرے ان سے دوستانہ مراسم قائم تھے۔

سب سے پہلے میری ملاقات مصر کے سفیر عبدالوہاب عزام[79] سے ہوئی۔ وہ اعلیٰ پایہ کے عالم تھے (وہ قاہرہ یونیورسٹی میں فارسی زبان وادب کے معلم بھی رہے)۔ وہ گہری حساسیت اور تیز فہم وفراست کی خوبیوں کے مالک تھے اور کئی زبانیں روانی سے بول سکتے تھے۔ انہیں محمد اقبال سے گہری عقیدت تھی، جن کی بیشتر شاعری کو انہوں نے عربی میں منتقل کیا تھا۔ ہمارا سفارتی تعلق بہت جلد گہری دوستی میں تبدیل ہوگیا۔ اب ہم دو دوست ممالک کے نمائندوں کی حیثیت سے نہیں ملتے تھے، بلکہ ہماری ملاقات دو قریبی دوستوں کی طرح ہوتی تھی۔ ہر روز کبھی وہ میرے گھر یا میں ان کے گھر ملنے چلا جاتا تھا اور ہم تقریباً ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے، بالخصوص مسلمان ممالک کے موجودہ یا مستقبل بعید میں رونما ہونے والے حالات پر بحث ہوتی رہتی۔ ہماری سوچ کے دھاروں کا تقریباً ایک ہی رخ تھا۔ چند سال بعد وہ ریاض کی سعودی یونیورسٹی کے ریکٹر مقرر ہوئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی وفات تک میرے ان سے نجی دوستانہ مراسم قائم رہے۔

عبدالوہاب کے بعد میں نے عمر بہاء الامیری سے رابطہ قائم کیا، جو پاکستان میں شام کے مختار کل وزیر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ حلب کے ایک پرانے اشرافی خاندان کے فرد تھے۔ عربی کے جانے پہچانے شاعر تھے۔ ان کی والدہ ترکی النسل تھی، اس لیے وہ پیدائشی طور پر اتحاد عالم اسلامی کے حامی تھے۔ وہ مصر کی اخوان المسلمین کے بانی حسن البنا[80] سے متاثر تھے اور خود کو ان کا پیروکار سمجھتے تھے۔ اس جماعت کی جو شاخ شام میں کام کر رہی تھی، وہ

Marfat.com

اس سے گہرے روابط رکھتے تھے۔ وہ خوش رُو اور ہنس مکھ شخصیت کے مالک تھے اور ان سے ملنے کے بعد وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ کلفٹن میں ان کا سفارت خانہ میری سرکاری رہائش گاہ کے قریب تھا، اس لیے گاہے بگاہے ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ وہ بھی عبدالوہاب عزام کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ہم تینوں اکثر اپنے فارغ اوقات میں اکٹھے بیٹھ کر محفل جمایا کرتے تھے۔

تیسرے شخص سعودی عرب کے سفیر شیخ عبدالحمید الخطیب تھے۔ ان کا آبائی تعلق مکہ سے تھا، اس لیے میں ان سے ملنے کے بعد اپنے گذشتہ ایام کی ناقابل فراموش یادوں میں کھو جاتا۔ ان کی ولادت اور پرورش حجاز میں ہوئی تھی اور ان کی رگوں میں انڈونیشیائی خون گردش کر رہا تھا، اس کے باوجود وہ نجدی زندگی پر گہرے عربی اثرات کو بنظر استحسان دیکھتے تھے۔ سعودی عرب میں گزرے ہوئے خوشگوار لمحات کی یاد نے مجھے ان سے اور قریب کر دیا۔ ان کے ادبی ذوق وشوق بالخصوص قدیم عربی شاعری کے گہرے مطالعہ کے سبب وہ وسطی عرب اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں میرے جذبات واحساسات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ ہم دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔

حکومت پاکستان میں میرے رفقائے کار اور اعلیٰ افسران کے علاوہ یہی تین اشخاص تھے، جن کے ساتھ مشرق وسطیٰ کے میرے متوقع سفر کے ہر پہلو پر بات چیت ہوتی رہی اور انہی سے ان کے ممالک کی مختلف شخصیات کے نام مراسلات حاصل ہوئے۔ وزیراعظم اور وزیر خارجہ کے سرکاری پیغامات بھی موصول ہو چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

باب نہم

اتحاد بین المسلمین کے لئے سفر
(1951ء)

(1)

جب میں اپنے مشرق وسطیٰ کے سرکاری دورے پر روانہ ہونے والا تھا تو حج کے دن قریب آ گئے۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے سعودی عرب جانے کا فیصلہ کرلیا اور کراچی سے جہاز پر سوار ہونے سے پہلے میں نے فریضہ حج ادا کرنے کے لیے احرام باندھ لیا۔ آئندہ دو ہفتے مجھے یہی احرام باندھے رکھنا تھا۔ یعنی دو سفید چادریں، ایک کو کمر سے باندھ کر جسم کا نچلا حصہ ڈھانپ لیا جاتا ہے اور دوسری چادر کندھے کے اوپر ڈھیلی ڈھالی لٹکتی رہتی ہے اور ایک بازو ننگا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ پاؤں کے لیے سینڈلوں کا ایک جوڑا بھی لے لیا۔ میں نے یہ اہتمام اپنے ساتویں حج کے لیے کیا تھا۔

جہاز پاکستانی حجاج کرام سے بھرا ہوا تھا اور سبھی مسافروں نے میری طرح پہلے ہی سے احرام باندھ رکھے تھے۔ خواتین اسی لباس میں ملبوس تھیں جس کی شریعت نے انہیں اجازت دے رکھی تھی، یعنی سر سے پاؤں تک لمبا لباس اور کھلا ہوا چہرہ۔ حج کی سعادت نصیب ہونے پر تمام مسافر دینی جذبے سے سرشار تھے، کیونکہ ان میں اکثر زندگی میں ایک ہی بار یہ فریضہ ادا کر سکتے ہیں۔

جدہ کا ہوائی اڈہ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے آنے والے جہازوں سے بھرا ہوا تھا اور ہزاروں نئے حاجیوں کی ہڑبونگ اور تھکے ہارے سعودی محافظوں کو انہیں قابو میں رکھنے کے باعث عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ اس دھکم پیل، دھما چوکڑی اور شور شرابے کے باوجود اس ہجوم میں خوشی کی لہر سرایت کر گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہاں ایک بڑے خاندان کے بھائی اور بہنیں اکٹھے ہو گئے ہیں اور ان کے جمع ہونے کا صرف ایک ہی مقصد ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو یہ میری زندگی کے پُرمسرت دور کی جانب مراجعت تھی یا سالوں کا الٹا بہاؤ تھا، جو بیت چکے، لیکن وہ ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔

جدہ کے ہوائی اڈے پر میرے بہت سے دوستوں نے استقبال کیا، جن میں ایک شیخ محمد سرور الصبان بھی

Marfat.com

تھے، جو میرے سابقہ قیام کے دوران میں شعبہ مالیات کے افسر تھے، لیکن اب وزیر مالیات تھے۔ ہم دونوں بغلگیر ہوئے اور ایک دوسرے سے معانقہ کیا۔ یوں لگا جیسے ہم ایک دن پہلے جدا ہوئے تھے۔ عرب کی ساری گرم جوشی ان کے گلے ملنے کے انداز میں سمٹ آتی ہے۔

الصبان نے میرے سامان کی رسید اپنے ماتحت کے حوالے کی کہ وہ کسٹم والوں سے میرا سوٹ کیس لے آئے۔ ہم کچھ دیر پرانے دنوں کو یاد کرتے رہے۔ نصف گھنٹے کے بعد وہ شخص واپس آیا اور ہمیں بتایا کہ جہاز کا کونا کونا چھان مارا، لیکن میرا سوٹ کیس نہیں ملا (بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ کراچی کے ہوائی اڈہ پر حاجیوں نے جو بدنظمی پھیلا رکھی تھی، اس کی وجہ سے میرا سامان غلطی سے بنکاک جانے والے جہاز پر رکھوا دیا گیا۔ تقریباً ایک ہفتہ بعد یہ سامان جدہ پہنچا)۔

میں احرام میں تھا، جس پر ایک ٹانکا تک نہیں لگایا جاتا۔ شیخ الصبان کہنے لگے "آپ پریشان نہ ہوں۔ کل ہم عرفات جائیں گے اور فریضہ حج ادا کریں گے اور آپ کو مناسب ملبوسات فراہم کر دیئے جائیں گے۔ ہمارا قد و قامت تقریباً ایک جیسا ہے۔"

وہ رات میں نے الصبان کے گھر پر ہی گزاری اور علی الصبح ہم بذریعہ کار عرفات روانہ ہو گئے۔ کار میں بیٹھتے ہی میں سوچنے لگا کہ میں نے جب پہلی بار اس سرزمین پر قدم رکھا تھا، اس وقت اور موجودہ دور میں کتنی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔

جب میں نے اٹھارہ سال قبل اپنا آخری فریضہ حج ادا کیا تھا، میں ایک اونٹنی پر سوار سفید احرام میں ملبوس ہزارہا نجدی بدوؤں کے درمیان کھڑا تھا۔ ہم میدان عرفات میں اونٹوں کے سرپٹ دوڑنے کی گرج دار آواز میں چلے جا رہے تھے اور اب اسی جگہ ہزاروں کاریں اور بسیں تا حد نظر بیس یا اس سے بھی زیادہ قطاروں میں جبل الرحمت کی طرف رواں دواں تھیں۔ یہ پہاڑی عرفات کے بالکل درمیان واقع ہے۔

مکینکی گاڑیوں کی ان نہ ختم ہونے والی قطاروں کے درمیان بادشاہ کے محافظ دستہ کے سینکڑوں لوگ موجود تھے اور وہ اس بے ہنگم ہجوم کو قابو کرنے اور ان میں ممکن حد تک نظم و ضبط پیدا کرنے کی سعی کر رہے تھے۔ ظاہر ہے، یہ انتہائی مشکل کام تھا۔ اچانک ان محافظوں میں میری نظر امیر فیصل پر پڑی۔ وہ بادشاہ کے دوسرے فرزند اور وائسرائے تھے اور اس وقت یہاں انتظامی سرگرمیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ وہ پتلی سی چھڑی پکڑے وہاں کھڑے تھے۔ ایسی ہی چھڑی سے اونٹنی پر سوار شخص اپنے مرکب کو قابو میں رکھتا ہے۔ وہ ایک معمولی ٹریفک کے سپاہی کی طرح کاروں اور بسوں کے اس غیر منظم بہاؤ کو قابو کرنے میں کوشاں تھے۔ بدنظمی حج سے متعلق تھی اس لیے وہ اس کی درستی کو مذہبی فریضہ سمجھتے تھے، بالکل ویسے ہی جیسے بادشاہ ہر سال خانہ کعبہ میں خود پہلے جھاڑو دیتا اور پھر اسے پانی سے دھوتا ہے۔

میں نے جدہ واپس پہنچنے تک بادشاہ یا امیر فیصل کو کسی قسم کی زحمت نہیں دی تھی۔ یہاں مجھے اطلاع دی گئی کہ شاہ عبدالعزیز نے مجھے ضیافت پر مدعو کیا ہے، جو حج کے اختتام پر مکہ میں دی جا رہی ہے۔

Marfat.com

میں نے اپنی کتاب ''شاہراہ مکہ'' میں بتایا ہے کہ اٹھارہ سال بعد امیر فیصل سے میری ملاقات کیسے ہوئی اور کیسے میں نے انہیں مخاطب کیا۔ ''آپ شاید مجھے بھول گئے ہوں گے۔'' یہ سن کر انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں؟''

اور یہی فیصل تھے، جن کے ساتھ میں نے اپنے قیام کا بیشتر وقت گزارا تھا۔ اٹھارہ سالہ دھیمے مزاج کا نوجوان، لیکن اس کے برتاؤ میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا تھا۔ اس کی شخصیت میں باطنی طمانیت نمایاں تھی اور وہ اس کے روئیں روئیں میں منعکس تھی۔[81]

(2)

اگلی صبح مجھے سرکاری طور پر بادشاہ سے ملنا تھا (وہ پچھلی رات سے علیل تھے اس لیے ان کی جگہ امیر فیصل ضیافت حج کی میزبانی کر رہے تھے)۔

بادشاہ ایک کھلی سی آرام کرسی میں دھنسے ہوئے بیٹھے تھے۔ بظاہر بیمار اور نقاہت کے سبب وہ مہمان کا اٹھ کر استقبال بھی نہیں کر سکتے تھے، حالانکہ پچھلے وقتوں میں وہ اپنے مہمان کی عزت افزائی اپنی جگہ سے اٹھ کر کیا کرتے تھے۔ سعودی عرب سے میری اٹھارہ سالہ غیر موجودگی کے دوران میں وہ خاصے عمر رسیدہ ہو گئے تھے۔ ان کی مسکرانے کی نیم دلانہ کوشش اور ان کے تھکے تھکے چہرے کو دیکھ کر میرے دل پر گہرا اثر ہوا۔ لمحے بھر کے لیے ان کے چہرے پر چمک سی محسوس ہوئی، جیسا ان کے قریب کھڑے بااعتماد مشیر شیخ یوسف یاسین نے ذرا جھک کر انہیں بتایا ''محمد اسد آداب بجا لانے کو حاضر ہوا ہے۔'' یہ سن کر بادشاہ نے سر کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔ تھوڑی دیر کے لیے ان کے چہرے پر عقابی نظر دکھائی دی اور آہستہ آواز میں صرف یہ کہا ''اہلاً وسہلاً' میرے بیٹے!''

میں ان کی یہ حالت دیکھ کر سخت پریشان ہوا۔ میں ان کو مزید زحمت نہیں دینا چاہتا تھا، اس لیے میں پیچھے بیٹھ گیا۔ یہ آخری موقع تھا کہ میں نے عبدالعزیز ابن سعود کے محبت بھرے چہرے کو دیکھا۔[82]

قیام مکہ کے دوران میں امیر فیصل سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ حجاز کے وائسرائے کے علاوہ سعودی عرب کے وزیر خارجہ کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے، اس لیے مجھے انہی سے اپنی آمد کا مقصد بیان کرنا تھا۔ انہوں نے بلا استثناء مسلمان اقوام کی تنظیم کی بھرپور حمایت کی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ خود بھی اسی منزل کی جانب قدم اٹھا چکے ہیں یعنی پہلے عرب ممالک کو متحد کیا جائے اور پھر پورے عالم اسلام کو منظم کر کے ایسی لیگ کی داغ بیل ڈالی جائے۔

وزارت خارجہ کے ایک سادہ سے کمرے میں بیٹھے ہم دونوں اپنے اس مشترکہ خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے ممکنات پر بات چیت کرتے رہے۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چوبیس برس بعد جب وہ تقریباً تمام عربوں کو متحدہ قوت بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا، ایک قاتل کی گولی اتحاد بین المسلمین کے متعلق ان کی تمام

Marfat.com

کوششوں کو ختم کر دے گی اور یوں ان کا دیرینہ خواب بکھر کر رہ جائے گا۔

لیکن یہ دہشتناک المیے سے پہلے مختلف مقامات پر ان سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

(3)

یہ کیسے ممکن تھا کہ میں مدینہ کو دیکھے بغیر سعودی عرب سے چلا جاؤں۔ برسوں گزر گئے، جب میں یہاں مقیم رہا۔ میرے لیے دنیا میں یہی ایک ایسا شہر ہے، جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔

میں جدہ سے جہاز پر سوار ہوا۔ مدینہ میں اب ہوائی اڈہ بن چکا تھا اور دنیا کے کونے کونے سے یہاں جہاز آ رہے تھے۔ یقیناً وقت خاصا بدل چکا تھا۔

لیکن حوادث زمانہ نے ابھی مدینہ کو بالکل تبدیل نہیں کر دیا تھا۔ تبدیلیوں کی یہ یورش بعد میں ہوئی۔ تاہم سڑکوں پر نئی کاریں چل رہی تھیں۔ چند کئی منزلہ عمارتیں تعمیر ہو چکی تھیں، لیکن ان کے نواح میں پرانے، پتھروں کے بنے ہوئے گھر بھی موجود تھے، جو اب بھی تنگ اور بل کھاتی ہوئی گلیوں میں کھڑکی کے بغیر دیواروں کی آنکھ سے محوخواب ہیں، لیکن ابھی پرانے وقتوں کا سکون اور پُر امن فضا کی چادر تنی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اس کے استقبال کے لیے موجود ہے۔

میرا گمان ہے کہ حضرت محمد صلعم مکہ سے ہجرت کر کے یہاں تشریف لائے تھے، تو انہوں نے بھی ایسا ہی محسوس کیا ہوگا۔ کفار مکہ کا ظلم و تشدد اور نفرت آمیز سلوک ان کے تعاقب میں تھا اور وہ اپنی جائے ولادت کو چھوڑ کر یثرب کو چل پڑے، جس کو "مدینۃ النبی" کا اعزاز عطا ہونا تھا۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے: "اے اللہ! آپ کے حکم سے میں نے اپنی جائے ولادت چھوڑ دی، ایسی جگہ جو مجھے بہت عزیز تھی۔ اے میرے پروردگار! اس شہر کی جانب میری راہنمائی فرمائیے جو آپ کو زیادہ پسند ہو۔" اللہ نے حضور اکرمؐ کی دعا قبول فرمائی اور وہ ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لے آئے۔ ماضی کے بعض عظیم ارباب علم و دانش نے تقدس کے اعتبار سے مدینہ کو مکہ پر فوقیت دی ہے، کیونکہ یہ شہر مدینہ ہی تھا، جس سے پروردگار خود ہی محبت کرتا ہے۔

میرے جو احباب ابھی تک بقید حیات تھے، اُن سے ملاقات ہوئی۔ ظاہر ہے، اب ایسے دوستوں کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ ان میں ایک تو مدینہ کے سابقہ امیر ابن ابراہیم تھے۔ ان کی داڑھی سفید تھی، لیکن ان کی آنکھ کی تیزی اور جسم کی مضبوطی قائم تھی۔ اہلاً و سہلاً کے ساتھ قہوے کا دور چلتا رہا اور پرانے اور خوبصورت ماضی کو بھی یاد کرتے رہے۔

وسیع و عریض المناقہ چوک پر آخری نظر ڈالی۔ پرانے وقتوں میں یہاں کارواں آتے تھے اور اونٹوں پر لدا ہوا سامان نیچے اتارتے تھے۔ اب سینکڑوں اونٹوں کی یہ آرام گاہ میں بیسیوں کاریں اور بسیں کھڑی تھیں اور یہاں کوئی بدوی بکری کی کھال کے بنے ہوئے تھیلے میں خالص مکھن بیچ نہیں رہا تھا۔

Marfat.com

(4)

میرے اس سفر کا اگلا پڑاؤ مصر تھا۔

قاہرہ کے ہوائی اڈہ پر پاکستانی ناظم الامور میرے استقبال کو موجود تھے۔ہم وہاں سے سیدھے شیپ ہرڈ ہوٹل پہنچے۔یہ ہوٹل خاصا پرانا تھا اور میں ہمیشہ یہیں ٹھہرنا پسند کرتا تھا۔میں نہیں جانتا تھا کہ میرا نام اس دلکش اور قدیم وضع کے ہوٹل کے آخری سرپرستوں میں شامل ہوگا۔ہر کمرے میں مخملی پردے لٹکتے رہتے تھے اور اس کے آہستہ خرام پگڑیوں والے خدمتگار سنگ مرمر کے فرش اور قیمتی قالینوں پر ادھر اُدھر مصروف نظر آتے تھے۔اس وقت میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قاہرہ سے میری روانگی سے چند روز بعد یہ تاریخی ہوٹل لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بن جائے گا اور فسادی لوگ اس کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔

میں قاہرہ کو اس وقت سے جانتا ہوں، جب 1922ء کے موسم خزاں میں پہلی بار یورپ سے پیدل ہی نکل کھڑا ہوا تھا۔میں کئی بار اس شہر میں آیا اور ہر بار مجھے یہاں ناقابل فراموش تجربات ہوئے۔دریائے نیل پر آباد اس شہر میں ایک عجیب جادوئی کشش ہے۔راحت بخش بادِ صبا چلتی ہے لیکن بمشکل محسوس ہوتی ہے اور یہ دریا کے کنارے ایستادہ کھجور کے درختوں کے بڑے بڑے پتوں کو جھلاتی رہتی ہے تاکہ سننے والے کو پرانی حکایات سنائیں۔میں نے خود کو جوان محسوس کیا اور خوشگوار یادوں اور امیدوں میں کھوسا گیا۔

ہمیشہ کی طرح قاہرہ میں شوروغل اور ہنگامہ برپا تھا۔لوگوں کا ہجوم پہلے سے بڑھ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی غربت میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔سڑکوں کے کناروں پر غربت کے ڈھیر پڑے تھے، جہاں بے گھر اور بے سہارا لوگ چٹائیوں یا چیتھڑوں یا پتھروں پر پڑے تھے۔یہاں سے گزرتے ہوئے بڑی احتیاط کرنا ہوتی تھی، مبادا پاؤں کسی سوئے ہوئے شخص پر نہ پڑ جائے۔نیل کا جادو اور اس کے کنارے کھجوروں کے درخت بھی یہاں تک نہیں پہنچے تھے۔[83]

(5)

قاہرہ پہنچنے کے بعد اگلی صبح میں نے وزیر خارجہ صلاح الدین بے کو فون کیا۔عبدالوہاب عزام نے انہیں میری آمد کی اطلاع کردی تھی۔انہوں نے بڑے دوستانہ لیکن محتاط انداز میں میرا استقبال کیا۔بہت جلد مجھے ان کے دبے رہنے والا انداز ملاقات سمجھ میں آ گیا۔ابھی میں اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے ہی والا تھا کہ ان کے چہرے پر بے لچک تاثرات صاف دکھائی دینے لگے۔وہ نیم دلی سے مسکراتے ہوئے کہنے لگے ''ہم اپنے ملک میں مذہب اور سیاست کی آمیزش کے قائل نہیں۔''

اس وقت مجھے مصر کی آزادی کے سرخیل زغلول پاشا[84] سے 1926ء میں ہونے والی ملاقات یاد آ گئی، جس میں انہوں نے عام مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی زندگی میں اسلام کے بنیادی کردار کے بارے میں میرے جوشیلے اندازِ فکر پر شدید ردعمل ظاہر کیا تھا۔انہوں نے میری جانب اپنا زرد چہرہ موڑتے ہوئے ناصحانہ انداز میں کہا ''میرے

Marfat.com

جوان دوست! مذہب کا زمانہ ختم ہو چکا۔ اب قومیت کا دور ہے۔"

ابھی ابھی صلاح الدین نے جو الفاظ استعمال کیے تھے، ان میں زغلول پاشا کی اس رائے کی جھلک نظر آتی تھی، چنانچہ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ان سے مسلمان اقوام کی اس تنظیم کا ذکر چھیڑا جائے۔ پھر بھی اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہوئے میں نے اس بات پر زور دیا کہ عرب دنیا کی قیادت مصر ہی کا حق ہے اور پاکستان مسلمان ملکوں کی "قیادت" کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ بالآخر گاڑھی اور لذیذ ترکی کافی پیتے ہی میں ان سے رخصت لے کر چل دیا۔

اسی روز بوقت شام عرب لیگ کے بانی اور ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کے چچا عبدالرحمٰن عزام پاشا سے میری ملاقات ہوئی۔ انہیں اتحاد بین المسلمین پر یقین کامل تھا۔ انہیں مجھ سے کلی اتفاق تھا کہ مصری حکومت سے اس مقصد کے لیے رابطہ کرنا تضیع اوقات ہے۔ انہوں نے کہا "شاید کچھ عرصہ بعد ایسا ممکن ہو، لیکن مستقبل قریب میں یقیناً ایسی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے۔ ہمارے سیاستدانوں کو ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ انہیں اپنے لوگوں کے جذبات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔"

قاہرہ میں دو دن قیام کے بعد میں دمشق روانہ ہو گیا۔

(6)

1923ء کے بعد میں دمشق نہیں آیا تھا۔ ان دنوں میں پاسپورٹ یا ویزا لیے بغیر فلسطین کے پہاڑی علاقے سے ہوتا ہوا پیدل شام پہنچا تھا، کیونکہ فرانسیسی حکام نے جو ابھی تک پہلی جنگ عظیم کی تلخ یادوں میں کھوئے ہوئے تھے، میرے آسٹرین پاسپورٹ پر ویزا دینے سے انکار کر دیا تھا۔[85]

ان گذشتہ ایام اور دور حاضر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شام اب ایک آزاد اور خود مختار ملک تھا، لیکن گزرے ہوئے زمانے کی خراشیں ابھی اس کے چہرے پر نمایاں تھیں۔ 1925ء میں فرانسیسی توپخانے نے شام کی "تولیتی حکومت" (Mandatory Power) کے خلاف آخری اور کامیاب شورش کو دبانے کی خاطر دمشق کا مرکزی حصہ تباہ و برباد کر دیا تھا۔ لاتعداد عمارتیں اور سڑکیں ابھی تک ملبے کا ڈھیر دکھائی دیتی تھیں۔ ممکن ہے، بیرونی تسلط کی علامت کے طور پر تباہی و بربادی کا یہ منظر محفوظ رکھا گیا ہو یا شامی حکومت اپنی مالی دشواریوں کے باعث اس کی تعمیر نو کے قابل نہ ہو۔ دمشق اپنی پرانی شان و شوکت سے محروم ہو گیا اور اس کی تاریخ کا بڑا حصہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔

تاہم دمشق میں کہیں ناامیدی یا دل شکستگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ لوگ اپنی مخصوص رجائیت اور پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے جذبے سے سرشار تھے۔ دکانیں طرح طرح کے ساز و سامان سے بھری ہوئی تھیں اور ہر کوئی اپنے روشن مستقبل پر اعتماد رکھتا تھا۔ پرانے شہر کو باغوں اور پھلواڑیوں کی جن لمبی قطاروں نے گھیر رکھا تھا، وہ ویسی ہی کھڑی تھیں اور موسم خزاں کی باد صبا جو سڑکوں پر پڑے بدنما ملبے کے ڈھیروں پر گلابوں، یاسمین اور نارنگی کی خوشبوئیں بکھیر رہی تھی، جنت کی ہوا محسوس ہوتی تھی۔

Marfat.com

ملک کی سیاسی فضا بھی ناراضگیوں اور چھپی ہوئی بدگمانیوں سے آزاد تھی۔ شامی حکومت کے اعلیٰ اور نچلے طبقوں کے رویئے میں ایک خوشگوار کھلے پن کا احساس ہوتا تھا۔ وزیر اعظم شکری قوتلی نے پہلے کی طرح مجھے پرانے دوست کی طرح خوش آمدید کہا۔ 1929ء میں انہوں نے سعودی عرب میں سیاسی پناہ لے رکھی تھی۔ میں ان دنوں طائف کے پہاڑی علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ وہ کئی بار میرے گھر آئے اور کئی خوبصورت شامیں ہم نے اکٹھے گزاریں، جنہیں ہم کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔

وہ ممالک اسلامیہ کی مجوزہ تنظیم کا سن کر نہ گھبرائے نہ خوفزدہ ہوئے۔ وہ کہنے لگے "بلاشبہ ہمیں پاکستان سے ایسی ہی تجویز کی توقع تھی، کیونکہ یہ ملک اسلام ہی کے نام پر قائم ہوا ہے اور اسی سے اس کو دوام حاصل ہوگا۔"

ہم نے اس تجویز کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ میرے کراچی پہنچتے ہی حکومت پاکستان کو اپنا تیار کردہ میمورنڈم ارسال کر دیں گے۔ انہوں نے یہ بھی تجویز کیا کہ میں شام کی بزرگ ترین شخصیت فارس الخوری سے بھی ضرور ملوں۔

(7)

فارس الخوری کے لیے "شام کی بزرگ ترین شخصیت" کا خطاب خوب سجتا تھا۔ میں ان سے ملنے ان کے خوبصورت گھر پہنچا، جو دمشق سے باہر "مہاجرین کی پہاڑی" کی ڈھلوانوں پر واقع تھا۔ اس وقت ان کی عمر اسّی برس کے قریب تھی۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے، لیکن دانائی اور ذہنی قواء مضبوط تھے۔ وہ برائے نام مسیحی تھے، لیکن اقوام اسلامیہ کی تنظیم کے تصور نے ان کے تن بدن میں جوش و جذبے کی ایک لہر دوڑا دی۔ وہ اپنی جوانی میں ایک جوشیلے عرب قوم پرست رہے تھے اور شامی عہدے داروں میں ہر کوئی ان کی عزت کرتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم (1914ء-1918ء) کے دوران میں انہوں نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف برطانیہ اور فرانس کی حمایت کی تھی، حالانکہ ان دنوں شام ترکی کی مملکت کا حصہ تھا۔

فارس الخوری کہنے لگے "یہ ہماری بہت بڑی غلطی تھی، جس کا ہمیں اس وقت احساس نہیں ہوا تھا، اگرچہ ہمیں علم ہونا چاہیے تھا کہ سلطنت عثمانیہ ہی وہ واحد قوت تھی، جو ہمیں آزادی کی نعمت سے بہرہ مند کر سکتی تھی۔ بے شک اگر ترکوں کو شکست کا سامنا نہ کرنا پڑتا تو انور پاشا اپنی ملکی ترقی کے اہم منصوبے میں ضرور کامیاب ہو جاتا، جس کے تحت دوہری بادشاہت قائم کر دی جاتی۔ استانبول اور عرب علاقوں کا صدر مقام حلب قرار دیا گیا۔ وہ آپس میں متحد ہونے کے باوجود اندرونی طور پر آزاد رہتے اور سلطان دونوں صدر مقاموں میں چھ چھ ماہ گزارتا، لیکن کسی حد تک عربوں کی سیاسی حماقتوں سے سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے ہو گئے اور انور پاشا کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

مجھے مسیحی فارس الخوری کے خیالات نے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ انور پاشا کے نا تمام منصوبے کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی تھی، اس کے باوجود ایک عمر رسیدہ مسیحی اس کی تائید کر رہا تھا اور اب وہ مسلمان اقوام کی مجوزہ تنظیم کی

Marfat.com

اہمیت سے بھی متفق تھا۔ میں نے کہا ''آپ مسیحی ہوتے ہوئے ہماری تجویز کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟ سید فارس! آپ مجھے غلط نہ سمجھئے۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ آپ اس تجویز سے کلی اتفاق کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی میں ایک خوشگوار حیرت میں بھی مبتلا ہوں کہ آپ دنیائے عرب کو اسلام کے بڑے سیاسی نظام کا ایک جزو لاینفک قرار دینے کی تائید کرتے ہیں۔''

فارس الخوری ذرا سا جھکے اور میرا بازو پکڑتے ہوئے کہنے لگے ''بالکل درست! میں خود کو مسیحی کہتا ہوں، لیکن یہ صرف ایک لفظ ہے۔ مسیحیت اب ایک مردہ فارمولا ہے یا ایک بھولی بسری یاد۔ دنیائے عرب میں ابھی تک جو ''حقیقی'' طاقت ہے وہ صرف اسلام ہے اور اس میں ذرہ بھر شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اسلام کے بغیر مغربی دنیا کے لیے عربوں کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہیں اور آپ کے لیے شاید یہ بات باعث حیرت ہو کہ میں ایک عرب محب وطن کی حیثیت سے ایسے امکان کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔''

مجھے اب معلوم ہوا کہ شکری قوتلی نے کیا سوچ کر مجھے فارس الخوری سے ملنے کی تاکید کی تھی۔

دمشق میں میرا مشن پورا ہو چکا تھا اور اب میری اگلی منزل بغداد تھی۔

(8)

جب بھی میں بغداد آیا (اور میری سیاحتی زندگی میں ایسا کئی بار ہوا)، اس شہر کی بھدی آرائش اور کسی شناخت کے قطعی فقدان سے مجھے ہمیشہ دھچکا سا لگا۔ اس کی سابقہ داستانوں میں شان وشوکت کے آثار اب کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں منگولوں نے عراق پر حملہ کیا اور سب کچھ تباہ و برباد کر دیا۔ اگرچہ ہلاکو خاں جیسے فاتح نے بعد میں ایسے نادرۂ روزگار شہر کی ظالمانہ تباہی پر اظہار افسوس کیا اور اس کی کچھ تباہ شدہ عمارتوں کو از سر نو تعمیر بھی کرائی، لیکن بغداد کی گذشتہ اہمیت اور شان وشوکت لوٹ کر نہیں آئی۔ وہ شہر قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ اب اس میں اپنا کوئی حسن نہیں رہا، سوائے دریائے دجلہ کے جس کے کنارے یہ شہر آباد ہے۔ سڑکوں پر ہجوم اور شور وغل کے سوا کچھ نہیں اور تعمیراتی حسن کی کوئی شاہکار عمارت کسی نووارد کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی۔ اس کا ناقابل تغیر ماضی بھی یاد نہیں آتا۔ منگولوں کے قتل عام کے بعد یہ شہر ظاہری وضع قطع کے علاوہ اپنی باطنی خوبیوں کو بحال نہ کر سکا۔

دمشق سے بذریعہ جہاز یہاں آنے کے بجائے میں نے زمینی راستہ اختیار کیا اور بذریعہ کار وسیع اور ہموار حمادہ سے ہوتا ہوا اردن کے سفر کے بعد بغداد پہنچا۔ میں ولی عہد شہزادہ عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوا، جس نے اس وقت مرحوم شاہ فیصل کے بیٹے اور اپنے بھتیجے کی جگہ زمام حکومت سنبھال رکھی تھی۔ اس کا نام بھی فیصل تھا اور اس کی عمر چودہ سال کے قریب تھی۔ عبداللہ نے مجھے سرخ اینٹوں سے بنے ہوئے محل میں خوش آمدید کہا، جو شہر کی دیگر عمارتوں کی طرح بغیر کسی تعمیراتی خوبصورتی کے کھڑی تھی، لیکن شہزادے کی دوستانہ گرمجوشی نے مجھے گرد ونواح کی بے وقعتی سے بے پرواہ کر دیا۔ شہزادہ عبداللہ کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی اور وہ ظاہراً خوش خلق اور ہنس مکھ نظر آتا تھا۔ وہ طبعاً ایسا ہی تھا،

Marfat.com

کیونکہ جب میں چند سال بعد اسے نیویارک میں ملا تو اس کے پُرتپاک انداز میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میرے سابقہ تجربات کے مطابق یہ سمجھنا ممکن نہیں کہ کسی عراقی کے ذہن میں کیا ہے۔ نجد اور حجاز کے عربوں کے برعکس عراق کے لوگ قدرے غبی معلوم ہوتے ہیں اور ان کو سمجھنا بھی خاصا مشکل ہے۔

تاہم، جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں، میری ملاقات بڑے خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں ہوئی، اگرچہ شہزادہ عبداللہ نے معاہدہ بغداد کے متعلق پاکستان کے متذبذب رویئے پر کھل کر اپنے تحفظات کا اظہار کیا (پاکستان کے اس مؤقف کا میں ذمہ دار ہوں)۔ اس کے باوجود انہوں نے مسلمان اقوام کی مجوزہ تنظیم کو سراہا اور ان کی پسندیدگی عراق کی اسی روایت کی مظہر تھی، جو پہلی جنگ عظیم میں سامنے آئی تھی، جب تمام عرب ممالک میں صرف عراق نے دل و جان سے اتحاد بین المسلمین کی علامت کے طور پر سلطنت عثمانیہ کی حمایت کی تھی۔

ہماری گفتگو کے دوران میں عبداللہ نے بتایا کہ وزیر اعظم نوری سعید بیمار ہیں، اس لیے وہ مجھے مل نہیں سکتے ''لیکن ہمارے وزیر خارجہ آپ کی حکومتی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے۔''

شہزادہ عبداللہ کا کہنا بالکل بجا تھا۔ وزیر خارجہ فاضل الجمالی نے یہ صرف میرے دورے کے اصل مقصد سے کلی اتفاق کیا، بلکہ اپنی اس رائے کا برملا اظہار بھی کیا کہ انہیں اپنے پورے دور ملازمت میں اتنی اہم تجویز پیش نہیں کی گئی۔ ہم نے اس مجوزہ تنظیم کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور گفتگو کے اختتام پر فاضل الجمالی نے مجھے یقین دلایا کہ عراق صدق دل سے اس تجویز کی حمایت کرے گا۔ اس کے باوجود عبدالرحمٰن عزام کی طرح وہ مصری رویّے سے خاصے مایوس تھے۔ وہ کہنے لگے ''لیکن مصر کے بغیر دنیائے عرب کو یکجا کرنا بھی بڑا مشکل ہے۔ پھر بھی ہمیں کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اگر ہمارا میمورنڈم ضائع ہو جائے اور یہ منصوبہ سرد خانے میں ڈال دیا جائے، پھر بھی اس کی دھیمی دھیمی آواز تو آتی رہے گی۔''

میں یہ سوچتے ہوئی فاضل الجمالی سے رخصت ہوا کہ مجھے ایک اچھا دوست مل گیا۔ آگے چل کر کیا ہو، خدا جانے۔ میری یہ سوچ اتنی غلط بھی نہیں تھی۔ آئندہ برسوں میں میری جب بھی ان سے ملاقات ہوئی (اور اس کے اکثر مواقع ملتے رہتے تھے) میں نے فاضل الجمالی کو دنیائے اسلام کے دیگر سیاستدانوں کی نسبت سب سے زیادہ اپنا ہم خیال محسوس کیا۔

(9)

میرا اگلا پڑاؤ ترکی تھا۔ میں بذریعہ ہوائی جہاز استانبول پہنچا اور میں کئی سال بعد ایک بار پھر گذشتہ زمانہ کے حاکمانہ شہر کی رعنائیوں اور ریاستی شان و شکوہ کے مظاہر میں کھو گیا تھا۔ اس کی مسجدوں، پتھر اور ٹائل کی سمفونیوں، چمکتی محرابوں، آسمان کو چھوتے ہوئے میناروں، سنہرے سینگ (Golden Horn) مع مختلف سائزوں اور جھنڈوں کے کشتیاں اور سمندری جہاز کے، رنگوں، خوشبوؤں اور حیات بخش آوازوں سے بھرے بھرے بازاروں نے

Marfat.com

ایک سماں باندھ دیا اور میں دو دن ہر دم تر و تازہ اس شہر کے سحر میں گرفتار رہا۔ بامر مجبوری یہاں سے مقابلتاً بنجر شہر انقرہ جانا پڑا، جہاں مجھے اپنے مشن کی کامیابی کا بہت کم امکان نظر آتا تھا۔

مجھے علم تھا کہ ترکی کی حکومت کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کیا کیا دشواریاں پیش آئیں گی کہ وہ میری تجاویز پر کھلے ذہن پر اپنا نقطہ نظر بیان کریں۔ اگرچہ کمال اتاترک کے انتقال کو پندرہ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا، لیکن ابھی اس کے اثرات کے گہرے سائے ترکی پر منڈلا رہے تھے۔

انقرہ میں میرے قیام کے پہلے روز ہی بظاہر مشکل مرحلہ واضح طور پر آسان دکھائی دینے لگا۔ دیکھنے میں غیر فوجی حکومت برسر اقتدار تھی، لیکن طاقت کی ''حقیقی'' باگ ڈور فوجی جرنیلوں کے قبضے میں تھی، جو صرف اپنے آپ کو اتاترک کی ''اصلاحات'' کے اصل وارث قرار دیتے تھے۔ ترکی کے اسلامی دور کو یاد دلانے والی ہر چیز سے ان کا مخالفانہ رویہ انقرہ کی روزمرہ زندگی سے ظاہر ہوتا تھا۔ لوگوں کو ابھی تک اپنے سروں پر مخروطی شکل کی بے کنارہ سرخ ٹوپی (کلپک Kalpak) پہننے کی اجازت نہیں تھی اور تمام جوان اور بوڑھی خواتین کے لیے، چاہے وہ پسند کریں یا نہ کریں، ''مہذب'' لباس پہننا ضروری تھا۔ چنانچہ اب مرد اور عورتیں کسی یورپی شہر کے مضافات میں واقع، بیکار مزدوروں جیسی دکھائی دیتی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کو اس ڈھب کا لباس پہننے پر مجبور کیا گیا اور یقیناً ان پر اس سے یہ دباؤ ڈالا گیا کہ ان کا اپنے ماضی سے ہر طرح کا ظاہری رشتہ بھی منقطع ہو جائے اور وہ سرکار کے آمرانہ فیصلے کے تحت ''یورپی'' وضع قطع اپنائیں۔ حکومت کے اس غیر اہم عمل کے اثرات اتنے ہی تباہ کن ثابت ہوئے، جتنے اسکولوں اور پبلک اداروں سے عربی رسم خط کے اخراج اور وہاں رومن رسم خط مروج کرنے سے ہوئے اور یوں قلم کی ایک جنبش سے ترکوں کو ان کے ادب اور تہذیبی خزینوں سے محروم کر دیا گیا۔ ''ترکوں کے باپ'' اتاترک کا یہ منشا تھا یا نہیں، لیکن انہوں نے ترکوں کو، جن سے وہ بھی نسلی تعلق رکھتے تھے، تہذیبی اچھوتوں کی نسل میں تبدیل کر دیا، جو نہ پورے مغربی بن سکے نہ مشرقی ہی رہے یعنی تہذیبی اعتبار سے دوغلوں کی ایک نسل ہو کر رہ گئے۔

انقرہ پہنچنے کے دوسرے دن مجھے اندازہ ہو گیا کہ کمال اتاترک کی نقلی کوششیں پوری طرح بارآور ثابت نہیں ہو سکیں اور ترکی عوام نے بباطن اپنی اصل اور حقیقی شناخت کو ضائع نہیں ہونے دیا یعنی وہ اب بھی پکے مسلمان ہیں۔ اس حقیقت کا ادراک مجھے اس وقت ہوا جب پاکستانی سفیر میاں بشیر احمد نے مجھے بتایا کہ آج جمعہ کا دن ہے اور وہ مجھے اپنے ساتھ انقرہ کی جامع مسجد نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے لے گئے۔

یہ سادہ سی وسیع و عریض مسجد نمازیوں سے بھری پڑی تھی۔ اس کے اندرونی حصے اور خاصے بڑے صحن میں ہم دونوں کو کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہ مل سکی، چنانچہ ہم نے باہر سڑک پر اپنے مصلے بچھائے اور ہزاروں مردوں اور عورتوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کی۔ یہ ترک لوگ ابھی یہ بھول نہیں پائے تھے اور میرے خیال میں کبھی بھول نہیں سکیں گے کہ وہ مسلمان ہیں۔ اسی لمحے یہ اٹل حقیقت منکشف ہوئی کہ اتاترک ہو یا کوئی ایسا فوجی جنرل جو اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر ترکی کی مسند اقتدار پر براجمان ہو، اس قوم کے اسلام پر پختہ ایمان کو متزلزل نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد مسجد کے احاطے سے باہر آیا تو مجھے اسلامی بھائی چارے کا ایک اثر انگیز تجربہ ہوا۔ مسجد کے چاروں طرف لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اسی دھکم پیل میں میری سمور کی ٹوپی کہیں گر گئی اور اس کو ڈھونڈنا ناممکن تھا۔ میرے پاس یہی ایک ٹوپی تھی جو سفر کے دوران میں جب ضرورت پڑتی، استعمال کرتا تھا۔ میں نے سفارت خانہ کے ایک سیکرٹری سے پوچھا کہ اگر وہ کسی جگہ سے واقف ہوں، جہاں سے ایسی نئی ٹوپی دستیاب ہو تو مجھے بتادے۔ وہ مجھے ایک سمور فروش کی دکان پر لے گیا، جس کا مالک ایک بوڑھا شخص تھا وہ اور اس کا بیٹا تھا۔ اس نے ترکی زبان میں (جس سے میں بالکل ناآشنا تھا) دکاندار کو بتایا کہ مجھے ایک کلپک کی ضرورت ہے۔ ان کے پاس ایسی ٹوپی تیار نہیں تھی، کیونکہ ایسے سرپوش کے استعمال پر پورے ترکی میں سخت پابندی عائد کی گئی تھی، لیکن اس نے مجھ سے چند گھنٹوں میں ایسی ٹوپی تیار کرنے کا وعدہ کیا۔ جب میں سہ پہر کو وہاں پہنچا تو خاکستری دستر خوان سے تیار کردہ خوبصورت کلپک تیار رکھی تھی۔ جونہی میں نے اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے اپنا بٹوہ کھولا، دونوں باپ بیٹے نے رقم لینے سے صاف انکار کر دیا۔ بوڑھے دکاندار نے کہا ''ہم اپنے بھائی سے معاوضہ نہیں لیتے اور آپ ہمارے بھائی ہیں۔''

(10)

مسجد میں ہزاروں ترکوں کے ساتھ باجماعت نماز جمعہ ادا کرنے اور پھر سمور فروش کی گفتگو میری قوت ایمانی کے لیے تقویت بخش ثابت ہوئی۔ انہی ہمت افزا اور ایمان افروز مشاہدات و تجربات میں سرشار ترکی کے وزیر اعظم جلال بایار اور قانون ساز اسمبلی کے صدر نشین عدنان میندریس سے ملنے چلا گیا۔ ترکی قہوہ پیتے ہوئے میں نے مسلمان اقوام کی مجوزہ تنظیم کا خاکہ اور اس کے اغراض و مقاصد بیان کیے، جس کو معرض وجود میں لانے کے لیے ترکی اپنی کثیر آبادی، فوجی طاقت اور سب سے بڑھ کر صدیوں پر پھیلی ہوئی اپنی تاریخ میں کارہائے نمایاں کے باعث اہم کردار ادا کرسکتا تھا۔

جلال بلیار اور عدنان میندریس دونوں نے پاکستانی کوششوں کی تعریف کی۔ مؤخر الذکر نے مزید کہا ''پاکستان سے ہماری بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدا آپ کے ملک کو دنیا میں احیائے اسلام کی پیش روی کا اعزاز عطا فرمائے۔'' اسی ملاقات میں انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ انہیں اس راہ میں آہستہ روی اور محتاط انداز میں آگے بڑھنا ہوگا، کیونکہ ابھی کمال اتاترک کی تباہ کن میراث اس ملک میں بالخصوص شہروں میں مضبوطی سے اپنے قدم جمائے ہوئے ہے اور اسلام کے حوالے سے ذرا بلند آواز سے مقتدر حلقے شدید ردعمل کا اظہار کریں گے۔

ترکی کے ان دونوں بڑے رہنماؤں نے خفیف سا اشارہ تک نہیں کیا کہ اس ردعمل کی شدت کیا ہوگی اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ دونوں جلد دار و رسن پر جھول کر شہداء کی صف میں شامل ہو جائیں گے۔

(11)

اسی شام مجھے ایک خوفناک دھچکا لگا۔ بذریعہ فون سفارت خانہ خبر موصول ہوئی کہ لیاقت علی خاں کو قتل کر دیا

Marfat.com

گیا۔

وہ شمال مغربی پاکستان کے ضلع ہزارہ کے ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے کہ انہیں گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ حملہ آور ایک اجنبی شخص تھا، جسے کوئی نہیں جانتا اور نہ کبھی جان سکے گا، کیونکہ وزیر اعظم پر گولی چلانے کے چند لمحے بعد وزیر اعظم کے حفاظتی عملہ کے نگران پولیس انسپکٹر نے اسے بھی وہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس طرح اجنبی قاتل کی موت سے لیاقت علی خاں کی ہلاکت کے پس منظر کا کچھ پتہ نہ چلا اور یہ ابھی تک ایک سربستہ راز ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے یہ خبر سنتے ہی اندازہ ہو گیا کہ مشرق وسطیٰ کا میرا دورہ اپنے انجام کو پہنچ گیا اور اب مسلمان ممالک کی تنظیم کا ہمارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ میں نے فوراً اپنا سامان باندھا اور کراچی جانے والے پہلے جہاز پر سوار ہو گیا۔

واپس آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ شمال مغربی سرحدی صوبے کے اپنی زندگی کے آخری المناک سفر پر روانہ ہونے سے قبل لیاقت علی خاں نے اپنی تقریر کے چند نکات الگ کاغذ پر لکھے تھے۔ انہوں نے یہ تقریر اگلی صبح ایک جلسہ عام میں کرنا تھی۔ وہ نکات ان کی میز پر پڑے ہوئے ملے۔ یہ چند الفاظ پر مشتمل تھے اور ان سب کے نیچے سرخ لکیر لگائی گئی تھی۔ یہ الفاظ تھے: ''لیگ آف مسلم نیشنز'' اور ''کانسٹی ٹیوشن''۔ ظاہر ہے، ان الفاظ کا تعلق ان کی تقریر سے تھا، جو وہ کر نہ سکے۔

اس کے بعد میں نے اکثر خود سے سوال کیا ہے کیا لیاقت علی خاں کی ہلاکت اور ان نکات کے درمیان کوئی تعلق ہے؟ اس حوالے سے کیا میں ان کی موت کا ذمہ دار ہوں؟ میرے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں۔[86]

(12)

میں کراچی دیر سے پہنچا اس لیے وزیر اعظم کے جنازے میں شریک نہ ہو سکا، لیکن ان کے قتل سے لوگوں کو جو صدمہ اور دھچکا محسوس ہوا، اس کا میں شاہد ہوں۔ ہر شخص ایک ہی سوال لئے پھر رہا تھا کہ یہ حادثہ کیسے رونما ہوا، لیکن کسی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ بیشتر مفروضات سامنے آئے، بھانت بھانت کی افواہیں گردش کرتی رہیں، لیکن اصل حقیقت پر پردہ پڑا رہا، کیونکہ کوئی قاتل کی شناخت نہیں کر سکا۔ البتہ ایک بات یقینی ہے کہ قاتل اور مقتول کے درمیان کسی سابقہ تعلق کا کوئی سراغ نہیں مل سکا، اس لیے کسی 'ذاتی' وجہ کا تو بالکل امکان نہیں۔ یقیناً اس قتل کی وجوہ سیاسی تھیں اور کسی نے قاتل کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ وہ پس منظر میں رہا اور اس کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

چند روز بعد قومی اسمبلی نے مقتدر جماعت یعنی مسلم لیگ کے رہنماؤں میں سے ایک کو نیا وزیر اعظم منتخب کر لیا۔ وہ مشرقی پاکستان کا ایک سیاست دان تھا۔ ان کا نام محمد علی تھا[87] (کابینہ کے سیکرٹری جنرل کا بھی یہی نام تھا اور وہ بھی بعد میں وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہوئے)۔[88]

Marfat.com

زندگی حسب معمول رواں دواں رہی۔ میں نے اپنی دورۂ مشرق وسطیٰ کی رپورٹ وزیر خارجہ ظفر اللہ خاں کو پیش کر دی۔ انہوں نے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور پھر ایک طرف رکھ دی۔ اتحاد بین المسلمین کے لیے میری ساری تگ ودو ایک فائل کی صورت میں وزارت خارجہ کے دستاویز خانہ کی زینت بن گئی۔

(13)

دمشق میں میرے قیام کے دوران میں شامی وزیر خارجہ شکری قوتلی نے اپنے ملک اور پاکستان کے مابین دوستانہ معاہدے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اب شامی ناظم الامور اور میرے دیرینہ دوست بہاء الدین الامیری نے رسماً ایک منصوبہ اپنی حکومت کو پیش کیا۔ شعبہ مشرق وسطیٰ کے سربراہ کی حیثیت سے مجھے شامی نمائندے سے اس معاہدے کی تفصیلات طے کرنے کا کام سونپا گیا۔

ابتدا ہی میں میری یہ تجویز تھی کہ اس معاہدے کے عارضی مسودے کا عنوان ''معاہدۂ دوستی'' کے بجائے ''دوستی اور بھائی چارہ کا معاہدہ'' رکھا جائے اور بہاء الدین نے کھلے دل سے میری حمایت کی۔ ہم نے اس معاہدے کو خوب سے خوب تر بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، کیونکہ اس کے تحت دو اسلامی ممالک کے دوستانہ مراسم کو مضبوط بنیادوں پر استوار ہونا تھا۔ میرے خیال میں ہم اپنی کوشش میں سرخرو ہوئے۔

معاہدہ کا عارضی مسودہ تیار ہوتے ہی میں نے اسے اپنے سیکرٹری جنرل اکرام اللہ کو بھجوا دیا، جنہوں نے اسے دیکھتے ہی مجھے مخاطب کیا ''لیکن اسد! 'بھائی چارہ' کی اصطلاح سفارتی زبان میں مستعمل نہیں۔'' میں نے جواب دیا ''درست ہے، لیکن اس طرح ہمارا نام ایجاد کنندگان میں شامل ہوگا۔ ہم کیوں سفارتی اصطلاحات میں ایک نئے لفظ کی شمولیت سے ہچکچا رہے ہیں؟''

ہم کچھ دیر اس موضوع پر بحث کرتے رہے اور بالآخر اس کا فیصلہ وزیر خارجہ پر چھوڑ دیا، جنہوں نے اس پر سرسری سی نظر ڈالتے ہی مجھے کام کو جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ یوں جدید سفارتی ذخیرۂ الفاظ میں پہلی بار ''بھائی چارہ'' کی اصطلاح شامل ہوئی۔ اس معاہدہ کو آخری شکل دی گئی اور دونوں ملکوں کے نمائندوں نے اس پر دستخط کر دیے۔ مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت کو فروغ دینے میں یہ میرا پہلا قدم تھا۔

(14)

ایک روز دفتر میں مجھے ایک ملاقاتی ملنے آیا۔ اس کا نام حبیب بورقیبہ تھا اور یہ تیونس کی جنگ آزادی کا جلاوطن رہنما تھا۔[89]

وہ میرے ہم عمر یا شاید مجھ سے چند سال بڑے تھے۔ عرب ممالک اور یورپ کے لمبے سفروں نے انہیں تھکا دیا تھا اور اب خاصی مایوسیوں کا بوجھ لیے وہ اپنی تحریک کی مادی اور اخلاقی اعانت کے لیے پاکستان آئے تھے۔

Marfat.com

یہاں انہیں مایوس ہونے کا امکان کم نظر آتا تھا۔ ہمارے وزیر خارجہ کی بڑی خوبیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ ان لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے، جو نوآبادیاتی استعماریت کے خلاف نبرد آزما تھے۔ ان کے اس رویے میں ذرہ بھر کھوٹ نہیں تھی۔ مسلمانوں میں یگانگت واشتراک کو تقویت دینے کے اس مخلص جذبہ کا ان کے جماعت احمدیہ سے نجی گہرے تعلق یا برطانیہ سے ان کی جذباتی ''فرمانبرداری'' سے نہیں تھا۔ بورقیبہ کو میرے پاس بھیجنے سے قبل انہوں نے تیونس کی جنگ آزادی کو درپیش تمام مسائل پر ان سے تفصیلی مذاکرات کر لیے تھے اور اب ہم تینوں اپنی مختلف نشستوں میں ان کے دیگر پہلوؤں کو زیر بحث لاتے رہے۔ نتیجتاً حکومت پاکستان نے بورقیبہ اور اس کی تحریک کو نہ صرف ہر طرح کی مالی اور اخلاقی امداد کا پختہ یقین دلایا، بلکہ دوسرے ذرائع بھی بروئے کار لانے کا وعدہ کیا۔ بین الاقوامی سطح پر ان یقین دہانیوں کے منفی اثرات ہو سکتے تھے، لیکن پاکستان کو اس کی بالکل پرواہ نہیں تھی۔

بورقیبہ نے ان مذاکرات اور ان کے مثبت نتائج کے ضمن میں میرے مخلصانہ تعاون کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ کئی سال بعد جب میں وزارت خارجہ سے سبکدوش ہو چکا تھا اور وہ تیونس کی کرسی صدارت پر متمکن تھے، لیکن پھر بھی وہ کھلے عام اس کا اعتراف کرتے تھے۔

(15)

شعبہ مشرق وسطیٰ میں میرا کام اب ختم ہونے کو تھا۔ ایک روز اکرام اللہ نے مجھے اطلاع دی کہ وزیر خارجہ نے مجھے بیرون ملک بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے، شاید مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے۔ میں نے پوچھا ''کہاں؟'' انہوں نے جواب دیا ''بیونس آئرس ناظم الامور کی حیثیت سے، تاکہ وہاں پاکستان کے سفارت خانہ کا سنگ بنیاد رکھا جا سکے۔''

''لیکن اکرام اللہ صاحب! میں تو ''مشرق وسطیٰ'' کا آدمی ہوں۔ میری دلچسپیاں تو دنیائے عرب سے ہیں۔ میں جنوبی امریکہ جا کر کیا کروں گا؟''

اکرام اللہ نے کہا ''ٹھیک ہے! آپ ظفر اللہ سے بات کر لیجیے، کیونکہ یہ ان کا فیصلہ ہے، میرا نہیں۔''

میں ظفر اللہ خاں سے ملا اور ارجنٹائن میں اپنی مجوزہ تعیناتی پر احتجاج کیا اور ان کی خدمت میں اپنی معروضات پیش کیں، جن کا میں سیکرٹری جنرل سے ذکر کر چکا تھا، لیکن ظفر اللہ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے۔

''سر! اس صورت میں مَیں اب سیدھا اپنے دفتر جا رہا ہوں اور بہت جلد وزارت خارجہ سے میرا استعفیٰ آپ کو مل جائے گا۔''

جب میں بیرونی دروازے تک پہنچا تو وزیر خارجہ نے مجھے واپس بلایا اور کہنے لگے ''اسد! اتنی جلدی مت کیجیے۔ میں اس پر سوچوں گا۔''

حسب وعدہ انہوں نے سوچ لیا، کیونکہ اگلے روز بیونس آئرس میں میری تقرری کو منسوخ کر دیا گیا اور مجھے اپنی موجودہ ملازمت پر کام جاری رکھنے کا حکم دیا گیا۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

باب دہم

اقوامِ متحدہ میں
(1951ء-1952ء)

(1)

دسمبر 1951ء کے اوائل میں ظفر اللہ خاں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اقوام متحدہ جانا پسند کروں گا؟ انہوں نے آزمائشی انداز میں یہ تجویز پیش کی، کیونکہ انہیں پہلے اس بات کا تجربہ ہو چکا تھا کہ میرا مخصوص دائرہ کار کونسا ہے اور اس کے متعلق میرا نقطہ نظر کیا ہے؟ وہ بہت پُر اسرار شخص تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اقوام متحدہ کے اگلے اجلاس میں یورپ کی نو آبادیات اور ''ماتحت علاقوں'' کی حیثیت اور انہیں آزاد کرانے کے لیے جو تحریکیں چل رہی ہیں، ان کے بارے میں بحث ہوگی۔ ''چونکہ یہ تمام عرب ممالک ہیں، اس لیے ایسا نمائندہ بھیجنا مفید رہے گا، جو ان کے مسائل سے کما حقہٗ آگاہ ہو اور ان کی زبان بھی بول سکتا ہو۔ اسد! آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں نے اپنی تقرری کے بارے میں وزیر خارجہ کے محتاط رویّے کا شکریہ ادا کیا اور میں نے فوراً ان سے اتفاق کرتے ہوئے عرض کیا کہ شمالی افریقہ کے مختلف النوع امور سے مجھے خصوصی دلچسپی ہے اور ان سے نپٹنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہوں۔ اس کے ساتھ میں نے محسوس کیا کہ وزیر خارجہ نے میری اس تعیناتی کا ذکر کرتے ہوئے ''ہمارے نمائندوں میں سے ایک'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ مجھے اس مشن کا سربراہ نہیں بنایا جائے گا۔ ایک بار پھر میری جلد کا سفید رنگت اس راہ میں حائل ہو گیا، جیسا کہ وزارت خارجہ کی ملازمت اختیار کرتے ہوئے ٹیرنس کریگ کوئن نے واضح طور پر پیش گوئی کر دی تھی، لیکن میں نے اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ میں شمالی افریقہ کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں کسی بھی برائے نام سربراہ کے مقابلے میں اس فریضہ کو زیادہ مؤثر طریقے سے ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔

بہت جلد مجھے پتہ چل گیا کہ سربراہ کون ہوگا۔ وزیر اعظم اور وزیر خارجہ نے اس عہدے کے لیے احمد شاہ بخاری کو منتخب کیا[90]۔ وہ لاہور کے ایک کالج میں انگریزی ادب پڑھاتے رہے۔ وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے اور مجھے ناظم الامور کی حیثیت سے ان کی ماتحتی میں کام کرنا تھا۔ ہم ذاتی طور پر ایک دوسرے کو نہیں جانتے

Marfat.com

تھے اور یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ اجتماع ضدین ہے، جن کا اتصال ممکن نہیں ہوتا۔

(2)

میں اپنا رخت سفر باندھنے میں چند ہفتے مصروف رہا۔ شعبہ مشرق وسطیٰ کے کام کو سمیٹا اور اسے اپنے جانشین کے سپرد کیا، جو انڈین سول سروس کا ایک سابقہ رکن تھا، لیکن وہ مشرق وسطیٰ کے مسائل اور وہاں کی زبان سے بالکل نابلد تھا۔ سرکاری ملازمت میں اتنے سال گزارنے کے باعث میں ابھی ایسے فوری تبادلوں کا عادی ہو چکا تھا اور اب مجھے ایسی کوئی تشویش لاحق نہیں تھی کہ میرے بعد شعبہ مشرق وسطیٰ کا کیا بنے گا۔ مجھے پہلے ہی سے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ لیاقت علی خاں کی موت کے بعد وزارت خارجہ میں مَیں زیادہ عرصہ ٹھہر نہیں سکوں گا۔ تاہم اب میں اقوام متحدہ میں اپنے فرائض کی بجا آوری کے متعلق سوچ رہا تھا اور ہر وقت یہی خیال دامنگیر تھا کہ میں ذاتی طور پر شمالی افریقہ کے ممالک میں جاری آزادی کی تحریکوں کو آگے بڑھانے میں کیا کردار ادا کر سکتا ہوں۔

51-1952ء کے موسم سرما میں اقوام متحدہ کا اجلاس پیرس میں منعقد ہونا تھا، اس لیے میں پیرس روانہ ہو گیا۔ 31 دسمبر 1951ء کو رات گئے جہاز اورلی (Orly) کے ہوائی اڈے پر اترا اور میں نے پورے پچیس برس کے بعد یورپ کی سرزمین پر قدم رکھا۔ مجھے یاد ہے کہ یکم جنوری 1927ء کو میں برلین سے مصر روانہ ہوا تھا اور اس کے بعد یورپ کا رخ نہ کر سکا۔

ہمارے وفد کے بیشتر ارکان پہلے ہی پیرس پہنچ چکے تھے، لیکن وہ ابھی احمد شاہ بخاری کے منتظر تھے، کیونکہ وہ ابھی نیویارک میں تھے اور وہاں مستقل سفارت خانہ کے لیے حال ہی میں خرید کردہ عمارت پاکستان ہاؤس کی تزئین و آرائش میں مصروف تھے۔ پیرس کے اس اجلاس میں ظفر اللہ خاں بھی تشریف لا رہے تھے، کیونکہ انہوں نے ذاتی طور پر پاکستانی وفد کی قیادت کرنا تھی۔ فی الحال ان کی غیر موجودگی میں مَیں سینئر میزبان افسر کی ذمہ داریاں بھگتا رہا تھا۔

سفیر پاکستان نے پیرس میں ہمارے رہنے سہنے کے لیے شاندار رہائش گاہ کا انتظام کر رکھا تھا، یعنی پیرس کے انتہائی آراستہ و پیراستہ ہوٹل Plaza Atheneé میں ارکان وفد کے کمرے محفوظ کرا دیئے گئے تھے۔ غالباً اس طرح وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ پاکستان کوئی غریب ملک نہیں ہے۔ وفد کے عارضی سربراہ کے طور پر مجھے کمروں کا ایک پورا سویٹ (suite) دیا گیا، جس میں میری خواب گاہ کے علاوہ ایک بیٹھک بھی تھی، جس کو اصل قدیم نوادرات اور نفیس قالینوں سے سجایا گیا تھا۔ پاکستان کی اقتصادی صورت حال کے پیش نظر یہ پُر تکلف انتظامات صریحاً فضول خرچی اور روپے پیسے کا زیاں تھا۔

جنرل اسمبلی میں ہماری مصروفیت کچھ زیادہ نہیں تھی، سوائے اس کے کہ ہم اقوام متحدہ کے نمائندوں گروس اور روسی مندوب، جس کا نام بھول گیا ہوں، کے مابین مستقل عامیانہ سے تقریری مقابلوں کو سنتے رہیں۔ ابتدا میں ایسے مناقشے پُر لطف محسوس ہوتے تھے، لیکن کچھ دیر بعد یہ بیزار کن یکسانیت کا شکار ہو گئے اور سب سے اہم بات یہ کہ ان

Marfat.com

تقریروں کا کچھ حاصل نہیں تھا۔ نوبت بہ ایں جارسید کہ جونہی ان میں کوئی اسمبلی میں تقریر کرنے اٹھتا، حاضرین ایک ایک کر کے کچھ وقت کے لیے ہال سے باہر نکل جاتے، برآمدوں میں دوسرے وفود کے ارکان سے ملتے ملاتے اور تقریباً آدھا گھنٹہ ان افراد سے پُرجوش گفتگو کرتے، جن کی عالمی سیاست پر گہری نظر تھی یا جو ایک دوسرے سے کسی تلخی یا نفرت کے بغیر بات چیت کر سکتے تھے۔

جب کبھی دن یا شام کو کئی گھنٹے جنرل اسمبلی کا اجلاس نہیں ہوتا تھا تو میں پیرس کی سڑکوں پر گھومنے نکل جاتا تھا۔ کبھی میرے ساتھ اپنے وفد کا کوئی رکن ہوتا تھا، لیکن عموماً میں اکیلا ہی گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ گاہے بگاہے طلوع آفتاب سے پہلے Les Halles کے مقام پر مزدوروں اور بس ڈرائیوروں میں بیٹھ کر شاندار سُوپ (soupe à l'oignon) پیا کرتا تھا۔ یہ لوگ باہر سے شہر کی مارکیٹوں کے لیے کھانے پینے کی اشیاء لایا کرتے تھے۔ میں ''اعلیٰ طبقہ'' کے اکھڑ اور اکثر بدتمیز لوگوں کے بجائے پیرس کے مزدوروں کو زیادہ پسند کرتا تھا اور یوں عام طور پر اپنے ہوٹل کا پُرتکلف ناشتہ نہیں کر پاتا تھا۔ اس کے بجائے میں کسی چھوٹے کیفے یا کلب میں بیٹھ کر خاص وضع کی فرانسیسی روٹی (croissant) کھالیتا اور کافی کا کپ پی لیتا، عام لوگوں سے گپ شپ لگاتا اور یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ وہ کس طرح اپنے روزانہ کے محنت طلب کام میں مصروف ہو جاتے ہیں اور جب نقاہت محسوس کرتے ہیں تو خشک اور بے رنگ شراب (aqua-vit) کا گلاس انڈیل کر پھر سے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔

تقریباً دو ہفتوں بعد ظفر اللہ خاں بھی پیرس پہنچ گئے اور ہمارے مشن کو ''منظم'' کرنا شروع کر دیا۔ وہ ہمیں جتنا کام سونپ رہے تھے، وہ جنرل اسمبلی میں ہمارے دائرہ کار سے بڑھ کر تھا۔ ابھی شمالی افریقہ یا مشرق وسطیٰ کے مسائل زیر بحث نہیں آئے تھے اور ہندوستان کے ساتھ ہمارا تنازعہ کشمیر بھی ایجنڈے پر نہیں تھا۔ درحقیقت، کم از کم اس وقت تک، اسمبلی میں کسی اہم مسئلہ پر سنجیدہ گفتگو نہیں ہو رہی تھی۔ صرف امریکہ اور روس کے مندوبین کے درمیان گرما گرم تقاریر کا لامتناہی اور بے نتیجہ سلسلہ چل رہا تھا۔

پھر بھی ہمارے لیے ''منظم'' ہونا لازم تھا اور اس کے لیے ظفر اللہ خاں روزانہ صبح نو بجے ایک کانفرنس منعقد کرتے تھے، جس میں وفد کے سبھی ارکان کو حاضر ہونا پڑتا تھا، تا کہ وہ اسمبلی کی روزمرہ کی کارروائی میں اٹھائے گئے غیر متعلقہ نکات پر پاکستانی مؤقف کو ذہن نشین کر لیں۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ اسمبلی کے مباحث کے بارے میں وہ اپنی مستعدی اور پیش بینی سے متاثر کرنا چاہتے تھے تا کہ یوں وہ پیرس کے ایک مہنگے ہوٹل (Plaza Atheneé) میں ہمیں ٹھہرانے کا کوئی جواز پیدا کر سکیں۔ بہرکیف ہر روز صبح کی کانفرنس میں چار پانچ ارکان وفد کی حاضری ضروری تھی اور بس!

یہ بہت بعد کی بات ہے کہ پاکستان نے نیویارک میں 'حقیقتاً' اپنا بنیادی کردار ادا کرنا شروع کیا اور اس میں میرا بھی کچھ عمل دخل رہا۔

Marfat.com

(3)

پیرس کا اجلاس تو عارضی نوعیت کا تھا، اس لیے میں اپنی بیوی کو وقتی طور پر کراچی ہی میں چھوڑ آیا۔ ویسے بھی برصغیر میں رہنے والی ایک نجدی خاتون کے لیے پیرس کی زندگی میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ بیٹا طلال اب لندن میں فن تعمیر کا طالب علم تھا، اس لیے میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس کی ماں کے لیے یہی مناسب ہوگا کہ وہ اپنے بیٹے کی تعلیم مکمل ہونے تک اس کے پاس ہی رہے۔ چنانچہ میں چند روز کی رخصت لے کر کراچی پہنچا تا کہ سامان وغیرہ باندھ کر طلال کی والدہ کو لندن ساتھ لیتا آؤں۔ پیرس کا اجلاس بھی اب قریب الاختتام تھا، اس لیے میں پیرس جانے کے بجائے لندن ہی سے سیدھا نیویارک روانہ ہو گیا۔

لندن میں پاکستانی ہائی کمشنر کے سیکرٹری نے میرا اور منیرہ کا استقبال کیا اور ڈورچسٹر (Dorchester) میں ہماری رہائش کا انتظام کر دیا۔ میرے خیال میں یہ بھی ایک فضول خرچی ہی تھی اور شاید پاکستان کے سفارتی نمائندوں کو اپنے 'رتبہ' کی نمائش کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔

یہ جگہ رہنے سہنے کے اعتبار سے آرام دہ تھی اور ان دنوں مجموعی طور پر لندن میں جو بے لطفی کی فضا طاری تھی، یہاں ایسا احساس نسبتاً کم ہی ہوتا تھا۔ بمباری نے جو یہاں تباہی مچائی تھی، اس کے آثار ابھی جا بجا دکھائی دیتے تھے۔ اندرون شہر تباہ شدہ عمارتوں کی اینٹوں کے ڈھیر لگے تھے۔ مڑے تڑے آہنی شہتیر اور کاٹھ کباڑ پڑا تھا اور اب یہ کسی کام کا نہیں تھا۔ جنگ کے بعد تقریباً دس برس تک لندن کا ماحول اتنا یاس انگیز تھا کہ شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آیا ہو۔

جلد ہی میں نے ایک مناسب ضروری سامان سے آراستہ فلیٹ تلاش کر لیا اور طلال اور اس کی والدہ کو وہاں لے گیا۔ اس کے بعد میں نیویارک چل پڑا۔ دھکیلو پنکھوں والے اس جہاز (propeller) کی یہ پرواز لمبی اور تھکا دینے والی تھی۔ جہاز شنون (Shannon) کے ہوائی اڈہ پر تھوڑی دیر کے لیے رکا اور پھر موسمی حالات کے باعث اس نے شمال کی جانب ایک لمبا چکر کاٹا اور نیوفاؤنڈ لینڈ (Newfoundland) کے برفانی ہوائی اڈے پر خاصی دیر تک رکا رہا۔ تقریباً انیس گھنٹوں کی پرواز کے بعد یہ جہاز نیویارک کے بین الاقوامی ہوائی اڈہ پر اترا، جہاں پاکستان مشن کا تھرڈ سیکرٹری کار سمیت میرا انتظار کر رہا تھا۔ کراچی سے لندن اور پھر لندن سے نیویارک کے اس طویل فضائی سفر کے دوران میں میں نے اپنے صندوق کو، جس پر ہمارا نیا کوڈ (code) لگا ہوا تھا، اپنے ہاتھ سے باندھے رکھا۔ کراچی سے روانگی سے ایک روز قبل گیراج میں گرنے کی وجہ سے میری دو پسلیوں پر شدید چوٹ آئی تھی، لیکن میں کوئی احتیاطی تدبیر اختیار کیے بغیر اس لمبے سفر پر چل دیا، چنانچہ شاید اسی بے پروائی کے سبب کئی سال بعد مجھے ذات الجنب (pleurisy) کا شدید دورہ پڑا۔ یہ بھی وزارت خارجہ میں میری ملازمت کا ثمر تھا۔

ہوائی اڈہ سے شہر آتے ہوئے مجھے بتایا گیا کہ میرے عہدے کے اعتبار سے ہوٹل پیرے (Hotel Pierre) میں کمرے کا انتظام کیا گیا تھا، لیکن میرے بڑے افسر نے اس بنا پر اسے منسوخ کر دیا کہ یہ 'بہت' مہنگا ہے۔ چنانچہ مجھے دوسرے درجے کے ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔ احمد شاہ بخاری کے ساتھ مستقبل میں میرے تعلقات کس نہج پر آگے

Marfat.com

بڑھیں گے، یہ اس کی جانب پہلا قدم تھا۔

اگلے روز جہاں میری ان سے ملاقات ہوئی، وہ نیویارک کے مشرقی حصے میں واقع ایک مہنگا ترین ہوٹل تھا، جس کے متعدد پُرتعیش کمروں پر مشتمل ایک الگ حصے میں وہ سکونت پذیر تھے۔ ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، لیکن مجھے جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ ہم کبھی ایک دوسرے کے دوست نہیں بن سکیں گے۔ بلاشبہ وہ بلا کے ذہین شخص تھے اور ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا اور بظاہر ان کی پرورش اچھے ماحول میں ہوئی تھی، لیکن ان اوصاف کے ساتھ ساتھ وہ بڑے مغرور اور ''خود بین'' شخصیت کے مالک تھے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ کسی بھی موضوع پر اختلاف رائے کو برداشت نہیں کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کو اپنی ''ہیئت اقتدار'' کے ماتحت سمجھتے تھے، اس پر رعب جمانا اور اپنی بالادستی کا احساس دلاتے رہنا بخاری صاحب کی نفسیاتی کمزوری تھی، لیکن ایسی مغلوبیت میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ میں نے جب سے سرکاری ملازمت اختیار کی تھی، ہمیشہ اپنے تصورات کی پاسداری کی تھی اور بلاخوف وخطر ان کا برملا اظہار کرتا تھا۔ لیاقت علی خاں کو میرا یہی انداز تکلم پسند آ گیا تھا۔ وہ معمولی آدمی نہیں تھے، لیکن میری یہی غیر منافقانہ طرز گفتگو احمد شاہ بخاری سے میرے تعلقات کی راہ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ وہ غالباً اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ میں ان کی بلند مرتبہ شخصیت کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا اور پاکستانی وفد کو متحرک اور فعال رکھنے کے لیے جس ''ساکھ'' کی ضرورت ہے، میں اسے خراب کرنے کی سازش کر رہا تھا۔ چنانچہ وہ کبھی بھی مجھے میری حقیقت جتانے کا موقع ضائع نہیں کرتے تھے، خاص طور پر جب میں کسی زیر بحث سیاسی مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا۔ نجی گفتگو میں یا بھری محفل میں ان کا یہی طرز سلوک تھا۔ نتیجتاً میرے اور ان کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے اور مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ ہم ایک ہی ''ٹیم'' کے رکن ہیں اور مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے ہم اکٹھے کام کر رہے ہیں۔

(4)

پیرس کے اکتا دینے والے اجلاس کے برعکس نیویارک کا ماحول کم ازکم میرے لیے زندگی بخش تھا اور یہاں میرے ذوق وشوق کی ہر چیز میسر تھی۔ ابتدائی دنوں ہی سے مجھے عربی ممالک کے متعدد نمائندوں سے ملنے اور ان سے دوستانہ مراسم قائم کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ ان میں سے بیشتر اپنی حکومتوں کی نمائندگی کرنے یہاں آئے تھے یا شمالی افریقہ کے سیاستدان بطور مبصر ان اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان لوگوں میں نمایاں ترین مراکش کی استقلال جماعت کے رہنما علال الفسی (Allal al-Fassi) تھے۔ وہ اعلیٰ پایہ کے عالم اور اس سے بڑھ کر وہ اہم اور جرأت مند مفکر بھی تھے۔ ہماری جان پہچان بہت جلد دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ انہیں فوراً اس بات کا احساس ہو گیا کہ اپنے ملک کی آزادی کے لیے ان کے دل میں جو اضطراب اور تڑپ ہے، میں بھی اس میں برابر کا شریک ہوں اور مجھے شمالی افریقہ کے مفادات اتنے ہی عزیز ہیں، جتنے پاکستان کے، اس لیے ہمارے مابین کوئی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ درحقیقت میرے خیال میں بحیثیت مسلمان ہم دونوں نہ صرف ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، بلکہ فی نفسہٖ ایک ہی

Marfat.com

ہیں۔ ویسے بھی اگر ایک مسلمان ملک آزادی کی نعمت سے بہرہ مند ہوتا ہے، تو اس سے دوسرے ممالک میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کو تقویت ملتی ہے۔ میری رائے میں اس طرز فکر سے کسی کی اپنے ملک سے وفاداری یا جذبہ حب الوطنی پر کوئی حرف نہیں آتا، لیکن بعد میں مجھے پاکستانی رفقائے کار عربوں کا ضرورت سے زیادہ طرفدار ہونے کا طعنہ دیا کرتے تھے۔

الفسی سے گھنٹوں اس موضوع پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا کہ اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے اور کس طرح ہم ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ فرانسیسیوں نے انہیں مغربی افریقہ کے ایک گرم علاقے گبون میں جلاوطن کر دیا تھا اور وہاں انہوں نے نو سال گزارے اور میں نے بھی انہیں اپنی زندگی کے کچھ اہم واقعات سنائے مثلاً میں نے پچیس سال قبل کن حالات میں اسلام قبول کیا، سعودی عرب میں کس قدر خوش کن وقت گزرا اور پاکستان سے میری جذباتی اور نظریاتی وابستگی کی نوعیت کیا تھی۔ دنیائے اسلام کو مجموعی طور پر اس وقت جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، ان کے متعلق ہمارے خیالات یکساں تھے اور ہم دونوں کلی طور پر شمالی افریقہ اور مراکش کے مفید اشتراک عمل کے خواہاں تھے۔ ہماری جس دوستی کا یہاں آغاز ہوا، وہ برسوں بلکہ ان کی وفات تک قائم رہی۔ اس وقت میں مراکش ہی میں اقامت پذیر تھا۔

تیونس کی دستور پارٹی کے نمائندوں سے بھی میرے دوستانہ روابط تھے۔ اس جماعت کے رہنما میرے مرحوم دوست حبیب بورقیبہ اور بالخصوص بہی لدغم (Bahi Ladgham) تھے جو بعد میں خود مختار تیونس کے پہلے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ ان کے ساتھی اور رفیق کار صلاح بن یوسف بھی ہمراہ تھے، جنہیں بعد میں سیاسی بنا پر قتل کر دیا گیا۔ ان دنوں ہم اس سے زیادہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے کہ اسمبلی کی گزرگاہوں میں دیگر مسلمان اور غیر مسلمان وفود کے بااختیار نمائندوں سے ملتے رہیں اور انہیں اپنے مؤقف کی تائید کے لیے آمادہ کرتے رہیں۔ یوں میں نے اور تیونس کے ارکان وفد نے اکٹھے اسمبلی کے اجلاس میں بھرپور حصہ لیا۔

یہیں میری ملاقات اپنے ایک پرانے دوست فارس الخوری سے ہوئی، جو اپنے ملک یعنی شام کے نمائندے کی حیثیت سے یہاں آئے تھے۔ ان کی بینائی کمزور تھی، اس لیے وہ سیاہ شیشوں والی عینک لگا کے وقفے وقفے سے جھپکیاں لیتے رہتے تھے۔ اسمبلی کے اکتا دینے والے اکثر مباحث سے لاتعلق رہنے کا یہ ایک مفید حربہ تھا۔ انہیں پہلے کی طرح اب بھی یہ یقین محکم تھا کہ اسلام ہی وہ واحد قوت ہے جو مشرق وسطیٰ کے ممالک کی آزادی کا تحفظ کر سکتی ہے اور شمالی افریقہ کو نوآبادیاتی چنگل سے آزاد کرا سکتی ہے۔

الجزائر اور لیبیا کے مبصرین اور بہت سی دوسری شخصیات سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان میں سے بیشتر کو میں اپنے حالیہ دورۂ مشرق وسطیٰ کے دوران میں مل چکا تھا۔ مختصر یہ کہ یہاں میرے دن اور شامیں اپنے دوستوں میں گزرتیں اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے مشترکہ لائحہ عمل ترتیب دینے میں مصروف رہتے۔

Marfat.com

(5)

اسی اثنا میں مجھے اپنی نجی زندگی کو بھی مستحکم بنیادوں پر منظم کرنا تھا۔ میں غیر معینہ مدت تک کے لیے ہوٹل کے کمرے میں رہنا پسند نہیں کرتا تھا، اس لیے میں نے نیویارک کی مغربی جانب ایک رہائشی ہوٹل کی چھت پر علیحدہ فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ یہ فلیٹ ہر طرح کے فرنیچر سے آراستہ پیراستہ چار کمروں پر مشتمل تھا اور اس کی چھت پر خاصی کھلی جگہ تھی۔ یہاں میرے ساتھ صرف میرا باا عتماد پاکستانی ملازم اشرف رہتا تھا۔ وہ سابقہ فوجی اور تجربہ کار ڈرائیور تھا اور میں ایسے ہی کسی کام کے لیے اس کو ملازم رکھوانا چاہتا تھا۔ بدقسمتی سے وہ انگریزی پڑھ اور لکھ نہیں سکتا تھا، اس لیے وہ نیویارک میں گاڑی چلانے کے لیے لائسنس حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اُسے اپنا ذاتی ملازم رکھ لیا۔ وہ کھانا بھی بہت اچھا بنا لیتا تھا اور اس حوالے سے اس کی کارکردگی خاصی تسلی بخش تھی۔ وہ ہر طرح کا پاکستانی کھانا تیار کر سکتا تھا، اس لیے وہ میرے کھانے پینے کے ذوق سے مناسبت رکھتا تھا۔ مزید یہ کہ جب میں اپنے دوستوں کو گھر پر مدعو کرتا تھا، وہ ان کی لذیذ کھانوں سے خاطر تواضع کرتا تھا۔

انہی دنوں میری ایک ایسی خاتون سے ملاقات ہوئی، جس نے آگے چل کر میری جیون ساتھی بننا تھا۔

ہمارے پریس اتاشی نے ایک دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ پاکستان ہاؤس کا بڑا ہال مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کہ اچانک میری نظر ایک جوان اور خوبصورت خاتون پر پڑی اور اس کو دیکھتے ہی میں نے اپنے دل میں ایک عجیب سی کسک محسوس کی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بہت حسین تھی، بلکہ وہ ان لوگوں میں رہتے ہوئے ان کی دنیا سے بالکل لاتعلق سی لگتی تھی۔ وہ اپنے باطنی سکوت میں کھڑی تھی، جس نے اس کی شخصیت کو شفاف پردے کی مانند ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کیفیت کو جذب کرنا اور پھر اسے بیان کرنا مشکل ہے۔ اس کو ایک نظر دیکھتے ہی یہی میرا پہلا تاثر تھا، جس نے میرے دامن دل کو اپنی جانب کھینچا۔ میں نے اپنے میزبان یعنی پریس اتاشی سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ امریکی ہے لیکن اس کا آبائی تعلق پولینڈ سے ہے اور وائس آف امریکہ میں ملازمت کرتی ہے۔ شادی شدہ ہے لیکن اپنے شوہر سے نالاں ہے اور جیسا کہ میرے دوست نے بتایا کہ نوبت طلاق تک پہنچنے والی ہے۔ اس نے پوچھا ''کیا میں آپ کو اس خاتون سے متعارف کرا سکتا ہوں؟'' میں نے جواب دیا ''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی اپنا تعارف کرا لوں گا۔''

میں ابھی تک اپنی مادری زبان نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ میں نے آگے بڑھ کر اسے پولش میں مخاطب کیا۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر میری جانب منہ پھیرا اور انگریزی میں کہنے لگی ''میں زیادہ پولش نہیں جانتی۔'' اس کے بعد میں نے رسماً اپنا تعارف کرایا اور یوں ہماری بات چیت کا آغاز ہوا۔ وہ بڑی لیے دیئے رہنے والی شرمیلی سی خاتون تھی، لیکن آہستہ آہستہ وہ قدرے بے تکلفانہ انداز میں بتانے لگی کہ جب اس نے مجھے پہلی بار دیکھا تو مجھے کسی عرب ملک کا باشندہ سمجھا، کیونکہ وہ بہت سے ایسے عربوں کو جانتی تھی، جو اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے اور انہی میں ایک میں بھی تھا۔ میں کچھ دیر اس کے خاندانی پس منظر کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ

Marfat.com

اس کی والدہ مشرقی پولینڈ میں کسی جگہ پیدا ہوئی تھی۔ یہ جگہ میری جائے ولادت سے تقریباً دو گھنٹے کی مسافت پر تھی اور اس سے ہمارے مابین قربت کا احساس قدرے بڑھ گیا۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے اور مجھے فوری یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ خوش طبع اور حساس ذہن کی مالک ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میں اس کے دام محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔

میں نے اسے رات کے کھانے کی دعوت دی، جو اس نے قبول کر لی۔ ہم نے نیویارک کے ایسٹ سائیڈ کے ایک ترکی آرمینی ریسٹورنٹ ''دی گولڈن ہورن'' میں کھانا کھایا اور وہیں اس نے بتایا کہ وہ اگلی صبح اپنے کچھ دوستوں سے ملنے لانگ آئی لینڈ جا رہی ہے اور پانچ چھ روز کے بعد واپس آئے گی۔ میں نے اس کے دوستوں کا فون نمبر لے لیا اور اس سے فون پر بات کرنے کا وعدہ کر لیا۔

کھانے کے بعد میں اسے چھوڑنے اس کی رہائش گاہ تک گیا، جو ایسٹ سائیڈ ہی میں واقع تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو الوداعی سلام کیا۔ یہ 7 مئی 1952ء کا دن تھا۔

(6)

پانچ روز بعد پولا نیویارک واپس آ گئی اور پھر ہم روزانہ دوپہر کے کھانے پر ملنے لگے۔ وہ وائس آف امریکہ میں مشہور ریڈیو مبصر ریمونڈ گرام سونگ (Raymond Gram Swing) کے ساتھ بطور ادارتی معاون کام کر رہی تھی۔ اس حوالے سے معاصر سیاسی منظر نامے پر اس کی گہری نظر تھی اور اسی موضوع پر ہماری طویل گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ اس کی موجودہ ملازمت سے قبل وہ واشنگٹن کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ شعبہ امور مغرب (European Desk) کے سربراہ کے ساتھ معاون کی حیثیت سے کام کرتی تھی اور کچھ عرصہ اقوام متحدہ کے امریکی وفد کے معتمدین کے سربراہ کے فرائض بھی انجام دیتی رہی۔ اسی وجہ سے وہ مشرق وسطیٰ اور پاکستان کے بعض نمائندوں کو جانتی تھی۔ مزید یہ کہ امریکی حکومت کی جو اہم ترین شخصیات Lake Success کے اجلاس میں شرکت کے لیے آئی تھیں، ان سے مختلف وفود کے اراکین کا تعارف کرانا بھی اس کے ذمہ تھا۔

بلاشبہ یہ اطلاع بھی میرے لیے انتہائی خوش کن تھی کہ پولا نے چند ماہ پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے بعد ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے کے اور قریب ہو گئے۔ یہ سب تقدیر کا کھیل تھا۔

بعد میں پتہ چلا کہ تبدیلی مذہب کا واقعہ کس طرح رونما ہوا۔ پولا کسی کٹر مذہبی خاندان سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔ اس کے والد کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا۔ وہ پولینڈ سے امریکہ آباد ہونے والوں کی دوسری نسل سے تعلق رکھنے والا ایک آزاد خیال شخص تھا۔ اس کی والدہ رسمی طور پر کیتھولک مسلک کی پیروکار تھی اور مذہبی شعائر کی بہت کم پابندی کرتی تھی۔ اس کی دونوں بڑی بہنیں تو کسی گرجا میں قدم تک نہیں رکھتی تھیں۔ ان تمام افراد خانہ کے برعکس پولا بچپن ہی سے اپنے اندر مذہبی طلب محسوس کرتی تھی۔ ابھی اس کی عمر پانچ یا چھ سال کی تھی کہ وہ اپنے قریبی کلیسا میں اتوار کی رسم عشائے ربانی میں شریک ہوتی تھی۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو اس نے سوال و جواب نامہ کا مطالعہ کیا اور تیرہ سال کی عمر

Marfat.com

میں بشپ نے اس کے مسیحی ہونے کی تصدیق بھی کر دی، لیکن پادری کے پند ونصائح سے وہ مطمئن نہیں تھی۔ اس کی روحانی سچائی کی طلب تشنہ رہی اور اس نے اپنی فطری پیاس بجھانے کی خاطر دیگر مذاہب کی کتابیں پڑھنا شروع کر دیں۔

ہندومت نے اسے بالکل متاثر نہیں کیا۔ بدھ مت کی تعلیمات سے وہ قدرے متاثر ہوئی، لیکن وہ جبلی طور پر اس کے جوان ذہن پر منکریت (negativism) حاوی تھی، اس لیے یہ مذہب بھی اسے مطمئن نہ کر سکا۔ بالآخر اس نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا اور جلد ہی اسے یہ احساس ہو گیا کہ جس چیز کی اسے تلاش تھی وہ اسے مل گئی ہے۔ وہ حضرت محمدؐ کی بنیادی تعلیمات کا بغور مطالعہ کرتی رہی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ دین کے بارے میں اسلام کا بنیادی اصول عقل اور استدلال سے کام لینا ہے اور یہ پہلو اس کی سوچ سے بالکل مطابقت رکھتا تھا۔

جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ میں اور پولا اپنی پہلی ملاقات کے بعد ہر روز بالعموم دوپہر کے کھانے پر ملتے تھے اور میں عمداً اس وقفے کو بڑھاتا چلا جاتا تھا۔ ہم سنٹرل پارک کی روشوں پر گھنٹوں چہل قدمی کرتے، جہاں موسم گرما شروع ہوتے ہی پھول پتے کھل اٹھتے اور عجیب سماں بندھ جاتا۔ خاکستری رنگ کی جھاڑی جیسی دموں والی گلہریاں ایک درخت سے دوسرے درخت کی طرف تیز تیز دوڑتیں، جنگلی کبوتر ہمارے اوپر اڑتے یا ہمارے بسکٹ یا روٹی کے ٹکڑے پیش کرنے پر نیچے اتر آتے۔ یہ خوبصورت قدرتی مناظر میری خوشیوں کو دوبالا کر دیتے اور پھر پولا کی موجودگی ان کے سہانے پن میں اور اضافہ کر دیتی۔ ہم اکثر دوپہر کا کھانا ایک چھوٹے سادہ سے ریستورنٹ میں کھا لیتے۔ ساؤتھ سنٹرل پارک کے اس ریستورنٹ کا نام "دی رشین ٹی روم" تھا۔ اس کا صرف ایک ہی کمرہ تھا اور ہر میز کے ساتھ دو کرسیاں رکھی تھیں اور ہر میز کے وسط میں بقائن (lilac) کے شگوفے ایک برتن میں سجا کر رکھے تھے۔ ہلکے سے کھانے اور باغ میں تھوڑے سے سیر سپاٹے کے بعد ہم جدا ہو جاتے، اپنے کام میں مشغول رہتے اور رات کے کھانے پر دوبارہ ملتے۔[91]

(7)

اس اثنا میں احمد شاہ بخاری مجھے اپنے لیے "بے ضرر" بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ بالآخر انہوں نے مجھ سے گلوخلاصی کرانے کے لیے مجھے ایک ایسی ذمہ داری سونپنے کا فیصلہ کیا، جس کی انجام دہی میں مجھے ہمہ وقت مصروف رہنا پڑے گا اور مزید یہ کہ جنرل اسمبلی کے اجلاسوں میں میری موجودگی بھی ان کی پریشانی کا باعث نہیں ہو گی۔ جن علاقوں میں ابھی خود مختار حکومتیں قائم نہیں ہوئی تھیں، ان کے لیے ایک کمیشن تشکیل کیا گیا تھا، چنانچہ میری خدمات اس کمیشن کے سپرد کر دی گئیں۔ بخاری صاحب کی نظر میں اس کام کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔

یہ کمیشن اقوام متحدہ کے رکن ممالک کے تقریباً دس یا بارہ نمائندوں پر مشتمل تھا اور ہر ملک کو باری باری اس کی رکنیت مل جاتی تھی۔ 1952ء میں پاکستان نے اس کمیشن کا رکن بننا تھا۔ کمیشن کے اگلے اجلاس کے ایجنڈے میں

Marfat.com

شمالی افریقہ میں فرانس کے زیر تسلط علاقوں کے مسائل شامل کیے گئے تھے، جن سے مجھے خصوصی دلچسپی تھی۔

میں نے بخاری صاحب کو بتایا کہ اجلاس کے دوران میں مجھے ایک خصوصی سیکرٹری کی ضرورت پڑے گی۔ وہ فوراً مان گئے، کیونکہ وہ مجھے ہر صورت اپنے سے دور رکھنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ انہوں نے پاکستان ہاؤس میں موجود عملہ میں سے کسی کو بطور سیکرٹری منتخب کرنے کی تجویز پیش کی، جسے میں نے مسترد کر دیا، کیونکہ وہ زیادہ تر اپنی شکل وصورت پر ملازم رکھی جاتی تھیں۔ میں نے صاف الفاظ میں بخاری صاحب کو کہا کہ سیکرٹری کے انتخاب کا فیصلہ مجھے خود کرنے دیا جائے اور انہوں نے بلا تامل میرے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا۔ میں نے اخبارات میں اشتہار دے دیا اور چند دنوں میں کئی امیدواروں کی درخواستیں موصول ہو گئیں۔ بالآخران میں سے ایک لڑکی کو منتخب کر لیا گیا۔ اس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ چھوٹے قد وقامت، فربہ جسم کی یہ ایک معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی، لیکن اس کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی اور مسکراتے ہوئے ہر بات کا جواب دیتی تھی۔ اس کا نام روزی تھا۔ میں نے اسے متنبہ کر دیا کہ اس کا کام آسان نہیں ہوگا اور اوقات کار بھی متعین نہیں ہوں گے۔ میری ان باتوں سے وہ بالکل خوفزدہ نہیں ہوئی اور آئندہ چند ہفتوں کے بعد اندازہ ہو گیا کہ میں نے اپنے انتخاب میں غلطی نہیں کی۔ اس سے قبل مجھے اتنی باصلاحیت اور خوش دلی سے اپنا کام کرنے والی سیکرٹری کا تعاون حاصل نہیں ہوا تھا۔

اپنے آپ کو ہر طرح کی خلل اندازی سے بچانے کے لیے میں نے پاکستان ہاؤس کے سرکاری کمرے کے بجائے اپنی قیام گاہ ہی کو دفتر کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے میں نے مراکش اور تیونس سے متعلق ان فرانسیسی دستاویزات اور شماریاتی تفصیلات کی نقول کا مطالبہ کیا جن کا ایجنڈے میں سب سے پہلے ذکر کیا گیا تھا۔ بیشتر مطلوبہ دستاویزیں اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ سے دستیاب ہو گئیں اور باقیماندہ اس کے توسط سے فرانسیسی مآخذ سے حاصل ہو گئیں۔ نتیجتاً سائیکلوسٹائل کاغذات کا تقریباً ایک میٹر اونچا ڈھیر لگ گیا اور میں روزی کے ساتھ ان کو بنظر غائر دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ہم دونوں نے معمولی سے معمولی کاغذ کو بھی اول تا آخر پڑھا اور مفصل نوٹس تیار کر لیے۔ اسی عمیق مطالعے کے بعد ہم کسی بھی اہم مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو کے لیے تیار تھے۔ روزی نے عام سیکرٹری کی نسبت بڑی محنت اور ذوق وشوق سے اپنے فرائض نپٹائے۔ اس کی معاونت کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کی یادداشت اتنی اچھی تھی کہ کمیشن کے اجلاسوں کے دوران میں وہ ہر متعلقہ دستاویز تیار رکھتی تھی اور جب بھی مجھے تقریر کرتے ہوئے اس کی ضرورت پڑتی تھی، وہ فوراً چپکے سے میرے سامنے رکھ دیتی تھی۔

ہم تقریباً تین ہفتے اس کام میں مصروف رہے۔ صبح سے دوپہر کے کھانے تک اور پھر سہ پہر سے شام تک ضروری معلومات کو جمع کرتے رہتے۔ اجلاس شروع ہونے سے ایک دو روز قبل رات کے دو تین بجے تک اپنے کاغذات کو پڑھتے رہتے۔ اس کے بعد ہم ہر بات کا تسلی بخش جواب دینے کے لیے بالکل تیار ہو جاتے تھے۔

Marfat.com

(8)

اس کمیشن کے اجلاس اقوام متحدہ کے سب سے بڑے کمیٹی روم میں منعقد ہوتے تھے۔ اس میں نہ صرف تقریباً پچیس کے قریب سرکاری نمائندوں اوران کے ارکان عملہ کے بیٹھنے کی جگہ تھی، بلکہ جو ممالک اس کمیشن یا اقوام متحدہ کے بھی رکن نہیں تھے، ان کے نمائندے بھی شریک ہوتے تھے۔ مؤخر الذکر شرکاء میں کثیر تعداد شمالی افریقہ کے مبصرین کی ہوتی تھی۔

افتتاحی اجلاس میں پاکستان کے نمائندے کو بطور صدر نشین منتخب کرنے کی تجویز پیش کی گئی اور اسے بھاری اکثریت سے منظور کر لیا گیا۔ کرسی صدارت پر بیٹھتے ہی حکومت برطانیہ کا نمائندہ میری برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا (وہ برطانوی وفد کا سیکرٹری تھا اور مجھے اچھی طرح جانتا تھا) اور میں نے اس کو ایک ''شریفانہ معاہدہ'' کی پیشکش کی، ''میں برطانیہ یا اس کے زیر قبضہ کسی نو آبادیاتی انتظامیہ کو تنقید کا ہدف نہیں بناؤں گا، بشرطیکہ آپ فرانس کی نو آبادیاتی پالیسی پر میری تقاریر میں مداخلت نہیں کریں گے۔ کیا آپ کو یہ تجویز منظور ہے؟''

میرے برطانوی ہم منصب نے بلا دقت میری اس تجویز کو قبول کر لیا اور میں کمیشن کے صدر نشین کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ اس کے بعد ہر اجلاس کے شروع ہوتے ہی میں یہ صراحت کر دیتا تھا کہ میں کمیشن کے صدر نشین کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کروں گا یا نمائندہ پاکستان کی حیثیت سے۔ باضابطہ سوال و جواب کے بعد اجلاس کی باقاعدہ کارروائی شروع ہو جاتی۔

میرے اس اعلان سے اجلاس کے تمام شرکاء انگشت بدنداں ہو گئے کہ ہم اپنی بحث کا آغاز تیونس کی داخلی صورت حال سے کریں گے اور میرے اس اعلان کے ساتھ ہی فرانسیسی نمائندے نے مجھے قدرے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ میں نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ''بدقسمتی سے تیونسی عوام کے نمائندوں نے ہمیں متعلقہ دستاویزات مہیا نہیں کیں، اس لیے ہمیں تیونس کی فرانسیسی انتظامیہ کی فراہم کردہ معلومات پر انحصار کرنا ہوگا۔''

میری اس بات پر فرانسیسی نمائندے نے اطمینان کا سانس لیا، لیکن تیونسی مبصروں بالخصوص بہی لدغم (Bahi Ladgham) نے مضطرب نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے اپنی بات کو آگے بڑھایا ''میں اپنی گفتگو کا آغاز اس نظام تعلیم سے کرتا ہوں، جو فرانسیسی حکومت نے وہاں رائج کر رکھا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میرے پیچھے بیٹھی ہوئی روزی نے متعلقہ دستاویزات میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے کہا ''آئیے دیکھیں۔ میرے پاس سرکاری اسکولوں میں نئے طلبہ کے داخلہ سے متعلق سرکاری اعداد و شمار موجود ہیں، جن کے مطابق تیونس شہر میں تقریباً تین سو مقامی طلبہ کو داخل کیا گیا ہے، جبکہ دو ہزار سے زیادہ نشستیں یورپی یا بالفاظ دیگر فرانسیسی طلبہ کے لیے مختص کی گئی ہیں۔''

(یہاں میں اس بات کا ذکر کرتا چلوں کہ میں نے اس اجلاس میں یا کمیشن کے آئندہ اجلاسوں میں جو اعداد و شمار پیش کئے، وہ تخمینی نوعیت کے ہوتے تھے۔ میں انہیں کسی کاغذ پر نہیں لکھتا تھا بلکہ وہ میری یادداشت میں محفوظ

Marfat.com

ہوتے تھے۔نتیجتاً میرے فراہم کردہ اعداد وشمار اور سرکاری دستاویزات کے اصل اعداد وشمار میں نمایاں فرق پایا جاتا تھا، لیکن میرا منشا موجودہ صورت حال سے حاضرین کو مطلع کرنا تھا۔مثلاً فرانسیسی حکام نے ''مقامی لوگوں'' اور یورپیوں سے برتاؤ کے جو الگ الگ طریقے اپنا رکھے ہیں، ان کو طشت از بام کیا جائے۔ہسپتالوں میں طبی سہولتوں کے بارے میں آئندہ جو اعداد وشمار دیئے گئے ہیں، ان کو بھی اسی تناظر میں ملاحظہ کیجئے)۔

سرکاری اعداد وشمار کے مستند حوالوں، نیز تیونس کے مقامی باشندوں اور فرانسیسی آبادکاروں کی قلیل تعداد کے درمیان شرمناک تفریق کی ناقابل تردید شہادتوں نے فرانسیسی نمائندے کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں کر دیئے، لیکن مبصرین کی گیلری میں موجود تیونسی اصحاب نے میرے پیش کردہ حقائق کو تالیاں بجا بجا کر خراج تحسین پیش کیا۔

اس کے بعد میں نے ہسپتالوں کی سہولتوں کا سوال اٹھایا (روزی نے بڑی ذمہ داری سے مستند کاغذات میرے سامنے رکھ دیئے)''جیسا کہ سرکاری اعداد وشمار سے عیاں ہے، پورے تیونس کے ہسپتالوں میں مقامی باشندوں کے لیے دو سو بستروں کا، جبکہ یورپی لوگوں کے لیے پندرہ سو بستروں کا انتظام کیا گیا ہے۔'' یہ گفتگو طول پکڑتی گئی اور ہسپتال کے بستروں کے علاوہ تجارتی اسکول اور مقامی لوگوں کے روزگار کے مسائل بھی زیر بحث آئے۔تقریباً ہر شعبہ زندگی میں نسلی تفریق اور ناانصافیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ سامنے آیا۔

تقریباً ایک گھنٹہ فرانسیسی اعداد وشمار پیش کرنے کے بعد میں نے اعلان کیا ''حضرات! اب میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے آپ سے گفتگو کروں گا۔''

کمیشن کی صدرنشینی کے بوجھ سے خود کو عارضی طور پر آزاد کرتے ہوئے میں نے فرانس کی نوآبادیاتی پالیسیوں کی شدید مذمت کی اور اس بات پر زور دیا کہ نام نہاد ''زیرحمایت حکومت'' نے تیونس کے اختیارات کو مکمل طور پر ختم کر دیا ہے، اس لیے اب ہمیں اس ملک میں سوائے پرانی طرز کے نوآبادیاتی نظام کے کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ قابض ملک یعنی فرانس نے یہاں کے عوام الناس کو ان سہولتوں سے محروم کر رکھا ہے، جو برطانوی نوآبادیاتی ممالک میں محکوموں کو دی جاتی ہیں۔غیر جانبدارانہ عدالتی نظام، سول سروس میں باصلاحیت مقامی لوگوں کی شمولیت وغیرہ وغیرہ۔میں نے اقوام متحدہ، جس کا پاکستان بھی ایک رکن ہے، یہ مطالبہ کرتے ہوئے اپنی تقریر ختم کی کہ تیونس اور مجموعی طور پر شمالی افریقہ سے نوآبادیاتی نظام کو ختم کرنے کے عمل کو تیز کیا جائے۔

میری یہ تقریر سن کر فرانسیسی نمائندے کا چہرہ زرد پڑ گیا۔اس کی جوابی تقریر تلخ تھی اس لیے کمیشن کے اراکین نے اس کی کھل کر حمایت نہیں کی۔صرف بلجیئن کانگو کے گورنر جنرل ''سنیئے سنیئے'' کہتے رہے، کیونکہ وہ بہ نفس نفیس کمیشن میں اس کالونی کی نمائندگی کر رہے تھے۔

اس اجلاس کے اختتام پر شمالی افریقہ کے مبصرین نے مجھ سے ملاقات کی۔ان کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے تھے اور وہ باری باری مجھ سے گلے مل رہے تھے۔

Marfat.com

(9)

کمیشن کے ان اجلاسوں میں میری کامیابیوں کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ احمد شاہ بخاری صاحب نے مجھے اپنے راستے سے ہٹانے کا جو حربہ استعمال کیا تھا، اس پر ضرور کف افسوس ملتے ہوں گے۔ ان کے لیے یہ امر نا قابل برداشت تھا کہ ان کے بجائے میرا نام شہرت و ناموری کی بلندیوں تک پہنچ جائے۔

میں مانتا ہوں کہ میں نے ان کے جذبات و احساسات کی ذرہ بھر پرواہ نہیں کی اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں میری نجی زندگی بڑے سکون و اطمینان سے گزر رہی تھی۔ میں محبت کی وادیوں میں گم تھا اور جب کمیشن کی مصروفیات کے دوران میں مجھے سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی، اس وقت بھی اپنی شاموں کا بیشتر حصہ پولا کے ساتھ گزارتا تھا۔

مئی اور جون کے ابتدائی پُرشوق دنوں میں یہ بھی پتہ چلا کہ ہماری عمروں اور مزاجوں میں اتنے بڑے فرق کے باوجود پولا طبعاً خوش مزاج، ہنسوڑ اور اپنے پسندیدہ ماحول میں باتیں کرنے کی شوقین ہے، جبکہ میں زیادہ تر اپنی ذات میں گم اور گھنٹوں خاموش رہنے والا شخص تھا۔ اس کے باوجود ہم میں بہت سی باتیں مشترک بھی تھیں۔ مثلاً میری طرح اس نے بھی اپنی ابتدائی عمر ہی میں لاؤتسے[92] (Lao-tse) کا بغور مطالعہ کیا تھا اور قدیم چینی تصاویر میں قدرتی مناظر کو جس خوبصورتی اور مہارت سے پیش کیا گیا تھا، اس سے وہ بہت متاثر تھی۔ ہم دونوں مشرقی ظروف سازی اور ایرانی قالینوں کے شیدائی تھے۔ ہم وسیع و عریض میدانی علاقوں کے ممالک کو پسند کرتے تھے اور شہروں کی بلند و بالا عمارتوں کے بجائے ہمیں جنگلوں میں وقت گزارنا اچھا لگتا تھا۔ کاروں اور جہازوں کی نسبت کتے، گھوڑے اور عام جانور ہمارے لیے زیادہ کشش کا باعث تھے۔ جدید زمانے کے تکنیکی ''عجائبات'' کے مقابلے میں ریمبراں (Rembrandt) کی ایک تصویر یا قرون وسطیٰ کے کسی کلیسا کا منظر ہمیں نہال کر دیتا تھا۔ مختصراً یہ کہ ہم ایک دوسرے کی پسند و ناپسند سے اچھی طرح سے واقف ہو گئے اور ہمیں یقین ہو گیا کہ زندگی کے بیشتر معاملات میں یکساں سوچ کے سبب ہم اکٹھے ہنسی خوشی زندگی گزار سکتے ہیں۔ چنانچہ ان تمام مشترکہ طبعی میلانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ایک روز پولا کو شادی کی تجویز پیش کر دی۔ اس نے حیرت کا اظہار تو نہیں کیا، البتہ کچھ مضطرب سی ہو گئی۔ آہستہ سے اس نے اپنا چہرہ میری جانب موڑتے ہوئے کہا ''لیکن تم تو میری طرح پہلے ہی سے شادی شدہ ہو۔''

میں نے جواباً عرض کیا ''بالکل درست۔ میں شادی شدہ ہوں، لیکن میں اپنی بیوی کے ساتھ نہیں رہتا اور آئندہ بھی میرا اس کے ساتھ رہنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم پہلے ہی ایک دوسرے سے الگ الگ زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہمارے مابین سوائے ایک بیٹے کے اور کوئی چیز مشترک نہیں۔ مزید یہ کہ میں مسلمان ہوں اور میرا دین اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ میں ایک سے زیادہ شادیاں کر سکوں۔ میں بیٹے کی وجہ سے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینا نہیں چاہوں گا۔ ویسے بھی ہم پہلے ہی اس حد تک ذہناً اور مزاجاً ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہیں کہ وہ بظاہر میری شریک حیات

Marfat.com

ہوتے ہوئے بھی ہماری زندگی میں مخل نہیں ہوسکتی۔ میں مالی طور پر اس کی پوری نگہداشت کروں گا اور اگر وہ تن تنہا یا اپنے بیٹے طلال یا چودھری نیاز علی کے خاندان کے ساتھ رہنا چاہے، تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ جہاں تک طلال کا تعلق ہے، وہ تمہارا ہم عمر ہی ہے اور تم دونوں بظاہر بہن بھائی ہی دکھائی دیتے ہو‘‘ (اس کو میری سادہ لوحی سمجھیے، بہر حال اس وقت صورت حال کچھ ایسی ہی تھی)۔

لامحالہ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ جس خاتون کی پیدائش اور پرورش مغربی ماحول میں ہوئی ہو، وہ ’’دوسری بیوی‘‘ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی، لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ پولا اور میں رشتہ محبت میں اتنی مضبوطی سے بندھ چکے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کچھ دیر اپنی سوچوں میں کھوئی رہی اور پھر وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے آہستہ سے کہنے لگی ’’ٹھیک ہے، مجھے تمہاری دوسری بیوی بننا پسند ہے، اگرچہ یہ مرحلہ طے کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہوگا۔‘‘

اس کے بعد میں نے لندن منیرہ کو خط لکھا اور اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگرچہ وہ میرے ساتھ رہنا پسند نہیں کرے گی، پھر بھی وہ رسماً میری بیوی ہی رہے گی اور میں حسب منشا اس کے نان ونفقہ کا ذمہ دار ہوں گا۔ میں نے طلال کو بھی کہا کہ وہ اس مسئلہ کے حل کے لیے اپنی والدہ کو سمجھانے کی کوشش کرے۔ میں نے اپنے قیام پیرس کے دوران میں اسے بتا دیا تھا کہ میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں اور یہ ان دنوں کی بات ہے، جب میری پولا سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔

منیرہ کے متوقع جواب اور اس کے بعد کے حالات سے بے پرواہ ہو کر پولا اور میں دونوں مستقل مزاجی سے راہ محبت پر گامزن رہے۔ اس نے فوری طلاق کی خاطر میکسیکو جانے کا ارادہ کر لیا۔ ہم روزانہ ملتے اور مستقبل کے پروگرام بناتے۔ ہماری زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔

منیرہ کا ردعمل فوری ظاہر ہوا اور وہ بہت تند و تیز تھا۔ اس نے میری تجویز قبول کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ وہ سیدھی لندن کے پاکستانی ہائی کمشنر کے دفتر پہنچی اور اسے بتایا کہ میں اسے چھوڑنا چاہتا ہوں۔ اس نے وہاں ایسا ہتک آمیز ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ ہائی کمشنر نے صرف مجھے ’’تنبیہ‘‘ کے طور پر ایک انتہائی ناپسندیدہ انداز میں خط لکھا، بلکہ گورنر جنرل پاکستان خواجہ ناظم الدین[93] کو اس قضیے کو براہ راست سلجھانے کے لیے درخواست کر دی۔ بلاشبہ یہ تمام کارروائی وزارت خارجہ میں میرے مقام و مرتبے کے لیے خاصی نقصان دہ تھی، لیکن احمد شاہ بخاری اور دیگر حاسدوں اور جاہ طلبوں کے لیے نوید مسرت تھی۔

مروجہ قوانین کے تحت اگر وزارت خارجہ کا کوئی افسر غیر پاکستانی قومیت کی خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہو، تو اسے گورنر جنرل سے پیشگی اجازت لینا ضروری تھا۔ ایسی درخواست کے ساتھ رسمی طور پر ملازمت سے مستعفی ہونا پڑتا تھا۔ درخواست منظور ہونے کے بعد استعفیٰ بھی درخواست دہندہ کو واپس کر دیا جاتا تھا۔ بصورت دیگر استعفیٰ حتمی قرار پاتا تھا۔ مجھے اپنی درخواست کی منظوری کا پورا یقین تھا۔ ایک تو میں جس خاتون سے شادی کرنے والا تھا، وہ امریکی

Marfat.com

شہری تھی یعنی ایسے ملک کی رہنے والی جس سے پاکستان کے قریبی دوستانہ تعلقات تھے اور دوسرے یہ کہ وہ اسلام قبول کر چکی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ حال ہی میں وزارت خارجہ کے نچلے درجے کے ایک ملازم کو جرمن لڑکی سے شادی کی اجازت مرحمت ہوئی تھی اور مجھے بھی ایسے ہی برتاؤ کی امید تھی۔ اس کے باوجود میں نے ذاتی طور پر ظفر اللہ خاں سے بھی رابطہ قائم کیا اور انہیں گورنر جنرل سے سفارش کرنے کی درخواست کی، کیونکہ وہ پولا کو میری ملاقات سے بہت پہلے سے جانتے تھے اور وہ جب بھی نیویارک آتے، پولا کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کرتے۔ اس حوصلہ افزا پس منظر میں مَیں نے اپنی درخواست ارسال کر دی۔

تقریباً دو ہفتے بعد مجھے حیران کن خط موصول ہوا۔ میری درخواست مسترد کرتے ہوئے میرا استعفیٰ منظور کر لیا گیا۔ لندن کے ہائی کمیشن میں منیرہ نے جس طرح واویلا کیا تھا، یہ اس کا نتیجہ تھا۔ اب میرے پاس سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں منیرہ کو طلاق دے دوں، کیونکہ منیرہ کے ان ناپسندیدہ احتجاجی شور شرابے کے باعث ہمارا میاں بیوی کی حیثیت سے دنیاداری کی خاطر بھی اکٹھے رہنا ناممکن تھا۔

انہی دنوں مجھے اپنے بیٹے طلال کا بھی خط ملا، جس میں اس نے لکھا تھا کہ ''میرا باپ مر گیا ہے۔'' اگرچہ مجھے احساس تھا کہ یہ اس کا جذباتی ردعمل ہے، لیکن پھر بھی مجھے یہ پڑھ کر افسوس ہوا۔ چند ہفتوں بعد وہ مجھے اطلاع دیئے بغیر نیویارک پہنچ گیا۔ بذریعہ جہاز یہاں آنے کے لیے لندن میں مقیم میرے سوتیلے بھائی مارٹن[94] نے رقم فراہم کی۔ اس کے آنے کا مقصد مجھے پولا سے شادی کرنے سے باز رکھنا تھا۔ پولا اور میں نے اسے ہر طرح سے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ کبھی بھی اس سے ہمارا تعلق منقطع نہیں ہوگا، لیکن اس نے ہماری ایک نہ سنی اور لندن واپس چلا گیا۔

اور زندگی یونہی ہم سب کے لیے اپنی رفتار سے رواں دواں رہی۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

ARAFAT

Quarterly Journal of
Islamic Reconstruction

Edited by
MUHAMMAD ASAD

Rates of Subscription:

Pakisten and other Rupee-Countries	Rs. 7/8	p.a.
All other Countries	Sh. 12/6	p.a.

Published by the
DEPARTMENT OF ISLAMIC RECONSTRUCTION
Government of West Punjab
LAHORE

رسالہ "عرفات" (لاہور) کا اشتہار (بحوالہ "پاکستان ٹائمز" 30 مارچ 1948ء)

Marfat.com

حصہ دوم

از

پولا حمیدہ اسد

Marfat.com

Marfat.com

باب یازدہم

''شاہراہِ مکہ''

(1952ء-1953ء)

اس سال یعنی 1952ء میں محمد اسد کی یادداشتوں پر مشتمل مسودہ ختم ہو جاتا ہے۔ ان کی رفیقہ حیات کی حیثیت سے میرے لیے یہ امر محال تھا کہ میں انہیں اس خودنوشت کو جاری رکھنے پر مجبور کرتی۔ برسوں میں انہیں بار بار کہتی رہی اور ان کے سبھی احباب بھی ان سے یہی مطالبہ کرتے رہے، لیکن وہ یہی جواب دیتے کہ ''دوسری'' شاہراہ مکہ'' لکھنا ممکن نہیں'' اور میں ان کی ہم خیال تھی۔ سعودی عرب سے روانگی (1932ء) کے بعد انہوں نے زندگی کا بڑا حصہ کئی ممالک میں بسر کیا اور اس دوران میں انہیں مختلف تجربات سے گزرنا پڑا اور یادگار کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ میری خواہش تھی کہ وہ ان سب کو صفحہ قرطاس پر منتقل کریں۔ ''شاہراہ مکہ'' تو یقیناً ایک روحانی زندگی نامہ ہے جس میں انہوں نے اپنی ذات، دین اسلام، سعودی عرب جہاں سے اسلام کا آغاز ہوا اور ابن سعود کے شاہی خاندان کا بڑی شرح وبسط کے ساتھ ذکر کیا۔ اس خاندان سے ان کے قریبی دوستانہ تعلقات اتنے مستحکم تھے کہ وہ ان کی رحلت تک قائم رہے۔

اس کے بعد یعنی 1952ء تا 1992ء میں اپنے شوہر کے حالات زندگی کو سیدھے سادے پیرائے میں بیان کروں گی۔ اگرچہ میں سابقہ چالیس سالوں پر پھیلی ہوئی عجیب وغریب زندگی میں برابر کی شریک رہی ہوں، لیکن میں لکھاری نہیں ہوں، اس لیے میں اس زندگی کو جوں کا توں بیان کرنے کی کوشش کروں گی۔ تواریخ اور حالات کے ضمن میں غلطی کا امکان ہے یا یادداشت سے بھول چوک ہو سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی کوتاہیاں ضرور ہوئی ہوں گی، جن کی میں ذمہ دار ہوں۔ ہماری طویل ازدواجی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا، جب انہوں نے ''شاہراہ مکہ'' لکھنا شروع کی۔ یہ پہلی کتاب ہے جو میرے نام معنون کی گئی۔

(1)

1952ء کا موسم گرما ختم ہونے کو تھا اور وزارت خارجہ میں میرے شوہر کی ملازمت کا سرکاری فیصلہ بھی

Marfat.com

آخری مراحل میں تھا۔ انہی دنوں وہ اپنے ایک پرانے دوست کوینسی ہووے (Quincey Howe) کو ساتھ لے کر آئے۔ وہ ایک دوسرے کو گزشتہ تیس بتیس برسوں سے جانتے تھے۔ اسد کے یہ واقف کار اور سنجیدہ قاری ایک معروف امریکہ جریدے کے مدیر تھے اور برسوں پہلے اسد نے مشرق وسطیٰ کے ممالک پر جو جرمن مضامین برلین کے اخبار ''فرانک فورٹر تسائی تو نگ'' (Frankfurter Zeitung) میں لکھے تھے،[95] ان کا انگریزی ترجمہ اپنے مجلہ میں شائع کیا تھا۔ اس نے اسد کا تعارف جوزف بارنیس (Joseph Barnes) سے کرایا، جو مشہور ناشر سائمن اینڈ شسٹر (Simon and Schuster) کے ہاں ادبی ناظم کے طور پر ملازم تھا۔

''شاہراہ مکہ'' کے پیش لفظ بعنوان ''کہانی در کہانی'' میں میرے شوہر نے بارنیس سے اس پہلی ملاقات کا ذکر کیا ہے کہ یہ اس کا پُرزور مطالبہ تھا کہ وہ اپنے قبول اسلام اور پھر سعودی عرب میں اپنے زمانہ قیام کے تجربات و مشاہدات کو قارئین تک پہنچائیں۔ دراصل عرصہ دراز سے میرے شوہر کے ذہن میں بھی ایسا خیال جاگزیں تھا، لیکن اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے کسی مناسب موقع یا اہم محرک کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ جونہی وہ وزارت خارجہ کی ملازمت سے فارغ ہوں گے، مکمل یکسوئی اور دلجمعی سے اپنی ابتدائی زندگی کے کوائف اور ان محرکات کو قلمبند کرنا شروع کریں گے، جن کے زیر اثر انہوں نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔

اسد کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا اور اب وہ ہر طرح کے فرائض اور ذمہ داریوں سے آزاد ہو گئے۔ زندگی پھر اسی ڈگر پر آن پہنچی، جہاں سرکاری ملازمت اختیار کرنے سے پہلے تھی۔ محمد اسد ایک بار پھر تصنیف و تالیف کے مشغلہ کی طرف لوٹ آئے۔ یہ ایک ایسی قلمرو تھی جس میں انہی کا سکہ چلتا تھا اور اسی میں وہ اطمینان بخش زندگی گزارتے تھے۔

اسی سال یعنی یکم نومبر 1952ء کو ہماری شادی ہوئی۔ نیویارک کے شمال میں واقع ایک چھوٹے سے قصبے میں یہ تقریب منعقد ہوئی، جس میں اسلامی احکام کو ملحوظ خاطر رکھا گیا۔ دو گواہوں کا بھی اہتمام کیا گیا، تاکہ وہ ہماری رسمِ نکاح میں شریک ہوں۔

شادی سے ذرا پہلے اسد نے ایک چھوٹے لیکن نفیس کمرے کا انتظام کر لیا تھا، جو من ہٹن (Manhattan) کے ایسٹ سائیڈ میں واقع تین منزلہ عمارت کی پہلی منزل پر تھا۔ اس کا محل وقوع (3 East 80th Street) شاندار تھا، کیونکہ یہ سنٹرل پارک کے نواح میں تھا اور میٹروپولیٹن عجائب گھر اور خرید و فروخت کی دکانیں بھی بالکل نزدیک تھیں۔ میں دن کو اپنے دفتر چلی جاتی تھی اور اسد سیکنڈ ایونیو کی استعمال شدہ چیزوں کی دکانوں کے چکر لگاتے رہتے تھے، جہاں سے انہیں عمدہ قسم کا فرنیچر دستیاب ہو گیا۔ اس میں کچھ تو گزرے وقتوں کا تھا، لیکن اس کی قیمت مناسب تھی۔ میں ملازم تو تھی، لیکن تنخواہ میں بمشکل گزارا ہوتا تھا اور یہی حال اسد کی متوقع کتاب کی پیشگی رقوم کا بھی تھا، جس کی ابھی انہوں نے ایک سطر بھی نہیں لکھی تھی۔

جس دن ہماری شادی ہوئی، امریکہ میں اسے ''انڈین سمر ڈے'' کہا جاتا ہے، کیونکہ اس روز غیر حقیقی اور عارضی حدت کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے فوراً بعد اکتوبر کی اصلی ٹھنڈ اور نومبر کی سرد لہر شروع ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر ہم

Marfat.com

نے اپنے چند دوستوں کو مدعو کیا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، یہ دعوت The Polonaise ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی۔

یوں ہماری نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ دن کو میں دفتر میں مصروف ہوتی اور اسد گھر بیٹھے لکھتے رہتے۔ شام کو ہم اکٹھے ہلکا پھلکا کھانا تیار کر لیتے اور یہ اکثر پاکستانی کھانوں جیسا ہوتا۔ پھر ہم اکثر میڈیسن ایونیو (Madison Avenue) کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کرتے اور بالعموم دکانوں کی بیرونی جانب شیشوں میں سجائے گئے قالینوں اور پرانی چیزوں کو دیکھتے رہتے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، ہم دونوں کو قدرتی مناظر کی چینی تصاویر، مشرق وسطیٰ کے ظروف اور ایرانی قالینوں کا شوق تھا۔ پرانی چیزیں بیچنے والی دکانوں میں پڑی ہوئی کوئی چیز خریدنا ہمارے بس میں نہیں تھا، لیکن ہم پارکے برنیٹ (Parke-Bernet) اور اس قبیل کے کم معروف نیلام گھروں میں بار بار جاتے رہتے، تا کہ باقاعدہ نیلامی سے قبل اپنے ذوق کی چیزیں حاصل کر سکیں۔ ہماری یہ تلاش وجستجو کامیاب رہی کیونکہ اگلے چند سالوں میں ہمیں ان تمام چیزوں کے کئی خوبصورت نمونے مل گئے۔ ان دنوں نیویارک میں ایسے فنی نمونوں کے شائقین کی تعداد بہت کم تھی۔ اس حوالے سے ہمارے علاوہ صرف کچھ ارمینیہ کے کاروباری لوگ تھے، جو ان پرانی چیزوں سے گہری واقفیت رکھتے تھے، لیکن ہماری دلچسپی چھوٹی موٹی چیزوں میں ہوتی تھی، جنہیں یہ لوگ قابل توجہ نہیں سمجھتے تھے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ میرے شوہر نیلامی کے وقت کتنے اطمینان وسکون سے شرقیات پر اپنی گہری نظر اور مہارت کو بروئے کار لاتے تھے۔ مجھ میں قطعاً یہ خوبی موجود نہیں اور آئندہ برسوں میں مشرق وسطیٰ اور پاکستان میں خریداری کرتے ہوئے میں بالکل الگ تھلگ رہتی تھی۔ ان معاملات میں اسد مکمل طور پر ''مشرقی'' تھے۔ انہوں نے ہمیشہ مغرب اور مشرق کی اعلیٰ اقدار کے امتزاج کو برقرار رکھا اور اس میں کہیں بھی جھول نہیں آنے دیا۔ کئی سال بعد میری ملاقات ایک ایسے ہی شخص سے ہوئی، جس نے اپنے مشرقی تشخص پر آنچ آئے بغیر مغربی دنیا میں نام کمایا۔ وہ ہمارے قریبی دوستوں میں تھے اور ان کا نام شیخ احمد ذکی یمانی ہے۔ معذرت چاہتی ہوں کہ میں جس زمانے کا ذکر کر رہی تھی، اس سے بہت آگے نکل آئی ہوں۔

نیویارک میں دو سالہ قیام کے دوران میں ہمارے کئی مختلف دوست تھے۔ ان میں ایک تو جوئے بارنس (Joe Barnes) تھے، جن کا میرے شوہر کے ساتھ پیشہ وارانہ تعلق تھا، لیکن وہ ہمارے احباب میں بھی شامل تھے۔ اسد کے دو چچازاد بھائی بھی وہیں رہائش پذیر تھے، جو 1938ء میں ہونے والے جرمنی اور آسٹریا کے سیاسی اتحاد سے قبل اپنا ملک چھوڑ کر نیویارک آ گئے تھے۔ ان میں ایک کا نام فریڈ ٹوبس (Fred Taubes)[96] تھا، جو ایک کامیاب اور جانا پہچانا مصور بن چکا تھا اور دوسرا جان تینی (John Taeni)[97] وال سٹریٹ دلال کی حیثیت سے آسودہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ دیگر احباب میں روڈولف (Rudolph) اور ماریسیا راٹ ہاؤس (Marysia Rathaus) تھے، وہ پولینڈ سے ترک وطن کر کے آئے تھے اور یہاں انہیں شہرت حاصل ہوئی۔ وہ میرے سابقہ خاوند کے پرانے دوستوں

Marfat.com

میں سے تھے، لیکن اب ان کا شمار ہمارے قریبی احباب میں ہوتا تھا۔ کبھی کبھار ڈوروتھی تھامسن (Dorothy Thomson) اور اس کے خاوند ماکس کوپف (Max Kopf) سے بھی خوش کن ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ اس وقت وہ ''مشرق وسطیٰ کے امریکی دوست'' نام کی تنظیم میں مصروف رہتی تھی، جس کا مقصد عرب اسرائیلی تنازعہ کو بڑھنے سے روکنا تھا۔ ڈوروتھی کی یہ ابتدائی کوشش بری طرح ناکام ہوگئی۔ پاکستانی مشن کے احباب میں ہمارا ملنا جلنا صرف اکبر طیب جی اور ان کی خوبصورت اور ذہین ہندوستانی بیگم ثریا سے تھا۔ ان دنوں اکبر غالباً فرسٹ یا سیکنڈ سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ بعد میں وہ مراکش اور انڈونیشیا میں پاکستان کے سفیر رہے۔

کئی سال بعد اکبر طیب جی نے ہمیں اس گفتگو کے بارے میں بتایا جو ان کی موجودگی میں اقوام متحدہ کے دورے پر آئے ہوئے امیر فیصل اور اسد کو وزارت خارجہ سے نکلوانے والے وزیر خارجہ ظفر اللہ خاں کے مابین ہوئی۔ امیر فیصل جانتے تھے کہ اسد اب پاکستانی وفد میں موجود نہیں، اس لئے ان کی حالیہ مصروفیات کے بارے میں دریافت کیا۔ ظفر اللہ خاں نے مختصر سا جواب دیا کہ ''اب وہ ہمارے ساتھ نہیں رہے'' جس میں غیر وفاداری کی جانب خفیف سا اشارہ کیا گیا تھا۔

درحقیقت میرے شوہر کے وزارت خارجہ سے مستعفی ہونے کی وجہ کے متعلق ہر طرف جھوٹی اور گمراہ کن افواہوں کا بازار گرم تھا اور ان میں اسد کو بے وفائی یا غداری کا مرتکب قرار دیا جاتا تھا۔ یہ بے بنیاد خبر بھی پھیلا دی گئی کہ اسد نے اسلام چھوڑ کر پھر یہودیت اختیار کر لی ہے[98] اور ثبوت کے طور پر یہ کہا گیا کہ انہوں نے ایک امریکی یہودی خاتون سے شادی کر لی ہے (حالانکہ میں قبول اسلام تک کیتھولک مسلک سے تعلق رکھتی تھی)۔ ان تمام افواہوں میں ایک بات مشترک تھی کہ ان کا اصل منبع نیویارک کا پاکستان ہاؤس یا وزارت خارجہ تھی۔ بالآخر میرے خاوند نے تنگ آ کر ظفر اللہ خاں کو خط لکھا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اصل حقائق کو سامنے لائیں، لیکن انہوں نے صرف اتنا جواب دیا کہ وہ ''ایسی افواہوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔''

خوش قسمتی سے پاکستان میں ہمارے چند ایسے دوست بھی تھے، جو ان من گھڑت کہانیوں پر یقین نہیں رکھتے تھے مثلاً چودھری نیاز علی، چودھری نذیر احمد[99] (پاکستان کے سابق اٹارنی جنرل)، ممتاز حسن (وزیر مالیات)، پاکستان میں مصری سفیر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، شام کے وزیر عمر بہاء الامیری، سعودی عرب کے سفیر عبدالحمید الخطیب وغیرہ وغیرہ۔ انہی میں اسد کے محبوب ترین دوست محمد حسین بابری بھی شامل تھے۔ میں نے کسی مرد یا عورت کا اتنا مخلص اور بے لوث دوست نہیں دیکھا۔ وہ لاہور میں ٹائپ رائٹر کی مرمت کا کام کرتے تھے۔ چند سال بعد اسد کے یہ تمام احباب سے میری جان پہچان ہوگئی اور وہ بھی میرے دوستوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔ ہماری دوستیاں ہمیشہ مشترکہ رہی ہیں۔

شادی سے تقریباً ایک ماہ بعد اسد نے ''شاہراہ مکہ'' کے ابتدائی ابواب قلمبند کر لیے تھے۔ انہی دنوں دو عرب دوست تشریف لائے جو کسی سرکاری کام سے نیویارک آئے تھے۔ ان میں ایک علوم اسلامیہ کے معروف اسکالر

Marfat.com

اور دمشق کی معزز شخصیت شیخ مصطفیٰ الزرقا اور دوسرے مصر کی اخوان المسلمین کے فعال رکن سعید رمضان تھے۔ ثانی الذکر کی بیوی ''وفا'' سے چند سال بعد بھی ملاقات ہوئی۔ وہ اخوان المسلمین کے بانی حسن البنا کی دختر تھیں۔ اس نے انتہائی سادگی اور ثابت قدمی سے اپنے خاوند کے سرگرم حالات میں ساتھ دیا۔ وہ ایسے عظیم مسلمان رہنما کی بیٹی تھی، جس کی دنیائے اسلام میں مسخ شدہ تصویر پیش کی گئی ہے۔

ہماری یہ دوستیاں عمر بھر قائم رہیں اور ان دنوں کے جو دوست ابھی تک بقید حیات ہیں، وہ میرے غم انگیز دنوں میں بھی میری خبر گیری کرتے رہتے ہیں۔

(2)

یکم نومبر 1952ء کو ہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اور اس کے فوراً بعد ہم دونوں ہیوسٹن چلے گئے تاکہ وہاں میں اسد کو اپنے خاندان والوں سے ملوا سکوں۔ میرے والد تو ہماری ملاقات سے پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ میری والدہ اپنی بیٹی وانڈا (Vanda) اور اس کے خاوند کے ساتھ رہتی تھیں۔ میری دوسری بہن رگینا (Regina) بھی قریب ہی سکونت پذیر تھی۔ وہ ایک قوی ہیکل امریکی ڈیوڈ شیر ووڈ (David Sherwood) سے بیاہی گئی تھی اور اس کا آبائی تعلق سکاٹ لینڈ انگلستان سے تھا۔ وہ Prudential Assurance of America کے صدر بھی مقرر رہے، لیکن عہدۂ صدارت سنبھالنے کے تھوڑی دیر بعد 1965ء کے اوائل میں میری بہن کا انتقال ہو گیا۔

اپنی مشترکہ عائلی زندگی کے متعلق لکھنے میں ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ غیر ارادی طور پر یا بلا سوچے سمجھے لکھنے والے کا قلم اپنے حالات بیان کرنا شروع کر دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سانحہ ہوا ہے، حالانکہ میری زندگی تو میرے لیے اہم ہے، دوسروں کے لیے نہیں۔ میں اس داستان حیات سے خود کو الگ رکھنے کی پوری کوشش کروں گی اور صرف انہی اشخاص اور واقعات کو منظر عام پر لانے کی کماحقہٗ سعی کروں گی، جن کا تعلق بنیادی طور پر میرے شوہر سے تھا۔

1954ء کے اواخر میں ''شاہراہ مکہ'' کا مسودہ آخری باب کے بغیر مکمل ہو گیا۔ اس کا ناشر یعنی سائمن اینڈ شسٹر اس نو ماہ کی شبانہ روز محنت سے تحریر کردہ کتاب سے مطمئن تھا اور اس میں کسی طرح کی قطع و برید کے لیے اس نے کوئی تجویز پیش نہیں کی۔ آئندہ موسم سرما تک اس کی اشاعت کا فیصلہ کر لیا گیا۔ کچھ صفحات لکھنا باقی تھے کہ اسد حسب معمول شدید انفلوئنزا میں مبتلا ہو گئے، چنانچہ تاریخ اشاعت کو موسم خزاں تک مؤخر کرنا پڑا اور ہمارے لیے اس کتاب کی تقریب رونمائی میں شرکت بھی مشکوک ہو گئی، حالانکہ ہر مصنف کے لیے اپنی نئی کتاب کے حوالے سے یہ لمحہ انتہائی اہم ہوتا ہے۔[100]

اس تقریب میں شمولیت کی اصل وجہ مالی صورت حال تھی۔ مسودہ مکمل ہو چکا تھا، لیکن اس کی اشاعت سے قبل پیشگی رقوم کی ادائیگی محال تھی۔ میں ابھی تک ملازمت کر رہی تھی، لیکن یہ ناکافی تھی۔ ہمیں ابھی تک طلال اور اس کی

Marfat.com

والدہ کو رقم بھیجنا پڑتی تھی اور یہ بھی طے نہیں تھا کہ یہ ترسیل زر کب تک چلتی رہے گی۔ طلال لندن کے رائل انسٹی ٹیوٹ آف آرکی ٹیکچر میں زیر تعلیم تھا، لیکن اس کی پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، حالانکہ اس کے والد نے خاصی تگ و دو کے بعد اسے وہاں داخلہ دلوایا تھا۔ بعد میں اس نے خود تسلیم کیا کہ لکھنے پڑھنے سے اس کا جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ اب اس نے کہیں ملازمت کر لی تا کہ وہ اپنی مالی دشواریوں کو دور کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مستقبل میں ایک تعلیم یافتہ اور کامیاب انسان بننے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بالآخر اس کی محنت رنگ لائی اور وہ سماجی بشریات (Social Anthropology) کے ذہین پروفیسر کی حیثیت سے کئی سال انگلستان کی ہل (Hull) یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا اور اس وقت وہ نیویارک شہر کے نیو اسکول فار سوشل ریسرچ (New School for Social Research) میں پڑھا رہا ہے۔ میں ایک بار پھر راستے سے ہٹ گئی ہوں، کیونکہ مجھے تو اپنے قیام نیویارک (1952ء تا 1954ء) کے حالات و واقعات بیان کرنا ہیں۔

جب ہم انتہائی تکلیف دہ صورت حال میں گرفتار تھے اور آئندہ بھی اس کے سدھرنے کے امکانات نظر نہیں آ رہے تھے، اس وقت اسد کی ملاقات جرمنی کے اہم ترین اشاعت گھر S. Fischer Verlag کے مالکان سے ہوئی۔ ہٹلر کے دور سے پہلے وہ جرمن ناشرین میں سرفہرست تھا، لیکن نازیوں کے برسر اقتدار آتے ہی انہوں نے اپنا کاروبار سویڈن منتقل کر لیا، جہاں اس فشر کی وارثہ کے خاوند برمان (Bermann) نے نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا۔ جنگ کے بعد انہوں نے جرمنی واپس آتے ہی پھر سے اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ برمان اور اس کی بیوی ''شاہراہ مکہ'' چھپنے سے پہلے پڑھ چکے تھے اور وہ دونوں اس کتاب سے متاثر تھے۔ اگرچہ وہ مذہباً یہودی اور نسلاً جرمن تھے، لیکن اس کے باوجود وہ آزاد خیال اور یورپی کلچر کے فدائی تھے۔ اسد نے ایک یہودی گھرانے میں آنکھ کھولی اور صیہونیت کے خلاف اُن کے تحفظات کسی سے پوشیدہ نہیں تھے، لیکن انہیں اسد کی زندگی کے اس پہلو سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ ''شاہراہ مکہ'' کا جرمن ترجمہ چھاپنے کے خواہش مند تھے، بشرطیکہ اسد خود اس کو جرمنی میں منتقل کریں یا مندرجات کو اس زبان میں تحریر کریں۔ اسد نے اس شرط کو مان لیا، لیکن یہ وضاحت بھی کر دی کہ وہ گذشتہ کئی سالوں سے انگریزی میں لکھ رہے ہیں اور جرمن بولنے والے علاقوں سے بھی دور رہے ہیں، اس لیے وہ فوراً اس کتاب کے مندرجات کو انگریزی سے جرمن میں منتقل نہیں کر سکتے۔ اگر وہ جرمنی میں کچھ وقت گزاریں، جرمن میں بات چیت کریں اور اسی زبان میں سوچیں تو پھر اس زبان میں اپنا مافی الضمیر بآسانی بیان کر سکیں گے۔ برمان کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہم نے جرمنی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مالی تنگدستی کے باعث میں نے اپنی والدہ سے کچھ رقم ''ادھار'' لی اور ناروے کے ایک مال بردار جہاز پر سوار ہو گئے، جو ہمیں بروک لین ہاربر سے انٹ ورپ (Antwerp) لے گیا۔[101]

Marfat.com

(3)

ناروے کے مال بردار جہاز پر ہمارا سفر بڑا خوشگوار رہا۔ ہمارے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اور اس سے ملحقہ غسل خانہ بھی تھا۔ جہاز پر بہت سے مہذب لوگ سوار تھے، جن میں ایک جرمن فوٹو گرافر بھی تھا، جس کی تسکنی (Tuscany) اور دیگر مقامات کی کھینچی ہوئی تصاویر پر مشتمل کتاب شائع ہو چکی تھی۔ جہاز جس کمپنی کی ملکیت تھا، وہ مسافروں کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ کھانا بدذائقہ تھا، لیکن اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہم خوش تھے اور اگر سچ پوچھیے تو ہمارے لیے یہ سفر ہنی مون سے کم نہیں تھا، کیونکہ نیویارک میں عدیم الفرصتی اور مالی وسائل کی کمی کے باعث شادی کے بعد ہمارے لیے ایسے پُر لطف دن گزارنا ممکن نہیں تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا بحری سفر تھا اور اسد کا ماورا بحر اوقیانوس کا بھی پہلا، لیکن ہمیں جہاز کے ڈولنے اور ہچکولوں سے ذرہ بھر سمندری متلاہٹ نہیں ہوئی۔ تقریباً ایک ہفتے میں بحر اوقیانوس کو پار کیا، لیکن یہ سفر اتنا پُر لطف اور آرام دہ تھا کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر ایک روز شام کے قریب انٹ ویرپ (Antwerp) کے نواحی شہر فلشنگ (Flushing) پہنچے۔ ہلکے نیلے پانی کی سطح پر سورج کی سنہری کرنیں اطلس کی طرح پھڑ پھڑا اور جھلملا رہی تھیں۔ میں نے آج تک اتنا دلکش منظر نہیں دیکھا تھا اور اب تقریباً چالیس سال گزر چکے ہیں، لیکن اس ناقابل فراموش سفر کی یاد ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے۔

ہمارے جس فوٹو گرافر مصنف سے جہاز پر دوستی ہوئی تھی، وہ بروجس (Bruges) روانہ ہو گیا۔ اس نے ہمیں بھی ساتھ چلنے کو کہا، لیکن ہمارے محدود مالی وسائل اتنی معمولی سیر و سیاحت کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے تھے، چنانچہ ہم اکیلے برسلز پہنچے اور ایک سستے لیکن آرام دہ ہوٹل میں ٹھہرے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں پہلی بار یورپ آئی تھی اور اسد بھی اس سے پہلے بلجیئم نہیں آئے تھے۔

ہم کئی روز برسلز کی سیر و سیاحت میں مصروف رہے۔ یہ بڑا پیارا شہر ہے اور ہم قدرے سستے ریسٹورانوں میں بلجیئم کے طرح طرح کے روایتی کھانوں سے لطف اندوز ہوتے رہے، بالخصوص آملیٹ اور سبز سلاد تو ویسا کہیں نظر ہی نہیں آیا۔ ایک دن ہم برسلز شہر کے مرکز میں واقع گرینڈ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں متعدد قدیم اور پُرشکوہ عمارتیں اور آرکیڈ ہیں، جنہیں کاریگر تازہ ملمع سازی اور آہنی پتروں کو بڑی مہارت سے خوشنما بنا رہے تھے۔ اچانک ایک نوجوان جوڑا، جو شکل و شباہت سے امریکی دکھائی دیتا تھا، ہمارے ساتھ والی میز پر آن بیٹھا۔ ان میں ایک نے اپنے ساتھی سے پوچھا "پرانے زمانے کا یہ کاٹھ کباڑ کیا ہے؟" ان کا اشارہ عالمی شہرت کے اس علاقے کی عمارتوں کے بارے میں تھا۔ یہ تاثر امریکہ کے قدرے پرانے اور سیدھے سادے دور کی باقیات سے تعلق رکھتا تھا اور میرے خیال میں اب صورت حال خاصی تبدیل ہو چکی ہے۔

ہمیں بادل نخواستہ جلدی برسلز چھوڑنا پڑا، کیونکہ ہمیں فرانکفورٹ پہنچنا تھا، جہاں ناشر اشاعت گھر والے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہاں ان کے ساتھ ابتدائی شرائط طے ہونے کے بعد ہم نے ہامبورگ جانے کا ارادہ کر لیا، کیونکہ وہیں اپنے کام کو بعجلت ممکنہ ختم کرنا چاہتے تھے۔

Marfat.com

مجھے اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ ہم فرانکفورٹ یا ہامبورگ یا ہانوور میں اسد کے سوتیلے بیٹے احمد شیمان (Ahmad Schiemann) اور اس کی بیوی روت (Ruth) سے پہلی بار ملے۔ جنگ کے بعد احمد جسے جرمنی میں ہائنرخ (Heinrich) کے نام سے پکارا جاتا تھا، پاکستان کے فضائی تحقیق کے ادارے میں بطور انجینئر ملازم تھا اور وہاں وہ اپنے سوتیلے باپ سے ملتا رہتا تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ تقریباً ایک سال وہ کراچی میں کسی منصوبے پر کام کرتا رہا اور اتنا عرصہ وہ اسد کے گھر پر مقیم رہا۔ اسد کے وزارت خارجہ سے سبکدوش ہونے تک وہ کراچی میں تھا۔ منیرہ اور طلال سے بھی اس کے اچھے تعلقات تھے، لیکن وہ اسد کو بہت چاہتا تھا اور ان کے حوالے سے مجھے بھی، اور اس کی یہ چاہت ابھی تک قائم ہے۔[102]

ہمارے ہامبورگ جانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اسد کا ایک پرانا ناشر دوست کلاسن (Classen)، جواب اللہ کو پیارا ہو چکا تھا، وہاں رہتا تھا۔ وہ آلسٹر (Alster) پر واقع ایک خوبصورت بورژا مکان میں رہائش پذیر تھا اور اس کا طرز زندگی بھی بورژوائی تھا۔ ہم نے گھر کا ایک چھوٹا سا حصہ کرایہ پر لیا اور جلد ہی اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ہامبورگ میں ہمارے ذوق کا سامان بکثرت تھا اور میرے دیکھنے کو تو پورا شہر پڑا تھا، لیکن اس وقت جرمنی میں کہیں بھی ایسے چھوٹے سے گھر کی تلاش میں تھے، جہاں پوری توجہ اور یکسوئی سے اپنے تفویض کردہ کام کو جتنی جلدی ممکن ہو سکے، مکمل کر دیں۔ یہاں اسد نے جرمن ریڈیو پر ایک سلسلہ تقاریر شروع کیا اور ان کی یہ تمام تقریریں بعد میں کتابی شکل میں بھی طبع ہو گئیں[103]۔ جلد ہی ہم ہامبورگ چھوڑ کر بلیک فارسٹ منتقل ہو گئے جہاں ہم نے ایک خوبصورت تفریحی علاقے باڈن وائیلر (Badenweiler) میں پریوں کی کہانیوں جیسا چھوٹا سا گھر کرایے پر لے لیا۔ اس کی مالک انیٹے کولب (Annette Kolb) پرانے وقتوں کی جانی پہچانی مصنفہ تھی۔ اب وہ خاصی عمر رسیدہ تھی اور کسی اور جگہ رہتی تھی، اس لیے ہماری اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ بویریا کے پاگل لڈوگ (Ludwig) کی ناجائز بیٹی یا پوتی ہے۔

باڈن وائیلر میں ہمارے ہمسائے نفیس اور اچھے لوگ تھے۔ مثلاً محترمہ شک کیلے (Schickele)۔ وہ ایک معروف جرمن ادیب کی بیوہ تھی، محترمہ والی روگے (Wally Ruge)۔ وہ مشرقی جرمنی کے ایک جانے پہچانے ڈاکٹر کی بیوی تھی، جس کا خاوند غالباً ڈریسڈن سے بھاگ کر مغربی جرمنی آ گیا تھا۔ اس چھوٹے سے خوشنما اور چشموں کے شہر سے ذرا ہٹ کر ہم سب قریب قریب کے گھروں میں رہتے تھے اور بیشتر وقت اکٹھے گزارتے تھے۔ یہی وہ ماحول تھا، جس کی اسد کو ''شاہراہ مکہ'' کو بزبان جرمن بالکل نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت تھی اور انہوں نے یہ کام بخوبی پایہ تکمیل کو پہنچا دیا۔

بلیک فارسٹ میں موسم سرما شروع ہوتے ہی مغربی جرمنی کی حکومت کی دعوت پر بون چلے گئے، جہاں ہم مغربی جرمنی میں پاکستانی سفیر کے گھر ٹھہرے۔ وہ اسد کے پرانے دوست تھے۔ وہ غیر شادی شدہ تھے، اس لیے انہوں نے اپنا پُر تعیش گھر ہمارے سپرد کر دیا۔ انہوں نے کئی پُر تکلف عصرانوں کا اہتمام کیا، جن میں اونچے درجے کے

Marfat.com

سیاستدان اور صنعت کار بطور مہمان شریک ہوتے تھے۔ بظاہر ان کا ماضی بے داغ سمجھا جاتا تھا، پھر بھی وہ مہذب اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ ویسے بھی ایسے دوست نما لوگوں سے اس طرح کے سوالات پوچھنا زیب نہیں دیتا۔ سفیر کا گھر کیونگزونٹر (Königswinter) میں تھا اور یہاں کسی زمانے میں نازی وزیر روبرٹ لے (Robert Ley) رہا کرتا تھا۔ یہاں میں نے پہلی بار ایک ایسا غسل خانہ دیکھا، جو مکمل طور پر ایرانی قالینوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ گھر کے بقیہ حصوں پر بھی ایسے ہی نفیس قالین بچھے ہوئے تھے۔ سفیر پاکستان کو نوادرات جمع کرنے کا شوق تھا اور یہ سب کچھ ان کی ذاتی ملکیت تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ اب ان کا نام میری یادداشت سے محو ہو گیا ہے۔ شاید میرے شوہر کو یاد ہو۔ ہر روز دوپہر کے کھانے میں Chantilly meringues ضرور رکھی جاتی تھیں۔ یہ بیکری کی مقامی patisseries دکانوں پر تیار ہوتی تھیں اور وہیں سے انہیں بھجوائی جاتی تھیں۔

موسم سرما اور پھر موسم بہار میں باڈن وائیلر کا ماحول اتنا دلکش اور ساحرانہ تھا کہ میں نے ایسا سابقہ یا آئندہ زندگی میں ویسا شاذ و نادر ہی کہیں دیکھا ہو سوائے ان کچھ سالوں کے جو سوئٹزرلینڈ میں گزارے۔ موسم سرما میں شدید ٹھنڈ تھی، لیکن تمام کمروں کو گرم رکھنے کے لیے ٹائلوں کی بنی ہوئی مخصوص جرمن انگیٹھیاں ۰۰ جو تھیں۔ علاوہ ازیں ایک نوجوان لڑکی (جو کسی مشرقی ملک کو چھوڑ کر یہاں آئی تھی) بھی ان میں لکڑیاں کوئلے جھونکتی رہتی اور صاف بھی کرتی۔ گھر میں فرنیچر زیادہ نہیں تھا، پھر بھی گھر کی صفائی اور دیکھ بھال یہی لڑکی کرتی تھی۔

یہاں اسد ہر وقت تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے اور میں ان کی خودنوشت تحریر کو اپنے مستعار ٹائپ رائٹر پر بزبان جرمن منتقل کرتی۔ میں جرمن نہیں جانتی تھی اور مجھے یہ پسند بھی نہیں تھی۔ فرصت ملتی تو جنگل میں گھومنے پھرنے نکل جاتے (ویسے بھی ہماری رہائش بلیک فارسٹ ہی میں تھی)۔ برف سے ڈھکے ہوئے صنوبر کے درخت، ٹن ٹن بجتی ہوئی قلم یخ (icicle) اور سبک رفتار بادصبا ہمیں عجیب کیف و سرور سے سرشار کر دیتے۔ ہم دونوں چھڑیوں کے سہارے تنگ چوبی راہوں اور جرمنی کے سنسان جنگلوں میں گھومتے پھرتے۔ یہاں پیدل چلنے سے سرتاپا خوشی کی جو لہر دوڑ جاتی تھی، اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایک روز ہم ذرا جلدی جنگل کی سیر کو نکل پڑے۔ تنگ پتھریلی سڑکوں اور لکڑی کے تراشیدہ ٹکڑوں سے بنائے گئے راستوں پر ہم لڑکھڑاتے ڈگمگاتے قدموں سے چلتے گئے۔ اچانک ہمیں محسوس ہوا کہ ہم خاصی دور نکل آئے ہیں اور اب اندھیرے جنگل میں اسی راستے سے واپس باڈن وائیلر پہنچنا مشکل تھا۔ میں جوان تھی اور اسد کی عمر ابھی پچپن برس تھی اور وہ چلنے پھرنے کے شوقین تھے۔ سو ہم چلتے گئے۔ تھکاوٹ محسوس ہوئی، لیکن ابھی تھک کر چُور چُور نہیں ہوئے تھے۔ بالآخر ہم ایک شاہراہ پر پہنچ گئے اور اس کے مقابل ایک پرانا سا جھونپڑی نما کمرہ نظر آیا، جس کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ اس کمرے میں لکڑیوں کے دھوئیں، بیئر، پکے ہوئے کھانے اور انسانوں کی وجودی حدت نے جو سماں باندھ رکھا تھا، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔

لوگوں سے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ چند گھنٹوں بعد بس یہاں رکے گی اور وہی ہمیں باڈن وائیلر واپس۔

Marfat.com

جائے گی۔ فاصلہ زیادہ تو نہیں تھا، لیکن ہم جنگل کے ناہموار اور اونچے نیچے راستوں پر چلتے چلتے تھک چکے تھے، اس لیے بذریعہ بس جانے کا ارادہ کر کے وہیں بیٹھ گئے۔ بھوک چمک اٹھی تھی، اس لیے ہم نے یہیں سستا لیکن لذیذ جرمن کھانا کھایا (Pfankuchen)- پتلے چپٹے جرمن کیک، خود رو سبز اور چھوٹے پتوں والے جنگلی پودوں کا سلاد (feldsalad)- کئی سال بعد یہی سلاد سوئٹزرلینڈ میں دوبارہ کھایا جہاں اسے 'rampon' کہا جاتا ہے۔ فرانسیسیوں نے اسے مراکش میں بھی عام کر دیا ہے، اور اس کا نام 'doucette' ہے، لیکن یہاں اس سلاد جیسا ذائقہ نہیں، جو ہم نے جرمنی میں کھایا تھا۔ مستقبل میں بھی ایسے بہت سے مواقع آئے، جو ہمارے ماضی کی سہانی یادوں کا حصہ ہیں۔ انہی میں وہ خاص دن بھی ہے، جب ہم پیدل آمشٹیک (Amsteg) پر جا چڑھے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی اسے بھلا نہیں سکتا۔ برسوں بعد ہم پھر وہاں گئے، لیکن اولیں تجربے والی خوشیاں عنقا تھیں۔ اور یہ فطری بات ہے۔

(4)

بالآخر وہ وقت بھی آ گیا، جب ہمیں اپنی اس ارضی جنت کو چھوڑنا پڑا۔ ہم دوبارہ فرانکفورٹ پہنچے، جہاں اسد کو فشر فرلاگ (Fischer Verlag) کے یہودی اول ناظم کے ساتھ خاصی گرما گرم بحث کرنا پڑی، کیونکہ وہ مصنف اور اس کی کتاب دونوں کو ناپسند کرتا تھا۔ اسد اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے اور وہ اصرار کرتے رہے کہ وہ اپنی کتاب ''شاہراہ مکہ'' کے جرمن ایڈیشن سے بالکل مطمئن ہیں اور اس کی اشاعت کے بعد جو تبصرے کیے جائیں گے، وہ اس کی شہادت دیں گے۔ نازی دور سے قبل اسد کئی سال تک ''Frankfurter Zeitung'' میں مضامین لکھتے رہے اور قارئین ان کے طرز نگارش کے معترف تھے[104]۔ ان دنوں بیشتر جرمن قلم کاروں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور عجیب ملواں زبان استعمال کرتے تھے، لیکن اسد نے اپنے طرز تحریر کو نازیوں کی لسانی پالیسی سے دور رکھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ جرمن زبان ابھی تک اس تجربے کے منفی اثرات سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکی۔

حسب معمول جب مسودہ برائے طباعت و اشاعت تیار ہو گیا، ہمارے لیے وہاں مزید قیام کرنا اور اپنی محنت شاقہ کے ثمرات سے لطف اٹھانا مشکل ہو گیا۔ سب سے بڑا مسئلہ دگرگوں مالی حالت تھی۔ ابھی ہم باڈن وائیلر ہی میں تھے کہ ایک روز میری نظر دو ایسے خطوط پر پڑ گئی، جن پر ہمارا پاکستانی پتہ لکھا ہوا تھا اور وہ اسد کی میز پر اَن کھلے رکھے تھے۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی اور میں اسے ذاتی طور پر اچھا نہیں سمجھتی۔ نیویارک میں بھی مجھے اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ شادی کے بعد میں نے ان کی میز کی ایک دراز ایسے اَن کھلے خطوط سے بھری ہوئی دیکھی۔ ظاہر ہے کہ ان خطوط کے جواب نہیں دیے گئے تھے۔ تاہم اس دفعہ میں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ ان خطوں کو میرے سامنے کھولیں۔ جب انہیں کھولا گیا تو پتہ چلا کہ کراچی کے ایک اسلامی ادارے کی جانب سے یہ پیشکش کی گئی ہے کہ وہ اسلام کے سیاسی نظام پر کتاب لکھیں اور جو تکمیل کے بعد اسے برکلے کی کیلیفورنیا یونیورسٹی پریس شائع کی جائے گی۔ نیز مصنف کو یہی ادارہ

Marfat.com

اعزاز یہ بھی پیش کرے گا۔ اسد کے لیے اس موضوع پر کتاب لکھنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، چنانچہ انہوں نے فوراً اپنے جوابی خط میں اس پیشکش کو قبول کرلیا۔

اس اثناء میں اسد کو دنیائے عرب میں بسنے والے لوگوں کے جوش وخروش اور موسمی حدت کی یاد ستانے لگی اور راتوں رات یہ فیصلہ کرلیا کہ ہم بذریعہ ریل جے نوا (Genoa) جائیں گے اور وہاں سے بحری جہاز پر سوار ہوکر بحیرۂ روم سے پرے بیروت پہنچیں گے۔ اس سے اگلی منزل دمشق ہوگی۔ انہیں اس شہر سے گہرا لگاؤ تھا اور یہ جذباتی تعلق اس وقت سے تھا، جب وہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں یہاں پہلی بار آئے تھے۔

ہم نے اپنے سبھی جرمن احباب کو الوداعی سلام کیا، ہم جرمنی کے ممنون احسان ہیں۔ ان دنوں یہاں کا ماحول بڑا آسودہ اور خوشگوار تھا۔ لوگ ابھی غریب، قدرے عذر خواہ اور خوش اطوار تھے۔ ہم رات کی گاڑی پر سوار ہوئے، جو بلند وبالا اور پُراسرار کوہ الپس سے، جس کی چوٹیاں چاندنی میں چمک رہی تھیں، فراٹے بھرتی ہوئی چلتی رہی۔ رات بھر ہم سو نہ سکے۔ علی الصبح ہم جے نوا پہنچے اور تلاش بسیار کے بعد سر چھپانے کو ایک خاصا بڑا کمرہ مل گیا۔ قبل ازیں اسد اٹلی آچکے تھے اور اپنی پہلی جرمن بیوی ایلسا (Elsa) کے ساتھ شمال میں واقع لیک کومو (Lake Como) کے قریب چند روز ٹھہرے تھے۔ ان دنوں وہ مالی طور پر تنگدست تھے لیکن پھر بھی خوش تھے۔ اب بھی ہمارے حالات ایسے ہی تھے یعنی مالی دشواریوں کا خوش دلی سے مقابلہ کررہے تھے۔ اسد اس شہر میں اجنبی تھے، چنانچہ ہم دونوں نے یہاں جی بھر کے سیر سپاٹے کیے اور تب سے یہی شہر ہماری یادوں میں بس گیا۔ یہ تصنع سے پاک سیدھا سادا شہر تھا۔ سیاح بھی ادھر کا رخ کم ہی کرتے تھے۔ ہم نے یہاں کشتی پر کیبن کا انتظام کرلیا، جو بیروت روانگی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اپنے کمرے میں واپس آئے تو وہ ایک بڑے آڑو کی مہک سے بھرا ہوا تھا۔ ہم نے یہ آڑو آج ہی خریدا تھا اور چند گھنٹے پہلے ہم اسے یہیں چھوڑ کر باہر چلے گئے تھے۔ میں نے کئی ممالک کے آڑو کھائے ہیں، لیکن جو مٹھاس اور قلب ونظر کو لبھانے والی خوشبو یہاں کے آڑو میں ہے، وہ کہیں اور نہیں۔ میرے شوہر کو بھی کام و دہن کے ایسے تجربات سے گزرنا پڑا، مثال کے طور پر سیستان کے تربوزوں اور شمالی ہندوستان کی وادی کولو کے سبز اور سرخ سیبوں کے ذائقے وہ عمر بھر نہیں بھولے۔ ماضی کی سہانی یادوں نے ان تجربات میں مبالغہ کا رنگ نہیں بھرا۔ جو حقیقت ہے، وہ بیان کردی گئی۔ ویسے بھی ایسے تجربات دہرائے نہیں جاتے۔

(5)

جے نوا کی ہواؤں میں مجھے پہلی بار مشرق کی خوشبو محسوس ہوئی۔ نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی دور کے تعمیر کردہ کلیساؤں اور محلات کی سفید وسیاہ دھاری دار سنگ مرمر کی محرابیں شام کی مساجد کی محرابوں سے کس قدر مشابہ ہیں۔ غالباً یہ طرز تعمیر اسی ملک سے شروع ہوا۔ جو محلات بعد میں تجارتی مراکز اور شاندار بنکوں میں تبدیل کردیے گئے، وہ سب اطالوی تھے۔ یہ شہر زیادہ معروف نہیں، لیکن اس کی دلکشی اور جاذبیت مسلمہ ہے۔

Marfat.com

جس کشتی پر ہم سوار ہوئے، وہ میرے خیال میں مصر تک جاتی تھی۔ پہلے وہ نیپلز رکی جہاں ہم نے شامی بہن بھائی کی معیت میں پورا ایک دن سیر و سیاحت میں گزارا۔ یہ دونوں یورپ سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے ملک جا رہے تھے۔ نیپلز کے اس خوبصورت شہر کی عمارات میں مجھے ٹھوس ہسپانوی اثرات دکھائی دیئے۔ برسوں بعد ہسپانیہ کی قدیم عمارتوں کو دیکھ کر میرا یہ خیال یقین میں بدل گیا۔ سڑکوں پر خاک بھی اڑ رہی تھی اور جا بجا غربت بھی دکھائی دیتی تھی، لیکن وہ بل کھاتی ہوئی مشرقی انداز کی گزرگاہوں اور یہاں کے لوگوں کی زندہ دلی کے نیچے چھپ گئی تھی۔

اسی شام ہمارے جہاز نے لنگر اٹھایا، تو مجھے پہلی بار بحیرۂ روم کی دنیا کی آہٹ سنائی دی۔ وہ دنیا جو مہذب ہے اور اپنی مثال آپ ہے۔ تقریباً ایک ہفتے بعد ہم بحیرۂ روم کے دوسرے کنارے پہنچے تو پھر مجھے اندازہ ہوا کہ میرے شوہر نے اپنی کتاب ''شاہراہ مکہ'' میں خاص طور پر بحیرۂ روم کے مشرقی حصے میں آباد اس دنیا کے بارے میں جو تفصیلات اور کوائف بیان کئے ہیں، وہ کس قدر حقیقت اور سچائی پر مبنی ہیں۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور زندگی سے بھی۔

تب سے میں اکثر یاد کرتی ہوں کہ شادی کے چند روز بعد میں نے اپنے شوہر سے کہا تھا کہ ''آپ نے اتنی دنیا دیکھی ہے کہ میرے لیے اپنی تمام تر کوشش کے باوجود آپ کو چھو لینا بھی ممکن نہیں۔'' اور انہوں نے جواب دیا ''فی الحال انتظار کرو۔'' ان کی بات بالکل درست تھی۔ اگرچہ میں ان تک پہنچ تو نہیں پائی، لیکن مجھے ان کی بے مثال رفاقت میں اتنے ملکوں اور براعظموں کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا، جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے اور شاید میرے خوابوں میں بھی کبھی نہیں آئے تھے۔ پھر ایسے رہنما کے ساتھ، جو مختلف اقوام، مقامات، واقعات، بلکہ ہر چیز کے بارے میں وسیع معلومات رکھتا ہو۔ میں کبھی یہ نہیں جان سکی کہ انہوں نے یہ خزینۂ علم کیسے حاصل کیا۔ جگہوں اور سنین کے متعلق وہ غیر معمولی یادداشت کے مالک تھے۔ اگرچہ وہ ایسا ''چہرہ'' بھول جایا کرتے تھے، جو انہیں ضرور یاد رکھنا چاہیے تھا۔ بلاشبہ یہ بھول چوک تعجب خیز ہے اور اتنی قابل فہم بھی نہیں۔

اور پھر ایک صبح کہر آلود فاصلے سے بیروت کے سواحل نظر آئے۔ یہاں کی بندرگاہ پر عجیب کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اس کے عقب میں گہرے نیلے رنگ کی پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ مشرق کا پہلا منظر، جو میری آنکھوں نے دیکھا، ہر چند کہ اسد یہاں 1922ء میں پہلی بار آئے تھے اور وہ اس شہر کے کونے کونے سے واقف تھے۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

باب دوازدہم

مشرقی بحیرۂ روم تا خلیج فارس
(1955ء-1957ء)

(1)

بندرگاہ بیروت کی گودی پر ہمارا پرانا دوست سعید رمضان ہمارے استقبال کو موجود تھا۔ وہ میرا ''جڑواں'' بھائی تھا، کیونکہ ہم دونوں کی ولادت کا دن، مہینہ اور سال ایک ہی ہے۔ بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ یہی نہیں، ہماری مزاجی خوبیوں اور کوتاہیوں میں بھی خاصی مشابہت پائی جاتی ہے۔ ہم دونوں سریع الحس، مضطرب، موہوم پسند اور اضطراری شخصیت کے مالک تھے۔ ہمیں جلدی دمشق پہنچنا تھا، کیونکہ وہاں سعید کی بیوی ''وفا'' اور ان کے بچے ہمارے منتظر تھے۔ غالباً اس وقت ان کے دو بچے تھے۔ ہم بذریعہ کار بل کھاتی سڑک پر بیروت سے دمشق جا رہے تھے۔ کہیں کہیں ریگستانی منظر بھی دکھائی دے جاتے تھے۔ بیکا (Bekaa) میں چتورا (Chtoura) کے مقام پر ہم دوپہر کے کھانے کے لیے رکے۔ یہاں ایسے خوش ذائقہ مخصوص لبنانی کھانوں کا تجربہ ہوا، جن سے میں بالکل ناواقف تھی، البتہ میرے شوہر کو وہ بہت مرغوب تھے، بالخصوص تہینا (tahina) اور حمس (humus) اور طرح طرح کے سلاد، جو صرف یہاں کے لوگوں ہی کو نہیں بلکہ انہیں بھی بے حد پسند تھے، جو عرب نہیں تھے۔ مجھے ذاتی طور پر یہ کھانے پسند نہیں آئے، لیکن ان کے بجائے مجھے دمشق کی مٹھائیوں، جو نہ صرف عرب اور مسلمان ممالک میں بلکہ پوری دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، نہایت عمدہ آئس کریم اور sorbets نے زندگی بھر مجھے اپنی لذتوں میں جکڑے رکھا۔

لبنان اور شام کی سرحد پر پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ ''آپ کو شام میں داخل ہونے کی اجازت نہیں، کیونکہ آپ کے نام ناپسندیدہ افراد کی فہرست میں درج ہیں۔'' یہ سن کر میرے شوہر حیران رہ گئے۔ شام کے صدر شکری قوتلی اور فارس الخوری دونوں ان کے پرانے اور گہرے دوست تھے۔ کچھ دیر تلخ و ترش گفتگو ہوتی رہی اور پھر ہمیں پتہ چلا کہ یہ سب کچھ ان جھوٹی اور بے بنیاد افواہوں کا کیا دھرا ہے، جو اسد کے پاکستانی وزارت خارجہ سے مستعفی ہونے کے موقع پر اڑائی گئی تھیں، خاص طور پر یہ کہ انہوں نے پھر یہودی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ یہی افواہیں اڑتی اڑتی یہاں کی وزارت داخلہ تک پہنچ گئیں اور انہیں سچ مان لیا گیا۔

Marfat.com

اب ہمارے پاس سوائے بیروت واپس جانے کے اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا، کیونکہ ابھی ان افواہوں کی رسائی وہاں تک نہیں ہوئی تھی یا کم از کم کوئی ذی ہوش انہیں سچ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہاں ہم نے چند روز غیر معمولی ہیجانی صورت حال میں گزارے۔ اسد نے میرے بارے میں یہ انکشاف کیا کہ مجھے پیچش کا مرض لاحق ہے اور ان کی یہ تشخیص اس بنا پر تھی کہ امریکن اکثر اپنی قوت مدافعت کی مضبوطی کی خاطر سلاد اور اَن چھیلے پھلوں سمیت ''ہر چیز'' کھا جاتے ہیں، کیونکہ انہیں ابھی تک ایسی مرض کا تجربہ نہیں ہوا تھا اور وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ لبنان اور شام میں میرے قیام کے پہلے دن ہی مجھے کمزوری کا احساس ہوا، جس پر میں برسوں قابو نہ پا سکی۔ جب ہم پاکستان گئے تو وہاں کے تیز مرچ مصالحے کے کھانوں کے صحت بخش اثرات سے افاقہ ہوا اور پھر زندگی بھر مجھے ایسی کمزوری محسوس نہیں ہوئی۔

دمشق فون کرنے کے بعد متذکرہ بالا ''غلط فہمی'' دور ہو گئی اور جب ہم بعد میں وہاں پہنچے تو بہت سے پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ شکری صاحب نے اپنے دفتر میں بڑے پُر تپاک انداز سے اسد کا استقبال کیا۔ فارس الخوری نے بھی ہمیں دمشق کی پہاڑیوں پر واقع اپنے خوبصورت روایتی گھر میں مدعو کیا۔ اب وہ ہم دونوں کے دوست بن چکے تھے۔ ہم اس کوتاہ قد و قامت، نرم خو شخص سے کئی بار ملے۔ آخری بار ہماری ملاقات جنیوا میں ہوئی، جہاں وہ چند سال سکونت پذیر رہے۔ ان کے رویے میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ جھک کر ملتے اور بالآخر وہ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جنیوا میں جب ہماری آخری ملاقات ہوئی تو وہ خاصے بیمار تھے اور تقریباً بینائی سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ خاصی دیر تک باتیں کرتے رہے اور آخر میں کہنے لگے ''میری خواہش ہے کہ جب میں آخری ہچکی لوں تو میرا ایمان بوڑھی خواتین جیسا ہو۔'' اس فقرے میں پنہاں مفہوم اب میری سمجھ میں آیا ہے۔ یہ ایمان کی ایک ''خصوصی'' حالت ہے، جہاں نہ سوال پوچھے جاتے ہیں اور نہ ان کی ضرورت ہی پڑتی ہے۔

(2)

اسد دمشق کے کونے کونے سے واقف تھے۔ انہیں اس شہر سے محبت تھی اور اپنے اس جذباتی لگاؤ کا پس منظر بھی بتاتے رہتے تھے۔ اس وقت یہ حقیقتاً ایک مشرقی شہر تھا، باوجودیکہ فرانسیسیوں کی شدید گولہ باری نے اس شہر کا خاصا بڑا حصہ تہس نہس کر دیا تھا۔ اس کے ''سوق'' اور حمیدیہ بازار کا کچھ حصہ دوبارہ تعمیر کر دیا گیا تھا۔ یہاں کی دکانیں مشرقی اشیاء کے علاوہ مغرب سے درآمد شدہ سامان سے بھری پڑی تھیں۔ یہاں عورتوں کے چہرے پر نقاب نہیں تھا، البتہ انہوں نے لمبے سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ اسی حمیدیہ بازار میں کسی راہگیر نے میرے جسم کے اس نچلے حصے پر چٹکی بھری، جہاں کسی نامحرم شخص کو چھونے تک کی اجازت نہیں۔ میری زندگی میں یہ ''حرکت'' پہلی اور آخری بار ہوئی۔ اسد سے میں نے اس واقعہ کا ذکر تک نہ کیا، لیکن کئی سال بعد میں نے انہیں بتایا۔ وہ تند مزاج شخص نہیں تھے، لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر میں اسی وقت انہیں بتا دیتی، تو ان کا فوری ردعمل شدید ہوتا۔

دمشق میں سعودی عرب کے سفیر شیخ عبدالعزیز بن زید سے ملاقات ہوئی۔ اسد جن دنوں سعودی عرب میں

Marfat.com

تھے، تب سے ان کے گہرے دوستانہ تعلقات چلے آ رہے تھے اور وہ ہمیشہ اسد کی مجھ جیسی جوان، انتہائی ناتجربہ کار اور بے نقاب بیوی سے انتہائی خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے ملتے تھے۔ یہ شائستگی صرف عربوں سے مخصوص ہے اور آئندہ برسوں میں بلکہ اب تک مجھے اس کا تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ اس وقت میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ اتنے برسوں پہلے اسد کیوں عربوں کے دام محبت کے اسیر ہوئے۔ اس حوالے سے عرب مرد و عورت کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے، لیکن عربی النسل افراد کے جو ''حقیقی'' اوصاف ہیں، وہ الفاظ میں بیان نہیں کئے جاسکتے۔

اسد کے ایک اور دوست شیخ عبدالحمید الخطیب سے ملنے ان کے مثالی گھر گئے جو انہوں نے دمشق شہر سے ہٹ کر اپنی نئی شامی بیوی کے لیے بنوایا تھا۔ جن دنوں اسد کراچی میں ملازم تھے، وہ پاکستان میں سعودی عرب کے سفیر کے طور پر تعینات تھے۔ دمشق میں اپنے منصب سفارت سے سبکدوش ہوئے اور حال ہی میں نئی شادی رچالی۔ یہ گھر مضافاتی علاقہ میں واقع تھا اور اس کے گردونواح دور تک کھلی زمین پڑی تھی، جو مالک مکان ہی کی ملکیت تھی۔ یہاں پھولوں اور پھلوں کے ہر قسم کے پودے اور درخت لگائے گئے تھے۔ اس گھر کی بیٹھک خاصی بڑی تھی۔ سنگ مرمر کا فرش قیمتی قالینوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور اس کے درمیان سے ایک نہر گزرتی تھی۔ اس کے بیچ میں ایک فوارہ تھا، جو پانی کے تیز بہاؤ کو روک کر اسے باغ کی طرف جانے دیتا۔ یہ عربوں کے ذوق، کلچر اور آسودہ حالی کی علامت ہے، تاہم یہ اپنی خوبصورتی کے باوجود کسی کے لیے زیادہ متاثر کن نہیں ہے۔ قرآن کریم میں جس بہشت کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کے مقابلے میں یہ بہت کمتر ہے۔ بلاشبہ سماوی جنت کا ہلکا سا تاثر دکھائی دیتا تھا، کیونکہ ایک عجیب انداز میں اس کے نمائشی پہلو سے گریز کیا گیا ہے۔

فارس الخوری سمیت ہمارے دمشقی احباب نے تجویز پیش کی کہ ہمیں موسم گرما میں کسی ٹھنڈے اور تفریحی مقام پر کرایے کا گھر لے کر منتقل ہو جانا چاہیے۔ یہ جگہ بلودان (Bloudan) ہوسکتی ہے یا زبدنی (Zebadani)۔ ہم نے مؤخر الذکر جگہ کا انتخاب کیا، کیونکہ یہاں مکانات کا کرایہ کم تھا، لیکن بعد میں ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا۔

(3)

ان دنوں یعنی 1955ء کے اوائل میں بہت کم سیاح شام آتے تھے۔ پھر اس وقت شام اور مصر میں سیاسی تحریک بھی چل رہی تھی۔ جمال عبدالناصر کی شہرت بام عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اگر کوئی ٹیکسی میں انگریزی بولتا تو ڈرائیور اور ساتھ بیٹھے لوگ اسے مشکوک نظروں سے دیکھتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایسے ہی ایک موقع پر اسد نے ڈرائیور کو ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا ''یہ ہمارا بھی ملک ہے۔'' ڈرائیور بھی یہ سوچ کر طیش میں آ گیا کہ ہم تو یورپی 'استعمار پسند' نہیں، چنانچہ اسد نے اسے بتایا کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم بھی اس کی طرح برطانیہ اور فرانس کے مخالف ہیں۔ یہ سنتے ہی اس کا چہرہ اور لہجہ دونوں بدل گئے اور اس کا رویہ دوستوں جیسا ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد میں سمجھ گئی کہ عرب کیوں آمادہ پیکار

Marfat.com

تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی ممالک نے انہیں سمجھنے میں غلطی کی ہے اور انہیں اپنے مقاصد کے لیے غلط طور پر استعمال کیا ہے۔

زبدنی میں صورت حال مختلف تھی۔ غیر ملکیوں کے ساتھ ان کا رویہ ایسا نہیں تھا، لیکن وہ خوش دلی سے ملتے بھی نہیں تھے۔ ہم باہر نکلتے تو معصوم بچوں کو ہم پر سنگریزے مارنے کے لیے اکسایا جاتا۔ مخالفت اور نفرت کی یہ لہر ہر طرف چل رہی تھی۔ البتہ یہاں کا مقامی سرکاری منتظم غیر ملکیوں سے بدسلوکی نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک صحت مند نوجوان شامی قوم پرست تھا۔ بعث پارٹی کا رکن تھا۔ اس کا طرز عمل شام کے ایک شریف الطبع شخص جیسا تھا۔

زبدنی کے ان مخاصمانہ حالات میں چند ماہ کے قیام کے دوران میں فارس الخوری سے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ وہ اکثر ہمارے قریب پہاڑی شہر بلودان میں گرمیاں گزارنے آتے تھے۔ موسم گرما اب قریب الاختتام تھا، اس لیے اب وہاں منتقل ہونا مناسب نہیں تھا، لیکن وہاں گہرے سرخ گلاب کی دلربا خوشبو سے مہکتے ہوئے باغات اور بین الاقوامی معیار کے اعلیٰ ہوٹل دامن دل کو کھینچتے تھے۔ یہاں آنا خوشی کا باعث تھا اور دلوں کو بڑھاوا بھی ملتا تھا۔

(4)

نہر سویز کے تنازعہ کے حوالے سے دمشق میں جلسے جلوس اور ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ موسم سرما بھی آن پہنچا تھا اور دمشق میں گھروں کو گرم رکھنے کا انتہائی ناقص انتظام تھا، اس لیے ہم نے بیروت واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسد نے جس کتاب کے لکھنے کی ہامی بھرلی تھی، اس کو بھی تو مکمل کرنا تھا۔

ہم نے بیروت کے مرکزی حصہ میں ایک کمرہ کرایے پر لیا، لیکن ہم دونوں اس بات کا پہلے سے اندازہ نہ لگا سکے کہ یہاں کس قدر شور شرابا ہوگا۔ یہاں ہمارے پاس مختصر سا فرنیچر تھا۔ برسوں سے ہمارا گھریلو سامان نیویارک میں پڑا ہوا تھا اور ہم اس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہاں کا بے پناہ شور کم از کم میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ ٹریفک کا شور، گرجا گھروں کی گھنٹیوں کا شور، مساجد کی اذانوں کا شور اور سب سے بڑھ کر اوپر والے کمرے میں رہنے والوں کا شور، جو صبح سویرے اپنے پسندیدہ کھانے قبہ کے لیے ہاون دستے میں گندم کوٹنا شروع کر دیتے تھے اور یہ عمل گھنٹوں جاری رہتا۔ ویسے اس کھانے سے مجھے شدید نفرت تھی۔ ایسے بے ہنگم غل غپاڑے میں تصنیف و تالیف جیسا سنجیدہ کام ممکن نہیں تھا۔ ہمارے قریبی دوست ڈاکٹر مصطفیٰ خالد نے آلے (Aley) کی پہاڑیوں پر موسم گرما گزارنے کے لیے ایک شاندار گھر بنوا رکھا تھا۔ انہوں نے ہمیں اس گھر کی پوری منزل کی پیشکش کی، چنانچہ ہم نے وہاں منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے ہمارے لیے ملازمین کا بھی بندوبست کر دیا۔ بغرض رہائش یہ جگہ بہت موزوں تھی، لیکن بدقسمتی سے یہاں نقل مکانی کے بعد بالخصوص موسم سرما میں ہم اپنے احباب سے بالکل کٹ کر رہ گئے اور ہمیں اپنا بیشتر وقت تنہائی میں گزارنا پڑتا، چنانچہ یہاں آنے کے بعد اسد بیمار رہنے لگے۔ جس روز اس نئے گھر میں آئے، اسی شام ہمیں ظفر اللہ خاں کی دعوت موصول ہوئی، جو کچھ وقت کے لیے بیروت میں رکے تھے اور انہیں ہماری موجودگی کا علم ہو گیا

Marfat.com

تھا۔رات کے کھانے پر ہماری ملاقات ہوئی، جس میں ایک صحت مند شامی نوجوان بھی موجود تھا۔وہ ظفر اللہ خاں کی ہونے والی بیوی کا بھائی تھا۔چند روز بعد یہ شادی ہوگئی۔ظفر اللہ خاں کی اس بیوی کا نام بشرہ تھا اور وہ بھی احمدی مسلک سے تعلق رکھتی تھی۔بادی النظر میں تمام معاملات کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتے جا رہے تھے (لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔کچھ عرصہ بعد طلاق ہوگئی اور پھر ظفر اللہ خاں نے شادی نہیں کی۔اس وقت وہ ستر کے پیٹے میں تھے)۔

کھانے کے دوران میں ماحول کھچا کھچا سا رہا اور اس باہمی تناؤ کا اصل سبب وہ استعفیٰ تھا، جو اسد سے دباؤ کے تحت لیا گیا تھا، لیکن ہم نے کبھی بھولے سے بھی اس کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔کھانا کھاتے ہی اسد کے پیٹ میں شدید درد شروع ہوگیا، چنانچہ ہمیں جلد رخصت لے کر واپس آنا پڑا۔رات اسی تکلیف میں گزری۔ڈاکٹر خالدی کے اصرار پر معروف کیتھولک ہسپتال گئے۔طبی معائنہ کے بعد بتایا گیا کہ یہ تو پتے کی تکلیف ہے اور اس کے لیے آپریشن کرانا پڑے گا۔علاج معالجے، آرام کرنے اور پرہیزی خوراک سے ان کی طبیعت بحال ہوگئی۔دسمبر کا مہینہ اور سردی زوروں پر تھی۔کمرہ گرم رکھنے کا انتظام تھا، لیکن وہ ابھی چالو نہیں ہوا تھا، چنانچہ جاڑے کی اس رُت میں اسد کو ٹھنڈ لگ گئی۔پھر ہسپتال آنا پڑا اور اس بار ذات الجنب (pleurisy) کی تشخیص ہوئی۔وہ شدید تکلیف میں مبتلا تھے۔بالآخر ہمیں آلے (Aley) کے ''سمر ہاؤس'' میں منتقل ہونا پڑا۔وہاں کم از کم سونے کے کمرے کو گرم رکھنے کا انتظام درست تھا، لیکن اس کے باوجود اسد کو افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ہمارے ایک دوست نے ڈاکٹر سے مارفین کی پوری شیشی لے کر دی تا کہ اس کے استعمال سے ناقابل برداشت درد کچھ کم ہو سکے۔میں تمام رات ان کے سرہانے بیٹھی رہتی اور وہ درد کی شدت کے باعث دیوار سے سر ٹکراتے، لیکن کچھ دنوں بعد بیماری کا زور ٹوٹا اور یہ بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھا، تو میں نے دیکھا کہ مارفین کی شیشی جوں کی توں بند پڑی تھی۔میں نے فوراً اسے باہر پھینک دیا۔بعد میں ہمارے بزرگ دوست شیخ عبدالعزیز بن زید نے ہمیں بتایا کہ اگر انہیں اس مرض کا پتہ چل جاتا تو وہ ایک تجربہ کار بدوی کو بھجوا دیتے جو اس کو ''بھسم'' کر دیتا۔ان کی اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں تھا۔یہ ایک ''قدیم'' اور فوری اثر کرنے کا طریقہ علاج ہے۔اس سے یقیناً اسد کا مرض رفع ہو جاتا اور انہیں اتنے دنوں اس اذیت سے بھی نہ گزرنا پڑتا۔

(5)

ہم دونوں کے لیے یہ ''اذیت اور بے بسی کا دور'' تھا، لیکن یہ ہماری خوش بختی تھی کہ ہمیں اتنے خلیق دوست ملے، جو ہمارا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ان میں سرفہرست خوری (Phillippe Khoury) تھے، جنہیں مقامی دروز کسان خواجہ خوری بھی کہتے تھے۔وہ کٹر یونانی عیسائی تھا، لیکن اس کے مذہبی خیالات شدت پسندی سے عاری تھے۔وہ ایک روایتی مسیحی تھا اور دیگر مذاہب کا احترام کرتا تھا، بلکہ اخوان المسلمین کے نام نہاد ''شدت پسند'' اراکین کو بھی برا بھلا نہیں کہتا تھا۔وہ شام کے شمالی علاقے کے ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ان دنوں یہ علاقہ ترکی کا حصہ بن چکا ہے۔وہ کئی سال قاہرہ میں کپڑے کا کاروبار کرتا رہا۔اس کی دوستی کا عجیب و غریب رنگ تھا۔اس کی

Marfat.com

مستقل رہائش ہمارے ''سمر ہاؤس'' سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ سردیوں کے موسم میں وہ خرگوش اور تیتروں کا شکار کرنے نکلتا اور ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔ ٹھٹھرتی شاموں میں اس کے ساتھ گزرا ہوا وقت بھلانا مشکل ہے۔ بھم دون (Bhamdoun) کے پہاڑی تفریحی مقام پر ''گرین ہاؤس'' نام کا ہوٹل تھا۔ یہ ہوٹل یونانی راسخ العقیدہ چرچ کی ملکیت تھا، لیکن موسم گرما میں یہاں عیسائی اور مسلمان ٹھہرتے تھے۔ یہ مناسب کرایے کا ایک ''فیملی ہوٹل'' تھا، جسے خوری بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہا تھا۔ ایسا مہذب، خلیق اور خوش اطوار دوست ہمیں بہت کم ملا ہے۔ وہ بیروت میں رنگ روغن کی ایک دکان کا بھی مالک تھا۔ وہ آئی سی آئی جیسی مشہور کمپنی کا نمائندہ تھا۔ وہ اکثر بیروت جاتا اور ہمارے کھانے پینے کا سامان بھی لے آتا۔ ڈرائیور ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا اور اسد کی طویل علالت کے دوران میں اس نے ہمیں سہولتیں بہم پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لبنان کو خیر باد کہنے کے بعد ہم پاکستان، سوئٹزرلینڈ اور مراکش میں سکونت پذیر رہے، لیکن ہم نے بذریعہ خط و کتابت اس سے رابطہ قائم رکھا۔ 1965ء میں وہ ہمارے پاس Taupier آیا۔ اس وقت وہ معدے کے کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بیروت میں انتقال کر گیا۔ اس کی یاد سے ہم کبھی غافل نہیں رہے۔ اس نے ہمیں جو آخری مختصر سا خط لکھا، اس میں صرف اپنی ناگزیر اور سر پر منڈلاتی ہوئی موت کا ذکر کیا۔ وہ ایک باہمت اور مہذب شخص تھا۔

یہیں ہمارا ایک اور دوست عبدالحکیم، عبدین (Abdin) میں رہتا تھا، جو اکثر ہمیں ملنے آیا کرتا تھا۔ وہ مصر کی اخوان المسلمین جماعت کے رہنماؤں میں سے تھا، لیکن جمال عبدالناصر کے برسر اقتدار آنے کے بعد وہ جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ (باہمت لیکن حماقت کا مظاہرہ کرنے والے پابند سلاسل ہوئے اور قید و بند کی صعوبتوں کو بہادری سے برداشت کرتے ہوئے موت کو گلے لگا لیا)۔ عبدالحکیم کی شادی حسن البنا کی بہن سے ہوئی تھی، جبکہ ہمارے ایک اور دوست سعید رمضان کی بیوی انہی کی بیٹی تھی۔ اس وقت سعید رمضان ان جلاوطن افراد کا بڑا فعال اور منہ پھٹ رہنما تھا۔ عبدالحکیم نے اس کو ہٹانے کی کوشش کی تھی، اس لیے ان دونوں میں قریبی اعزہ جیسے تعلقات بھی ختم ہو چکے تھے۔ عبدالحکیم ہمیشہ دوسری یا غالباً تیسری بیوی کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔

تمام تر کوتاہیوں کے باوجود عبدالحکیم ہمارے مہربان احباب میں شامل تھا۔ وہ اکثر ہمارے ہاں آتا تھا اور مختلف طریقوں سے ہماری مدد کرتا رہتا تھا۔ ایک روز اسد نے بتایا کہ وہ ایک مصری پکوان فول مدمس کا کس قدر شوقین ہے۔ اسے پکی ہوئی خشک favas اور مسور سے تیار کیا جاتا ہے اور اس کے اوپر زیتون کا تیل، لیموں کا رس اور مرچ ڈال کر کھایا جاتا ہے۔ اسے زیادہ تر ناشتے میں استعمال کیا جاتا ہے اور یہ امیر و غریب سبھی مصریوں کی مرغوب غذا ہے۔ ذائقہ اور مقدار میں اس کا جواب نہیں۔ عبدالحکیم کو جب معلوم ہوا کہ ہمیں بھی یہ کھانا پسند ہے، تو وہ اگلے روز اس میں استعمال ہونے والے تمام اجزا اور برتن بھانڈے سمیت ہمارے گھر آیا اور کوئلوں کی ہلکی آنچ پر ساری رات اسے تیار کرتا رہا۔ علی الصبح جب ہماری آنکھ کھلی، تو تیار شدہ کھانے کی مہک ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ عبدالحکیم نے اس کی تیاری میں رات بھر جاگ کر جو تکلیف اٹھائی، اس سے ہم بے حد متاثر ہوئے۔

Marfat.com

ذات الجنب کا مرض آہستہ آہستہ بڑھتا گیا اور یہ صاف نظر آنے لگا کہ اسد کی طبیعت درست نہیں۔ ہمارے دوستوں میں کئی مسلمان ڈاکٹر بھی شامل تھے اور وہ ہم سے دوا دارو کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ ان میں سے ایک مصری ڈاکٹر تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اسد کے پھیپھڑوں کا ایکسرے ضرور کرایا جائے۔ ایکسرے دیکھا گیا تو اس میں اخروٹ جتنا ایک دھبہ نظر آیا، جسے دیکھ کر مضطرب تکنیکی ماہر نے تجویز پیش کی کہ ہمیں پھیپھڑوں کے امراض کی سرکاری علاج گاہ سے رجوع کرنا چاہیے، جو بیروت سے ذرا اوپر پہاڑی علاقے پر واقع ہے۔ وہاں ان کا جو علاج ہوا، اس کی تفصیلات کا مجھے علم نہیں، لیکن معالجین کے خیال میں پھیپھڑوں کے کینسر کا خدشہ ظاہر کیا گیا۔ میں نے اس تشویش ناک اطلاع کو اپنے تک ہی محدود رکھا اور اسد کو اس کا پتہ بھی نہ چلنے دیا۔ وہ جلد ہی صحت یاب ہو گئے اور گہرے معائنوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہ پرانے ایبا (amoeba) میں مبتلا چلے آ رہے ہیں اور غالباً ان کی موجودہ جسمانی تکالیف کا یہی سبب ہے۔ اس کے بعد انہیں کبھی "پتے کا عارضہ" لاحق نہیں ہوا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر ان کے پتے کا مجوزہ آپریشن ہو جاتا، تو انہیں آگے چل کر زیادہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ان کے ذات الجنب کا مرض مناسب علاج سے خاصا کم ہو گیا تھا، البتہ بقیہ زندگی میں سرد اور تیز ہواؤں سے ان کی طبیعت پر ناگوار اثرات پڑتے تھے۔ شاید یہ بیروت میں ان کی مہمات کا نتیجہ تھا۔ بیروت میں بالخصوص وہاں کی امریکی یونیورسٹی کے ہسپتال میں ان کی صحت خاصی بہتر ہو گئی۔ اس تجربے کے بعد میں لیونٹین (Levantine) ڈاکٹروں کی طبی کارکردگی سے بالکل مایوس ہو گئی اور میں پاکستانی ڈاکٹروں پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرنے لگی، کیونکہ میرے خیال میں شعبہ طب میں وہ بے مثال ہیں۔

زندگی کے دکھ سکھ ایسے ہی چلتے رہے اور انہی نامساعد حالات میں وہ کتاب بھی پایہ تکمیل کو پہنچ گئی، جو کراچی کے ایک ادارے کی تجویز اور مالی اعانت سے شروع کی گئی تھی۔ یہ انگریزی میں لکھی گئی اور یہ امریکہ کی کیلے فورنیا یونیورسٹی پریس کی جانب سے منظر عام پر آئی۔ اس کا عنوان "اسلام میں ریاست اور حکومت کے اصول" تھا۔ بعد میں اس کے عربی تراجم بھی شائع ہوئے۔ اگرچہ یہ انتہائی کٹھن حالات میں لکھی گئی، لیکن پھر بھی یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اہم کتاب ہے۔ اس کے عربی مترجم محمود شریف عمان کے ایک اہم اخبار کے مدیر مقرر ہوئے اور آج کل وہ اردن کے وزیر اطلاعات ہیں۔ اس کا بھائی کامل شریف کا شمار بھی ہمارے پرانے عزیز ترین دوستوں میں ہوتا ہے۔ وہ ابتدائی ایام میں اخوان المسلمین کا نمایاں رکن رہا، کئی ممالک میں اردن کے سفیر کی حیثیت سے کام کیا اور انہیں وزیر برائے مذہبی امور کا قلمدان بھی سونپا گیا۔

اسد کی یہ نئی مختصر کتاب پوری دنیائے اسلام میں خاصی مقبول ہوئی۔ پاکستان کے دو حکمران ایوب خاں اور ضیاء الحق اس کے بڑے معترف تھے اور انہوں نے اس کے مندرجات سے استفادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ بھی اسد کی ایک ایسی کتاب ہے جو "اپنے وقت سے پہلے" حیطہ تحریر میں آ گئی، بشرطیکہ ایسا وقت کبھی آ جائے۔[105]

Marfat.com

(6)

جن دنوں ہم جرمنی میں تھے، امریکہ سے ''شاہراہ مکہ'' منظر عام پر آ گئی اور اسے شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ موقر مجلہ ''سیچر ڈے ریویو آف لٹریچر'' کے سرورق پر اسد کی عربی لباس میں کھینچی گئی تصویر شائع کی اور اندرونی صفحات پر بھرپور توصیفی تبصرہ بھی شائع کیا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ''بک آف منتھ کلب'' اس کتاب کو منتخب کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور وخوض کر رہی تھی اور اس کلب کے پانچ منصفین نے اتفاق رائے سے اسی کے حق میں رائے دی تھی، لیکن ایک رکن کلفٹن فاڈی من (Clifton Fadiman) نے اس متفقہ فیصلے کو مسترد کر دیا، کیونکہ وہ پکا صیہونی تھا، لیکن اس سے کتاب کی فروخت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

بعد میں یہی کتاب برطانیہ کے ناشر میکس رائن ہارٹ نے شائع کر دی۔ اس پر بھی شاندار تبصرے کئے گئے، لیکن ویسے نہیں جیسے امریکہ میں ہوئے تھے، کیونکہ ابھی برطانیہ کے زیر نگیں کئی نو آبادیات تھیں اور ''لارنس آف عریبیا'' کی دھندلی اور قدرے تلخ یادیں بھی لوگوں کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھیں۔ اس کتاب کے جرمن ایڈیشن کو بھی مبصرین نے بہت سراہا لیکن قارئین تک اس کی رسائی بہت کم ہوئی۔ عرصۂ دراز بعد سوئٹزرلینڈ میں یہ عقدہ کھلا کہ کسی پُراسرار یہودی گروہ یا تنظیم نے یہ جرمن ایڈیشن خرید لیا اور معلوم نہیں کہاں پھینک دیا۔ ہم نے بھی اس ایڈیشن کی ''گمشدگی'' کا کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی۔

جب ہم پہلی بار بیروت پہنچے تو ہمیں اتفاقاً یہ پتہ چلا کہ ایک لبنانی ناشر نے ''شاہراہ مکہ'' کا بلا اجازت عربی ترجمہ کروا لیا ہے اور اب وہ زیر طبع ہے۔ بالعموم اسلامی دنیا میں ایسی روایت کا سراغ کم ہی ملتا ہے، پھر بھی ہم نے اس ترجمہ کی طباعت رکوا دی، کیونکہ اس کا معیار کمتر تھا۔ اس کتاب کے جن حصوں میں عرب ریگستان کے قدرتی حسن کو جس اچھوتے انداز سے بیان کیا گیا تھا ان کو حذف کر دیا گیا تھا، کیونکہ بقول ناشر ''بہت کم عرب جانتے ہیں کہ ریگستان کیا ہوتا ہے۔'' جب اسد نے دریافت کیا تو جواب ملا کہ ''ہم بذریعہ بس ایسے ریگستانوں کے بیچ میں سے گزرے ہیں۔'' ایسی ذہنیت کے اشخاص سے مزید بحث میں الجھنا درست نہیں تھا، لیکن حیرت ہے کہ اس کے باوجود یہ معمولی سا ترجمہ دنیائے عرب میں شہرت کی بلندیوں تک جا پہنچا۔ اسد کی فراخ دلی ملاحظہ کیجئے کہ اس ترجمہ کا ناشر اور اس کی حسین فلسطینی بیوی، جو ان معاملات سے ناآشنا تھی، ہمارے حلقہ احباب میں شامل ہو گئی اور ہم دونوں نے کبھی اس کی بدمعاملگی کا ذکر تک نہیں کیا۔[106]

گذشتہ کچھ سالوں میں اس غیر معمولی کتاب کے ایک درجن کے لگ بھگ بہ اجازت اور اس سے بھی زیادہ بلا اجازت ایڈیشن شائع کئے گئے (ان کی دوسری کتابوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ''سلوک'' کیا گیا)۔ 1960ء کے اوائل میں اس کتاب کے ولندیزی، سویڈش، فرانسیسی، جاپانی، سربوکروشین اور متعدد دوسری زبانوں میں تراجم کئے گئے۔ ہماری نجی لائبریری میں ایک پورا شیلف ان تراجم سے بھرا پڑا ہے، لیکن اس کی طبع اول نے ہمیں جس سنسنی خیز کیفیت سے دوچار کیا، اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس کتاب کو میرے نام معنون کیا گیا اور اس اعزاز نے مجھے جس

Marfat.com

خوشی سے ہمکنار کیا، اس کا ذہن سے محو ہونا ممکن نہیں۔ سعودی عرب کی جدید تاریخ کے دورِ عبدالعزیز ابن سعود کے حوالے سے یہ کتاب کلاسیکی حیثیت کی حامل ہے، کیونکہ اس ملک نے اسی حکمران کی رکھی ہوئی بنیادوں کو اوپر اٹھایا۔ ہم سعودی عرب کی مزید ترقی اور خوشحالی کے لیے دعا گو ہیں۔

(7)

1950ء کی دہائی کے نصف دوم میں بیروت دنیائے عرب کے تحرک کا محور و مرکز تھا۔ موسم گرما میں ملک کے بالخصوص سعودی عرب اور خلیجی ممالک کے عرب یہاں جوق در جوق آتے اور شہر کے پہاڑی حصے میں نئے گھر بنواتے یا کرائے پر لیتے۔ اس طرح ہمارے اپنے نئے اور پرانے دوستوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ ایک روز حمدون میں ہمارے کرائے کے مکان کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ یہ ڈاکٹر ذاکر حسین تھے، جو بعد میں بھارت کی کرسی صدارت پر متمکن ہوئے۔ وہ تقسیم ہند سے قبل کی ایک معروف علمی شخصیت اور ماہر تعلیم تھے اور اسد کے برصغیر کے قریبی احباب میں شامل تھے۔ تقسیم ہند سے قبل انہوں نے میرے شوہر سے کہا تھا ''اسد صاحب! اگر مجھے یقین ہو کہ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے جن اصولوں کا آپ پرچار کر رہے ہیں، اگر انہی پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا، تو میں آپ کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا، لیکن آپ کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ بنیادی طور پر اس ملک کے لوگوں کے ایک معمولی سے گروہ کے مالی مفادات کو فائدہ پہنچے گا۔'' اس مختصر مگر غیر متوقع ملاقات کے دوران میں میرے شوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین دیر تک ہندوستان کے دور ماضی پر گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد ان دونوں کی دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی۔[107]

ہمارے نئے واقف کار جو بعد میں ہمارے حلقہ احباب میں شامل ہو گئے، سعودی عرب کے ناظم شعبہ اطلاعات شیخ عبداللہ بالخیر تھے، جن سے پہلی ملاقات ہمارے مشترکہ دوست سعید رمضان نے کرائی۔ شیخ عبداللہ اپنی نئی دلہن عیدہ (Aida) کے ہمراہ بیروت آیا تھا۔ اس کی نوجوان اور خوبصورت بیوی کا تعلق اردن کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ وہ اپنے اس رشتہ ازدواج پر بہت خوش تھا اور میں ان پُرمسرت دنوں کے جذبات و محسوسات کو بخوبی جانتی تھی، کیونکہ صرف چار سال قبل میری شادی ہوئی تھی۔

شیخ عبداللہ ان سعودی باشندوں میں سے تھا، جنہیں شاہ عبدالعزیز کے دور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بیرون ملک بھیجا گیا۔ انہوں نے اپنی تعلیم بیروت کی یونیورسٹی میں مکمل کی۔ وہ درمیانی قد و قامت، مضبوط جسم اور خوش خلق شخص تھا اور اسد کی سعودی عرب سے روانگی کے بعد بالخصوص تیل دریافت کرنے کے بعد اس ملک کو جن حالات و واقعات سے نبرد آزما ہونا پڑا، ان پر اس کی گہری نظر تھی۔ وہ ابن سعود اور صدر روزویلٹ کی اس مشہور کانفرنس میں موجود تھا، جو کاسابلانکا سے پرے اول الذکر کی بادبانی کشتی پر ہوئی تھی۔ سعودی عرب کے شاہ کی سعودی عرب سے باہر کسی ملک میں یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی، جو خاصی کامیاب رہی۔ جب بیروت میں ہماری ملاقات شیخ عبداللہ سے ہوئی، اس وقت ابن سعود ہی برسراقتدار تھے اور بالآخر امیر فیصل سے اختلاف کے باعث انہیں معزول ہونا

Marfat.com

پڑا۔ شیخ عبداللہ کو بھی ابن سعود کی معزولی کے ساتھ ہی فارغ کر دیا گیا۔ یہ بات کس قدر افسوسناک ہے کہ اتنے ذہین اور قابل شخص کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا، جبکہ وہ ابھی جوان اور فعال تھے۔ بالعموم نئے حکمران غیر شخصی حکومتی نظاموں میں بھی اپنے اردگرد کے لوگوں کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ ایک فطری عمل ہے۔ شیخ عبداللہ اپنی معزولی کے بعد بھی سعودی عرب میں نمایاں حیثیت کا مالک رہا۔ مختلف اخبارات اور رسائل میں اس کے مضامین شائع ہوتے رہے، جن میں وہ ''دور ماضی کے سہانے دنوں'' کو یاد دلاتا رہتا تھا اور اس کی یادداشتیں معتبر اور دلچسپ ہوتی تھیں۔ اس کے قارئین ابھی تک یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ اپنی یادداشتوں کو کتابی صورت میں شائع کرائے گا لیکن شاید وہ اس لیے ایسا نہیں کر سکا کہ ان واقعات کو اس نے بڑے قریب سے دیکھا تھا اور ان کی تمام جزئیات سے واقف تھا، اس لیے اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ اسد سے اس کے دوستانہ تعلقات آخر تک استوار رہے۔ کئی سال بعد جب وہ تجیہ (Tangier) میں ہمیں ملنے آیا تو اس کی خوبصورت بیوی بھی اس کے ہمراہ تھی اور ہم سب نے یادگار وقت گزارا۔

(8)

اگرچہ ہم بیروت میں رہتے تھے، لیکن اکثر شام جاتے اور اب تو میں بھی دمشق سے بخوبی واقف ہو گئی تھی۔ یہاں کے عمومی مناظر مثلاً سوق، دیدہ زیب قدیم مساجد، بل کھاتی تنگ سڑکیں جہاں صرف انسان اور گدھے ہی چل سکتے تھے، جا بجا بکھرے پڑے تھے، لیکن ایک بار اسد مجھے عظیم عالم دین ابن تیمیہ کی قبر پر لے گئے، جو دمشق یونیورسٹی کے کھلے میدان میں واقع تھی اور اس کے اردگرد آہنی تاروں کی باڑھ لگا دی گئی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ قبر سے ملحقہ جگہ استعمال شدہ ڈبوں اور بوتلوں سے بھری پڑی تھی اور کاٹھ کباڑ کا ڈھیر دکھائی دیتی تھی۔ ایسی ہی افسوسناک صورت حال صلیبی جنگوں کے مسلمان ہیرو اور سالار اعلیٰ صلاح الدین ایوبی کے مزار کی بھی تھی۔ اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا وسیع احاطہ بھی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں، کڑکڑاتی مرغیوں اور اس طرح کے گھریلو پرندوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم دونوں کو یہ منظر دیکھ کر دھچکا سا محسوس ہوا۔ مزار کے اندر مدہم اور بدنما بجلی کے بلب چھت سے لٹک رہے تھے۔ دمشق کی کچھ خوبصورت مساجد کے اندرونی حصوں کو روشن رکھنے کا ایسا ہی ناقص انتظام کیا گیا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر بہت افسوس ہوا اور میرے کہنے پر اسد نے اپنے بعض مقتدر احباب سے اس بدنظمی کا ذکر کیا۔ چنانچہ اس مسئلہ پر شامی پارلیمنٹ میں خوب بحث ہوئی اور بالآخر یہ ناگفتہ بہ صورت حال میں بہتری کے آثار پیدا ہوئے۔

انہی دنوں اسد کو شام کی اسی قومی اسمبلی میں تقریر کرنے کی دعوت دی گئی اور میرے خیال میں ان کی زندگی کی یہ واحد تقریر تھی، جسے ناکام کہا جا سکتا ہے۔ یہ تقریر پاکستان کے روحانی رہنما محمد اقبال کی یاد میں کی گئی۔ پاکستانی سفارت خانہ نے میرے شوہر سے رابطہ قائم کیا۔ اس حوالے سے نہیں کہ وہ اقبال کے رفیق کار رہے، بلکہ ان کو بلانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ سفارت خانہ کے عملہ میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا، جو عربی زبان میں اس موضوع پر بول سکتا۔ اسد کو عربی زبان پر دسترس حاصل تھی اور وہ ''کلاسیکی'' عربی روانی سے بول سکتے تھے۔ پارلیمنٹ اور دنیائے عرب کی تمام

Marfat.com

دانشگاہوں میں ایسے مواقع پر مخصوص طرز اظہار مستعمل تھا، جو ثقالت اور تصنع سے مملو ہوتا۔ اسد کو اپنی پُر تکلف اور مصنوعی زبان سخت ناپسند تھی اور ایسی عمومی تقریبات کے لیے اسے بے محل سمجھتے تھے۔ بامر مجبوری انہیں بھی یہی پیرایہ اظہار اختیار کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنی تقریر اسی ادق اور ثقیل عربی زبان میں لکھی، چنانچہ اس میں سے اس بے ساختہ پن کا شائبہ تک نہ تھا، جو اسد کی بطور مقرر پہچان تھی۔ مزید برآں جس اسٹینڈ پر اپنی لکھی ہوئی تقریر رکھ کر پڑھ رہے تھے، وہاں روشنی خاصی کم تھی اور انہیں پڑھنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ ویسے بھی ان کی قریب کی نظر کمزور تھی۔ جیسے تیسے انہوں نے اپنی تقریر تو مکمل کر لی، لیکن اس دوران میں غیر سنجیدہ سامعین کے شور اور دبی دبی طنز آمیز ہنسی سے وہ خاصے بیزار ہوئے۔ بعد میں انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ آئندہ ایسے عرب سامعین سے کبھی خطاب نہیں کریں گے۔ پھر وہ زندگی بھر اپنے اس فیصلے پر قائم بندر ہے، لیکن اسد ایسے ناخوشگوار واقعات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے اور انہیں اپنے دل کا روگ نہیں بناتے تھے، البتہ جب کبھی ایسے حادثات رونما ہوتے تھے، مجھ پر ان کا گہرا اثر ہوتا تھا۔

ہم تقریباً تین برس سے شام اور لبنان میں مقیم تھے۔ یہیں ہمیں پاکستان کی پنجاب یونیورسٹی نے ایک بین الاقوامی کانفرنس کے انعقاد کی دعوت دی۔ ہم پہلے ہی سے پاکستان جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے، چنانچہ یہ دعوت فی الفور قبول کر لی گئی۔ اپنے بے شمار دوستوں سے ہماری الوداعی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ہم ان سے آخری بار نہیں مل رہے تھے، کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ان سے دوبارہ ملیں گے ان شاء اللہ۔ پھر بھی بیروت کے ہوائی اڈے پر جہاز پر سوار ہوتے ہوئے میں سوچنے لگی کہ شاید میں پھر اس خوبصورت شہر کو دیکھ سکوں یا نہیں اور ایسا ہی ہوا۔ ہم یہاں دوبارہ قیام نہ کر سکے، البتہ پاکستان سے واپس آنے کے دس سال بعد ہم 1966ء میں حج پر جاتے ہوئے ایک دن کے لیے یہاں رکے تھے۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

ISLAM
UND ABENDLAND

BEGEGNUNG ZWEIER WELTEN

EINE VORTRAGSFOLGE

HERAUSGEGEBEN

VON MUHAMMAD ASAD UND

HANS ZBINDEN

شریک مدیر کی حیثیت سے محمد اسد کی مرتبہ جرمن کتاب بعنوان "اسلام اور مشرق" (مطبوعہ سوئٹزرلینڈ، 1960ء)
جس میں ان کے تحریر کردہ تین مقالات بھی شامل ہیں۔

Marfat.com

باب سیزدہم

دوبارہ پاکستان میں
(1958ء-1959ء)

(1)

کراچی کے ہوائے اڈے پر میرے پرانے دوست ایم۔ جے۔ اسعد اور ان کی بیگم فرخ ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ اسعد کو میں اپنی شادی سے پہلے سے جانتی تھی، جب وہ 1950ء میں اقوام متحدہ میں کام کر رہے تھے۔ اس سے اگلے سال یعنی 1951ء میں وہ پاکستان واپس چلے گئے۔ فرخ سے شادی کے بعد بھی ہمارا رابطہ منقطع نہیں ہوا۔ ان دونوں میاں بیوی کا تعلق احمدی جماعت سے تھا اور اقوام متحدہ (نیویارک) میں اپنی ملازمت کے دوران میں اسعد، وزیر خارجہ ظفر اللہ خاں کے قریبی ساتھیوں میں شامل تھا۔ مذہبی اختلافات کے باوجود ہمارے دوستانہ تعلقات میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا اور اسعد ہمیشہ میرے شوہر کی شخصیت اور تبحر علمی کے معترف رہے۔ 1988ء میں فرخ کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا اور چار سال بعد فروری 1992ء میں اسد بھی مجھے داغ مفارقت دے گئے، لیکن ہماری دوستی اب بھی قائم و دائم ہے۔

کراچی میں چند روز ٹھہرے۔ بندرگاہ پر واقع یہ شہر اچھا لگا، لیکن مجھے اس میں انوکھا پن بھی محسوس ہوا، جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ شہر کے پرانے دوستوں سے ملتے ہوئے ہم لاہور پہنچے جہاں ہمارے دیرینہ محب محمد حسین بابری ہمارا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ ٹائپ مشینوں کی مرمت وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ ہم شہر کے عمدہ ترین ہوٹل فلیٹیز میں ٹھہرے، جو لاہور کے نو آبادیاتی دور کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ پرانے طرز تعمیر کے اس ہوٹل میں تمام ضروری آسائشیں میسر تھیں اور ہمیں یہاں کا ماحول پسند تھا۔ یہ ہوٹل نئے شہر کے بالکل درمیان میں واقع ہے اور اس کی کھڑکیوں میں سے لاہور کی بارونق اور رنگوں سے بھری ہوئی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ لوگ اپنے کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ گوبر کے جلتے ہوئے اپلوں کی بو محسوس کر سکتے ہیں، جن کو جلا کر لوگ باہر ہی اپنا کھانا تیار کر لیتے ہیں۔ ان اپلوں سے اٹھنے والے دھوئیں کے مرغولے خاک آلودہ فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہ بو کیسی ہے، بیان کرنا مشکل ہے۔ تلخ لیکن حیران کن حد تک خوشگوار اور کسی حد تک پُر اثر بھی۔ یہاں کے گردونواح کا ماحول بڑا جاذب

Marfat.com

نظر تھا۔ ہوٹل کا کھانا عمدہ اور خوش ذائقہ تھا اور اسے مخصوص پاکستانی انداز سے تیار کیا جاتا تھا۔ سیاحوں کی خاطر مرچ مصالحوں کی تیزی کو کم نہیں کیا جاتا تھا۔ ویسے بھی ان دنوں یہاں سیاح بہت کم آتے تھے۔

ناشتے میں پپیتا، دوپہر کے کھانے میں لذیذ پلاؤ اور پھلوں اور سبزیوں کا اچار اور رات کے کھانے میں خوش ذائقہ نان، جو زیادہ تر شمال مغربی سرحدی صوبہ افغانستان اور ایران میں بھی بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ پتلا، اندر سے نرم، باہر سے خستہ۔ یہ نان لاجواب ہے اور برصغیر پاک وہند کے لوگ اسے شوق سے کھاتے ہیں۔

یونیورسٹی میں ہماری ملاقات وائس چانسلر سے ہوئی، جو نرم خُو لیکن ان کے مزاج میں سرد مہری کا عنصر نمایاں تھا۔ میرا فوری تاثر یہ تھا کہ وہ اسد کو پسند نہیں کرتا اور غالباً وہ چند ماہ بعد منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس کے لیے اسد کی منتظم کی تقرری پر خوش نہیں تھا۔ وائس چانسلر خود اس کانفرنس کا سرکاری میزبان تھا۔ اسد کی اسلام پر گہری نظر، وسعت مطالعہ، عربی زبان پر کامل دستگاہ اور کانفرنس کے متوقع شرکاء سے گہرے روابط کے پیش نظر انہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ وہ وائس چانسلر کے اختیارات کو غصب کرنے کا بھی ارادہ نہیں رکھتے تھے اور نہ انہوں نے اس عہدے کے لیے کوئی درخواست بھجوائی تھی۔ بہرحال ابتدا میں نظم ونسق کے معاملات بلا روک ٹوک چلتے رہے۔ یونیورسٹی ہی میں ہمیں چھوٹا سا الگ دفتر دیا گیا۔ دفتری امور کی بجا آوری اور معاونت کے لیے ایک پاکستانی سیکرٹری کا بھی تقرر ہوا۔ یہ صاحب قدرے کند ذہن تھے، چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ میں اعزازی طور پر اپنے شوہر کی معاون کی حیثیت سے کام کروں اور اس کے لیے مجھے عہدہ دیا جائے گا نہ تنخواہ۔ میں نے دل وجان سے اپنی ذمہ داریوں کو نپٹایا اور ہم دونوں نے جوش وجذبہ سے اس کانفرنس کے کامیاب انعقاد کے لیے دن رات کام کیا۔ ہم علی الصبح تانگے پر دفتر آتے اور رات گئے اپنے کرائے کے مکان پر واپس پہنچتے۔

لاہور میں ہم نے چمبہ ہاؤس لین پر ایک گھر کرائے پر لیا، جہاں درختوں کی بہتات تھی۔ اس سے پہلے بھی اسد یہیں ایسے ہی گھر میں رہائش پذیر رہے، جب انہیں حکومت مغربی پنجاب کے قائم کردہ محکمہ احیاء ملت اسلامیہ کا ناظم مقرر کیا گیا تھا۔ یہ خوبصورت رہائشی علاقہ تھا اور یہاں کے تقریباً تمام گھر برطانوی دور کی یاد دلاتے تھے۔ ہر گھر میں پھولوں سے لدے ہوئے باغیچے تھے اور وہ شام ڈھلتے ہی رات کی رانی کی دل لبھانے والی معطر خوشبو سے مہک اٹھتا۔ مون سون کا موسم آیا اور موسلا دھار بارشیں شروع ہوگئیں۔ اس پرانے مکان کی اینٹوں کی بنی ہوئی محرابی چھتیں پہلی بارش کے ساتھ ہی ٹپکنے لگیں۔ صورت حال اتنی دگرگوں ہوگئی کہ یہاں ہمارا رہنا دوبھر ہوگیا، چنانچہ ہم کہیں اور مکان تلاش کرنے لگے۔ خوش قسمتی سے اسد کے ایک پرانے دوست سردار شوکت حیات کے ذریعے مناسب کرایے پر نیا گھر مل گیا۔ یہ لاہور سے ذرا ہٹ کر ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں واقع تھا۔ یہاں کے بیشتر گھر خاصے بڑے تھے۔ یہ گھر سردار صاحب کے سالے نے بنوایا تھا لیکن مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہوگیا اور اس کی بیوی ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ وہ یہاں منتقل ہوگی یا نہیں۔ اس گھر میں وسیع وعریض باغ تھا اور اس سے ملحقہ زمین بھی شوکت حیات کی ملکیت تھی۔ ہم خود کو خوش قسمت سمجھتے تھے کہ ہمیں اتنے اچھے ہمسائے ملے، جو ہماری نجی زندگی میں مخل نہیں ہوتے تھے

Marfat.com

اور ہر طرح سے ہمارا خیال رکھتے تھے۔ نقل مکانی سے ذرا پہلے بیروت سے ہمارا فرنیچر بھی پہنچ گیا اور ہم نے نئے گھر میں سلیقہ سے رکھوالیا۔ بیروت سے روانہ ہونے سے چند روز قبل ہم نے جو کار خریدی تھی، وہ بھی پہنچ گئی اور یوں کہیں آنے جانے کے لیے ہماری جان تانگے سے چھوٹ گئی۔ بلاشبہ یہ سواری خوش نما تھی، لیکن میرے لیے ذہنی اذیت کا باعث تھی، کیونکہ جس بے دردی اور بے رحمی سے جتے ہوئے گھوڑوں سے سلوک کیا جاتا ہے، وہ انتہائی تکلیف دہ ہے اور اس کے خلاف میں اکثر تانگے والوں سے احتجاج کیا کرتی تھی، لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میرے اس احتجاج کا محرک کیا تھا۔

یہاں اسد کے پرانے دوست ان کی سابقہ بیوی کو بھی جانتے تھے۔ ان میں چند بد طینت افراد کو چھوڑ کر اکثر مؤدب اور خوش اخلاق تھے اور بہن کی طرح میری عزت کرتے تھے، خاص طور پر محمد حسین بابری اور چودھری نیاز علی خاں۔ ثانی الذکر تو خاصی بڑی جاگیر کے مالک تھے اور ہم انہیں ملنے وہاں گئے [108]۔ چودھری نذیر احمد خاں، پاکستان کے سابق اٹارنی جنرل اور میری ہم نام ان کی بیگم حمیدہ نذیر احمد دراز قد، خوش وضع انسان تھے اور ان کا طرز عمل طبقۂ خواص جیسا تھا، جبکہ ان کی بیگم چھوٹے قد اور معمولی شکل وصورت کی خاتون تھیں، لیکن ذہین تھیں۔ ان میں محبت اور چاہت اس قدر تھی کہ مغرب کیا مشرق میں بھی ویسی کم کم ہی دکھائی دیتی ہے۔

ممتاز حسن، وزیر مالیات سے کراچی اور لاہور مین ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کا تعلق لاہور سے تھا۔ ان کے کئی بھائی تھے جو اپنے اپنے شعبوں میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان میں ایک نسیم حسن تھے، [109] جو مشہور قانون دان تھے اور لاہور ہی میں رہتے اور وکالت کرتے تھے۔ اے۔ ڈی۔ اظہر بھی ہمارے دوستوں میں شامل تھے [110]۔ وہ بڑھاپے میں بھی یوگا کی مشقیں کرتے تھے، حالانکہ اس عمر میں ایسی ورزش نہیں کرنی چاہیے۔ ایسے اور بھی بہت سے پُر خلوص دوست تھے، جن کے نام اب ذہن میں نہیں آ رہے، لیکن ان کی محبتیں اور شفقتیں کبھی بھول نہیں پاؤں گی، حالانکہ وہ اسد کی سابقہ بیوی کو زیادہ جانتے تھے اور ان کے لیے میں ابھی کم آمیز اجنبی خاتون تھی۔ یہ تمام لوگ پاکستان کی ابتدائی سیاسی اور تہذیبی زندگی کے روح رواں تھے، لیکن انہیں آہستہ آہستہ مسند اقتدار سے الگ کر دیا گیا اور میرے خیال میں اس سے پاکستان کو نقصان اٹھانا پڑا۔

یونیورسٹی موسم گرما کی تعطیلات کی وجہ سے بند ہوگئی اور ہم اس وسیع وعریض ملک کے شمالی علاقوں کی سیر وسیاحت کو نکل پڑے۔ ہمیں جنرل بختیار نے اپنے ہاں پشاور آنے کی دعوت دی تھی۔ ان دنوں وہ شمال مغربی صوبے کے فوجی کمانڈر تھے۔ وہ فیلڈ مارشل ایوب کے قریبی دوست تھے، جو بعد میں پاکستان کی کرسی صدارت پر متمکن ہوئے۔ جنرل بختیار نے ہمارے لیے اس دلفریب علاقے کی سیر وسیاحت کے تمام انتظامات کر رکھے تھے۔ لنڈی کوتل جاتے ہوئے راستے میں پٹھان سرداروں نے ہمارا پُر تپاک استقبال کیا اور گرم گرم کبابوں اور لذیذ کھانوں سے ہماری خاطر تواضع کی۔ [111]

واپس آتے ہوئے بدھ مت کے کھنڈرات اور دور افتادہ علاقوں میں گوتم بدھ کے آدھے گرے ہوئے

Marfat.com

مجسمے بھی دیکھے۔ پاکستان عجیب تضادات کا مجموعہ ہے۔ یہاں اٹک جیسے قلعے، عجائب گھروں میں محفوظ مرحوم شہزادیوں کے قیمتی جواہرات، دنیا کی خوبصورت مساجد اور انہی میں میری پسندیدہ لاہور کی بادشاہی مسجد بھی ہے، جو میرے خیال میں مسجد قرطبہ کے بعد دنیا کی حسین ترین مسجد قرار دی جاسکتی ہے۔

(2)

ہمارے پاکستان آنے کا مقصد بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد کرانا تھا اور یہاں ہمیں ایک ہی مسئلہ درپیش تھا اور وہ تھا یونیورسٹی کا وائس چانسلر۔ ابتدا میں اسد کو یہی کہا گیا تھا کہ اس کانفرنس میں وہ جن اسکالروں اور علمائے دین اور مذہبی شخصیات کو مدعو کرنا چاہیں، انہیں دعوت نامہ بھجوا سکتے ہیں۔ اس پیشگی یقین دہانی کے باوجود وائس چانسلر اس سلسلے میں بے جا مداخلت کرتے، مدعوئین کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتے اور ان کے بجائے ناموزوں اشخاص کو بلانے پر اصرار کرتے۔ اس کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ اسلامی ممالک کے ''سرکاری'' وفود کو نہیں بلایا جائے گا، کیونکہ مصر اور مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک میں جمال عبدالناصر کے اثر ورسوخ کی وجہ سے اس پابندی کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری تھا، لیکن اسد کا مؤقف یہ تھا کہ یہ عالمانہ نوعیت کا بین الاقوامی اجتماع ہے، اس لیے ناصر کے حامی اور مخالف دونوں گروہوں کے علماء کو مدعو کرنا چاہیے۔ چونکہ وائس چانسلر تنگ نظر شخص تھا، اس لیے اس نے اسد کی اس معقول تجویز پر تنازعہ کھڑا کر دیا اور اسے مؤثر بنانے کے لیے مولانا مودودی جیسے معتبر علماء کو کمیٹی کا رکن بنا دیا۔ مولانا موصوف اس وقت تک پاکستان کے سیاسی اور مذہبی حلقوں میں اپنے پاؤں جما چکے تھے۔ اسد کو جب وزارت خارجہ سے فارغ کیا گیا، تو مولانا مودودی نے اسد کی حمایت کی تھی۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے رابطے میں نہ رہے اور نہ کبھی دوست بن سکے۔ ان کی رائے میں میرے شوہر ضرورت سے زیادہ آزاد خیالی کے داعی ہیں۔ میرے شوہر ایک بلند پایہ عالم دین کی حیثیت سے مودودی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے، لیکن اسلام پر مبنی ان کے سیاسی اور سماجی افکار میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا تھا۔[112]

میری مولانا موصوف سے صرف ایک بار لاہور کے ہوائی اڈہ پر ملاقات ہوئی اور میں اس کو کافی سمجھتی ہوں۔ اسد نے میرا ان سے تعارف کرایا تھا۔ دمشق میں مردوں سے مصافحہ کرتے ہوئے مجھے تلخ تجربات ہوئے تھے، اس لیے اب میں ہاتھ ملانے سے اجتناب کرتی تھی۔ میں نے مولانا موصوف کو السلام علیکم کہا، لیکن انہوں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ شاید انہوں نے میرے مغربی لباس کو پسند نہیں کیا تھا، حالانکہ اس میں ایسی کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی یا اس کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ میں نے سر نہیں ڈھانپ رکھا تھا، چہرے پر نقاب بھی نہیں تھا اور ہاتھ ملانے سے گریزاں تھی۔ مولانا کے سلام کا جواب نہ دینے سے مجھے حیرت ہوئی، کیونکہ میری زندگی میں ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ شام میں اکثر میری ملاقات وہاں کے کٹر اور راسخ العقیدہ مسلمان عالموں سے ہوتی تھی اور وہ اسلامی روایت کے مطابق سلام کا جواب دیتے تھے۔ مودودی صاحب کے اس رویے کو میں نے اپنی بے عزتی سمجھا اور میں ایسا سمجھنے میں حق

Marfat.com

بجانب تھی۔

میرے شوہر کے خلاف سازشوں اور پس پردہ مخالفتوں کا سلسلہ طول پکڑ گیا اور بدقسمتی سے یہ "حرکات" مخصوص پاکستانی ذہنیت کی عکاسی کرتی تھیں۔ نتیجتاً اسد نے کانفرنس سے متعلق تمام ریکارڈ وائس چانسلر کے سپرد کرنے اور خود کو اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم تمام انتظامات مکمل کر چکے تھے۔ حتیٰ کہ مدعوئین کو ہوائی ٹکٹ بھی ارسال کر دیئے گئے تھے۔ اسد کو یقین تھا کہ اب انہیں اس کانفرنس میں بلایا تک نہیں جائے گا، لیکن انہیں اس کی بالکل پرواہ نہیں تھی۔ حالانکہ پاکستان کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک میں بحیثیت مفکر اسلام ان کی جو شہرت تھی، اس کے پیش نظر ان کی عدم شمولیت کا فیصلہ افسوس ناک تھا۔ یہ ہماری زندگی کا پہلا واقعہ نہیں تھا۔ قبل ازیں نیویارک میں بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا گیا تھا۔[113]

کانفرنس میں شریک ہونے والے بیشتر مندوبین اسد کو ملنے آتے رہے، بالخصوص ہمیں پاکستان میں سابق مصری سفیر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ دراز قد، خوش وضع اور مہذب شخصیت کے مالک اس عالم کے سر پر بڑی سی ترکی انداز کی "طربوش" تھی، جو برسوں پہلے مصر کے اونچے طبقے کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ ان کی دوستانہ گرمجوشی اور ان کے قلب و ذہن کی وسعت نے اسد کی طرح مجھے بھی ان کا گرویدہ بنا دیا۔ کئی سال بعد سعودی عرب میں ان کی وفات کی خبر ملی تو ہمیں ایسے محسوس ہوا جیسے ہمارا کوئی عزیز بچھڑ گیا ہو۔ مصر پر جمال عبدالناصر کے برسر اقتدار آنے کے بعد بیشتر اعتدال پسند علماء اور مفکرین ہجرت کر کے دوسرے ممالک میں چلے گئے۔ عزام بھی سعودی عرب چلے گئے، جہاں انہیں شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی کا پہلا ریکٹر مقرر کیا گیا۔ اس نئی یونیورسٹی کے لیے اس سے بہتر اور کوئی انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی بیٹی کی شادی شاہ فیصل کے ممتاز فرزند محمد سے ہوئی، جس نے بعد میں اسلامی نظام معیشت کی روشنی میں بلاسود بنکاری کو متعارف کرایا اور ایسے بنکوں کی متعدد شاخیں قائم کر دیں۔ مغرب کے مروجہ اور پیچیدہ بنکاری کے نظام کی موجودگی میں شہزادہ محمد کی اولیں کوشش کامیاب نہ ہو سکی، پھر بھی ان کا یہ دلیرانہ اقدام لائق تحسین تھا۔ آئندہ سالوں میں سعودی عرب اور باہر کے ممالک میں بھی شہزادہ اور ان کے خاندان کے تمام افراد سے ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

(3)

ذاتی پریشانیوں کے علاوہ پاکستان کے عمومی حالات احسن طریقے سے نہیں چل رہے تھے، البتہ ذاتی طور پر مجھے یہ ملک اپنے گھر جیسا لگتا تھا۔ مرکزی حکومت کی مقبولیت عوام الناس تک نہیں تھی۔ یہ حکومت اسلامی تھی، نہ تسلی بخش طور پر کام کرنے کے اہل تھی۔ رشوت کا بازار گرم تھا۔ لوگ مطمئن نہیں تھے۔ حالات تبدیلی کا تقاضا کر رہے تھے، لیکن اس وقت کوئی یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ یہ تبدیلی ملک کے منظم ادارے یعنی فوج کی جانب سے رونما ہوگی۔

اسد طبعاً ہمیشہ تبدیلی حالات کے لیے خود کو تیار رکھتے تھے، چنانچہ انہوں نے پاکستان چھوڑنے اور اکثر

Marfat.com

دوستوں سے صلاح مشورے کے بعد سوئٹزرلینڈ منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا، تاکہ وہاں اطمینان سے لکھنے پڑھنے کا کام کیا جاسکے۔ میں پہلے ہی اسد کو کہہ چکی تھی کہ انہیں قرآن کے انگریزی ترجمہ اور تفسیر پر کام شروع کر دینا چاہیے۔ مدت دراز سے بیشتر احباب، علمائے دین، قارئین انہیں اس الہامی کتاب کے نئے انگریزی ترجمہ کے بارے میں استفسار کرتے رہتے تھے، لیکن ابھی تک وہ اس پُرزور مطالبے پر سنجیدگی سے غور نہیں کر سکے تھے۔ محمد علی کا انگریزی ترجمہ مع مختصر حواشی مروجہ انگریزی تراجم میں سب سے اچھا سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کے بھی بعض حصوں کو پڑھتے ہوئے تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ اے۔ جے۔ آربری کا ترجمہ عمدہ ہے، لیکن اس میں بھی کچھ کمیاں پائی جاتی ہیں اور مترجم کا انداز نظر بھی غیر مسلموں جیسا ہے۔ عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ مرصع و مسجع عبارت آرائی کا مظہر ہے اور اس کے حواشی بھی اصل موضوع سے ہٹ جاتے ہیں۔ مختصراً یہ بھی تراجمے کئی اعتبار سے ناکافی ہیں۔ فی الحقیقت قرآن کا ترجمہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ ویسے بھی مسلمانوں کا یہ کہنا درست ہے کہ قرآن کے مفاہیم کو کسی بھی زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں۔ ان مترجمین کے برعکس اسد برسوں سعودی عرب میں بدوؤں کے ساتھ رہے اور یہ لوگ جو زبان بولتے ہیں، وہ قرآنی عربی سے بہت قریب ہے۔ مزید یہ کہ اسد نے کئی سال ''صحیح بخاری'' جیسے معروف مجموعہ احادیث کے ترجمہ و تشریح میں صرف کیے تھے، اس لیے اسد بلاشبہ ترجمہ قرآن کے لیے موزوں ترین شخص تھے اور پھر میں بھی انہیں اس کام کو شروع کرنے کے لیے اصرار کرتی رہتی تھی۔ بالآخر یہی طے ہوا کہ سوئٹزرلینڈ کے پُرامن ماحول میں اس ترجمہ کا آغاز کر دیا جائے گا۔

پاکستان چھوڑنے سے قبل میں نے سوچا کہ ہمسایہ ملک بھارت کی چند روزہ سیر و سیاحت کرتے جائیں۔ اس وقت دونوں ممالک کے تعلقات کشیدہ تھے اور ہمیں غیر ملکی کرنسی ساتھ لے جانے کی اجازت بھی نہیں تھی، لیکن یہ ہمارے لیے پریشانی کی بات نہیں تھی، کیونکہ بھارت میں سعودی عرب کے سفیر شیخ یوسف اسد کے پرانے دوست تھے اور ان کی شادی شاہی خاندان میں ہوئی تھی، جس کے اکثر اصحاب ہمارے دوستوں میں شامل تھے۔ نئی دہلی پہنچتے ہی ہمیں ایک شاندار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ میں فوراً ساڑھیوں کے بلاؤز خریدنے چل پڑی۔ میرے پاس کئی قیمتی اور رنگ برنگ کی ساڑھیاں موجود تھیں اور نیویارک میں میں اکثر انہیں پہنا کرتی تھی۔ لاہور سے نئی دہلی آنا یوں لگا جیسے ہم پیرس آ گئے ہیں۔ سفیر ہمیں اکثر بلاتے رہتے اور سفارت خانہ میں ہمارے اعزاز میں کئی پُرتکلف دعوتوں کا بھی اہتمام کیا گیا۔ یہاں ہم پہلی بار سعودی عرب کے وزیر تجارت محمد علی رضا سے ملے۔ وہ سعودیہ کے ایک قدیم تاجر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا آبائی تعلق ایران سے تھا۔ لیکن اب اپنے رہن سہن اور دیگر اطوار سے مکمل عرب ہی دکھائی دیتے تھے۔ ایسے متعدد تجارت پیشہ خاندان بیرونی ممالک سے آئے تھے مثلاً قصیبی، جو اصلاً بحرین کے رہنے والے تھے۔

شیخ یوسف کے سعودیہ کے حکمران خاندان سے گہرے مراسم تھے اور یہ ان کے باپ کے زمانے سے چلے آ رہے تھے۔ وہ ہندوستان کے عرب تاجروں میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور انہوں نے نامساعد حالات میں عبدالعزیز ابن سعود کی مالی اعانت کی تھی۔ حکمران خاندان نے اس ''قرض'' کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ اس کے صلہ میں شیخ یوسف کو

Marfat.com

سعودیہ کا مستقل سفیر مقرر کیا گیا تھا اور وہ اپنے ملک کی بطریق احسن نمائندگی کر رہے تھے۔ ان کی بیوی بصرہ سے تھی۔ ان کے ہاں ابھی کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا، صاحب اولاد ہونے کی فطری خواہش رکھتے تھے، لیکن شیخ یوسف نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ ہماری طرح انہوں نے بھی نعم البدل کے طور پر اعلیٰ نسل کے کتے پال رکھے تھے۔

نئی دہلی کے قیام کے دوران میں ہم تاج محل دیکھنے آگرہ گئے۔ تقسیم ہند سے قبل اسد نے یہاں کئی سال گزارے، لیکن انہوں نے تاج محل نہیں دیکھا تھا۔ وہ کبھی بھی سیر و سیاحت کے شائق نہیں رہے اور وہ صرف میری فرمائش پر اس شہرۂ آفاق عمارت کو دیکھنے چل پڑے۔ وہ اس عجوبۂ روزگار کی حسن کاریوں میں کھو گئے اور گھنٹوں مغلوں کے ذوق تعمیر کی تعریف کرتے رہے۔ ایسے ہی دیرپا اثرات غرناطہ میں الحمرا کی پُرشکوہ عمارت کو دیکھ کر مرتب ہوئے۔ اکتوبر 1964ء کو اپنے دو غزالوں جیسے تازی کتوں کے ساتھ وہاں گئے تھے، لیکن آج ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔

نئی دہلی کے اس مختصر قیام کے بعد ہم سیدھے کراچی آئے، تاکہ دوستوں سے الوداعی ملاقات ہو سکے۔ روانگی سے چند روز قبل ہمارے پرانے دوست، جواں ہمت اور مداح ممتاز حسن (وزیر مالیات) ملنے آئے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ہم پاکستان چھوڑ کر نہ جائیں، اسی لیے انہوں نے اسد کو زیر تجویز ادارۂ تحقیقات اسلامی[114] کے شریک ناظم کے عہدے کی پیش کش کی، لیکن اب بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ ویسے بھی میرے شوہر بار بار مستعفی ہونے سے نالاں تھے اور آئے دنوں کی سبکدوشیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ مزید یہ کہ کسی ادارے کی سربراہی میں شرکت کا انہیں تلخ تجربہ ہو چکا تھا اور انہیں پختہ یقین تھا کہ دونوں سربراہوں کی ذہنی یگانگت کے علی الرغم ایسی رفاقت دیرپا ثابت نہیں ہو سکتی۔ انہی دنوں کراچی کے موقر انگریزی روزنامہ "ڈان" میں ایک اداریہ شائع ہوا، جس کا عنوان تھا "پاکستان نے اسد کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا۔" بدلحاظی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

(4)

مطمئن قلب و ذہن کے ساتھ ہم کراچی سے بذریعہ بحری جہاز روانہ ہوئے۔ ہمیں سوئٹزرلینڈ پہنچنا تھا، جو ہمارے لیے بالکل ایک اجنبی ملک تھا۔ راستے میں خلیج فارس کی کسی بندرگاہ پر رکنا تھا۔ کئی روز خاموش سمندر میں سفر کرنے کے بعد ہم مسقط پہنچے۔ یہاں ہمیں ایک سفارتی نمائندے نے دعوت پر بلایا، جو کراچی کے برطانوی سفارت خانے میں کچھ وقت گزار چکے تھے۔ وہاں ہم برطانوی ریذیڈنٹ کے مہمان تھے اور انہوں نے ہمیں اس خوبصورت جگہ کے کئی ایسے "مناظر" دکھائے جہاں عام آدمی نہیں جاسکتا تھا۔ درحقیقت ان دنوں مسقط جانے کے لیے اجازت لینا آسان نہیں تھا۔ یہاں عربوں کی حقیقی زندگی کا پہلی بار مشاہدہ نہیں کیا تھا، کیونکہ قبل ازیں شام میں ہمیں بدوؤں کے خیموں میں جانے، ضیافتوں سے لطف اندوز ہونے اور ان کے پالتو عقابوں کو دیکھنے کے کئی مواقع میسر آئے، لیکن مسقط کے قدرے "خفیہ" پہلوؤں کا مشاہدہ خاصا دلچسپ پایا۔ یہ علاقہ ابھی برطانیہ کے زیرنگیں تھا۔ یہاں کے سخت مزاج

Marfat.com

حاکم سے لوگ خوش نہیں تھے، لیکن جب اس کا بیٹا حکمران ہوا، تو لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ برطانوی ریذیڈنٹ کی رہائش گاہ کے فرنیچر میں نخلی موم استعمال کیا گیا تھا اور اس کی خوشبو کو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ برطانیہ کے نو آبادیاتی نظام کی دلکش خوشبوؤں میں سے یہ بھی ایک خوشبو تھی۔

یہاں سے ہمارا بحری جہاز اصل خلیج فارس میں داخل ہوا اور کویت، بحرین، شارجہ اور قطر کی بندرگاہوں پر رکتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ ہر جگہ ہم وہاں کے حکمران یا کسی بڑے تاجر کے مہمان رہے۔ ہمیں بحرین کے حکمران امیر سلطان نے بڑا متاثر کیا۔ وہ عالی مرتبہ اور مہذب شخص تھا۔ وہ عرب رسوم، تازی کتوں اور اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کا شوقین تھا۔ اس کا بیٹا عیسیٰ بھی انہی اوصاف کا مالک تھا اور وہی آج کل بحرین کا حاکم ہے۔

کویت میں ہم الشایہ خاندان کے مہمان رہے۔ یہ تجارت پیشہ قبیلہ ہے اور تیل نکلنے سے پہلے بیشتر کاروبار اسی قبیلے کے افراد کے ہاتھوں میں تھا۔ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ ان سے ہماری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب ہم لبنان کے پہاڑی علاقے میں اپنے ''سمر ہاؤس'' میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ان کا گھر بھی ہمارے قریب ہی واقع تھا۔ ہم ان کے تہ دل سے ممنون ہیں کہ انہوں نے میرے شوہر کی مالی پریشانیوں کو دور کرنے میں بھرپور مدد کی، تاکہ وہ اطمینان اور دلجمعی سے سوئٹزرلینڈ میں قرآن کے ترجمہ و تشریح کو مکمل کر سکیں۔ جب لبنان میں اسد بیمار ہوئے، تب سے سعودی عرب سے انہیں کچھ رقم بطور پنشن ملنا شروع ہوئی۔ اس خاندان والوں نے اس پنشن میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا۔ سعودی عرب کی مالی اعانت شیخ عبداللہ بالخیر کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ بعد میں سعودی عرب کے وزیر اقتصادیات شیخ محمد سرور الصبان ذاتی طور پر رقم بھجواتے رہے۔ شاہ فیصل کے زمانے میں اس پنشن کو باقاعدہ طور پر سرکاری حیثیت دے دی گئی، جو ان کی وفات کے بعد بھی جاری رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ضروریات زندگی کے باعث روزمرہ اخراجات بھی بڑھتے گئے، چنانچہ شاہ فہد نے اس پنشن میں معقول اضافہ کر دیا۔ اپنے پیشروؤں کی طرح شاہ فہد بھی کشادہ دل انسان ہیں۔

ترجمہ قرآن کے حوالے سے الشایہ خاندان نے اسد کی جتنی مالی امداد کی، وہ خاموشی سے کی اور کسی کے کان میں اس کی بھنک نہیں پڑنے دی۔ ہم ان کے اس مخلصانہ تعاون کے ممنون ہیں اور اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ شاید اس کے بغیر یہ منصوبہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکتا۔

شارجہ میں ہم شیخ سقر بن سلطان القاسمی کے مہمان رہے۔ شام اور لبنان کے قیام کے دوران میں ان سے دوستی ہوئی۔ وہ عمدہ شاعر تھے، لیکن بدقسمتی سے وہ سیاسی امور میں ناکام رہے۔ انہوں نے کھل کر جمال عبدالناصر کی حمایت کی، چنانچہ برطانیہ نے انہیں معزول کر دیا، کیونکہ ابھی وہاں انگریزوں ہی کا سکہ چلتا تھا۔ بعد میں انہوں نے جبراً اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی اور بدقسمتی سے، جو ان کے قریبی عزیز تھے، ہلاک ہو گئے۔ اسی جرم میں وہ قید کر لئے گئے۔ متحدہ عرب امارات میں ان کی ذات محاسن و معائب کا مجموعہ ہے، لیکن ہمارے ساتھ اس کا برتاؤ ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ سوئٹزرلینڈ میں ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی اور آخری بار وہ ہمیں تنجیہ میں ملے اور بالآخر انہیں رہا کر دیا

Marfat.com

گیا۔ شیخ سقر نے تازی کتے اور اعلیٰ نسل کے عربی گھوڑے پالنے کی بدوی روایت کو قائم رکھا۔ 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں انہوں نے متعدد بار یورپ کے دورے کیے اور وہ خود کو ان دوروں کے منفی اثرات سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ ہمارے لیے یہ صورت حال افسوس ناک تھی۔

ہمارا اگلا پڑاؤ قطر تھا اور آرام و آسائش کی یہ جگہ ایک بوڑھے شیخ کے زیر نگیں تھی، لیکن اصل اقتدار درویش خاندان کے پاس تھا۔ اگرچہ ہمیں شیخ اور اس کے خاندان والوں نے اپنے محل میں خوش آمدید کہا، لیکن ہمارے اصل میزبان درویش ہی تھے۔ شیخ خاندان کا کرتا دھرتا ان کا سب سے بڑا بھائی عبداللہ تھا، جو زیادہ تر سعودی عرب میں اپنا وقت گزارتا اور اس دور کے دولتمند لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کا بھائی جسیم کاروباری معاملات میں کم دخل دیتا اور اس کا رجحان مذہب کی جانب زیادہ تھا۔ سب سے چھوٹا بھائی عبدالرحمٰن ابھی پچیس برس کا نوجوان اور وجیہ شخص تھا، جو اکثر یورپ جاتا رہتا اور وہاں کی ''پُرکشش زندگی'' سے لطف اندوز ہوتا۔ اس سے ہماری ملاقات جنیوا میں ہوئی، جو اس کے دوسرے گھر کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں اکثر اس درویش خاندان کی خواتین سے بھی ملتی رہتی تھی، جن میں سے بعض کی شخصیت بڑی متاثر کن تھی۔

ہمارے ان سبھی دوستوں اور واقف کاروں نے مختلف طریقوں سے ہماری عزت افزائی کی اور خلیج میں گزارے ہوئے دنوں کی خوشگوار یادیں ابھی تک تازہ ہیں۔

(5)

خلیج سے ہم بذریعہ ہوائی جہاز بغداد پہنچے۔ یہاں بھی ہم ایک متوسط طبقے کے عراقی خاندان کے مہمان رہے، جن سے ہم لبنان میں مل چکے تھے۔ بغداد تباہ و برباد ہوا پڑا تھا اور خستہ حالی کے مناظر جابجا بکھرے پڑے تھے۔ سوائے کاظمین مسجد کے کوئی اور قابل ذکر عمارت شکست و ریخت سے محفوظ نہیں رہی تھی۔ یہ اہل تشیع کی مسجد ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو اس پر سیاہ عبا پڑی تھی، جبکہ میرا چہرہ بے نقاب تھا۔ یہاں میں نے پہلی بار کسی بزرگ کے مزار کی جالیوں کو پکڑے ہوئے عورتوں کو آہ وزاری کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ مدینہ کی مسجد نبوی میں ایسی باتوں کی کیوں ممانعت ہے۔ عموماً عراقی عورتیں چہروں کو نقاب سے نہیں ڈھانپتیں اور میری معلومات کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں اکثر فاحشہ عورتیں اپنے چہروں کو نقاب سے چھپائے رکھتی ہیں۔ یوں ان کو پہچاننا مشکل ہوتا ہے اور وہ بآسانی اپنے ''خفیہ کاروبار'' کو جاری رکھتی ہیں۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ نہیں، بلکہ ہمارے دوستوں نے یہی بتایا ہے۔

ہمارے عراقی میزبانوں نے موسم گرما کی تعطیلات گزارنے کے لیے ایک گھر سامرہ میں بنا رکھا تھا اور وہ ہمیں اپنے ساتھ وہاں لے گئے۔ یہ گھر بڑے ذخیرۂ آب کے ایک کنارے پر واقع تھا جو حال ہی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ آپ بلند قامت پام کے درختوں کے چوڑے پتے پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے دیکھ سکتے تھے۔ صاف شفاف پانی کی تہہ میں سینکڑوں سامن مچھلیاں دوڑتی پھرتی اور مصنوعی آبشار کو پھلانگتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اس منظر کو دیکھ کر یقین نہیں

Marfat.com

ہوتا تھا کہ یہاں کبھی ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔ اس جگہ سے تھوڑے فاصلے پر بابلیوں اور اشوریوں کے کئی منزلہ مندر یا اُن جیسی ایک عمارت کھڑی تھی جس کو زمانہ قدیم میں سامرہ کے ماہرین فلکیات استعمال کرتے تھے۔ قبل از اسلام دور کی عمارتوں کے کھنڈرات جابجا نظر آتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے ایک دوست سے پوچھا تھا کہ کیا ابھی قدیم ظروف سازی کے بچے کھچے نمونے دستیاب ہوجاتے ہیں (شمالی پاکستان سے یونانی طرز کا پتھر کا بنا ہوا گوتم بدھ کے مجسمہ کا خوبصورت چھوٹا سا سر تحفتاً ملا تھا) اور اگلے روز انہوں نے بڑے فخریہ انداز سے مجھے ایک قدیم مٹی کا بنا ہوا ڈونگا پیش کیا، جو بالکل اپنی اصلی حالت میں تھا، لیکن اس کے اوپر سبزی مائل نیلگوں چمکدار سطح کو کھرچ دیا گیا تھا۔ شاید انہوں نے خوب تر بنانے کے لیے ایسا کیا ہو، لیکن یہ دیکھ کر میں نے چاہا کہ شدید احتجاج کروں، لیکن جلد میں نے اپنے جذبات پر قابو پالیا۔ اس کے بعد عربوں نے اپنے اور دوسری اقوام کے قدیم آثار اور فنون لطیفہ کے نادر نمونوں کو سنبھالا اور ان کے حقیقی نقش ونگار کو نمایاں کیا، کیونکہ وہ ان کی اہمیت اور قدر و قیمت جانتے تھے۔ یہ درست ہے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ ان کی کوششوں سے ایسے، بہت سے قیمتی تاریخی آثار نیست و نابود ہونے سے بچ گئے۔

یہاں ہمارا قیام ختم ہونے کو تھا۔ اسد نے اپنے جوتے مرمت کے لیے دے رکھے تھے، جو ابھی تیار نہیں ہوئے تھے۔ ہم نے نئے جوتے خریدے اور پرانے مرمت کرنے والے کے پاس ہی رہنے دیئے۔ تین ہفتے بعد انقلاب برپا ہوا اور اس کے ساتھ ہی بادشاہی نظام کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد کامیاب اور ناکام سازشوں اور نہ ختم ہونے والی جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور اس افراتفری اور بدنظمی کے زمانے میں ہمارا وہاں سے نکلنا ممکن نہ رہا۔ اسد بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے شروع میں عراق آئے تھے اور اس کے مختلف حصوں میں سفر کیے، لیکن انہیں کبھی بھی یہ ملک پسند نہیں آیا، البتہ ان کی دلی خواہش تھی کہ یہاں کے لوگ برطانوی راج سے آزادی حاصل کریں، لیکن اس عجیب وغریب ملک میں تشدد کی ایک زیرزمین تیز لہر چل رہی تھی۔ شاید قبل از اسلام دور کی سمیری، اشوری اور بابلی حکومتوں کا یہ اثر تھا، جو نسل در نسل اب تک چلا آرہا تھا۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

باب چہاردہم

سوئٹزرلینڈ
(1959ء-1964ء)

(1)

جنیوا کے ہوائی اڈہ پر جہاز اترنے لگا تو خوبصورت جھیل اور اس کے اردگرد چھوٹے چھوٹے سرسبز و شاداب کھیتوں نے عجب سماں باندھ رکھا تھا۔ یہ منظر دیکھتے ہی ہمیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ اسد نے ترجمہ قرآن کا جو منصوبہ شروع کر رکھا تھا، اس کو مکمل کرنے کے لیے یہ انتہائی موزوں جگہ ثابت ہو گی اور ہمارا یہ اندازہ اتنا غلط بھی نہیں تھا۔

جنیوا شہر کے قدرے پرانے حصے میں عارضی قیام کے لیے چند کمروں پر مشتمل ایک چھوٹے سے کرایے کے گھر میں ٹھہرے، لیکن کسی نواحی علاقے میں مستقل رہائش کے لیے کوئی گھر بھی تلاش کرتے رہے۔ اپنی آمد کے ایک ہفتہ بعد ایک روز ہم دریائے رہون (Rhone) کے پل پر سے گزر رہے تھے کہ اچانک طلال اور اس کی والدہ سے ملاقات ہو گئی۔ میں تو اس ملاقات کو اتفاقیہ ہی سمجھتی تھی، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ایسا نہیں تھا۔ طلال کو کسی طرح جنیوا میں ہماری موجودگی کا علم ہو گیا تھا اور وہ مصر تھا کہ اسد اس کی والدہ سے تعلق منقطع نہ کرے اور اسے اپنے ساتھ رکھے۔ لندن میں انہیں خاصی مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ طلال سے تفصیلی ملاقات میں اسد نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنی والدہ کو پاکستان واپس بھجوا دے، تا کہ وہ چودھری نیاز علی اور ان کے افراد خانہ کے ساتھ سکون و اطمینان سے رہ سکے۔ ویسے بھی دونوں ماں بیٹا برسوں چودھری صاحب کے ہاں مقیم رہے اور وہ انہیں اپنے خاندان کا حصہ ہی سمجھتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں اسد تقریباً چھ برس قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے اور طلال اور اس کی والدہ اتنا عرصہ چودھری صاحب ہی کے ہاں مقیم رہے[115]۔ اس کے خیال میں والدہ کے پاکستان جانے کے بعد وہ اپنے پسندیدہ موضوع Social Anthropology کو بآسانی جاری رکھ سکے گا۔ منیرہ کے لیے پاکستان جانا مشکل نہیں تھا، لیکن وہ وہاں کی دیہاتی زندگی سے مطمئن نہیں تھی، حالانکہ اسے وہاں ہر طرح کی سہولت میسر تھی اور پھر چودھری صاحب کے اہل خانہ اس کے اپنے اعزہ جیسے ہی تھے۔ بعد میں اس نے سوڈان میں طلال کے ساتھ رہنے کا

Marfat.com

فیصلہ کرلیا، جوان دنوں ڈاکٹریٹ کے لیے اپنے مقالہ خصوصی کو حتمی شکل دینے میں مصروف تھا۔ اس کے بعد وہ سعودی عرب اپنے خاندان والوں کے ہاں چلی گئی کیونکہ اب وہ لوگ خاصے دولتمند ہو چکے تھے۔ بالآخر وہیں اپنے بیٹے کی موجودگی میں اس کا انتقال ہو گیا۔[116]

جنیوا میں ہمارے پرانے اور مخلص دوست سعید رمضان بھی مل گئے، جو اپنے بال بچوں سمیت وہاں رہائش پذیر تھے۔ وہ ایک اسلامی مرکز قائم کرنے کی غرض سے یہاں آئے تھے۔ ایسے مرکز کے قیام کی تجویز سب سے پہلے میرے شوہر ہی نے پیش کی تھی اور اس کی تفصیلات بھی انہوں نے ہی طے کی تھیں۔ سعید رمضان کے مجوزہ مرکز کا خاکہ بھی اسد کے منصوبے سے ملتا جلتا تھا، اس لیے وہ اس میں عملی طور پر شریک نہیں ہوئے۔ اگر وہ اشتراک کا عندیہ دیتے تو سعید رمضان انہیں خوش آمدید کہتے۔ ویسے بھی ہم پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ترجمہ قرآن کو ہر کام پر ترجیح دی جائے گی اور اپنا سارا وقت اسی کی تکمیل کے لیے مختص کیا جائے گا۔

جن دنوں ہم قطر کے درویش خاندان کے ہاں بطور مہمان ٹھہرے ہوئے تھے تو انہوں نے ہمیں رولیکس کی ایک قیمتی گھڑی تحفۃً پیش کی۔ یہاں اس میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی، چنانچہ اس کی مرمت کے لیے ہم نے اس کمپنی کے مرکزی دفتر سے رابطہ قائم کیا۔ یوں ہماری ملاقات ایڈی پیٹر (Edi Peter) سے ہو گئی جو مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے ممالک کے لیے اس کمپنی کے نمائندے کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ وہ عربوں کا بڑا مداح تھا اور اس قدر مشترک کے باعث جلد ہی ہمارے مابین دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے۔ وہ پہلے سے "شاہراہ مکہ" کا مطالعہ کر چکا تھا اور اس حوالے سے محمد اسد کے نام سے واقف تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں ایڈی صاحب نے اپنے گھر دوپہر کے کھانے کی دعوت دی اور وہیں ان کی ننھی منی خوبصورت اور ہنس مکھ بیوی فریڈل (Friedl) سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہماری گہری دوستی کا یہ آغاز تھا، جو ہمارے سوئٹزرلینڈ چھوڑنے کے بعد عرصہ دراز تک قائم رہی۔

جنیوا کے قریب ہی کنٹون آف واوڈ (Canton of Vaud) کے چھوٹے چھ قصبوں میں کوئی مناسب سا گھر تلاش کرنے جاتے رہتے تھے۔ ایک روز شہر سے تیرہ کلومیٹر دور ایک ایسے ہی کوپیٹ (Coppet) نامی گاؤں میں گھومنے پھرنے چلے گئے اور وہاں کے ایک کریانہ فروش کے توسط سے مکانات وغیرہ کے ایک ایجنٹ سے ملاقات ہوئی، جس نے کومگسی (Commugcy) میں جھیل سے چند کلومیٹر اوپر ہمیں کرایے پر ایک گھر لے دیا۔ اس چھوٹے سے دیہاتی گھر میں پہلے شراب کشید کی جاتی تھی۔ ہمارے لیے یہ آئیڈیل گھر تھا۔ اس گھر سے ملحقہ تین پتھروں (Cobblestones) کا ایک صحن تھا اور یہ سترہویں صدی عیسوی کے اواخر کے ایک بہت بڑے فارم ہاؤس کا ایک حصہ تھا۔ جس کی مالک دو خواتین تھیں۔ ایک عمر رسیدہ اسی ملک کے ہیوگینوٹ (Huguenot) خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور دوسری اس کی درمیانی عمر کی غیر شادی شدہ بیٹی گجیٹے (Gigitte) تھی۔ وہ یہاں مرغیاں پالتی تھیں اور انہیں مقامی مارکیٹ میں فروخت کر دیتی تھیں۔ اتنے بڑے زرعی فارم کو سنبھالنا ان دو خواتین کے لیے مشکل تھا، اس لیے انہوں نے اس کا بیشتر حصہ بیچ دیا تھا۔ اس گاؤں میں منتقل ہونے کے بعد ہمیں تر و تازہ انڈے بکثرت ملتے رہے۔

Marfat.com

یہ سوئٹزرلینڈ کا ایک مخصوص پُرکشش گاؤں تھا۔ ان دنوں ہمارے علاوہ وہاں کوئی اور غیر ملکی موجود نہیں تھا۔ کھاتے پیتے تجارت پیشہ غیر ملکیوں کی اکثریت جنیوا میں رہائش پذیر تھی اور ان کی تعداد مقامی لوگوں سے زیادہ تھی۔

اس گاؤں میں ایک چھوٹی سی کریانہ کی دکان تھی، جہاں سے ہمیں تازہ دودھ، مکھن اور آئس کریم مل جایا کرتی تھی۔ میس (Mies) سے قریبی گاؤں کے نانبائی علی الصبح خستہ سفید رولز اور باگیٹ (ایک خاص قسم کی سفید لمبی ڈبل روٹی) مل جاتی تھی۔ ہماری روزمرہ ضروریات کی اشیاء پھل اور سبزیاں حتیٰ کہ ادویات بھی کو پیٹ میں ہمارا نیا کریانہ فروش دوست پہنچا دیا کرتا تھا۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے لوگ ملنے ملانے میں روکھے پن اور غیر شخصی رویے کا مظاہرہ کرتے ہیں، لیکن ہمیں ذاتی طور پر جو تجربہ ہوا، وہ ان کی دوستانہ گرمجوشی اور مثالی تعاون کا بیّن ثبوت ہے۔ چھ سال بعد جب ہم سوئٹزرلینڈ سے رخصت ہوئے تو زرعی فارم کی مالک دونوں خواتین نے کہا کہ "تمہیں سوئٹزرلینڈ چھوڑنے کا افسوس ہوگا" اور ان کا یہ کہنا بالکل بجا تھا۔

(2)

کونگسی کے پُرسکون ماحول میں اسد کی پوری توجہ ترجمہ قرآن پر مرکوز رہی۔ کبھی کبھار ہم اپنے بعض دوستوں سے ملنے جنیوا جایا کرتے تھے۔ انہی دنوں اسد نے گھر میں اچھی نسل کا پالتو کتا رکھنے کی خواہش ظاہر کی جو ہمہ وقت ہمارے ساتھ رہے۔ ان کا خیال تھا کہ قریبی دیہاتی علاقوں مین ایسا کوئی کتا مل جائے۔ جن دنوں اسد سعودی عرب میں تھے، تب سے وہ عربی نسل کے آہو چشم سگِ تازی کو حاصل کرنے میں کوشاں رہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے لندن کے کتے پالنے والے اصحاب سے رابطہ کیا اور بالآخر وہ اپنی تلاش میں کامیاب ہو گئے۔ اس کتیا کا نام ازدر (Azdar) تھا۔ اس کا رنگ سنہرا اور آنکھیں بادام سے مشابہ تھیں۔ اس کے ساتھ ہم مضافاتی علاقے میں چلے جاتے۔ وہ کھلے میدانوں اور قریبی نجی جنگلات میں آزادانہ گھومتی پھرتی رہتی اور اکثر وادی سے نرگس کے پھول اور ڈھکی چھپی جگہوں سے خودرو سٹرابیری ساتھ لے آتی۔ ایک بار ازدر گھنٹوں غائب رہی اور ہم اس کی واپسی سے مایوس ہو گئے، لیکن وہ ہانپتی ہوئی واپس آئی، کیونکہ ایک جنگلی ریچھ اس کے تعاقب میں رہا اور وہ بمشکل اس سے جان بچا کر پہنچی تھی۔ پھر ایک دفعہ ہم سنہری اور لمبی گندم کے کھیتوں میں سے گزر رہے تھے، کہ اچانک وہ ہوا میں اُچھلی اور ایک تیتر پکڑ کر ہمارے قدموں میں رکھ دیا۔ اگر اس لمحے کوئی دیکھ لیتا تو وہ ہمیں چور شکاری سمجھتا۔ اسد اس مردہ پرندے کو رومال میں لپیٹ کر گھر لے آئے اور اسے ازدر کے لیے پکایا، لیکن اس نے اسے چھوا تک نہیں۔

یوں ہماری زندگی ایک متوازن ڈگر پر رواں دواں رہی۔ اسد گھنٹوں بیٹھے ترجمہ کرتے رہتے۔ فارغ ہوتے تو ہم اپنی ازدر کے ساتھ لمبی سیر کو نکل جاتے اور ہفتے میں ایک بار دوستوں سے ملنے اور اشیائے ضرورت کی خریداری کے لیے جنیوا چلے جاتے۔ ترجمہ قرآن بھی آخری مراحل میں تھا اور ہم اپنی اس دیہی انداز کی زندگی سے خوش تھے۔

Marfat.com

آرام و آسائش کے اسی دور میں ہمیں ایک روز تار موصول ہوئی اور یہ کسی اجنبی شخص نے نہیں بھجوائی تھی، بلکہ اس کے ارسال کنندہ مرحوم شاہ عبدالعزیز کے ایک فرزند تھے اور ظاہر ہے اس شاہی خاندان کا کوئی شخص بھی اسد کے لیے "اجنبی" کیسے ہوسکتا تھا۔ یوں امیر نواف بن عبدالعزیز سے ہماری دیرپا دوستی کا آغاز ہوا۔ اس وقت ان کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ دراز قد، خلیق، وجیہ، حقیقی سعودی اطوار شہزادگی کا مظہر، سنجیدہ اور باوقار۔ ان دنوں سعودیہ کا شاہی خاندان بحران کا شکار تھا۔ اسد کے مشورے سے انہوں نے شاہ فیصل کی حمایت کا فیصلہ کرلیا۔ شاہ فیصل نے برسراقتدار آنے کے بعد انہیں اپنا مشیر مقرر کر دیا اور اس کے بعد وہ دیگر برادران فیصل کی طرح آخر تک اپنے عہدوفاداری پر قائم رہے۔

امیر نواف سال میں کم از کم دوبار جنیوا تشریف لاتے اور ہم اکثر وہاں کے کسی شاندار ریسٹورنٹ میں اکٹھے کھانا کھاتے۔ وہ عمدہ کھانوں کے شوقین تھے اور ایک بار ہم نے اکٹھے پہلی بار مینڈک کی ٹانگیں بھی کھائیں۔

اس گاؤں میں ہمارے کئی نئے دوست بھی بن گئے۔ ان میں ایک انگلستان کے ڈیوڈ والٹرز تھے، جو ہمیں یہاں کے چھوٹے سے ڈاکخانہ میں ملے۔ وہ سڑک کی دوسری جانب ہمارے گھر کے سامنے ایک پرانے مکان کے ملحقہ حصے میں رہتے تھے۔ وہ جامع الکمالات شخص تھے۔ وہ کہیں ملازمت وغیرہ نہیں کرتے تھے۔ پیشہ ور مترجم تھے اور انہیں روسی زبان پر کامل دستگاہ حاصل تھی۔ وہ کئی بار روس جاچکے تھے اور دلچسپ انداز میں اپنے تجربات سنایا کرتے تھے۔ ان کے عالمانہ ذوق وشوق کا دائرہ وسیع تھا۔ ان کی بیوی مارتے (Martte) کا تعلق سوئٹزرلینڈ کے جرمن بولنے والے علاقے سے تھا۔ وہ پیانو اور ہارپسیکارڈ بہت اچھا بجاتی تھی اور ہمیشہ محافل نغمہ وسرود میں جانے سے انکار کردیتی تھی، لیکن ہم اس کے چند ایسے احباب میں تھے، جنہیں وہ اپنے گھر کے ایک چھوٹے سے آرام دہ کمرے میں بٹھاتی اور ان سازوں پر مسحور کن دھنیں سناتی۔ اس کا مالک مکان جوڑا چارلس آنتوائنے وودوتس (Charles Antoine Vodoz) بھی ہمارے حلقہ احباب میں شامل ہوگئے۔ انہوں نے پرانا فارم ہاؤس خرید کر اس کی اپنے عمدہ ذوق کے مطابق تزئین وآرائش کی۔ لب سڑک کے پار ہمارے دو دوست گھرانے تھے۔

تقریباً ہر اتوار کی سہ پہر کو ترکی کے سابقہ سلطان عبدالحمید کے پوتے محمد اکرم، فرانسیسی بیوی رولانڈے (Rolande) جو پہلے فیشن ماڈل تھی، اور اپنے بیٹے علی کے ہمراہ تشریف لاتے اور ہم ان کی چائے اور چوکور کیک سے تواضع کرتے۔ جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہوچکا ہے کہ تقسیم ہند سے قبل اسد حیدرآباد دکن میں شہزادہ اکرم سے مل چکے تھے۔ ان کا رہن سہن اور رنگ ڈھنگ عام لوگوں جیسا ہی تھا، البتہ ان کا انداز نظر قطعی اور سنجیدہ تھا۔ وہ اپنے ترک مسلمان ہونے پر فخر کرتے تھے لیکن ان کا رویہ متکبرانہ نہیں تھا۔ ہم ابھی سوئٹزرلینڈ ہی میں تھے، کہ ان کی جواں عمر بیوی کا افسوسناک حالات میں انتقال ہوگیا۔

مجھے اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ شیخ عبداللہ بالخیر نے اسد کو سعودی عرب بلایا۔ وہ ان دنوں دمام میں رہتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی ساتھ آنے کی دعوت دی، لیکن میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں ازدر کو کسی گھٹیا مکان یا

Marfat.com

دوستوں کے ہاں چھوڑ کر چلی جاتی۔ وہ ہمارے ساتھ اتنی گھل مل چکی تھی کہ وہ شاید ہم دونوں کی جدائی برداشت نہ کر سکتی۔ اسد کئی ہفتے سعودی عرب میں شیخ عبداللہ اوران کی بیگم کے مہمان رہے۔ اسد جب بھی سعودی عرب جاتے، ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں اورانہیں ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اپنے ''اصلی'' گھریا ''مامن'' کو جارہے ہیں۔

امیر فیصل بھی اکثر سوئٹزرلینڈ آتے رہتے تھے۔ ایک روز برن میں سعودی سفیر فخری شیخ العرض نے فون پر شاہ کا پیغام پہنچایا کہ وہ اسد سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ امیر فیصل کا قیام لوزانے (Lousanne) میں ہے اور وہیں ملیں گے۔ مجھے اس شخص سے ملنے کا بیحد اشتیاق تھا، کیونکہ میرے شوہر اکثر بڑی محبت اور احترام سے ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جب ہم باؤر یواج (Bau Revage) پہنچے تو وہاں بہت سی عرب شخصیات شاہ سے ملنے آئی ہوئی تھیں۔ ان ملاقاتیوں میں مَیں اکیلی خاتون تھی، لیکن میں مدعوئین میں شامل تھی۔ کچھ دیر کے بعد اچانک قیمتی یورپین لباس پہنے ایک دراز قد اور دبلا پتلا شخص نمودار ہوا اور یہی امیر فیصل تھے۔ وہ کچھ عرصہ سے بیمار تھے، تھکاوٹ اور نقاہت ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس عظیم شخص کی یہ حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ان سے ملاقات کے دوران میں بھی میرے اندرونی جذبات کا یونہی اظہار ہوتا رہا۔ امیر فیصل اور اسد گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے۔ میرا تعارف بھی کرایا گیا اور پھر وہ ہم دونوں کو بڑے سے ہال کمرے میں لے گئے، جس کے چاروں طرف کرسیاں رکھی تھیں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے مجھے اپنی دائیں جانب کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور جب بیرہ کافی لے کر آیا تو انہوں نے اس کے ہاتھ سے چاندی کا برتن پکڑا اور میرے خالی کپ میں کافی انڈیلی۔ اس کے بعد دیگر حاضرین کو کافی پینے کی اجازت دی۔ ایک عظیم عرب شاہ کے نفیس برتاؤ اور خوش اخلاقی کا مجھے پہلی بار تجربہ ہوا تھا۔ دیکھنے والے کو پہلی نظر ہی میں یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ قدرت نے انہیں تاج شاہی پہنا کر ہی اس دنیا میں بھیجا ہے۔ جب وہ سعودی عرب کے تخت شاہی پر رونق افروز ہوئے تو مجھے پھر ان سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی اور جب ان کی ہلاکت کی خبر سنی تو ہم دونوں اکٹھے دیر تک روتے رہے۔

کوئکسی میں ایک بار طلال ہمارے گھر آیا۔ اس کے آنے کا مقصد اپنے والد کو یہ اطلاع دینا تھا کہ وہ تانیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک خوش شکل انگریز لڑکی تھی اور ایڈنبرا یونیورسٹی میں اس کی ہم جماعت تھی اور سوشل انتھروپولوجی ہی کی طالبہ تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ اب باپ اور بیٹے کے مابین اچھے تعلقات کا آغاز ہوگا، کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بڑی محبت کرتے تھے، لیکن افسوس ہماری یہ امید بر نہ آئی۔ میرے اور طلال کے تعلقات ہمیشہ تناؤ کا شکار رہے۔ یہاں بھی ایک روز انتہائی معمولی بات پر ہمارا جھگڑا ہو گیا۔ اس کے جانے کا ہمیں افسوس ہوا، کیونکہ اس کے آنے سے ہم نے اچھی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ بعد میں جب ہماری تانیا سے ملاقات ہوئی تو وہ طلال کی بیوی بن چکی تھی۔ وہ بڑی ذہین، محتاط اور مخصوص برطانوی حسن کی مالک خاتون تھی اور طلال کی مثالی رفیقہ حیات ثابت ہوئی۔

Marfat.com

(3)

یوں ہمارے خوشیوں بھرے چھ سال پلک جھپکتے گزر گئے۔ اس دوران میں اسد نے قرآن کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا اور اس کا ایک چوتھائی حصہ چھپ بھی چکا تھا۔[117]

ایک روز انہیں صدر پاکستان ایوب خاں کا ارسال کردہ خط موصول ہوا۔ وہ ان سے کبھی نہیں ملے تھے، البتہ انہوں نے اسد کی انگریزی کتاب ''اسلام میں حکومت اور سیاست کے اصول'' پڑھ رکھی تھی اور وہ اس کے بڑے مداح تھے۔ بعد میں خطوط کا جو تبادلہ ہوا، ان میں ایوب خاں نے اسد کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔ وہ انہیں سات مسلمان اسکالروں کی جماعت کا رکن بنانا چاہتے تھے، جو حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے اور علوم اسلامیہ کے بھی ماہر تھے۔ وہ صدر پاکستان کو روزمرہ مسائل کے حل کے ساتھ ساتھ ملک کے نئے آئین کے بارے میں بھی مشورے اور تجاویز پیش کرتے رہتے تھے۔ اسد نے صدر پاکستان کی یہ پیشکش قبول کرنے سے معذرت کر دی، کیونکہ وہ ان دنوں قرآن کے ترجمہ میں منہمک تھے اور وہ اسے مکمل کیے بغیر کسی اور کام کو شروع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

(4)

ترجمہ قرآن کی تکمیل اور اس کی جزوی اشاعت کے بعد اسد کچھ مضطرب رہنے لگے۔ انہیں مسلمان ملکوں کی گرم آب و ہوا کی یاد ستانے لگی اور ساتھ ہی الگ سے اپنا گھر بنانے کی خواہش بڑھ گئی۔ سوئٹزرلینڈ میں ہم ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے اور یہاں ہمیں ہر طرح کی سہولت میسر تھی، پھر بھی انہوں نے کہیں اور جانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

اس اثنا میں ہم نے ازدر کا ایک ساتھی تلاش کر لیا، یعنی ایک اور سگ تازی اور یہ بھی آکسفورڈ کی کتے پالنے والی خاتون سے منگوایا گیا۔ ہم نے اس کا نام عفریت رکھا اور وہ بہت جلد ہماری زندگی کا جزو لازم بن گیا۔ وہ اپنی ساتھی ازدر کی پرستش کرتا تھا اور اس سے دبا دبا رہتا۔ اس نے کبھی ازدر کو اپنی ''بیوی'' سمجھ کر اس پر اپنا رعب نہیں جمایا۔ ہم بھی اپنی محبتیں ان دونوں پر نچھاور کرتے تھے اور ہم نے انہیں سکون بخش زندگی گزارنے کے لیے ہر سہولت مہیا کر رکھی تھی۔

انہی دنوں اسد کے ذہن میں قبرص میں سکونت اختیار کرنے کا خیال جاگزیں ہو گیا۔ یہ علاقہ مشرق وسطیٰ کا حصہ تو نہیں ہے، البتہ اس کے قریب واقع ہے۔ متعدد تعارفی خط لے کر اسد قبرص گئے اور وہاں ایک برائے فروخت گھر تلاش کر لیا، جو کیرینا (Kyrenia) سے ذرا اوپر پہاڑوں میں تھا۔ یہ گھر سپنے (Spinney) خاندان کی ملکیت تھا۔ بیروت اور مشرق وسطیٰ کے کئی اور بڑے شہروں میں انہوں نے کئی تجارتی مراکز قائم رکھے تھے۔ اسد کو یہ گھر بہت پسند آیا اور انہوں نے اس کو خریدنے کے لیے بات چیت شروع کر دی۔ ہمارے دوست ایڈی پیٹر نے وہاں کی عدالت عالیہ کے جج سے اسد کا تعارف کرا دیا تھا۔ علاوہ ازیں اسد کی جن یونانی قبرصیوں سے ملاقات ہوئی، وہ بھی خاصے

Marfat.com

مددگار ثابت ہوئے۔ وہ مسلمانوں کے نہیں بلکہ ترکوں کے مخالف تھے، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اسد ان کے پاس رہیں اور انہوں نے مقدور بھر اسد کے لیے موزوں گھر تلاش کرنے میں تعاون کیا۔ گھر کی خریداری کا مرحلہ طے ہونے کو تھا کہ اسد کو نکوسیا کے محکمہ حیوانات کے سربراہ سے رابطہ کرنا پڑا، کیونکہ اپنے دونوں پالتو کتوں کو قبرص لانے کے لیے ہمیں سرکاری قواعد وضوابط کو ملحوظ خاطر رکھنا تھا۔ یہیں سے اصل مسئلہ شروع ہوا۔ قبرص روانہ ہونے سے قبل اسد نے لندن میں قبرص کے ہائی کمیشن سے رابطہ قائم کیا اور جواباً انہیں مطلع کیا گیا کہ چونکہ دونوں کتے انگلستان میں پیدا ہوئے اور ابتدائی عمر ہی میں انہیں باؤلے پن کے ٹیکے لگا دیئے گئے تھے، اس لیے انہیں قبرص لے جانے میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔ سرکاری محکمہ حیوانات کا متعلقہ افسر سخت مزاج ترک تھا، چنانچہ اس نے ترش روئی سے یہ کہہ دیا کہ ''انگریزوں کے جانے کے بعد جب میں نے یہ عہدہ سنبھالا، اس وقت قبرص صاف ستھرا ملک تھا اور یہ آئندہ بھی ایسے ہی رہے گا۔'' اس نے کتوں کو قبرص لانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور اس نے واضح کر دیا کہ اس کے باوجود اگر انہیں لایا گیا تو وہ انہیں کم از کم چھ ماہ کے لیے جبری حراست میں رکھیں گے۔ یہ سنتے ہی اسد نے شہر میں بہنے والی بدروؤں کو ملاحظہ کرنے کی درخواست کی۔ انہیں فوراً احساس ہوا کہ کسی کتے خاص طور پر دو تیز رفتار کتوں کے لیے، جنہیں دوڑنے کے لیے کھلی جگہ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ممکن نہیں ہوگا کہ وہ چھ مہینے ایک تنگ وتاریک کوٹھڑی میں گزاریں۔ ایسی پابندی ان پر ظلم ہو گا۔ انہوں نے ایک اور تجویز پیش کی اور وہ یہ کہ وہ جہاں ان کتوں کو رکھیں، وہاں چاروں طرف اونچی دیوار بنوا دیں اور ان میں بڑے دروازے بھی لگوا دیں، جن کی چابی متعلقہ سرکاری افسران اپنے پاس رکھ سکتے ہیں، تا کہ وہ دیکھ سکیں کہ ان کتوں کو کہیں باہر تو نہیں لے جایا گیا، لیکن وہ اکھڑ مزاج ترک ٹس سے مس نہ ہوا۔ بعض اعلیٰ عہدوں پر فائز یونانی قبرصیوں نے بھی اسے قائل کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ مختصراً یہ کہ ہمارا قبرص منتقل ہونے کا ارادہ بدل گیا اور اسد نے بھی بادل نخواستہ وہاں گھر خریدنے کی کوششیں ترک کر دیں۔ تین ہفتوں بعد کیرینیا میں یونانیوں اور ترک قبرصیوں کے مابین لڑائی شروع ہوگئی اور ہم جس گھر کو خریدنا چاہتے تھے وہ فسادات میں گھرے اس علاقے کے بالکل وسط میں تھا اور بعد میں یہاں ترکوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس صورت حال میں ہم اس بدمزاج ترک ماہر حیوانیات کے ممنون ہیں کہ اس کے سخت رویے کے سبب ہم اس مار دھاڑ سے محفوظ رہے۔ اگر ہم وہاں قیام پذیر ہوتے تو اب اپنے دونوں کتوں سمیت بیروت کے کسی مہاجر کیمپ میں پڑے ہوتے، جہاں تھوڑے عرصہ بعد خانہ جنگی شروع ہونے والی تھی۔ یوں ہم اپنے کتوں کے باعث ان تباہ کن حوادث سے ''محفوظ'' رہے۔

قبرص سے واپسی کے بعد اسد خاصے مایوس ہوئے اور وہ کسی متبادل جگہ کے متعلق سوچنے لگے۔ اتفاقاً ایک روز وہ انگریزی رسالہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی نظر تنجیہ (Tangier) پر تحریر کردہ ایک مضمون پر پڑی۔ اس ملک کی بین الاقوامی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے یہاں مقیم غیر ملکیوں کے فون نمبر الفبائی ترتیب سے درج کئے گئے تھے۔ ان میں ایک نام کریگ کوین (Creagh-Coen) کا تھا۔ اسد پاکستان کے دفتر خارجہ میں اپنی ملازمت کے دوران میں اس شخص سے مل چکا تھا۔ ہمیں یوں لگا، جیسے اس کا فون نمبر نہیں ملا، بلکہ ہمارے نام فال نکل آئی ہے۔ چنانچہ اسد نے

Marfat.com

تنجیہ جانے کا فیصلہ کرلیا، تاکہ وہاں اپنے لیے کوئی گھر تلاش کیا جاسکے اور یوں ایک بار پھر کسی مسلمان ملک میں کچھ وقت گزارنے کا موقع مل سکے۔

اسد بڑے جذباتی انداز سے وہاں مستقل سکونت کے بارے میں سوچنے لگے۔ سر ٹیرنس کریگ کوین (Sir Terence Creagh-Coen) نے انہیں اپنے کئی برطانوی دوستوں سے متعارف کرایا اور ایسے ایجنٹوں کے نام پتے بتائے جو انہیں مکان دلوانے میں مدد دے سکتے تھے۔ بلاشبہ وہ بڑے مددگار ثابت ہوئے۔ بالآخر تنجیہ سے ذرا ہٹ کر پہاڑی پر ایک خوبصورت گھر تلاش کرلیا گیا، جس کی قیمت بھی نہایت مناسب تھی۔ یہ سات ہزار مربع میٹر کا ایک وسیع بے آباد اور ویران باغ تھا، جس میں پام اور پھل دار درخت ایستادہ تھے، اردگرد پتھریلی دیوار تھی اور یہاں سے تنجیہ اور سمندر نظر آتے تھے۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا اور خستہ حالی کا شکار تھا، لیکن مرمت وغیرہ کے بعد اس کو بہتر بنایا جاسکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اسد نے مجھے اس مکان کا ایک خاکہ بھی بھجوایا تھا اور اس میں ان جگہوں کی نشاندہی بھی کی گئی تھی، جن کو تبدیل کرانا ضروری تھا۔ چنانچہ جب مرمت اور تعمیر نو کا کام مکمل ہوگیا، تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اب مکان بالکل اسد کے جلدی میں بنائے گئے سابقہ خاکے کے مطابق تھا۔ یہ پہلا گھر تھا، جو ہمارا اپنا تھا اور یہاں ہم نے اپنی زندگی کے انیس سال گزارے۔

(5)

سوئٹزرلینڈ جیسی ارض جنت نظیر کو مستقل چھوڑنا آسان نہیں تھا۔ طرح طرح کے خدشات نے پریشان کر رکھا تھا۔ یہاں سے نقل مکانی کے کیا مثبت یا منفی اثرات ہوں گے، کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ بہرحال مستقبل کے بارے میں جو خدشات تھے، وہ میرے اپنے تھے، کیونکہ میں نہیں جانتی تھی کہ سوئٹزرلینڈ کے قیام کے دوران میں اسد نے ترجمہ قرآن کے اہم ترین منصوبے کو جس ذوق وشوق اور انہماک سے آگے بڑھایا تھا، اس میں کسی طرح کی رکاوٹ آئے۔

اکتوبر 1964ء کو ہم سوئٹزرلینڈ سے رخصت ہوئے۔ الوداعی لمحات نے اداس نہیں کیا، کیونکہ یہاں چھ سالوں میں جن اصحاب سے ہمارے دوستانہ مراسم قائم ہوئے ان کو بھلانے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ایسا ممکن تھا۔ ہم نے اپنے دونوں وفادار کتوں کو نئی خرید کردہ سٹیشن ویگن میں سوار کیا اور اپنی "موعودہ سرزمین" کے طویل سفر پر روانہ ہوگئے۔ راستے میں بہت سے قابل ذکر مقامات پر رک کر مثلاً ہاؤتے ساوو(Haute Savoie) کوتے دآزور (Cote d'Azur) اور گاسکوائنے کے علاقہ میں پاؤ (Pau)۔ مؤخرالذکر اکتوبر میں قریب قریب خالی تھا۔ ہوا میں بھی یہاں کی ویرانی کا تاثر پایا جاتا تھا۔ کسی زمانے میں برطانیہ کے اعلیٰ طبقات کے لوگوں کی یہ پسندیدہ تفریح گاہ تھی، لیکن جب سے انہوں نے یہاں آنا چھوڑا، اس چھوٹے سے خوبصورت شہر کی رونقیں ماند پڑ گئیں، لیکن اب بھی یہاں کے لذیذ کھانوں کا سارے فرانس میں جواب نہیں۔ ہم از دراور عفریت سمیت یہاں کے ایک عمدہ ترین ریسٹورنٹ میں گئے۔ وقفے وقفے سے مختلف اقسام کے کھانے میز پر سجتے رہے۔ ان میں بہت سے کھانے ایسے تھے جو ہم نے

Marfat.com

پہلی بار چکھے تھے۔ برسوں گزر گئے اور اب تو ہمیں یہ بھی یاد نہیں کہ کیا کچھ کھایا، لیکن ان کھانوں کی لذت کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

پاؤ سے چلے تو ارون (Irun) پہنچے اور سپین کے سرحدی شہر بیداسوا (Bidassoa) سے آگے بڑھے۔ باسکوئے (Basque) کے چھوٹے سے شہر سے ذرا باہر سڑک پر واقع ایک ریسٹورنٹ میں پہلی رات بسر کی۔ یہاں کا کھانا اس قدر عمدہ تھا کہ ویسا سپین میں کہیں نظر نہیں آیا۔ اس شہر کی سرحد کے دونوں جانب غیر معمولی کھانے تیار کئے جاتے ہیں۔ سپین میں اکثر بجلی چلی جاتی تھی اور ہمیں موم بتیوں کی روشنی میں اپنی شام گزارنا پڑتی تھی۔
اس سے آگے ہم بورگوس (Burgos) کے مقام پر رکے۔ کاسٹیل (Castile) کے اس شہر میں خوبصورت گرجا گھر ہے۔ ابھی تک ہم ہسپانوی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں بول سکتے تھے۔ بالآخر ہم غرناطہ پہنچے، جو ہمیں اپنے گھر جیسا لگا۔

غرناطہ ایک ہسپانوی شہر ہے، لیکن اس کا تعلق مورز (Moors) کے ہسپانوی دور سے ہے۔ یہاں آتے ہی ہمیں اس ہوا میں اپنائیت کا احساس ہوا۔ جب ہم الحمرا دیکھنے گئے (مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس دن روس پر خروشچیف کا اقتدار ختم ہوا تھا)، تو وہ بالکل خالی تھا۔ ہم وہاں بغیر گائیڈ کے گھومتے پھرتے رہے، کیونکہ ہمیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ وسیع اور بے ترتیب عمارتوں اور میدانوں میں پھرتے رہے۔ ہمارے دونوں قیمتی عربی النسل کتے بھی ہمراہ تھے۔ معاً میرے ذہن میں خیال آیا کہ زوال غرناطہ کو پانچ صدیاں گزر گئی ہیں اور شاید اس کے بعد یہ پہلے سلوکی کتے ہیں، جو الحمرا میں یوں بلا خوف وخطر پھر رہے ہیں۔ یہاں ہماری صرف ایک ہی شخص سے ملاقات ہوئی، جس کا نام آنٹونیو مولینا (Antonio Molina) تھا، جو الحمرا کی دیواروں پر جپسم کی عمدہ تزئین و آرائش کی نوک پلک درست کر رہا تھا۔ اس کا تعلق اس کام کے ایک ماہر خاندان سے تھا، جو تقریباً ایک صدی سے ان نازک تزئینی آثار کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بعد میں ہم نے ہسپانوی مسلمانوں کے اس خوبصورت شہر کو کئی بار دیکھا۔ ایک بار تو ہم تقریباً دو ماہ یہاں مناسب سا گھر تلاش کرتے رہے۔ اس وقت وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک روز اسی شہر کے ایک چھوٹے سے مسلمانوں کے قبرستان میں محمد اسد کو سپرد خاک کر دیا جائے گا۔

اور پھر ہم ملاغہ (Màlaga) کے پہاڑوں سے گزرتے ہوئے سمندر تک پہنچے۔ الجیسی راس (Algeciras) کے مقام پر ہم بذریعہ فیری تنجیہ کے لیے روانہ ہوئے جو قریب قریب سامنے نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد قریب پہنچے تو سمندر کے کنارے پورے شہر کا منظر نظروں کے سامنے تھا۔ ذرا اوپر چھوٹی سی پہاڑی تھی اور یہیں ہم نے اپنی زندگی کے اگلے انیس سال گزارنا تھے اور اسی جگہ اسد نے قرآن کریم کا ترجمہ مع تفسیر مکمل کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

Muslim scholar honoured by Austria

VIENNA, April 18: The Austrian capital has named one of its squares as Muhammad Asad Platz as part of its two-day programme on European Year of Intercultural Dialogue focussing on Islam and its relationship with Europe.

The programme commemorated the life and work of Mr Asad, described as a great Austrian visionary, who earned international recognition by building bridges between the religions.

Mr Asad, born Leopold Weiss, was a Jew who converted to Islam and translated the Holy Quran into English, says a media release of the organisers.

University Professor Talal Asad (Muhammad Asad's son) and Anas Schakfeh, president of the Islamic Community of Austria, spoke on the occasion of the inauguration of Muhammad Asad Platz, the first square in Vienna to be named after a Muslim.

Mayor of Vienna Michael Haup hosted a reception, followed by the screening of a film — "The Road to Makkah: the Journey of Muhammad Asad". The film looks at today's relations between Islam and the West from a new point of view. The journey starts in Lviv and leads to Vienna, Berlin, Palestine, Egypt, Saudi Arabia, Pakistan, the US and Spain.

محمد اسد پر حکومت آسٹریا کے مالی تعاون سے بننے والی جرمن دستاویزی فلم کی اطلاع۔ یہ فلم Der Weg nach Mekka-Die Reise des Muhammad Asad کے نام سے نومبر 2008ء میں ریلیز ہوئی۔

Marfat.com

باب پانزدہم

تنجیہ (Tangier)
(1964ء-1983ء)

(1)

اس شہر میں ہم نے انیس سال ایک ساتھ گزارے اور ممکن نہیں کہ اتنی طویل مدت کے حالات وواقعات کو چند صفحات میں سمیٹ دیا جائے۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہماری زندگی کا پُر مسرت، کارآمد اور کئی اعتبار سے اہم ترین وقت تھا۔

دوستوں کے تعاون سے ہمیں کرایے پر ایک عارضی گھر مل گیا۔ ہمارا ارادہ یہاں اپنا مستقل گھر بنانا تھا اور اس کی تعمیر کے لیے ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ ہمارے بعض مراکشی احباب کی یہ رائے بڑی صائب تھی کہ گھر بنوانے کے لیے کسی ماہر تعمیرات یا ٹھیکے دار کی خدمات حاصل نہ کیجیے، بلکہ یہ کام خود اپنی نگرانی میں کسی مراکشی معمار اور مقامی مزدوروں سے کرائیے۔ ہمیں عملاً موجودہ مکان کو گرانا پڑا۔ سوائے اندرونی سیڑھی اور گیراج کے ہر چیز توڑ پھوڑ دی گئی۔ گیراج کو ہم باورچی خانے کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ اس گھر کا سنگ بنیاد رکھنے اور تعمیراتی کام کی نگہداشت کے لیے ہم نے ایک انجینئر کی خدمات حاصل کیں، جس کے پاس سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کی دوہری شخصیت تھی، لیکن چند ماہ بعد اسے اچانک کانگو جانا پڑا جو ان دنوں بلجیئم کے ماتحت تھا (وہاں خانہ جنگی کے باعث قتل وغارت گری کا بازار گرم ہو گیا، چنانچہ اسے وہاں سے بے سروسامانی کی حالت میں اپنی جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑا۔ اللہ کے کام بھی یقیناً بڑے پُراسرار ہوتے ہیں)۔ یوں وہ ہمیں بیچ منجدھار کے اور پیشگی ادا شدہ رقم لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مکان بنوانے اور راج مزدوروں سے کام کرانے کا بوجھ ہم پر آن پڑا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ کیسے ایک روز اسد خود اس دو منزلہ مکان کی چھت پر جا چڑھے اور کاریگر کو بتاتے رہے کہ کونوں میں ٹائلوں کو کس طرح جوڑ کر لگایا جائے۔ انہیں اس کا بالکل تجربہ نہیں تھا لیکن اس کا سبب ان کی اعلیٰ ذہنی استعداد تھی۔ مزید یہ کہ وہ مراکشی کاریگروں کے کام کو بغور دیکھتے رہتے تھے اور اس مشاہدے سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ مراکشی کاریگر تیز فہم لوگ تھے۔ جو بات انہیں بتائی جاتی، اس کو فوراً سلیقہ مندی سے انجام دیتے۔

Marfat.com

سبھی مراکشی مزدور عمدہ لوگ تھے۔ مفلوک الحال تھے اور بعض نے تو اپنا جسم چیتھڑوں سے ڈھانپ رکھا تھا، لیکن میں یہ دیکھ کر بے حد متاثر ہوئی کہ ہر روز وہ اپنے ساتھ گھر سے پکا ہوا کھانا لاتے اور اسے دوبارہ گرم کر کے باغ میں بیٹھ کر کھاتے۔ یہ تھا مراکش، جہاں لوگ اچھا کھاتے ہیں، چاہے وہ غریب ہی کیوں نہ ہوں۔

جن بازاروں سے یہاں کے لوگ سودا سلف خریدتے ہیں، وہاں دکانیں ہر قسم کی تازہ سبزی، سلاد، پھل، مچھلی اور پرندوں سے بھری ہوتی ہیں اور ہر کوئی انہیں خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ اس سے قبل یا بعد حتیٰ کہ یورپ کے آسودہ حال ممالک میں بھی اتنی اچھی اشیائے خوردنی دیکھیں نہ کھائیں۔ یقیناً یہ ایک "اچھی زندگی" کی بنیاد ہے۔

ہمارے ہاں کام کرنے والے تمام لوگ خوش طبع، سادہ مزاج اور متحمل تھے۔ رواداری مراکشی لوگوں کی زندگی کا بنیادی اصول ہے۔ دنیا کے دیگر اسلامی ممالک کی طرح یہاں کے لوگ بھی مسلمان ہیں اور وہ ہمیشہ دیگر اقوام کی مذہبی رسوم اور اعتقادات کا بھی احترام کرتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یورپی سیاحوں وغیرہ کی خاصی بڑی تعداد تجیہ اور مراکش آنا پسند کرتی ہے اور یہاں سے واپس جاتے ہوئے اکثر ان کے چہرے غم زدہ اور ملول دکھائی دیتے ہیں۔

تجیہ آج کی نسبت ان دنوں بہت خوبصورت شہر تھا۔ پاکستان کے مغرب میں واقع مسلمان ممالک اور یہاں کی زندگی میں سب سے زیادہ مشرقیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ پاکستان کی طرح لوگوں کی اکثریت روایتی لباس پہنتی ہے، حتیٰ کہ بیشتر مرد جو پہلے پہل عموماً مغربی لباس پہننا پسند کرتے ہیں، وہ بعد میں اپنے اسی لباس کو اپنا لیتے ہیں۔ اس ضمن میں سعودی عرب کو ایک عجیب استثنائی حیثیت حاصل ہے جہاں خواتین نے بڑی تیزی سے اپنا مقامی لباس پہننا چھوڑ دیا، جو خوبصورت تھا اور وہاں کی آب و ہوا سے بھی مطابقت رکھتا تھا۔

مراکشی عورتیں زیادہ تر اپنے جلباس (jellabas) اور نقابوں کے نیچے کفتان یا دفن (diffin) پہنتی ہیں۔ مضافاتی علاقوں کی کسان عورتیں سرخ و سفید رنگ کی خوشنما شال جس میں کینڈی کی شکل کی پٹی لگی ہوتی ہے، اپنی کمر کے گرد لپیٹتی ہیں، جو ان کے گھٹنوں تک لٹکتی رہتی ہے۔ وہ اپنے سروں پر تنکوں کا بنا ہوا بڑے کنارے والا ہیٹ رکھتی ہیں۔ (اس طرز کا ہیٹ میکسیکو میں استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس کا آغاز یمن سے ہوا۔ ابتدائی حملوں کے دوران میں یمنی فوجیوں کے ذریعے یہ ہیٹ ہسپانیہ میں متعارف ہوا۔ بعد میں ہسپانوی حملہ آوروں کے توسط سے یہاں کی مقامی لوگوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا۔ تنکوں کے بنے ہوئے ایک سادہ سے ہیٹ کو کتنا طویل سفر طے کرنا پڑا)۔

دیہاتی عورتیں اور کسان بڑے پُر اعتماد لوگ ہیں اور وہ اکثر آپ کو گلیوں اور بازاروں میں دھکا دے کر آگے نکل جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ ان میں زیادہ تر تعداد عورتوں کی ہوتی ہے، جنہوں نے اپنے چہرے نقاب سے چھپائے ہوتے ہیں۔ بالعموم یہ خواتین طلاق یافتہ ہوتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی گود میں اٹھائے ہوتی ہیں، اس کے باوجود وہ عقد ثانی کے بارے میں نہیں سوچتیں۔ مراکش میں بالخصوص "نچلے طبقوں" میں طلاق دینے اور طلاق یافتہ عورت کا دوبارہ شادی کرنے کا عام رواج ہے اور اس عمل کو معاشرے میں ناپسند نہیں کیا جاتا، جیسا کہ پاکستان میں

Marfat.com

طلاق یافتہ خاتون کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ مراکش کے تمام رہنے والوں کو ہر طرح کی مذہبی اور سماجی آزادی حاصل ہے اور وہ اس سے کلی طور پر مطمئن ہیں۔ وہ اس اعتبار سے بھی خوش قسمت ہیں کہ انہیں شاہ حسین جیسا حکمران ملا، جو اپنے لوگوں کے مزاج اور سوچ سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ ایسی قوم پر کامیابی سے حکومت کرتے رہے، جو بنیادی طور پر مراکشی تھے۔ جن دنوں فرانسیسی اور ہسپانوی یہاں برسر اقتدار تھے، ان کا بھی یہی خیال تھا۔

ہمیں جلد ہی اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ مراکش کے لوگ عرب نہیں ہیں، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ نسلی اور تہذیبی اعتبار سے یہ لوگ، خاص طور پر پہاڑوں اور دیہاتوں میں رہنے والے، بربری ہیں۔ اگرچہ یہاں کی سرکاری زبان عربی ہے، لیکن ان پڑھ زیادہ تر دریجہ (darija) زبان بولتے ہیں۔ یہ عربی زبان ہی کی ایک ایسی شاخ ہے، جس میں بربری اور غیر ملکی زبانوں کے الفاظ بکثرت استعمال کیے جاتے ہیں۔ حقیقتاً یہ ایک الگ زبان ہے۔ اسکولوں میں بچوں کو اصل عربی ہی پڑھائی جاتی ہے، کیونکہ یہ قرآن کریم کی زبان ہے، لیکن اس کے بولنے میں بھی مخصوص مراکشی لہجہ نمایاں ہوتا ہے۔ جنوبی علاقے اور شمالی ریف (Rif) میں رہنے والے صرف اپنی زبان یعنی بربری ہی بولتے ہیں۔

مراکشی مزاجاً بھی عرب نہیں ہیں۔ ان کا عمومی رویہ دوستانہ ہے، لیکن پھر بھی وہ غیر ملکیوں کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے اس تشکیکی رویے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے تک غیر ملکیوں کے سخت جابرانہ نظام کا شکار رہے ہیں اور وہ عربوں اور مصریوں کی طرح غیر ملکیوں سے خوش دلی کے ساتھ نہیں ملتے۔ یہاں رہنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی، البتہ اکیلے پن کا احساس ضرور ہوتا ہے، کیونکہ مشرقی ممالک کے عربوں کے برعکس یہاں نئے دوست بنانا امر محال ہے۔ مغربی معیاروں سے پرکھا جائے تو مراکشی بھی بڑے مہمان نواز ہیں، لیکن اصل عربوں سے بہت کم اور پھر خاطر تواضع کرنے میں بھی وہ کھچے کھچے سے رہتے ہیں۔ سعودی عرب میں آپ کسی شہزادے یا امیر کبیر شخص کے گھر جائیے، آپ کو ملنے ملانے اور کھانے پلانے کے حوالے سے ایک بے تکلفانہ ماحول دکھائی دے گا اور عربوں کے یہی وہ فخریہ آداب مہمان نوازی ہیں، جو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہر حال ''مشرق، مشرق ہے اور مغرب، مغرب''۔ ویسے بھی مغرب سے مراد یورپ ہی ہے۔

مراکشی کھانے عمدہ ہیں، لیکن یہ مشرقی ممالک عربیہ سے بالکل مختلف ہیں۔ میرے خیال میں یہ ان کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور نفیس ہوتے ہیں۔ مختلف لوگوں کے خورد و نوش کے الگ الگ معیار ہیں اور پسند و ناپسند میں بھی فرق ہے۔ میری ذاتی رائے میں یہاں کے فواکہات (desserts) درمیانے درجہ کے ہیں اور ان میں دمشق کی بو باس ناپید ہے۔ وہ مختلف قسموں کی روٹی استعمال کرتے ہیں۔ اس کو ابتدائی طور پر گھر ہی میں تیار کیا جاتا ہے اور پھر قریبی چھوٹے چھوٹے تنوروں میں پکوانے کے لیے لے جاتے ہیں۔ ان تنوروں کے مالک امیر بھی ہیں اور غریب بھی۔ یہاں ہر ایسی روٹی تیار کی جاتی ہے، جس کا کوئی انسان تصور کر سکتا ہے۔ پھولی ہوئی سفید اور بھوری روٹی، چپٹی روٹی، پھولی ہوئی بھرتے والی وغیرہ وغیرہ۔ جب فرانسیسی یہاں حکمران تھے، تو وہ بلاشبہ ایسے عمدہ اور بھانت بھانت کے

Marfat.com

کھانوں سے بہت خوش ہوتے ہوں گے۔

(2)

نو ماہ کے بعد ہمارا گھر مکمل ہو گیا۔ بیٹھک اور لمبے دالان کی چھتوں پر جو مہوگنی کے شہتیر لگائے گئے تھے، ان پر شہد کی مکھیوں کے چھتوں سے تیار کردہ موم لگایا گیا تھا۔ کھڑکیوں پر زیبائشی جنگلے نصب کیے گئے۔ ہسپانوی طرز مہوگنی کے دروازے بنوائے گئے، جن کے ہینڈل اور چٹخنیاں پیتل کے تھے اور ہم یہ میڈرڈ سے لے کر آئے تھے۔ ہم اپنے گھر کی تزئین و آرائش کے لیے یہ تمام چیزیں خریدنے خصوصی طور پر وہاں گئے تھے۔ فرنیچر، قالینوں اور تمام گھریلو ساز و سامان کے ساتھ ہم اپنے اس نئے گھر میں منتقل ہو گئے، جس کا نام اسد نے اپنے نام پر "ولا اسدیہ" رکھا۔ ابھی ہمیں یہاں آئے ہوئے چند ہی روز گزرے تھے کہ سعودی عرب آنے کی دعوت موصول ہوئی اور وہ فی الفور روانہ ہو گئے، کیونکہ وہ سعودیہ کے "دلفریب نغمہ" کو سنے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔

ان دنوں سعودی عرب میں کوئی اسلامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی، جس میں شرکت کے لیے اسد کو مدعو کیا گیا۔ وہیں ان کی پہلی بار معروف وزیر تیل شیخ احمد ذکی یمانی سے ملاقات ہوئی۔ دوپہر کے کھانے کا وقفہ تھا اور اسد اکیلے ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھے تھے کہ ایک صحت مند، درمیانی قد و قامت اور فہیم و زیرک شخص ان سے مخاطب ہوا "کیا میں آپ کے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکتا ہوں، میرا نام ذکی یمانی ہے۔" جب اسد کانفرنس سے واپس آئے تو وہ اس شخص کے بارے میں اتنا ہی جانتے تھے، لیکن وہ شیخ ذکی یمانی سے اپنی ملاقات کے گہرے تاثر کو کبھی بھلا نہیں سکے۔118

گھر مکمل ہو گیا اور کچھ وقت کے لیے غیر ملکی دورے بھی ختم ہو گئے۔ یہی موزوں ترین وقت تھا کہ ہم اپنے رکے ہوئے کام کو دوبارہ شروع کریں اور اسے تیزی سے پایہ تکمیل کو پہنچائیں۔ چنانچہ اسد ناشتے کے بعد بیٹھ جاتے اور چار پانچ گھنٹے مسلسل ترجمہ قرآن میں منہمک رہتے۔ اس کے بعد ہم اپنے پالتو کتوں کے ساتھ گھر کے وسیع اور سرسبز و شاداب باغ میں جا بیٹھتے یا کار پر لمبی سیر کو نکل جاتے۔ اکثر بحر اوقیانوس کے پُرسکوت ساحلوں پر گھومتے پھرتے اور جب کبھی سمندر متلاطم نہ ہوتا تو بحیرۂ روم کی تنگ کھاڑیوں کا رخ کرتے۔ واپسی پر رات کا کھانا مل کر تیار کرتے اور یہ زیادہ تر اپنا من پسند ہی ہوتا تھا۔ یعنی پنیر کے نرم سوفلے اور سلاد یا کوئی پاکستانی کھانا کیونکہ اب ہم ایسے کھانے پکانے کے ماہر ہو چکے تھے۔ میں نے عمدہ قسم کا فرانسیسی سوپ (soup à la oignon) بھی تیار کرنا سیکھ لیا تھا۔ اگر ہمارے پاس وقت ہوتا تو ہم مچھلی کا سوپ بھی تیار کر لیتے۔ یہ فرانسیسی bouillabaisse اور ہسپانوی zarzuela de pescado کو ملا کر بنایا جاتا تھا۔ تنجیہ میں مچھلیوں کے دو بازار تھے، جہاں ان دنوں آپ کو ہر طرح کی مچھلی سستے داموں مل جاتی تھی۔

ہم نے ایک مالی بھی ملازم رکھ لیا تھا جو سارا دن باغ میں کام کرتا رہتا۔ میں بھی اپنا زیادہ تر وقت یہیں

Marfat.com

پودوں کی تراش خراش اور پھلواڑیوں کو سنوارنے میں گزارتی تھی۔ کھجور، ناشپاتی اور خوبانی کے درختوں کے علاوہ سوئی جیسے باریک پتوں والے سرو اور لاتعداد پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑیاں عجب خوشنما منظر پیش کرتی تھیں۔ میں اپنے اس پہلے 'حقیقی' باغ کو ذوق وشوق سے مزید سجانے میں مصروف رہتی تھی۔ یہیں ایک ہموار جگہ پر بہت سے چھتری نما صنوبر جنہیں عرف عام میں پتھریلے صنوبر کہا جاتا ہے، ایستادہ تھے۔ بحیرۂ روم کے نفیس ترین اشجار میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ان سے ہمیں اچھی خاصی تعداد میں صنوبری بادام حاصل ہو جاتے، جنہیں ہم غیر معمولی اطالوی کھانوں میں استعمال کرتے۔ لیموں اور سنگتروں کے درخت بھی بکثرت تھے، جن میں سیو لے (Seville) کا نارنگیوں کا مشہور درخت بھی تھا اور میں ان سے گھر ہی پر مارملیڈ تیار کر لیتی تھی۔

اس باغ کی تمام روشیں پتھریلی تھیں اور ان کے درمیان گھاس اور چھوٹے پھولوں کی جھاڑیاں تھیں۔ بے شمار اونچے نیچے سطحی پتھروں کو تراش کر بنائی گئی تھیں۔ گھر کے سامنے بے شمار بڑے چمکیلے پتوں اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت پھولوں والے پودے (بوگن ویلیا) تھے، جو تقریباً سو سال پرانے تھے۔ اس درخت کی ارغوانی شاخوں نے ہمارے گھر کی دیواروں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ چنبیلی کی خوشبو جسے "مشک اللیل" کہا جاتا ہے، سارے گھر کو معطر کر دیتی تھی اور یہ ہمیں پاکستان میں گزارے ہوئے دنوں کی یاد دلاتی تھی، جہاں یہ "رات کی رانی" کے نام سے موسوم ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے اپنے اس باغ سے محبت کرتی تھی۔ یہ ایک رومانی اور دلفریب باغ تھا اور یہیں سے میرے باغبانی کے شوق کی تکمیل ہوئی۔ اسد گل بوٹوں سے میرے شدید جذباتی تعلق اور اس کے مثبت نتائج کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے رہتے تھے، لیکن وہ کبھی اس باغ کو خوب سے خوب تر بنانے میں میرا ہاتھ نہیں بٹاتے تھے۔ اس حوالے سے وہ پکے سامی تھے۔ وہ اس کی دیدہ زیبی سے خوش ہوتے اور یہاں چہل قدمی بھی کرتے، لیکن اس کے سنوارنے میں عملاً کچھ نہیں کرتے تھے، کیونکہ یہ سب کچھ کسی جناتی وابستگی کے بغیر ممکن نہیں۔ میرا یہی شوق باغبانی تھا، جس سے وہ مکمل طور پر لاتعلق رہے۔ نتیجتاً میرا یہ شوق فراواں بھی رفتہ رفتہ ماند پڑ گیا اور جو چیز میری سرشت میں تھی، اس سے میرا تعلق کمزور ہوتا گیا۔

اس اثنا میں اسد کے ترجمہ قرآن کا منصوبہ اتنا آگے بڑھ گیا کہ اب میں اس میں عملی طور پر شریک ہو سکتی تھی۔ میں ان کے قدرے پیچیدہ لیکن واضح انداز تحریر کو ٹائپ کرتی، ترجمہ کا اول تا آخر بغور مطالعہ کرتی، کئی نکات زیر بحث آتے، زبان و بیان کو ایسے نکھارنے کی کوشش کی جاتی، جیسے ہاتھی دانت کو چمکایا جاتا ہے۔

یہ سارا عمل کٹھن تو تھا، لیکن اطمینان بخش بھی تھا۔ کبھی کبھار اسد گھنٹوں انگریزی سے کسی ایسے موزوں لفظ یا پیرایہ اظہار کی تلاش میں سرگرداں رہتے جو قرآنی آیات کے صحیح مفاہیم کے قریب تر ہوتا۔ ان مواقع پر میں اکثر انہیں یہ مشورہ دیتی کہ "تلاش کے اس عمل" کو کل تک ملتوی کر دیجیے اور آرام سے سو جائیے۔ شاید اگلی صبح مطلوبہ لفظ یا ترکیب مل جائے اور یہ امر باعث تعجب ہے کہ جب علی الصبح اسد بیدار ہوتے تو یہ عقدہ حل ہو چکا ہوتا۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ ہم دونوں اس منصوبے میں جذباتی طور پر شریک رہے اور پھر اس کو مکمل کرنے کے لیے ایسے سکون

Marfat.com

بخش ماحول کا اہتمام کیا گیا۔ ہم اسے خدائے بزرگ و برتر کی خود پر خصوصی عنایت سمجھتے ہیں۔

ہماری شبانہ روز محنت کا ثمر اب آپ اصحاب کے سامنے ہے۔ قرآن کے انگریزی ترجمہ مع تفسیر کا یہ منصوبہ جن مراحل سے گزرا، اس کی میں عینی شاہد ہوں۔ اسد نے برسوں کی انتھک محنت سے اس اہم ترین ترجمہ قرآن کو مع حواشی مکمل کیا اور یہ ان کی لگن، عجز، راستبازی اور دیانتداری کا بیّن ثبوت ہے اور ایک شریک کار کی حیثیت سے میں اس کی گواہ ہوں۔[119]

(3)

اپنے وقت کا بیشتر حصہ ترجمہ قرآن کے لیے مختص کرنے کے باوجود ہم دونوں تنجیہ میں اپنے سماجی تعلقات کو نباہنے میں غافل نہیں رہے۔ مراکش میں بسر کیے ہوئے ابتدائی دس سال تو ہماری زندگی کا خوشگوار ترین حصہ ہے۔ مراکش میں ہماری حیثیت غیر ملکیوں جیسی تھی۔ جس 'پہاڑی' پر ہمارا گھر تھا، اس کے قریب ہی بلجیئم، برطانیہ اور فرانس سے تعلق رکھنے والے غیر ملکی بھی رہائش پذیر تھے۔ ان میں سے بعض کو اعلیٰ ترین اعزازات اور القابات سے بھی نوازا گیا تھا اور وہ ہمارے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ یہاں ان سب کا نام گنوانا ممکن نہیں اور یہ بھی نامناسب ہے کہ ان میں کچھ کا ذکر کیا جائے اور باقی اصحاب کو نظر انداز کر دیا جائے۔ بطور ہمسایہ سرسری ملاقات اور آتے جاتے میل جول کے علاوہ سب کے ہاں اتنے تسلسل سے دعوتیں ہوتی رہتی تھیں کہ ان میں شمولیت مشکل ہوتی تھی۔ دن کو ہم اپنے زیر کار منصوبے میں مصروف رہتے تھے، اس لیے ہم اکثر ان احباب کو شام کے کھانے یا بوفے (buffet) پر بلاتے تھے اور ان کے لیے خصوصی پکوانوں کا اہتمام کیا جاتا تھا اور یہ زیادہ تر پاکستان کے مغلئی یا خاص ایرانی تراکیب سے پکائے جاتے تھے۔ ہم دونوں ایران کے نفیس اور لذیذ کھانوں کے شیدائی تھے۔ میرے پاس شمالی اور جنوبی ایران کے مخصوص کھانوں کی متعدد کتابیں موجود ہیں اور ان میں ایسے عمدہ کھانوں کے طریقے بتائے گئے ہیں، جن سے مغرب والے بالکل ناواقف ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ عرب انہیں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ان دنوں تنجیہ میں غیر ملکی سفارتی نمائندوں اور سبکدوش سیاستدانوں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی اور ان اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص سے ملنے اور حالات حاضرہ پر بحث چلتی رہتی تھی اور یوں میرے اس شوق کی آبیاری ہو جایا کرتی تھی۔ بلاشبہ یہاں ہماری زندگی بھرپور طریقے سے بسر ہو رہی تھی۔

گاہے بگاہے کسی مشرقی ملک کے مہمان بھی ہمارے ہاں آتے رہتے۔ ان میں ہمارے پرانے اور نئے دوست بھی شامل ہوتے تھے۔ یہیں حضر موت سے تعلق رکھنے والے سعودی عرب کے تاجر شیخ سالم بالمش (Balamash) سے دوستانہ مراسم مضبوط بنیادوں پر استوار ہوئے۔ مجھے ایسے راسخ العقیدہ مسلمان سے ملنے کا بہت کم اتفاق ہوا ہے۔ وہ دیگر مسالک و مذاہب کا بھی احترام کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ہمیشہ ان کے کاروباری شریک کار بخاشب (Bakhashab) پاشا کے اکلوتا فرزند ابوبکر بخاشب ہوتے تھے۔ ان کے اس امیر کبیر حصہ دار کا وسیع

Marfat.com

کاروبار تھا اور مال بردار بحری جہازوں کا پورا بیڑہ بھی ان کی ملکیت تھا۔ ان کا نسبی تعلق بھی حضر موت سے تھا اور ان کے حبشہ سے مضبوط کاروباری تعلقات تھے اور یوں ان کا زیادہ لین دین اٹلی سے تھا۔ پاشا کا بیٹا ابوبکر ہمارا قریبی دوست تھا۔ اس کی بیوی خدیجہ پُرکشش خاتون تھی اور تمام کاروباری معاملات میں برابر کی شریک تھی۔ ابوبکر کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کے بچے تجیہ کے امریکی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ یہ بچے ہم سے خاصے مانوس ہو چکے تھے۔ بعد میں ابوبکر نے ''پہاڑی'' پر ہمارے قریب ہی اپنا گھر بنوایا اور مراکشی طرزِ تعمیر کے اس عالیشان گھر کے وسیع سبزہ زاروں اور باغوں میں ہم موسم گرما کے طویل دن گزارتے۔ ان کے ملازمین کو بھی ہم دوست ہی سمجھتے تھے۔ عرصہ دراز سے ہم انہیں جانتے تھے۔ ابوبکر کا مستقل گھر جدہ میں تھا۔ جب کبھی وہ وہاں گئے ہوتے، ہم ان کے گھر جاتے اور موسم سرما میں ملازمین کے ہاتھ کی بنی ہوئی گرم گرم کافی پیتے جس کا مزہ کچھ عجیب سا تھا۔ ابوبکر نے اسد کے ترجمہ قرآن کی اشاعت میں بھرپور تعاون کیا، لیکن اس کے منظرِ عام پر آنے سے قبل ہی ہمارا یہ پیارا دوست انتقال کر گیا اور یوں وہ اس ترجمہ کو مطبوعہ شکل میں نہ دیکھ سکا۔

(4)

مراکش میں اس طویل قیام کے دوران میں ہمیں اکٹھے بیرونی ممالک کے سفر کرنا پڑے۔ ہم اپنے ملازموں کے شکرگزار ہیں کہ وہ ہماری غیر موجودگی میں چھوٹے چھوٹے الگ کمروں میں مقیم رہے اور ہمارے دونوں پالتو کتوں یعنی ازدر اور عفریت کی مناسب طریقے سے نگہداشت کرتے رہے، حالانکہ وہ ہماری کمی کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ دیگر مسلمانوں کے برعکس مراکش کے مسلمان جانوروں سے اچھا برتاؤ کرتے ہیں اور کتوں کو بلاوجہ نجس سمجھ کر ان سے نفرت نہیں کرتے۔ ہمیں اگر جانا پڑتا تو وہاں ایک دو ہفتوں سے زیادہ نہیں ٹھہرتے تھے اور خوش خوش اپنے گھر کو لوٹتے کیونکہ یہ ہمارا اپنا گھر تھا۔

1966ء کے اوائل میں شیخ محمد سرور الصبان نے سعودی عرب آنے کی دعوت دی۔ وہ پہلے وزیر مالیات تھے لیکن اس وقت وہ رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ اس عالمی تنظیم کا صدر دفتر مکہ میں تھا اور پوری اسلامی دنیا کے علماء اور اکابرین اس سے منسلک تھے۔ ابتداءً یہ تنظیم اسد کے ترجمہ قرآن کی نشر و اشاعت میں معاونت پر آمادہ تھی، جبکہ اس ترجمہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اسد نے اس منصوبے کو اپنے طور پر مکمل کیا اور اس کے لیے انہیں گذشتہ سالوں سے جو قلیل سی رقم ملتی تھی، وہ اسی پر اکتفا کرتے تھے۔ رابطہ عالم اسلامی کے بعض علماء اسد کے اس ترجمہ و تفسیر قرآن سے اختلاف رکھتے تھے اور ان کی بعض مفسرانہ توضیحات کو درست نہیں مانتے تھے۔ ان مخالفین میں متبحر اور ثقہ علماء شامل نہیں تھے۔ ان معترضین کی اکثریت پاکستان سے تعلق رکھتی تھی اور یہ سبھی مولانا مودودی کے پیروکار تھے۔ یہ لوگ غلط سلط انگریزی میں عرب علماء کو اپنے اعتراضات سے آگاہ کرتے تھے، جو ان کے اپنے مخصوص نقطہ نظر کی عکاسی کرتے تھے اور وہ سیاق و سباق سے ہٹ کر

Marfat.com

کئے جاتے تھے۔ان نام نہاد عالموں کے اس بے بنیاد پروپیگنڈے کا یہ اثر ہوا کہ رابطہ عالم اسلامی نے اسد سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ حواشی یا ضمیموں میں اپنی بعض توجیہات وتوضیحات کو تبدیل کردیں اور اس کے بعد یہ ترجمہ قرآن اس تنظیم کی جانب سے شائع کیا جاسکتا ہے۔اسد ایک دیانتدار شخص تھے،اس لیے وہ بعض امور کے بارے میں اپنی دیانتدارانہ رائے کو بدلنے پر راضی نہ ہوئے۔وہ اس کام کے حوالے سے خود کو صرف خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتے تھے اور دیانتداری اور احساس ذمہ داری کے ساتھ برسوں قرآن کا ترجمہ کرنے میں مشغول رہے۔وہ ہمیشہ خود کو ایک عام انسان سمجھتے رہے،جس سے خطائیں سرزد ہوتی رہتی ہیں،لیکن وہ اپنی ذات اور خدائے بزرگ و برتر کے روبرو ہمیشہ سنجیدہ رہے۔اگر وہ اپنے ضمیر سے سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہوجاتے،تو انہیں بہت سے مالی فوائد حاصل ہوسکتے تھے،لیکن اس سے ان کی راستبازی کا جذبہ ختم ہوجاتا اور پھر وہ کبھی اپنے انداز سے زندگی گزارنے کے قابل نہ رہتے۔میں ان کے اس طرزِ حیات کو پسند کرتی تھی۔[120]

مکہ میں ان سے جو باز پرس کی گئی،اس کے بعد اسد واپس آئے اور مجھے بتایا کہ شیخ سرور الصبان،جو زندگی بھر ہمارے دوست رہے،کا شمار علمائے دین میں نہیں ہوتا اور وہ رابطہ عالم اسلامی کے معاملات میں مداخلت نہیں کرسکتے تھے،حالانکہ انہوں نے ہی اس تنظیم کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔شیخ سرور الصبان نے ہمیں حج کے لیے مکہ آنے کی دعوت دی اور ہمیں یہ فریضہ ادا کرنے کی غرض سے ایک ہفتے کے اندر اندر وہاں پہنچنا تھا۔میرے لیے جلدی جلدی حج کا مخصوص لباس تیار کروایا گیا اور اسد نے بھی عربی لباس نکلوایا،جو برسوں سے بغیر استعمال کے صندوق میں پڑا تھا۔

ہم حج کے پُرہجوم دنوں میں جدہ پہنچے۔سرور الصبان کے عملہ کے کچھ افراد ہمارے استقبال کے لیے ہوائی اڈہ پہنچے ہوئے تھے اور وہی ہمیں فوراً مکہ لے گئے۔اسد نے سعودی عرب اور پاکستان کے قیام کے عرصے میں آٹھ حج کئے تھے،جبکہ مجھے یہ سعادت پہلی بار حاصل ہورہی تھی۔یہاں سعید رمضان اور اس کی بیوی کے ساتھ دوبارہ ملاقات ہوئی اور مکہ،عرفات اور مدینہ میں،ہم اکٹھے رہے۔کئی سال بعد اسد مدینہ آئے تھے اور میں نے دیکھا کہ رسول اکرمؐ کے اس خوبصورت شہر میں ہونے والی تبدیلیاں دیکھ کر کتنے افسردہ ہوگئے تھے۔پتھروں کے تعمیر کردہ کئی قدیم مکانات اور شہر کی پرانی دیواریں منہدم کردی گئی تھیں اور ان کی جگہ "امریکی انداز" کی جو عمارتیں بنائی گئی تھیں،وہ کمتر طرز تعمیر کی عکاسی کرتی تھیں۔مدینہ اسد کا محبوب ترین شہر تھا اور یہیں ان کے عارضی قیام کے دوران میں طلال پیدا ہوا تھا۔شکست وریخت کے اس عمل سے مسجد نبوی محفوظ رہی،لیکن اس کی توسیع اور اس مقدس جگہ کو مزید جاذب نظر بنانے کا کام شروع ہوچکا تھا۔

مسجد نبوی ہی میں ہمیں ایک غیر معمولی تجربہ ہوا۔ابن سعود کے زمانے ہی سے زائرین اور حجاج کو روضہ رسولؐ کی جالیوں کے قریب جانے یا انہیں چھونے کی سختی سے ممانعت کردی گئی تھی،کیونکہ نجدی کو اس روضۂ مبارک سمیت تمام برگزیدہ ہستیوں کے مزارات پر عقیدت مندانہ اظہار محبت کو ناپسند کرتے تھے اور اسے صریحاً قبر پرستی قرار دے کر اسے غیر اسلامی فعل قرار دیتے تھے۔بغداد کی ایک مسجد میں ہمیں جو تجربہ ہوا،اس کے پیشِ نظر ہم اہل نجد کی عائد

Marfat.com

کردہ اس پابندی کی وجوہ کو درست سمجھتے تھے اور اسد کو بھی ان پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ نیک نیت مگر قدرے کم علم زائرین کو ان جالیوں کے قریب جانے سے روکنے کے لیے نجدی ''محافظین'' کو تعینات کر دیا گیا تھا اور وہ چھڑیوں سے گمراہ لوگوں بالخصوص شدید جذباتیت کا شکار خواتین کو روضہ رسولؐ کے قریب آنے سے روکتے تھے۔ نماز ادا کرنے کے بعد اسد اور میں ان جالیوں سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے اور وہ مجھے بتا رہے تھے کہ اس روضہ کے اندر رسول اکرم کا جسد مبارک کا رخ کیا ہے۔ اچانک ایک ''محافظ'' ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ چونکہ ہم نے دیگر حجاج کی طرح روضہ رسولؐ کے قریب جانے کی کوشش نہیں کی، اس لیے وہ ہمیں خود جالیوں تک لے جا سکتا ہے۔ میں ایسے سیدھے سادے مگر راسخ العقیدہ شخص سے ایسی پیشکش کی کبھی توقع بھی نہیں کر سکتی تھی، لیکن میں اس کے محبت آمیز سلوک سے بڑی متاثر ہوئی۔ سپین میں رونده (Ronda) اور مراکش* میں فیض (Fez) کی مساجد میں بھی مجھے ایسے ہی انوکھے تجربات سے گزرنا پڑا۔

اندلس میں رونده عربوں کا آخری شہر تھا، جس کو مسیحی افواج نے فتح کیا۔ ہم کئی بار یہ شہر دیکھنے گئے۔ ایک بار یہاں ہم ایک چھوٹا سا گرجا گھر دیکھنے گئے، جو میرے خیال میں پرانے دور کی کوئی مسجد تھی۔ بعد میں میرا یہ خیال حقیقت میں بدل گیا، جب کچھ عرصہ قبل وہ محراب دریافت ہوئی جہاں کھڑے ہو کر امام نماز پڑھایا کرتا تھا۔ جب ہم اس مسجد نما گرجا گھر کی سیڑھیاں اتر کر نیچے اپنی کار کے پاس آئے، جہاں ہمارے دونوں کتے ہمارا انتظار کر رہے تھے، تو اچانک دو ہسپانوی شریر لڑکے میرے پاس آ کر پوچھنے لگے کہ کیا میں ''مورا'' (''مور'' کا مطلب ہے مسلمان خاتون) ہوں اور جب میں نے نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے سوال کیا کہ ''کیا میں ہندوستانی ہوں؟'' ان دونوں مسیحی بچوں کا یہ سوال عجیب بے تکا سا تھا، کیونکہ میں نے سکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا اور میرے بال اور سفید جلد کو دیکھ کر کوئی اندھا بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرا تعلق ہندوستان سے ہے۔

ایسا ہی ایک اور تجربہ ہمیں اس وقت ہوا جب اسد اور میں مراکش کے شہر فیض (Fez) میں پہلی بار مسجد قیروان دیکھنے گئے۔ کسی معقول وجہ کے بغیر مراکش میں عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت نہیں۔ وہ صرف اوقات نماز میں جا سکتی ہیں اور وہاں مردوں سے الگ مخصوص جگہ پر نماز ادا کر سکتی ہیں۔ دیگر اسلامی ممالک کے برعکس یہاں غیر ملکیوں کے مساجد میں جانے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے، البتہ ہمسایہ ملک نائیجیریا میں ایسی کوئی پابندی نہیں۔ میں نے مشرقی پوشاک نہیں پہن رکھی تھی، اس لیے میں مسجد کے اندر جانے کے بجائے اس کے بیرونی صحن ہی میں کھڑی رہی۔ جب میں جھجکتے ہوئے اندر جانے لگی تو بڑے دروازے پر کھڑا محافظ با آواز بلند یہ کہتا ہوا ہماری طرف بڑھا کہ ''غیر ملکیوں کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔'' اس وقت متجسس تماشائیوں کی بڑی تعداد باہر جمع ہو گئی تھی۔ ان میں زیادہ تر مراکشی خواتین تھیں اور وہ بھی ہماری طرح اندر داخل نہیں ہو سکتی تھیں۔ ہم سب کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اسد نے حسب معمول بڑے تحمل سے اس نگہبان کو بتایا کہ ہم مسلمان ہیں، لیکن وہ بدستور ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس عجیب صورت حال میں مَیں نے ٹوٹی پھوٹی مراکشی بولی دریجہ میں اسے مطلع کیا کہ ''میں نے حرم کعبہ میں کچھ

Marfat.com

وقت گزارا ہے اور مجھے روضہ رسولؐ پر حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔ میرے لیے آپ کو اتنا ہی بتانا کافی ہے۔'' یہ سنتے ہی وہ سادہ مزاج محافظ، جو پہلے بڑی تلخ گفتگو کر رہا تھا، بالکل نرم پڑ گیا اور وہ مجھے کھینچتا ہوا مسجد کے اندر لے گیا، جہاں اسد اور مجھے نماز ادا کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ ہم دونوں دیر تک اس مسجد کی اندرونی تزئین و آرائش کو دیکھتے رہے۔

وہاں سے ہم مولائی ادریس مسجد کی بل کھاتی ہوئی گزرگاہوں کی جانب بڑھ گئے۔ یہاں بھی ہمیں مذہبی اکابرین کا ایک گروہ ملا۔ یہ لوگ بھی ہمارے مسجد کے اندر جانے پر مُصر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہیں ایک بزرگ کی قبر بھی ہے اور اس کے قریب بھی ہم نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اس پیشکش کو قبول کرنا ہمارے اصولوں کے خلاف تھا، اس لیے ہم نے شائستگی سے اسے قبول کرنے سے معذرت کر دی۔ جب اس نے ان سے پوچھا کہ انہیں کس طرح ہمارے مسلمان ہونے کا پتہ چلا تو ان میں سے ایک شخص نے اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ہمیں یہاں سے علم ہو جاتا ہے۔'' آپ یقین کریں کہ مسجد قیروان کے محافظ نے انہیں یہاں ہماری آمد کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔

ایسے غیر متوقع اور ناقابل وضاحت تجربات کی یادیں بڑی سہانی ہوتی ہیں اور ان سے دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی اکثریت کے ایمان افروز جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

(5)

جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ میرا یہ پہلا حج تھا، جبکہ اسد 1966ء میں آٹھویں بار یہ فریضہ ادا کر چکے تھے۔ میں واپسی پر یروشلم جانا چاہتی تھی، لیکن ہمیں مالی وسائل کی شدید کمی کا سامنا تھا اور پھر مہمان کی حیثیت سے ہم اپنے میزبان سے بھی اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کر سکتے تھے، حالانکہ وہ ہمارے سفری اخراجات کا آسانی انتظام کر سکتا تھا۔ بعد میں ہمیں اپنی اس غیر ضروری شرم و حیا پر بڑا افسوس ہوا۔ ہم دونوں میں فطری جھجک بدرجہ اتم موجود ہے اور ہمیں اس پر فخر ہے۔ ہم یروشلم تو نہ جا سکے، لیکن ایک سال بعد عرب اسرائیل جنگ شروع ہوگئی، یروشلم پر اردن کا اقتدار ختم ہو گیا اور شرمناک طریقے سے اسرائیلی یہاں قابض ہو گئے۔ چنانچہ میں کبھی یروشلم نہ جا سکی۔ میں القدس کو آزاد اور غیر ملکی قابضین سے پاک دیکھنا چاہتی ہوں، لیکن کس کے ساتھ؟ کیونکہ اب میری زندگی کا ساتھی تو راہی ملک عدم ہو چکا۔

آئندہ برس 1967ء کے موسم خزاں کے آغاز میں اسد اور مجھے تیونس کے سرکاری دورے کی دعوت موصول ہوئی۔ سی عبداللہ گنون (Si Abdullah Gannoun) پر کچھ سرکاری افسران سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی اور یہ دعوت اسی کا نتیجہ تھی۔ سی عبداللہ مراکش کے معروف عالم دین تھے اور وہ واحد شخص تھے، جو بادشاہ کے ہاتھ کو بوسہ دینے سے مستثنیٰ تھے۔ وہ تنجیہ کے ایک قصبہ میں اپنے چھوٹے سے محل میں اقامت پذیر تھے اور وہیں پر انہوں نے اسد کو

Marfat.com

کھانے کی دعوت پر بلایا۔ یہاں وہ ان پرانے دنوں کا ذکر کرتے رہے، جب تیونس میں جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی، جس میں اسد نے اس وقت فعال کردار ادا کیا تھا، جب وہ کراچی میں پاکستان کی وزارت خارجہ اور پھر اقوام متحدہ میں سرکاری فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ رخصت ہوتے ہوئے تیونسی مہمان اپنے وزیراعظم بہی لدغم (Bahi Ladgham) کے لیے اسد کا نیک تمناؤں کا پیغام لیتے گئے۔ اسد کے تیونس کے وزیراعظم سے اقوام متحدہ کے زمانہ ملازمت سے تعلقات چلے آ رہے تھے۔ ایک ہفتہ بعد رباط میں تیونس کے سفیر حبیب شطی (Chatti) نے فون پر ہمیں تیونس آنے کی دعوت دی۔

موسم خزاں کا ایک سہانا دن تھا، جب ہم تیونس پہنچے اور وہاں ہم نے پورا ایک مہینہ سرکاری مہمان کی حیثیت سے گزارا۔ وہاں ہماری ملاقات بہی لدغم سے ہوئی اور انہوں نے اس بات پر احتجاج کیا کہ ہم نے ''اپنا گھر'' چھوڑ کر مراکش میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ اس سے اگلے روز صدر حبیب بورقیبہ اور ان کی بیگم سے Carthage کی خوبصورت سرکاری اقامت گاہ پر ملاقات ہوئی۔ اسد کی حبیب بورقیبہ سے پہلی ملاقات کراچی میں ہوئی تھی، جب وہ ایک سیاسی مہاجر کی حیثیت سے ناگفتہ بہ حالات کا شکار تھے۔ اب وہ اپنے ملک کی کرسی صدارت پر متمکن تھے، لیکن ان کے برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی خاصے بے باک تھے اور بے تکلفانہ گفتگو کرتے تھے۔ انہوں نے ہمارے قیام کو اتنا آرام دہ بنا دیا کہ ہم یہی سمجھے کہ جیسے اپنے ہی گھر میں مقیم ہیں۔ اس مشہور شخصیت کے سیدھے سادے سبھاؤ نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ بڑے پُراعتماد سیاستدان تھے۔ جب انہوں نے تقسیم فلسطین کے منصوبے کو تسلیم کرنے کا عندیہ دیا تو عرب ممالک کے پریس نے ان پر شدید تنقید کی لاٹھیاں برسائیں۔ بعد میں فلسطینیوں نے خود اسی حل کو مان لیا اور اس کا سہرا اپنے سر پر سجا لیا۔ انہیں بڑے کٹھن مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر انہوں نے بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے حبیب بورقیبہ ہی کی پالیسی پر عمل کیا۔ جیسا میں نے کہا ہے کہ وہ حقیقی سیاستدان تھے، لیکن ان کے ملک کے حدود اربعہ کے باعث ان کا دائرہ اثر محدود رہا۔ اس وقت میں نے ان سے کہا تھا ''آپ اور ناصر اپنے ملک ایک دوسرے سے بدل لیں، کیونکہ مصر کی وجہ سے آپ کا سیاسی اثر و رسوخ بڑھ جائے گا۔'' میری بات سن کر انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ بعد میں اسد صدر، ان کی بیگم اور بیٹی سے ملے، تو انہوں نے بورقیبہ کو جمال عبدالناصر کا ناشائستہ زبان میں ذکر کرتے ہوئے سنا۔ وہ ناصر سے شدید نفرت کرتے تھے۔ ویسے اعتدال پسند عرب رہنما ناصر کے بارے میں اسی طرح اظہار خیال کرتا تھا۔

بطور سرکاری مہمان تیونس میں ہمیں جو تجربات ہوئے، ان میں یہاں میں ایک کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ یہ قومی تعطیل کا دن تھا اور ہمیں بزرتا (Bizerta) جانا تھا، جہاں ہمیں فوجی پریڈ دیکھنا اور ایک استقبالیہ میں شرکت کرنا تھی۔ علی الصبح ہم بذریعہ کار تیونس سے روانہ ہوئے، کیونکہ ہم نے وہاں صدر کا استقبال کرنا تھا، جو ہیلی کاپٹر پر وہاں پہنچ رہے تھے۔ اکثر مواقع کی طرح میرے ساتھ وزارت خارجہ کی ایک خاتون ہم سفر تھی۔ وہاں پہنچتے ہی اسد کو فی الفور الگ لے جایا گیا اور انہیں اطلاع دی گئی کہ وہ تمام ممالک کے سفارتی نمائندوں کے ساتھ صدر بورقیبہ کو

Marfat.com

خوش آمدید کہیں گے۔ بعد میں اسد یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ استقبال کرنے والوں کی طویل قطار میں انہیں سب سے پہلے کھڑا کیا گیا۔ اسد نے پس و پیش کیا، کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ ان کی حیثیت سفارت کار کی نہیں، لیکن محکمہ استقبالیہ کا افسر اعلیٰ بار بار انہیں یہی کہتا رہا کہ "آپ سفارت کار نہ سہی، لیکن آپ ہمارے قابل صد احترام مہمان ہیں۔"

پریڈ دیکھتے ہوئے صدر بورقیبہ نے اسد کو اپنے دائیں ہاتھ بٹھایا، جبکہ میں ان کے بالمقابل بالکنی میں صدر کی بیگم اور تیونس کی دیگر معزز خواتین کے ساتھ بیٹھی تھی۔

تیونس کے صدر بورقیبہ نے اسد کی عزت افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور یوں انہیں یہ بتانے کی کوشش کی کہ جن لوگوں نے ان کے ساتھ جنگ آزادی میں تعاون کیا، ان کو وہ کبھی نہیں بھولتے اور انہیں ہمیشہ اپنا محسن سمجھتے ہیں۔ برسوں ان کی یہ محبت اور مخلصانہ جذبات کی یاد ہمارے دل و دماغ سے محو نہیں ہوئی۔

تیونس میں اپنے ایک مہینہ قیام کے دوران میں ہم نے پورے ملک کی سیر و سیاحت کی۔ حبیب بورقیبہ اور بہی لدغم سے متعدد بار ملاقات ہوئی۔ مغرب کے تمام ممالک بڑے خوبصورت ہیں، لیکن تیونس میں آپ خود کو تاریخ میں گھرے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ کارتاجی، رومن، بربر، عرب اور ترک۔ اس ملک کی تہذیبی سطح بھی خاصی بلند ہے۔

(6)

یوں تجیہ میں ہمارے خوشیوں بھرے سال ایک ایک کر کے گزرتے رہے۔ بیچ بیچ میں غیر ملکی دوروں کا سلسلہ بھی جاری رہا، لیکن ان تمام مصروفیات کے باوجود اسد اپنے اہم منصوبے یعنی ترجمہ قرآن سے بھی غافل نہیں رہے۔

1972ء کے شروع میں ہماری پیاری سلو کی کتیا ازدر سرطان خون کے مرض میں مبتلا رہی اور کئی ماہ اذیتیں برداشت کرتے ہوئے بالآخر فوت ہوگئی۔ وہ برسوں ہمارے ساتھ رہی اور اس کی دائمی جدائی ہمارے لیے کسی تکلیف دہ سانحہ سے کم نہیں تھی۔ اس کے بعد اس موذی مرض کے سبب ہم نے اسے ساتھ لے جانا چھوڑ دیا اور اس کے علاج معالجے کی مقدور بھر کوشش کرتے رہے، لیکن وہ جانبر نہ ہوسکی۔ ہم سال میں دو بار بغرض سیر و سیاحت سپین جایا کرتے اور عفریت ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتا۔ بعد میں ہم نے انگلستان سے ایک اور سلو کی کتا خرید لیا، تاکہ عفریت اکیلا پن محسوس نہ کرے۔ اس کا نام [redacted] رکھا، لیکن ازدر کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ہم بذریعہ سمندری کشتی Algeciras کو عبور کرتے اور Costa de Sol جس کو ہم بالکل پسند نہیں کرتے تھے، کے قریب سے گزرتے ہوئے سیدھے اسپین پہنچتے تھے۔ جب بھی ممکن ہوتا، ہم ثانوی راستے اختیار کرتے۔ اگلے چند برسوں میں اس ملک کے اہم مقامات کے علاوہ دور افتادہ علاقوں میں گھومتے پھرتے رہے، لیکن بدقسمتی سے ہم کتالونیا (Catalunia) اور استوریاس (Asturias) نہ جاسکے۔ میں سپین کی محبت میں اس طرح گرفتار ہوئی، جیسے اسد برسوں پہلے عربوں کی محبت میں اسیر ہوئے تھے، لیکن ہماری محبتوں میں ایک فرق تھا اور وہ یہ کہ میں سپین کے شہروں اور مرغزاروں کی فدائی تھی، جبکہ اسد

Marfat.com

عربوں کی محبت میں دل و جان نچھاور کر چکے تھے۔

1976ء میں ہم سپین ہی میں تھے اور اس ملک کا یہ ہمارا آخری سفر تھا کہ ہماری چہیتی کتیا ازدر جس کو مرے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے، کا پرانا ساتھی عفریت گم ہو گیا۔ تنجیہ میں عفریت کی ایک بڑی رسولی کا اپریشن کرایا تھا۔ اس کے روبصحت ہوتے ہی ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور اس کے مشورے سے ہم اسے اپنے ساتھ سپین لے آئے۔ ہماری طرح وہ بھی سیر وسیاحت کو پسند کرتا تھا اور اسپین تو اس کا پسندیدہ ملک تھا، جہاں ہر کوئی اس کی تعریف کرتا اور پوچھتا کہ ''اس کی قیمت کتنی ہے؟''

مئی کے اواخر میں ہم سپین پہنچے، لیکن یہ سفر ہمارے لیے المناک یادیں چھوڑ گیا۔ موسم یکدم تبدیل ہو گیا اور خاصی گرمی پڑنے لگی۔ جب ہم سڑک پر دو راتیں گزارنے کے بعد میڈرڈ پہنچے تو عفریت کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ وہ پیشاب نہیں کر سکتا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم ایک ہوٹل کی اوپر والی منزل پر ٹھہرے ہوئے تھے اور ہمارا کمرہ خاصا گرم تھا۔ ہم ابھی یہ سوچ رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ معاً مجھے اس ہسپانوی ماہر حیوانات کا خیال آیا، جو تنجیہ میں ہمارے ان کتوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور اس سے ہماری خاصی جان پہچان ہو گئی تھی۔ اب وہ میڈرڈ میں رہائش پذیر تھا۔ چنانچہ ہم نے ٹیلی فون ڈائرکٹری سے اس کا نام (Dr. Antonio Molina Larré) تلاش کر کے اس سے رابطہ قائم کیا اور وہ فوراً ہمارے ہوٹل چلا آیا۔ اس نے عفریت کی تکلیف دور کرنے کے لیے حتی الوسع کوشش کی۔ پھر اسد اور وہ دونوں اسے ہسپتال ایکسرے کرانے لے گئے۔ ایکسرے کے ماہر پروفیسر کی رپورٹ کے مطابق عفریت کے گردوں پر شدید چوٹ لگی ہے۔ فوراً ہمیں یاد آیا کہ عفریت کی حالت بگڑنے سے ذرا پہلے کچھ ہسپانوی دوستوں نے ہمیں اپنے ہاں دوپہر کے کھانے پر بلایا تھا اور اس کے بعد ہم دونوں میزبان کی بیوی کے ساتھ باہر چلے گئے تھے۔ مجھے میزبانوں کے بے حد اصرار پر مجبوراً اسد کا ساتھ دینا پڑا۔ یوں ہم نے عفریت اور [redacted] کو اپنے دوستوں کے گھر چھوڑا۔ میں انہیں اکیلا چھوڑنے پر تذبذب کا شکار تھی، کیونکہ میں انہیں کبھی یوں چھوڑ کر باہر نہیں گئی تھی۔ مختلف بازاروں میں شاپنگ کے دوران میں پریشان رہی اور جلد واپس جانے پر اصرار کرتی رہی۔ واپس آئے تو دیکھا کہ میزبان دروازے پر غصے میں بھرا ہوا کھڑا تھا۔ ظاہر ہے، عفریت کو اچانک قدرتی حاجت نے تنگ کیا اور اسے باہر جانے کی ضرورت تھی، لیکن ایسا ممکن نہیں تھا، اس لیے اسے بالکنی کے بند دروازے کے سامنے رفع حاجت کرنا پڑی۔ ہمارا میزبان بالکل بے حس شخص تھا اور اس نے عفریت کی فطری ضرورت کا بالکل احساس نہیں کیا، جبکہ وہ انتہائی صاف ستھرا اور تربیت یافتہ کتا تھا۔ اس پر اسہال کا فوری حملہ ہوا تھا۔ جانوروں کی طرح انسان بھی ایسی صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ ہمارے خوش خلق میزبان کے ہاں مراکشی ملازم بھی تھا، لیکن اس نے گندگی کو صاف نہیں کرایا، شاید اس وجہ سے کہ وہ بیچارے عفریت کی ''بداعمالی'' کو ہمیں بتا سکے۔ کتا تو معذرت نہیں کر سکتا تھا، اس لیے میں نے میزبان سے فوری معذرت کی اور پانی کی بالٹی اور کچھ پھٹے پرانے کپڑے لے کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر اپنے

Marfat.com

ہاتھوں سے اس چھوٹے سے قیمتی اور بے داغ قالین کو صاف کیا۔ اسد، میرے میزبان اور ان کا مراکشی ملازم مجھے صفائی کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ اس اثنا میں اسد نے دیکھا کہ ہمارے دونوں کتے ہمارے میزبان کی موجودگی میں خود کو خاصے مضطرب محسوس کر رہے تھے۔ [redacted] تو اس پر غرایا بھی، حالانکہ وہ ایسا کبھی نہیں کرتا تھا۔

ہم میزبان سے اجازت لے کر وہاں سے جلد واپس چلے آئے۔ ہوٹل آتے ہی میں نے راستے میں دیکھا کہ عفریت سے ٹھیک طرح چلا نہیں جا رہا تھا، چنانچہ ہم اسے فوری گھر لے آئے۔

تمام تر دوڑ دھوپ کے باوجود جانوروں کا معالج، جو ہمارا دوست بھی تھا، عفریت کی جان بچانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تین روز تک انتھک کوششیں جاری رہیں، لیکن اس کی حالت سنبھل نہ سکی اور بالآخر وہ مر گیا۔ میں نے اسے دفنانے کے لیے ڈاکٹر مولینا سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ عام حالات میں کسی جگہ گڑھا کھود کر اسے دبا دیا جاتا ہے، لیکن عفریت تو الگ ہی نوعیت کا کتا تھا۔ عجیب بات تھی کہ میڈرڈ میں پالتو جانوروں کو دفنانے کے لیے کوئی مخصوص جگہ نہیں تھی۔ عام طور پر مردہ جانوروں کو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا تھا۔

اچانک مجھے یاد آیا کہ تنجیہ میں میری ایک کٹالی (Catalian) دوست تھی، اس کا بیٹا میڈرڈ میں رہتا تھا۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اپنی والدہ کی طرح کتوں سے پیار کرنے والا شخص تھا اور اس نے میڈرڈ سے ذرا ہٹ کر ایک ایسی کھلی جگہ بنا رکھی تھی، جہاں وہ آوارہ اور لاوارث کتوں کو پناہ دیتا تھا اور ان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس نے فوراً ہم سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ ہم عفریت کو کتوں کے لیے مخصوص احاطے میں دفن کر سکتے ہیں، لیکن یہ بھی اطلاع دی کہ اس کے پاس کوئی ایسا شخص نہیں، جو گڑھا کھود سکے۔ جزوی طور پر لنگڑا ہونے کے باعث وہ خود بھی یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے (Casados) احباب میں سے ایک کو اپنی مشکل بتائی۔ وہ الکاتا دہینارس (Alcata de Henares) میں ذاتی گھر کا مالک تھا جس میں وسیع خوبصورت باغ بھی تھا اور اس کے ایک کونے میں اس کے اپنے کتوں کی کئی قبریں تھیں۔ سپین میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو جانوروں سے محبت کرتے ہیں۔

ہم عفریت کی لاش کو الکاتا دہینارس لے گئے اور وہاں اسے دفن کر دیا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ وہ ہمیشہ سفر میں خوش رہتا تھا اور مختلف مناظر سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ اب موت کے بعد اس کا ایک نیا سفر شروع ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی عمر چودہ سال سے تھوڑی سی کم تھی اور یہ کتوں کا بڑھاپا ہے، پھر بھی ہم دونوں کو اس کی موت سے شدید دھچکا سا محسوس ہوا۔ ہم براستہ پرتگال واپس تنجیہ پہنچے تو اکیلا [redacted] ہمارے ساتھ تھا۔ ہم جہاں بھی جاتے، وہ ہمارے ساتھ ہی ہوتا ہے، لیکن وہ طبعاً سفر سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔

(7)

1970ء کی دہائی کے شروع میں اسد کی دوبارہ اپنے دوست شاہ فیصل سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ملاقات جنیوا میں ہوئی، جہاں انٹرنیشنل ہوٹل میں انہوں نے گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ انہوں نے عربی لباس پہن رکھا تھا اور

Marfat.com

بہت سے مصاحبین میں گھرے ہوئے تھے۔ان میں سے اکثر اسد کو ان کے قیام سعودی عرب کے زمانے سے جانتے تھے۔اسد اور شاہ فیصل مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ان میں سرفہرست مسئلہ فلسطین تھا،جس کی حل کی مستقبل میں بھی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔اس مسئلہ کے بارے میں ہم تینوں کا مؤقف ایک ہی تھا۔عرب بادشاہ مہمان کو جانے کے لیے خود نہیں کہتے۔شاہ فیصل سے رخصت ہونے کی اجازت لینے سے تھوڑی دیر قبل اسد نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ مکہ میں واقع رابطہ عالم اسلامی کے ساتھ اپنے کشیدہ تعلقات کو بحال کرانے میں ان کی مدد کر سکتے ہیں،تو انہوں نے سفارت کارانہ انداز میں جواب دیتے ہوئے اسد کو مکہ آنے کو کہا اور میری طرف دیکھتے ہوئے ''میری بہن کے ساتھ'' کے الفاظ کہے اور یوں ان کے مخالفین سے براہ راست رابطہ قائم کر کے صلح صفائی کی کوئی صورت نکالی جائے گی۔ شاہ فیصل ذاتی طور پر اس الجھیڑے سے الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے اور میرے خیال میں ان کا یہ فیصلہ درست تھا،لیکن قدرتی طور پر ہمیں ان کے مؤقف سے سخت مایوسی ہوئی۔جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے،ان سے جب بھی اس تنازعہ کا ذکر کیا جاتا تھا،وہ کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے گریز کرتے تھے۔

دوسری ملاقات رباط میں ہوئی،جہاں شاہ فیصل سرکاری دورے پر تشریف لائے تھے۔اسد کے پرانے دوست فخری شیخ العرض نے انہیں وہاں مدعو کیا تھا اور ان دنوں وہ رباط میں سعودی عرب کے سفیر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔میرے شوہر کی طرح فخری اور ان کے پورے خاندان کے،جو نسلاً دمشقی اشرافیہ سے تعلق رکھتا تھا،سعودی عرب کے شاہی خاندان سے عبدالعزیز ابن سعود کے زمانے سے قریبی تعلقات تھے۔اسی حوالے سے فخری نے مناسب سمجھا کہ وہ اسد کو رباط بلا کر شاہ فیصل سے ملاقات کا موقع فراہم کرے۔(اگرچہ میں بھی اسد کے ساتھ تھی،لیکن ایسی ملاقاتیں صرف مردوں تک محدود ہوتی ہیں،اس لیے میں ہوٹل ہی میں ٹھہرتی)۔سعودی عرب کے سفیر کی پہلی دعوت میں اسد اپنے پرانے دوستوں سے ملتے رہے۔پھر یہ اعلان کیا گیا کہ ''سرکاری'' مہمان دونوں بادشاہوں سے ان کے کمرے میں جا کر مل سکتے ہیں،کیونکہ شاہ حسن بھی وہیں موجود تھے۔اسد دیگر مہمانوں کے ساتھ ملحقہ کمرے میں چلے گئے اور وہاں کھڑے سکیورٹی والوں نے ان سے ''تعارفی اسناد'' طلب کیں۔سعودی عرب میں کبھی ایسی صورت حال پیدا نہیں ہوئی تھی۔جب حفاظتی عملہ کو معلوم ہوا کہ اسد کے پاس ایسے کوئی اسناد موجود نہیں،تو انہیں اندر جانے سے روک دیا گیا۔اسد نے اس بندش پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا،بلکہ کمرے میں الگ سے کھڑے ہو گئے۔جب شاہ فیصل اس کمرے میں داخل ہوئے،کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی تو اسد کو دیگر مہمانوں سے ہٹ کر کھڑے دیکھا۔ خوبصورت انداز سے شاہ فیصل سیدھے اسد کی جانب بڑھے،گرمجوشی سے ان کے ساتھ بغل گیر ہوئے اور قدیم نجدی طریقے سے ان کی پیشانی اور ناک کی نوک پر بوسہ دیا(وہ کسی شاہ،حتیٰ کہ عبدالعزیز ابن سعود کے ہاتھ کو بھی بوسہ نہیں دیتے تھے۔سعودی عرب میں ان سے یا کسی اور سے ایسی توقع بھی نہیں کی جاتی تھی۔بنیادی طور پر یہ ایک جمہوری ملک کی علامت ہے)۔یہ انداز ملاقات کسی عام آدمی کا نہیں تھا،بلکہ ایک طاقتور حکمران کا تھا،جو شاذونادر ہی کسی شخص سے اس بے تکلفانہ طریقے سے ملتا تھا۔یہ آخری موقع تھا کہ اسد نے ان کے پُرخلوص اور محبت بھرے چہرے کو دیکھا۔

Marfat.com

25 مارچ 1975ء کی دوپہر کو ہم حسب معمول بی بی سی کا خبرنامہ سن رہے تھے کہ چند منٹ قبل اس عظیم شخص کے قتل ہونے کا سن کر ہمیں دھچکا سا محسوس ہوا۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ میں نے اسد کو زار و قطار روتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے فوراً رباط میں فخری شیخ العرض کو فون کیا۔ فخری نے ابھی یہ خبر نہیں سنی تھی، لیکن مجھے یقین ہے کہ انہوں نے بھی یہ خبر سنتے ہی چلانا شروع کر دیا ہوگا۔

(8)

1970ء کی دہائی کے دوسرے نصف حصے میں اسد کو لندن میں منعقد کئی کانفرنسوں میں بلایا گیا۔ ان میں بیشتر کا اہتمام اسلامی کونسل نے کیا، جس کے سیکرٹری جنرل ہمارے دوست سالم عزام تھے۔ وہ اسد کے قریبی دوست ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کے چھوٹے بھائی تھے اور اب معروف اسلامی شخصیت کی حیثیت سے ان کی اپنی الگ پہچان تھی۔ جب عزام خاندان والوں کے سعودی عرب کے مقتدر افراد سے روابط استوار ہوئے، تو سالم وہاں کی سفارتی ملازمت میں شامل ہو گئے اور لندن میں سفارت اعلیٰ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ بعد میں وہ سفارتی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے، لیکن اسلامی کونسل سے الگ نہیں ہوئے، کیونکہ یہ انہی کی سوچ کا مظہر تھی اور وہ اب تک فعال کردار ادا کر رہا ہے۔

لندن کے ان دوروں میں ایک بار میں بھی ان کے ساتھ تھی اور وہیں سعودی عرب کے وزیر تیل شیخ احمد ذکی یمانی سے اسد کی دوسری اور میری پہلی ملاقات ہوئی۔ ان کی خوبصورت نوجوان بیوی اور پہلی بیوی سے دونوں بیٹیاں بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ اس وقت ایک نئے انگریزی ماہنامہ ''عربیا'' کی اشاعت کا آغاز ہو رہا تھا، جس کا بیشتر حصہ محمد اسد کے علمی کاموں بالخصوص ان کے ترجمہ قرآن کے لیے مختص کیا گیا تھا[121]۔ وہیں ہماری ملاقات شاہ فیصل کے بیٹے شہزادہ محمد سے ہوئی۔ ہم پہلے سے انہیں جانتے تھے اور اس کے بعد بھی ان سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ اس تقریب میں سعید رمضان اور دیگر پرانے دوستوں کے علاوہ یمن سے تعلق رکھنے والے الوزیر برادران سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا، جن کا باپ ممتاز محب وطن شخص تھا اور امام بدر کے والد نے اس کا سر قلم کر دیا تھا۔ اس خاندان کے تمام لوگ راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور انہی میں ایک ابراہیم نامی شخص، آزاد خیال اور اعلیٰ پایہ کا اسلامی عالم تھا۔

1970ء کی دہائی کے یہ آخری سال نہایت اہم تھے اور ان میں رونما ہونے والے واقعات نے ہماری خوشیوں کو دوبالا کر دیا۔

قرآن کا ترجمہ و تفسیر مکمل ہوتے ہی اسد کو جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی بڑی اور فعال جماعت نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ یہ تمام مسلمان ہندی الاصل اور انگریزی بولتے اور سمجھتے تھے۔ وہاں انہوں نے سلسلہ وار لیکچر دیئے، کیونکہ وہ ہمیشہ فی البدیہہ اظہار خیال کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ ان تقاریر کے موضوعات قرآن سے متعلق تھے اور جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے انہیں بڑی توجہ سے سنا۔ علاوہ ازیں انہوں نے اسد کی مہمان نوازی میں بھی کوئی کسر اٹھا

Marfat.com

نہ رکھی۔ وہ جب لندن واپس پہنچے تو جہاز کے طویل سفر سے وہ تھکاوٹ کے باعث بے حال ہو چکے تھے۔ انہوں نے یہ سفر جہاز کی فرسٹ کلاس کے مسافر کی حیثیت سے کیا تھا۔ وہ سیدھے ہوٹل پہنچے اور وہاں سنگ مرمر کی ایک کم گہری سیڑھی سے ٹھوکر کھا گئے، کیونکہ اس میں اور فرش کے سنگ مرمر میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ وہ زمین پر گرے، لیکن جلد کھڑے ہو گئے اور یہی سمجھتے رہے کہ انہیں کچھ نہیں ہوا، لیکن جب میں اگلے روز تنجیہ کے ہوائی اڈے سے انہیں لینے کے لیے گئی تو وہ غیر معمولی طور پر تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔

تقریباً ایک ماہ بعد طلال اسد ہمیں ملنے آیا۔ تھوڑا عرصہ قبل اس کی والدہ کا ریاض میں انتقال ہوا تھا اور اس نے اپنی والدہ کے آخری ایام میں ان کے ساتھ رہنے کے لیے ہل (Hull) یونیورسٹی سے رخصت لے رکھی تھی۔ اس کے انگلستان واپس پہنچنے پر میں نے اسے خط لکھا کہ ہمیں اس کی والدہ کے کینسر کے موذی مرض کے سبب رحلت پر گہرا افسوس ہوا ہے اور یہ جان کر قدرے اطمینان ہوا کہ اس نے والدہ کے پاس کچھ وقت گزارا۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ اس کا باپ ابھی زندہ ہے اور اس کی پدرانہ شفقت میں کوئی کمی نہیں آئی، اس لیے تم کچھ وقت ہمارے پاس آ کر گزارو۔ ہم کئی برس مراکش میں رہے اور اس عرصے میں طلال اور اس کی بیوی تانیا ایک یا دو بار ہمارے پاس آئے۔ میں ہر ممکن طریقے سے کوشش کرتی رہی کہ باپ بیٹے کے تعلقات قائم رہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں استحکام پیدا ہوتا جائے۔

طلال کے آنے کے اگلے روز ہم تینوں گھومنے پھرنے نکل گئے اور اپنے پالتو کتوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ واپسی پر [redacted] سے اچانک ایسی فوری حرکت سرزد ہوئی کہ اسد اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور زمین پر گر پڑے اور ان سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ طلال اپنے ساتھ کار لے کر آیا تھا۔ چنانچہ ہم اسد کو گھر لائے اور کئی ڈاکٹروں کو فون گھمانے شروع کیے۔ چھٹی کا دن تھا اور کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ ایسی بحرانی صورت حال میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ شام کے قریب ہمارا ایک ناواقف ڈاکٹر سے رابطہ ہوا اور وہ گھر پہنچا۔ ہم نے اسد کو نیچے سیڑھیوں کے پاس ہی صوفے پر لٹا دیا تھا اور انہیں ہلنے جلنے سے منع کر دیا تھا۔ میں پہلے سے جان چکی تھی کہ اسد کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ انتہائی سرسری اور غیر ماہرانہ تشخیص کے بعد ڈاکٹر نے تجویز کیا کہ کولہے پر کوئی مرہم لگا کر ہلکا سا مساج کر دیا جائے اور علی الصبح انہیں ایکسرے کے لیے ایمبولینس میں بٹھا کر شہر کی کسی مناسب علاج گاہ میں لے جایا جائے۔

صبح ہوتے ہی کلینک فون کیا، جو ہمارے ایک دوست سرجن کی ملکیت تھا اور اسے کہا کہ جلد ''آگ بجھانے والے محکمہ'' سے رابطہ کریں۔ بالآخر میرے التماس پر وہ خود اپنی ایمبولینس میں اسد کو لے کر کلینک چلے گئے اور یہیں سے ہماری ذاتی افتاد کا آغاز ہوا۔

ایکسرے سے پتہ چلا کہ ران کی ہڈی کے اوپر کا حصہ ٹوٹ گیا ہے اور اسد کو مزید تکلیف سے بچانے کے لیے ان کی کمر سے پاؤں کے انگوٹھے تک پلستر لگا دیا گیا، لیکن شکستہ ہڈی کو اپنی جگہ پر رکھنے کے لیے چھوٹی کیلیں (pins) بھی نہیں لگائی گئیں۔ ابتدا ہی سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ ''علاج'' درست نہیں، چنانچہ میں نے اپنے

Marfat.com

مشتر کہ دوست ڈاکٹر عبدالکریم الخطیب کو فون کیا۔ وہ ایک معروف سرجن تھے اور رباط میں ان کا ذاتی ہسپتال تھا۔ بدقسمتی سے میرا ان سے براہ راست رابطہ نہ ہوسکا، لیکن تقریباً پانچ روز بعد انہوں نے خود ہی مجھے فون کیا۔ وہ شادی کی ایک شاہی تقریب میں شرکت کے لیے تنجیہ آئے ہوئے تھے اور اسی میں ہمیں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ انہیں اس حادثے کا بالکل علم نہیں تھا، جو اسد کو پیش آیا تھا، لیکن جب میں نے انہیں تمام حالات بتائے اور ان سے ایکسرے ملاحظہ کرنے کی درخواست کی، تو وہ فوراً اسد کو دیکھنے کلینک پہنچ گئے۔ وہ بجا طور پر مُصر تھے کہ اسد کو بلاتاخیر رباط کے سرکاری ہسپتال میں بذریعہ ایمبولینس منتقل کیا جانا چاہیے۔ اس ہسپتال میں جدید طبی سہولتیں میسر ہیں اور پیچیدہ آپریشنوں کے لیے تمام ضروری جراحی آلات بھی موجود ہیں۔ ایک دردمند دوست کی حیثیت سے اسد کو وہاں لے جانے کے لیے ضروری انتظامات بھی کردیئے۔

ہسپتال میں ہم نے جو وقت گزارا، میں اس کا ذکر نہیں کروں گی، لیکن اتنا ضرور بتاؤں گی کہ وہاں ایک نوجوان مراکشی ڈاکٹر نے آپریشن کیا اور اسد کی ٹوٹی ہوئی ران کی ہڈی کی مصنوعی عضو بندی (prosthesis) کردی گئی۔ پندرہ دن گزر گئے، لیکن اس دوران میں کوئی مناسب فزیوتھراپی کی گئی اور نہ مریض کی دیکھ بھال کی طرف ہی کوئی توجہ دی گئی۔ (بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انہیں آپریشن کے چند روز بعد ہی چند قدم چلنا شروع کردینا چاہیے تھا)۔ چنانچہ ہم نے بذریعہ ایمبولینس تنجیہ واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہاں طلال مضطرب حالت میں ہمارا انتظار کررہا تھا، کیونکہ ہماری غیرموجودگی میں وہی گھر کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ اسے اپنے باپ کے ساتھ ہسپتال میں رہنے کی اجازت ملنا ممکن نہیں تھا، اس لیے میں نے یہ فرض ادا کیا، لیکن اس کے لیے بالغ اصحاب سے کہلوانا پڑتا۔ ہماری واپسی کے فوراً بعد طلال نے بتایا کہ اسے اگلے روز صبح سویرے ہی لندن واپس جانا ہے۔ یہ جان کر مجھے قدرے ملال ہوا کیونکہ یہی ایسا وقت تھا، جب اسد کو اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ رہنے کی ضرورت تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو میرے لیے خوشی اور طمانیت کا باعث ہوتا۔

اگلا سال اسد نے بیساکھی کے سہارے گزارا اور اس کی 'تبدیل شدہ' ران کی ہڈی میں شدید درد شروع ہوگیا۔ چنانچہ ہم انہیں مخصوص سرجن کو دکھانے لندن چلے گئے، جس نے تفصیلی معائنے کے بعد بتایا کہ جو مصنوعی ہڈی لگائی گئی، اس کا سر قدرے چھوٹا ہے، لیکن اسے بروقت ٹھیک کیا جانا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہ کیا گیا، چنانچہ ہمیں دوبارہ لندن جانا پڑا اور ہمارے ایک مہربان اور انتہائی کارگر ڈاکٹر کی ہدایت پر انگلستان کے ایسے سرجنوں سے رابطہ ضروری سمجھا گیا جنہیں ایسے آپریشنوں میں مہارت تامہ حاصل تھی، لیکن ان آرتھوپیڈک سرجنوں کی رائے میں تبدیل شدہ ہڈی کی 'نوک پلک' درست کرنا مناسب نہیں۔ بالآخر اپنے اسی مہربان ڈاکٹر کے مشورے سے اسد کو ایک دوسرے سرجن کے پاس لے گئے، جس نے ہمیں بڑے ہمدردانہ لہجے میں بتایا کہ اگر متعلقہ جگہ کو کھولا گیا اور کہیں سوجن (infection) محسوس نہ ہوئی تو وہ آپریشن تو کردے گا لیکن اس سے ٹانگ قدرے چھوٹی ہوجائے گی اور اسد کو زندگی بھر کندھے نیچے کیے لنگڑاتے ہوئے چلنا پڑے گا۔ اس طرح چلنے کا اس نے عملی مظاہرہ بھی کرکے دکھایا۔ بامر

Marfat.com

مجبوری اپنی پسند کے پہلے سرجن ہی سے آپریشن کرایا۔ باوجودیکہ اصل ہڈی کے بیشتر حصے کو چھیلنا پڑا، لیکن آپریشن ہر طرح سے کامیاب رہا۔ اسد کو آپریشن تھیٹر لے جاتے ہوئے ڈاکٹر نے پوچھا کہ آپریشن میں کم از کم پانچ گھنٹے لگ جائیں گے اور اتنی دیر یہاں کون رہے گا۔ اس نازک اور پریشان کن صورت حال میں میرے علاوہ اور کون وہاں رک سکتا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد ڈاکٹر اس کمرے میں آیا، جہاں میں بیٹھی انتظار کی تلخ گھڑیاں گزار رہی تھی اور اس نے مجھے پرانی ران ہڈی بطور ''سوونیئر'' دی اور ساتھ ہی مطلع کیا کہ خلاف توقع کم وقت میں آپریشن مکمل ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اصل ہڈی (یعنی میرا سوونیئر) کو پہلی بار ٹھیک طرح سے ڈھانپا (cement) نہیں گیا تھا اور اسی وجہ سے اسد ایک سال تک لڑکھڑاتے ہوئے چلتے رہے۔

دو روز بعد اسد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے اور قدرے لنگڑاہٹ سے ہسپتال کے برآمدے میں آہستہ آہستہ چلتے رہے اور انہوں نے کوئی درد بھی محسوس نہیں کی۔ اس وقت ان کی عمر اسی سال تھی۔

ہمیں لندن آئے ہوئے تقریباً دو ماہ ہو چکے تھے، کیونکہ ہمیں انتظار تھا کہ سرجن کونسے ہسپتال کا انتخاب کرتا ہے۔ اس دوران میں ہماری کئی دوستوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، خاص طور پر اسد کے سوتیلے بھائی مارٹن اپنی بیگم سمیت ملنے آئے۔ ان سے ہمارا کوئی براہ راست تعلق تو نہیں تھا، پھر بھی وہ بڑے نفیس طبع میاں بیوی تھے۔ وہ طلال اور اس کی بیوی کے قریبی احباب میں سے تھے، لیکن انہوں نے ہمیں بھی اپنے دوستوں میں شمار کر رکھا تھا۔ مارٹن دانتوں کا کامیاب ڈاکٹر تھا اور ان دنوں اس کی بیوی ایوالطبی تحقیق میں مصروف تھی۔ وہ یہودی النسل تھے اور اسرائیل سے گہرا جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ میرے خیال میں مارٹن اپنی بیوی کی وجہ سے کھل کر اسرائیل کی حمایت کرتا تھا، کیونکہ وہ جرمنی میں نازیوں کے مظالم کا شکار ہوئی تھی، لیکن اسرائیل سے اتنی گہری جذباتی وابستگی کے باوجود وہ ہم سے دوستی نباہتے رہے اور کبھی اسرائیل کے مسئلہ پر گفتگو کی اور نہ فلسطینیوں کے بارے میں اپنی عملی کوششوں کا ذکر کیا۔

طلال اور اس کی بیوی تانیا اسد کی مزاج پرسی کے لیے لندن آئے۔ گذشتہ ایک سال سے تنجیہ میں ہمیں ان کا کوئی خط موصول نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے والد کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا، لیکن اس نے کبھی تنجیہ میں پیش آنے والے حادثے کا ذکر تک نہیں کیا، جس کے باعث ہمیں ان تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑا، حالانکہ یہ حادثہ اس کی موجودگی میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ اس عرصے میں وہ اپنے مختلف دوستوں اور مداحوں کو یہی باور کراتا رہا کہ رباط میں اس کے والد کا کامیاب آپریشن ہوا ہے اور اب وہ بالکل صحت مند ہو چکے ہیں۔ معلوم نہیں کہ وہ یہ سب کچھ کیوں کہہ رہا تھا، جبکہ اس نے ہمیں کبھی پوچھا تک نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے باپ سے حقیقی محبت کرتا تھا، لیکن 1952ء سے اس نے خود ہی دیوار کھڑی کر دی تھی، اب اس کو ہٹانا ممکن نہیں تھا، اس لیے آخر تک طلال کے اپنے والد سے تعلقات میں کھچاؤ رہا۔

Marfat.com

(9)

مجھے سراوک (Saravak) کی یاد بری طرح ستا رہی ہے۔ یہ ملائشیا کا ایک حصہ ہے اور یہاں اسد کو پہلی بار آنے کی دعوت دی گئی۔ یہ ان کے دو آپریشنوں کا درمیانی وقفہ تھا۔ اچانک ایک روز سراوک کے وزیر اعلیٰ تن دتک عبدالرحمٰن بن یعقوب کی جانب سے وہاں ایک سیمینار میں شمولیت کے لیے بلایا گیا۔ یہ مذاکرہ نوجوان مسلمان مردوں اور عورتوں کو دور حاضر کے مسائل سے آگاہ کرنے کے لیے منعقد کرایا جا رہا تھا۔ اسد ایسی تقریبات کے غیر رسمی پن کو بہت پسند کرتے تھے اور اس سیمینار کے میزبان تن دتک (Tun Datuk) کے تو وہ گرویدہ ہو گئے تھے۔ اس غیر معمولی شخص نے خود مختار سراوک کو ملائشین فیڈریشن کا حصہ بنایا اور وہ ملائشیا کی عمومی سیاسی زندگی کی روح رواں تھے۔ وہ خاصے تعلیم یافتہ بیرسٹر اور آزاد خیال سرگرم مسلمان تھے۔ اسد ان کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں گھنٹوں بات چیت کرتے رہتے اور وہ بیشتر معاملات میں اسد کے ہم خیال تھے۔ اس شخص کی انتھک کوششوں سے نوجوان خواتین معاشرے میں اپنا جائز مقام حاصل کرنے کے لیے جو تگ و دو کر رہی تھیں، اس سے اسد بہت متاثر ہوئے اور یہ گہرا تاثر ان کے تنجیہ واپس آنے تک قائم رہا۔ سراوک میں مختصر قیام کے دوران میں انہیں ہر روز کھانے میں جھینگا مچھلیاں ضرور پیش کی جاتی تھیں اور وہ اس پیشکش کو کبھی بھلا نہ سکے۔ خوش نصیب سراوک میں جھینگوں کو ''غریب لوگوں کا کھانا'' سمجھا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ بعد تن دتک اپنی بیگم نوراہ اور کئی پوتوں سمیت ہمیں ملنے تنجیہ آئے۔ ہم ان کو خوش آمدید کہنے ہوائی اڈہ پہنچے تو بیسیوں افراد خانہ اور کچھ احباب بھی ان کے شریک سفر تھے۔ وہاں ہمارے لیے یہ منظر پریشان کن تھا کہ ایک مستعد کسٹم انسپکٹر نے نوراہ کے سفارتی پاسپورٹ کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے ان کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذی بیگ کو کھولا، جس میں بھنی ہوئی مونگ پھلی تھی، جو ان کا پسندیدہ کھاجا تھی۔ بظاہر تو اسے معمولی سی فروگذاشت کہا جا سکتا ہے، لیکن انسپکٹر نے اس کی بغور تلاشی لی۔ غالباً اسے شک تھا کہ اس میں کہیں منشیات نہ چھپائی گئی ہوں۔ ہم نے انسپکٹر کے اس رویے پر احتجاج کیا، لیکن تن دتک بڑے نرم اور دھیمے لہجے میں کہنے لگے کہ ''یہ شخص تو صرف اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔''

ازاں بعد ہمیں اس وقت بلایا گیا، جب سراوک کی ملائشین فیڈریشن میں شمولیت کی سالگرہ منائی جا رہی تھی اور انہی دنوں تن دتک اور نوراہ کی کئی بیٹیوں کی شادی کی تقریبات بھی ہو رہی تھیں۔ ہمارے علاوہ اور بھی بہت سے مہمان مدعو تھے، لیکن ہر ایک یہی سمجھ رہا تھا کہ اسے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا۔ ہمارے قیام کے دوران میں کئی سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات منعقد ہوئیں، لیکن ان میں یادگار عروسی تقریب تھی جو گورنر کی اقامت گاہ پر منعقد ہوئی اور جس میں مہمانوں کی کثیر تعداد موجود تھی (تن دتک سراوک کے گورنر تھے اور ان کے بھتیجے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے تعینات تھے)۔ تمام مہمانوں کا پُر تپاک استقبال کیا گیا اور ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ یہ تقریب پُر تکلف انتظام و انصرام کی اعلیٰ مثال تھی۔ خصوصی مہمانان گرامی کی شمولیت نے اس تقریب شادی کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

Marfat.com

شادی تو اسلامی طریقے ہی سے انجام پائی، لیکن اس میں ہندوانہ رسوم اور ثقافتی آثار کی جھلک صاف طور پر دکھائی دیتی تھی۔

ملائشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد اپنی بیگم کے ساتھ مسند نشینی کی تقریبات میں شرکت کے لیے کوالالمپور سے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے ہمیں واپسی پر کوالالمپور آنے کی دعوت دی۔

سراوک میں تن دتک نے ہمارے ساتھ خصوصی برتاؤ کا ایک اور موقع نکال لیا۔ قبل ازیں وہ اسد کو بذریعہ ہیلی کاپٹر ایک گھنے جنگل میں لے گئے اور وہاں ایک ایسی بستی دکھائی جہاں زمین سے خاصی بلندی پر لمبی لمبی لکڑیوں کے بڑے بڑے گھر بنائے گئے تھے، جن کو دایک (dayak) کہا جاتا ہے۔ اب وہ مجھے بھی اس انوکھے تجربے میں شامل کرنا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے ہمارے لیے ہیلی کاپٹر کا اہتمام کیا اور ہم اس جنگل کی طرف چل پڑے۔ ہیلی کاپٹر کی نیچی پرواز کے باعث ہم اس وسیع و عریض جنگل کے گھنے پن سے قدرے خوفزدہ بھی تھے۔ ایک قدرے کھلی جگہ پر ہیلی کاپٹر اترا۔ ان دایک گھروں میں سراوک کے مقامی لوگ اور کچھ بورنیو (Borneo) کے باشندے رہائش پذیر تھے۔ یہ اسلام اور مسیحیت دونوں مذاہب کے ماننے والے تھے، البتہ جن افراد سے ہماری ملاقات کرائی گئی، وہ غالباً مسیحی تھے۔ وہ بڑے مہمان نواز اور کم گو دکھائی دیتے تھے، کیونکہ وہاں گاہے بگاہے ''مراعات یافتہ'' غیر ملکی آتے رہتے تھے۔ تن دتک کے آباؤ اجداد کا تعلق بھی انہی افراد سے تھے، لیکن چند پیڑھیاں پہلے انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ درمیانی عمر کے ایک کوتاہ قد، مضبوط جثہ اور شاہانہ طور طریقے رکھنے والے شخص تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا والد ایک مچھیرا تھا۔

واپسی پر ہم چند روز کوالالمپور ٹھہرے اور وہاں وزیر اعظم سے ملاقات ہوئی۔ یہاں اسد نے ریڈیو اور ٹیلی وژن پر کئی فی البدیہہ تقریریں کیں۔ کوشنگ (Kuching) میں بھی ان کا یہی معمول رہا۔ سرکاری سطح پر ہمارے قیام و طعام کا انتظام کیا گیا اور جب دل چاہے، ہمیں یہاں بلا روک ٹوک آنے کی پیشکش کی گئی، مگر بدقسمتی سے خواہش کے باوجود ہم یہاں دوبارہ نہ آ سکے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ہم نے اپنے محبوب شہر تنجیہ سے نقل مکانی کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ گذشتہ چند برسوں سے یہاں کا خوشگوار بین الاقوامی ماحول بگڑنا شروع ہو گیا تھا اور جیسا کہ ہمیشہ سابقہ نو آبادیاتی ممالک میں ہوتا ہے، یہاں بھی غیر ملکیوں سے نفرت کی لہر چل پڑی اور یہ ہسپانوی صحارا میں رونما ہونے والے واقعات اور مابعد کے گرین مارچ میں یہ لہر زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ اگرچہ ہم جذباتی طور پر اس شہر سے منسلک تھے، لیکن مراکشیوں کے، جو طبعاً روادار اور دوست نواز ہیں، عمومی رویوں میں تبدیلی افسوسناک تھی۔ بعد میں ایران کے واقعات اور ''اسلامی بنیاد پرستی'' نے غیر ملکیوں سے نفرت کے جذبات کو مزید بھڑکا دیا۔ ابتدا میں اسد رسوم کی اساسی عقائد کی بجا آوری پر زور دیتے تھے، لیکن وہ ''اسلامی بنیاد پرستی'' کی اصطلاح کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ میرے خیال میں اس کے لیے موزوں اصطلاح ''اسلامی کٹر پن'' ہے۔ درحقیقت ایران کے واقعات کا بقیہ دنیائے اسلام سے کوئی

Marfat.com

تعلق نہیں تھا، کیونکہ وہ زیادہ تر سُنّی العقیدہ ممالک ہیں، لیکن پھر بھی ہر مسلمان ملک کے بعض گمراہ اور انتشار ذہنی کے شکار افراد اس ایرانی صورت حال سے متاثر ہوئے۔ وہ جذباتی طور پر اسلام سے وابستہ تھے اور وہ ان واقعات کا رشتہ اسلام ہی سے جوڑتے تھے۔ بدقسمتی سے پیغمبر اسلام کی اصل اور بنیادی تعلیمات کی جانب رجوع کرنے کے بجائے یہ گم کردہ راہ افراد زیادہ تر ایسے مذہبی اور تہذیبی عوامل کی جانب متوجہ ہو گئے، جو چند صدیاں پہلے کے دور انحطاط سے تعلق رکھتے تھے اور یوں اس دور زوال کو اپنے غیر متوقع نتائج کے حوالے سے دوام حاصل ہو گیا۔

اسد نے ہندوستان میں اپنے قیام کے ابتدائی زمانے میں تحریراً اور تقریراً اس بات پر بہت زور دیا کہ مسلمانوں کو اپنی زندگیوں کو قانون اسلام یعنی شریعت کے مطابق بسر کرنا چاہیے اور اس کے لیے شریعت کی حقیقی شکل و صورت کو سامنے لانا ہو گا، جس پر صدیوں کے اضافوں نے اتنی دبیز تہہ چڑھادی ہے کہ اس کی اصل صورت مسخ ہو کر رہ گئی ہے اور اب اس پر عمل کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اسد نے اپنے ان خیالات کو بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی کتاب ''اسلام میں حکومت اور ریاست کے اصول'' اور برسوں بعد شائع ہونے والی کتاب ''یہ قانون ہمارے اور دیگر مضامین''[122] میں بیان کر دیا ہے۔ محمد اسد کو اپنی زندگی کے آخری دنوں تک یہ پختہ یقین تھا کہ اسی طریقے سے مسلمانوں میں صحیح اسلامی روح بیدار ہو گی اور ان کے روشن مستقبل کی راہیں متعین ہوں گی۔

(10)

1983ء کے آغاز میں اسد اور میں کئی بار پرتگال گئے۔ اس ملک اور یہاں کے لوگوں سے ہم اتنے متاثر ہوئے کہ یہاں جلد منتقل ہونے کا ارادہ کر لیا۔ پرتگال یورپ کا واحد ملک ہے، جہاں نسل پرستی کا کہیں وجود نہیں۔ شاید اس کا ایک وجہ یہ ہے کہ اکثر پرتگالیوں نے یا تو مشرق بعید، افریقہ اور برازیل میں اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ گزارا ہے یا وہاں کی خواتین سے شادیاں کر رکھی ہیں۔ پرتگال میں ابھی تک روزمرہ استعمال کی اشیا بھی سستی تھیں اور مغربی یورپ میں جس تنگ نظری اور نوکر شاہی سے واسطہ پڑتا ہے، وہ بھی یہاں مفقود ہے۔ بالآخر ہم نے یہاں مضافاتی علاقے میں ایک خوبصورت گھر تلاش کر لیا، جو لزبن سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس کے حاصل کرنے میں تن دتک نے ہماری معاونت کی، کیونکہ ابھی ہم تنجیہ میں اپنے گھر کو فروخت نہیں کر پائے تھے۔ ہم نے انہیں رقم واپس کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن انہوں نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

ہم ابھی پرتگال روانہ ہونے کے لیے رخت سفر باندھ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک رات ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ لندن میں پاکستانی سفیر اپنے ملک کے صدر جنرل ضیاء الحق کی جانب سے بات کر رہا تھا۔ قبل ازیں صدر صاحب خود اسد کو کئی بار فون کر چکے تھے، لیکن وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ صدر موصوف نے انہیں جلد اسلام آباد آنے کی دعوت دی۔ اسد کا فوری جواب نفی میں تھا، لیکن میرے اصرار پر وہ اتنے کم وقت میں جانے پر رضامند ہو گئے، حالانکہ ان دنوں ہم پرتگال جانے کے لیے پابہ رکاب بیٹھے تھے۔ وہ اسلام آباد پہنچے۔ وہ پاکستان کے اس نئے دارالسلطنت میں پہلی بار

Marfat.com

آئے تھے۔ یہاں ان کا پُرتپاک استقبال ہوا اور انہیں سرکاری مہمان کی حیثیت سے ہوائی اڈہ سے سیدھے ایوان صدر لے جایا گیا۔ یہاں صدر پاکستان کے ساتھ ان کی تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ برسوں پہلے پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کو قتل کر دیا گیا اور یوں اسد کا مشن ادھورا رہ گیا۔ اسد کو مدعو کرنے والے صدر کا بھی ایسا ہی انجام ہوا اور وہ جہاز کے حادثے میں ہلاک ہو گئے۔

اسلام آباد میں قیام کے دوران میں اسد کی مختلف طبقہ ہائے خیال کے علماء سے ملاقاتیں ہوئیں، کیونکہ وہ ان کے صلاح مشورے سے صدر پاکستان کے آئندہ کے پروگرام کو حتمی شکل دینا چاہتے تھے۔ اسد کو ان کی بعض باتوں سے اتفاق تھا، لیکن حسب معمول بعض نکات پر ان کا نقطہ نظر مختلف تھا، خاص طور پر انہیں ایسے امور پر شدید اختلاف تھا جو مسلمانوں کو پیچھے کی جانب دھکیلنے کے مترادف تھے۔ ایک نکتے پر وہ ڈٹے رہے اور اس پر انہوں نے ذرہ بھر لچک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ عورتوں کو مردوں کے مساوی سیاسی حقوق دینے کے حامی تھے، یہاں تک کہ اگر کوئی خاتون وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہو جائے تو انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ چند سال بعد صدر ضیاء الحق طیارے کے حادثہ کا شکار ہو گئے اور بے نظیر بھٹو کو دنیائے اسلام کی پہلی وزیر اعظم کا اعزاز حاصل ہوا، حالانکہ انہیں اسد کے مؤقف کا علم بھی نہیں ہو گا۔ تاہم جلد ہی انہیں اس عہدہ سے سبکدوش کر دیا گیا۔ بالعموم پاکستان میں اہل ترین اصحاب سے ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ بہر حال انہوں نے ایک مثال قائم کر دی اور یوں اسلامی دنیا میں ایک منفرد تاریخی کردار ادا کیا۔

اسد اسلام آباد اور لاہور میں اپنے بقید حیات دوستوں سے بھی ملے اور صدر پاکستان کی فرمائش پر ریڈیو اور ٹیلی وژن کو انٹرویو بھی دیئے اور فی البدیہہ تقاریر بھی کیں۔ واپس پہنچے تو پاکستان سے سینکڑوں مداحوں کے خطوط موصول ہوئے۔ انہیں گھر جائداد سمیت ہر دنیاوی سہولت مہیا کرنے کا یقین دلایا گیا، بشرطیکہ وہ پرتگال کے بجائے پاکستان منتقل ہو جائیں۔ ان پیشکشوں کا وہی جواب تھا، جو میرے شوہر نے اس خودنوشت سوانح عمری کے حصہ اول میں دے دیا ہے۔ غریب اور اجڈ پاکستانیوں کو یہ علم نہیں کہ انہیں محمد اسد جیسے شخص کی کتنی ضرورت ہے۔ ان کے مابین ایسی کوئی شخصیت موجود نہیں، لیکن انہوں نے اسے بھی ضائع کر دیا۔ وہ اس ملک کے وزیر خارجہ بن جاتے یا وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہو جاتے، لیکن اس طرح ان کا عام پاکستانیوں سے حقیقی رشتہ ٹوٹ جاتا۔ دراصل وہ ایسی علمی شخصیت کے مالک تھے، جس کی کوئی نظیر نہیں۔ 123

اسد کی واپسی کے بعد ہم نے نقل مکانی کے لیے بھاری سامان باندھنا شروع کر دیا۔ ایام گذشتہ پر ایک نظر دوڑاؤں تو آگے چل کر ہم پرتگال میں خوش و خرم رہے۔ خاص طور پر میں یہاں ہر لحاظ سے مطمئن رہی اور آج تک لزبن کو اپنے گھر جیسا ہی سمجھتی ہوں اور پوری دنیا میں میرا محبوب ترین شہر یہی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ہمیں پرتگال میں ہر دنیاوی سہولت میسر تھی، لیکن پھر بھی جس گھر میں ہم نے اپنی زندگی کے انیس سال گزارے تھے، اس کو مستقل چھوڑنا اپنی غلطی تصور کرتی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس وقت خود سے یہ سوال کیا کرتی تھی کہ ''کیا نقل مکانی ضروری ہے؟'' اسد کی عمر تراسی برس ہو چکی تھی اور وہ اپنی مطابقت پذیری اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے بحفاظت

Marfat.com

بڑی عمر کو پہنچ چکے تھے۔اس بڑھاپے میں یہ قرین مصلحت نہیں سمجھا جاتا کہ پرانی جڑوں کو اکھیڑ کر ان کی جگہ نئے بیج لگائے جائیں۔

اکتوبر کے اواخر میں ہم نے اپنی پرانی جڑوں کو اکھاڑ پھینکا اور دو کاروں میں پرتگال کا رخ کیا۔ایک میں ڈرائیور کے ساتھ اسد اور ان کا اکلوتا پالتو کتا [redacted] سوار تھے اور دوسری گاڑی میں ڈرائیور سمیت مَیں اور ہمارا نوجوان افغانی ملازم شمشیر تھے۔ہمارے اس ملازم کو ''ولا اسدیہ'' اور یہاں کی زندگی سے اس قدر لگاؤ تھا کہ وہ اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔

بندرگاہ پر ہمارے متعدد پرانے اور قریبی مراکشی دوست ہمیں الوداع کہنے آئے ہوئے تھے۔انہی میں معروف وکیل محمد مشیش العلامی اور ان کے ساتھ ہمارے دو مشترکہ دوست بھی موجود تھے۔مراکشی یہودی سلواڈور ازاگوری (Salvador Azagury) اور ان کی بیگم بھی ہمیں رخصت کرنے آئے تھے۔ان سب لوگوں میں صرف ایک ہی چیز مشترک تھی اور وہ تھی دوستی۔ہم ایک کشتی پر مع سامان سوار ہوئے اور بندرگاہ پر کھڑے دوستوں سے ہاتھ ہلاتے ہوئے رخصت ہوئے اور کشتی الجیسی راس (Algeciras) کی طرف روانہ ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

باب ششد ہم

پرتگال
(1983ء-1986ء)

(1)

پرتگال پہنچتے ہی ہم نے سامان کو ترتیب سے رکھا، گھر کو پھر سے رنگ و روغن کرایا اور لزبن میں اپنے بہت سے پرانے دوستوں سے ملے۔ یہاں آتے ہی مراکش کے سفیر مولائی سلامہ بن زیدان سے ملاقات ہوگئی۔ ان کی بیگم فاطمہ بڑی پُرکشش اور فعال خاتون تھیں۔ دونوں شاہ حسن کے قریبی اعزہ میں سے تھے اور ان کی نسبت کوئی اور بہتر طور پر اپنے ملک کی نمائندگی کرنے کا اہل بھی نہیں تھا، کیونکہ وہ مراکشی زندگی کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ لزبن کے نواحی علاقہ ریس ٹیلو (Restelo)، جہاں بیشتر سفیر اقامت پذیر تھے، میں واقع ان کا بھی خوبصورت گھر تھا، جس مین ان کی دو بیٹیاں اور سفید پائرینی نسل کے کتوں کا جوڑا بھی رہتا تھا۔ جلد ہی یہ ہمارے دوسرے گھر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ جب بھی ہم شہر جاتے، کچھ دیر کے لیے یہاں رکتے اور ہمیشہ بڑی چاہت اور گرمجوشی سے ہمیں خوش آمدید کہا جاتا۔

پرتگال آتے ہی اسد کو پاکستان کے صدر اور وزیر خارجہ کی جانب سے دو تعارفی خط موصول ہوئے، جنہیں پرتگال کے صدر اور وزیر خارجہ کو پیش کرنا تھے، لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس وقت پرتگال کا ''مرد آہن'' رملھوایئز (Ramalho Eanes) وہاں کی کرسی صدارت پر متمکن تھا اور وہ ضیاء الحق کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ بعد میں لزبن میں پاکستانی سفیر کے آنے سے دونوں ممالک کے تعلقات کچھ بہتر ہوئے، لیکن اب اسد اس بات سے لاتعلق ہو چکے تھے کہ پرتگالی صدر انہیں ملتے بھی ہیں یا نہیں۔ پاکستان کے نئے سفیر برجیس حسن خاں کو ہم اپنا اثاثہ سمجھتے تھے۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کا سفارت کار تھے۔ ان کی بیگم کوثر جلد ہی ہماری دوست بن گئی اور اس نے ہماری زندگی کو ایک نئی جہت عطا کر دی[124]۔ پاکستان اور مراکش کے ان دو سفیروں کے توسط سے کئی دوسرے مسلمان ممالک مثلاً مصر اور عراق کے سفیروں اور سفارتی نمائندوں اور ان کی پُرکشش بیگمات سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ یہ سب لوگ بڑے مہذب اور روشن خیال تھے۔ یہیں ہماری ملاقات آزادی فلسطین کی تنظیم کے نمائندے اور ان کی بیوی سے ہوئی۔ یہ بھی لوگ نہایت عمدہ اطوار کے مالک تھے۔ ان کے گھروں میں اکثر دعوتیں اور مختلف مواقع پر تقریبات ہوتی رہتی تھیں

Marfat.com

اور ان میں ہم عربوں کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ تنجیہ کے معاشرتی ریگستان میں اتنی طویل مدت گزارنے کے بعد میں اس پُر رونق، بھرپور اور غیر رسمی سماجی ماحول میں کھو سی گئی۔

یوں ہماری اس زندگی کے کچھ حصہ کی تلافی ہو گئی، جو ہم تنجیہ میں ضائع کر چکے تھے۔ یہاں ہمارے اعلیٰ منصب پر فائز مقتدر اصحاب سے انتہائی خوشگوار تعلقات استوار ہوئے اور پھر اس کے کھلے ڈھلے اور پُرسکون ماحول اور باطنی سکون بخشنے والی زندگی نے ہمارے سارے غم بھلا دیئے اور ہم دونوں ہنسی خوشی اپنا وقت گزارنے لگے۔

ہمارا گھر کسی قیمتی ہیرے سے کم نہیں تھا۔ ہم دو آدمیوں کے لیے یہ خاصا بڑا تھا۔ خوشنما اور اتنا وسیع کہ وہاں کے سبزہ زار میں بآسانی تیز بھاگا بھی جا سکتا تھا۔ فرشوں پر برسوں پرانی ٹائیلیں لگی ہوئی تھیں، جنہیں ہم نے پرتگال کے مخصوص انداز کے چوبی فرش سے بدل دیا۔ کمروں کو گرم رکھنے کا جدید انتظام کیا گیا تھا، لیکن تین ملاقاتی کمروں میں خوبصورت روایتی انگیٹھیاں بھی موجود تھیں جو اب بھی کمروں میں گرم رکھ سکتی تھیں، کیونکہ اس گھر کو کسی انگریز نے تعمیر کروایا تھا۔ پرتگال میں دنیاوی امور کی گاڑی چلنے کا اپنا انداز ہے اور یہ سپین سے خاصا مختلف ہے، جہاں لوگ پرتگال کے مقابلے میں خود کو زیادہ ''ترقی یافتہ'' سمجھتے ہیں، حالانکہ ذاتی طور پر میرا انداز نظر مختلف ہے اور میں ایسے رویے کو ناپسندیدگی سے دیکھتی ہوں۔

ہمارا گھر باہر سے بھی پرتگالی دکھائی دیتا تھا۔ بیرونی دیواروں پر قدرے گہرا پیازی رنگ کیا گیا تھا۔ دروازوں اور شٹروں پر سفید رنگ تھا اور اسی سے کھڑکیوں کی تزئین و آرائش بھی کی گئی تھی، لیکن اس کا اندرونی حصہ انگریزی طرز بود و باش اور سہولتوں کی عکاسی کرتا تھا۔ اس سے پہلے میں اتنے خوبصورت گھر میں کبھی نہیں رہی تھی، اگرچہ یہ ہماری ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر نہیں بنایا گیا تھا۔ البتہ تنجیہ میں ہم نے اپنے گھر کو خود ہی ڈیزائن کیا تھا اور اپنی آسائشوں کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا۔ پرتگال کے ہمارے اس گھر کا باغ گیارہ ہزار مربع میٹر پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف دیواریں تھیں۔ گھر کے اندر باہر آنے جانے کے دونوں بڑے دروازے پٹواں لوہے سے بنائے گئے تھے۔ اس کے کشادہ پیش راستوں میں چھوٹی مربع شکل کی پتھریلی اینٹیں استعمال کی گئی تھیں اور یہ پرتگال کی نمایاں خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ یہ باغ تنجیہ میں ''ولا اسدیہ'' جیسا رومانوی اور پُرشور نہیں تھا، لیکن میں نے فوراً اس کی نوک پلک درست کرنا شروع کر دی اور ہمیشہ کی طرح یہاں میں نے سب سے پہلے صنوبر کے درختوں کا اضافہ کیا۔ یہاں نہانے کے تالاب کے قریب ڈھلوان پر ''گریاں بید مجنوں'' کے درخت لگائے گئے تھے۔ تالاب کی دیواروں کو نیلے اور سفید رنگ کی بڑی پرتگالی ٹائیلوں سے سجایا گیا تھا۔ مجھے یہ گھر خواب جیسا لگتا تھا اور جب تک میں یہاں رہی، مجھے یہی محسوس ہوتا رہا جیسے میں کوئی سہانا خواب دیکھ رہی ہوں۔ یہ گھر کاسا کراولا (Casa Caravela) کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ 'کراولا' کا مطلب چھوٹا بادبانی جہاز ہے اور ہمیں اس موزوں ترین نام کو تبدیل کرنے کا خیال تک نہیں آیا، کیونکہ اگر ذرا فاصلے سے کسی پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر اسے دیکھا جائے تو یہ تہہ آب پر تیزی سے رواں دواں جہاز جیسا ہی معلوم ہوتا تھا۔

Marfat.com

ہمارے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر بیلاس (Belas) نامی چھوٹا سا قصبہ تھا۔ پرتگال کے پرانے دور شہنشاہیت میں اس سے ملحقہ بادشاہوں کی شکارگاہ تھی۔ یہ قصبہ قرون وسطیٰ سے تعلق رکھتا تھا۔ خاصی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی اور اب یہاں بہت کم لوگ آباد تھے۔ اس سے ذرا آگے قدرے بڑا قصبہ کیولز (Quelez) واقع تھا۔ یہ بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ سنٹرا (Sintra) کی طرح یہاں بھی پرتگال کے بادشاہ موسم گرما کی تعطیلات گزارنے آیا کرتے تھے۔ کسی ملکہ نے یہاں گلابی اور سفید رنگوں کا باروک (Baroque) طرز تعمیر کا ایک محل بنوایا تھا، جہاں بعد میں بیرونی ممالک سے آئے ہوئے سربراہ اور اعلیٰ مناصب پر فائز مہمان ٹھہرتے تھے اور وقتاً فوقتاً یہاں سرکاری تقریبات بھی منعقد ہوا کرتی تھیں۔ یہاں سے لزبن کا خوبصورت، خوشنما اور ماضی کی شان وشکوہ کا حامل شہر سترہ کلومیٹر دور تھا۔

ہمارے گردونواح میں جن چند ہمسایوں کے گھر تھے، ان میں ہم بیلاس کے باہر خاصی بڑی جاگیر کے مالکان Quinta Fonteneira کو سب سے زیادہ جانتے تھے۔ ان کا تعلق Vilas Boas خاندان سے تھا اور وہ مقامی اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس ہنستے بستے اور خوشحال گھرانے کے مالک کی خوبصورت بیوی تھی، لیکن اب یاد نہیں کہ ان کے کتنے بچے تھے۔ دو بیوہ سالیاں اس وسیع اور بے ترتیب محل کے الگ کمروں میں رہتی تھیں۔ اس محل میں چھوٹے الگ گھر بھی بنائے گئے تھے۔ میں نے اتنا خوبصورت نجی گھر کہیں اور نہیں دیکھا اور یہاں کا ماحول اتنا سادہ اور خوش کن تھا کہ شاید ہی کسی اور گھر میں نظر آئے۔ اس خاندان کے تمام افراد راسخ العقیدہ کیتھولک مسلک کے پیروکار تھے، لیکن انہوں نے دو مسلمان ہمسایوں کو اپنے دلوں میں جگہ دے رکھی تھی اور وہ ہمیں کرسمس کی تقریبات میں ضرور مدعو کرتے تھے۔ ان تقریبوں میں اس بڑے خاندان کے تمام افراد شامل ہوتے تھے۔ اگر پرانے وقتوں کی پرتگالی اشرافیہ اس خاندان جیسی ہوتی تو یہاں کی شہنشاہیت کبھی زوال پذیر نہ ہوتی۔ ہم مخلص دوستی، عمدہ مہمان نوازی اور دوسرے مذاہب کے لوگوں سے اچھے برتاؤ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

(2)

اسد کے ترجمہ وتفسیر قرآن کی تکمیل اور اشاعت کو چار سال گزر چکے تھے، لیکن مختلف اپریشنوں، سفروں اور پرتگال نقل مکانی کرنے کے باعث وہ جم کر کوئی اور کام شروع نہ کر سکے۔ میں انہیں اپنی یادداشتوں پر مبنی دوسری جلد لکھنے پر آمادہ کرتی رہی۔ اس جلد کا آغاز 1932ء سے ہونا تھا، جب اسد سعودی عرب کو چھوڑ کر ہندوستان آ گئے تھے، لیکن وہ ابھی تک مطالعہ قرآن میں مستغرق تھے اور اس عمیق غور وفکر کے حاصلات کو وہ ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں یکجا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اس کتاب کا عنوان ''Meditations on the Quran'' منتخب کیا تھا، جس میں اس الہامی کتاب کے کچھ ایسے پہلوؤں کو پوری شرح وبسط کے ساتھ بیان کرنا مقصود تھا، جن کی روشنی میں ان کی شائع کردہ تفسیر کی تفہیم میں قارئین کو دقت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ مختصراً یہ ان کی اپنی تفسیر کی تفسیر تھی۔ اگرچہ وہ اپنے نتائج فکر کو کاغذ پر منتقل کرتے رہتے تھے، لیکن انہوں نے باقاعدہ طور پر اسے لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ بلاشبہ یہ ان

Marfat.com

کے ترجمہ قرآن کی طرح ختم نہ ہونے والا کام تھا۔ جب انہوں نے قرآن کا ترجمہ شروع کیا تو ان کا خیال تھا کہ وہ دو یا تین سال میں اسے ختم کر لیں گے، لیکن اس کو ختم ہوتے ہوتے تقریباً سترہ سال گزر گئے۔

بالآخر میں نے انہیں تجویز پیش کی کہ وہ اپنی ان تحریروں اور تقریروں کو یکجا کر دیں، جو انہوں نے پہلے ہندوستان اور پھر پاکستان کے قیام کے دوران میں سپرد قلم کی تھیں۔ ان میں ان کا طویل ترین مضمون This Law of Ours تھا، جس میں بنیادی قانون اسلام یعنی شریعت کے بارے میں ان کے تصورات کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے۔

مراکش چھوڑنے کے بعد پہلے ماہ رمضان میں ہمیں شیخ ذکی یمانی نے سعودی عرب آنے کی دعوت دی۔ وہ اس مبارک مہینے میں جو تقریبات منعقد کرتے ہیں، وہ اپنی اعلیٰ پایہ کی مہمان نوازی کے سبب معروف ہیں۔ ابتدائی چند ہفتے Hadal میں گزارے۔ یہ شہر موسم گرما کے دارالحکومت طائف کے نواح میں واقع ہے اور یہیں شاہی خاندان کے بیشتر افراد گرمیاں گزارتے ہیں۔ یہاں شیخ ذکی کے گھر کے چاروں طرف پھل دار درخت ہیں۔ خاصا وسیع و عریض اور آرام دہ گھر ہے اور اس میں ایک خاندانی گھر کی خوبیاں بھی محسوس ہوتی ہیں۔ مہمانوں کی کثیر تعداد کے علاوہ، اس گھر میں شیخ ذکی کی دونوں بیویاں، ان کے بچے، ان کے اپنے اعزہ و اقارب، تمام خاندانوں کے افراد اور بہت سے مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ افطاری کے موقع پر باغ کے سامنے ایک قدرے وسیع بڑے سے کمرے میں چائے اور ہر قسم کی کھجوروں کا اہتمام کیا جاتا اور اس کے بعد پُرتکلف کھانوں کے دسترخوان چن دیئے جاتے، جن میں ہر وہ چیز ہوتی، جس کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد کچھ مہمان شام کی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر سبزہ زار میں بیٹھ جاتے اور چند لوگ تو سحری تک وہیں بیٹھے رہتے اور روزہ رکھ کر سونے کے لیے چلے جاتے۔ ان پُرتکلف کھانوں کے درمیان مردوں اور خواتین کی الگ الگ باجماعت نمازیں بھی ادا کی جاتیں۔ افطاری کے موقع پر شیخ ذکی میرے شوہر کو جن سنگ (ginseng) کی چھوٹی سی شیشی (vial) پینے کو دیتے۔ ان کے پیش کرنے کا انداز انتہائی دلفریب اور اثر انگیز ہوتا تھا اور یہ اسد پر ان کی خصوصی شفقت کا مظہر بھی تھا۔ رمضان المبارک کے ان اجتماعات کی مجموعی فضا ناقابل بیان ہے۔ روحانیت اور شگفتہ مزاجی کا یہ حسین امتزاج تھا، جو بمشکل کہیں دیکھنے کو ملتا ہے۔

ماہ رمضان میں ہماری اس اولیں آمد کے موقع پر شیخ ذکی کی حسین نجدی بیوی تمام (Tammam) حاملہ تھی اور عنقریب احمد بیٹا پیدا ہونے والا تھا، چنانچہ اسی مہینے کے وسط میں اسے بلا تاخیر وضع حمل کے لیے سوئٹزرلینڈ جانا پڑا۔ وہ اتنے دلچسپ اور محتاط طریقے سے روانہ ہوئیں کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی اور جب پتہ چلا تو ان کی روانگی کو چند روز گزر چکے تھے۔ دراصل ان کے گھر میں ماہ رمضان کی جو رونق تھی، اس رنگ میں وہ بھنگ نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔

ماہ رمضان کے نصف دوم میں ایک روز علی الصبح ہم مکہ روانہ ہو گئے۔ گاڑی خود شیخ ذکی چلا رہے تھے۔ وہاں جانے کا واحد مقصد حرم پاک کی زیارت، نماز کی ادائیگی، طواف کعبہ اور سب سے آخر میں سعی، جو عربوں کی نسل کی

Marfat.com

روحانی والدہ اور حضرت ابراہیمؑ کی بیوی ہاجرہ کی یاد میں کی جاتی ہے، جب وہ اپنے معصوم بچے حضرت اسمٰعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں دو پہاڑیوں کے درمیان دیوانہ وار دوڑ رہی تھیں۔ یہاں اسد کو کولہے کی ہڈی میں تکلیف محسوس ہوئی، اس لیے انہیں بیماربردار (سٹریچر) پر بٹھا کر سعی کرائی گئی۔

اس کے بعد ہم شیخ ذکی کی معیت میں ماہ رمضان کے آخری ایام مسجد نبوی میں گزارنے اور وہاں پیغمبر آخر الزماںؐ کے روضہ مبارک کے قریب نماز ادا کرنے کے لیے مدینہ پہنچے۔

مسلسل تین سال ہم اسی طرح ماہ رمضان شیخ ذکی کے ہاں گزارتے رہے۔ وہاں اسد کی اپنے پرانے عرب دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک بار مکہ میں شاہ فہد اور ولی عہد شہزادہ امیر عبداللہ سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوا۔ ایک بار امیر نواف سے بھی ملے جواب خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا ایک معصوم چھوٹا سا حسین وجمیل بیٹا بھی تھا۔ میں نے اس جیسا خوبصورت بچہ پھر کبھی نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ شاہ فیصل کے فرزند ترکی (Turki) نے طائف میں ہمیں شام کے کھانے پر بلایا، جہاں ہماری ملاقات شاہ فیصل کی بیوی محترمہ عفت، شاہی خاندان کے دیگر افراد، شہزادہ ترکی کی کئی ہمشیرگان اور ان کے شوہروں سے ہوئی۔ ہمیں وہاں کبھی بیگانگی کا احساس نہیں ہوا اور ہم خود کو اپنے گھر ہی میں سمجھتے تھے۔ کھانا بالکل غیر رسمی لیکن بہت لذیذ تھا۔ شاہ فیصل کی بیوہ نے چالیس سال سے زیادہ اپنے شوہر کے ساتھ گزارے تھے۔ وہ اور اسد سعودی عرب میں اپنے ابتدائی سالوں کی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ 1930ء کی دہائی کے اوائل میں ان کی امیر فیصل سے شادی ہوئی تھی۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ کیسے اپنے آبائی ملک ترکی سے پہلی بار سعودی عرب آئیں۔ انہیں شاہ عبدالعزیز یا ان کے بیٹے فیصل میں سے کسی ایک کے ساتھ شادی کرنا تھی، لیکن سعودی عرب پہنچنے تک انہیں اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ ان کی کس کے ساتھ شادی ہوگی۔ یہ شاہ فیصل کی خوش بختی تھی کہ ان کے والد نے اس ترک خاتون کو شادی کے لیے منتخب نہیں کیا۔ شاہ فیصل سے ان کی شادی بڑی کامیاب خوشگوار رہی اور برسوں ازدواجی تعلق کے باعث ان کا اپنے شوہر پر خاصا اثر تھا۔ ان کی شادی کا ثمر ان کے بچے ہیں، جو ان کی انتہائی موزوں ازدواجی تعلق کا نتیجہ ہے۔ اپنے شوہر کی طرح یہ خاتون بھی عظیم عورت تھی۔

انہی دنوں شیخ ذکی نے ہمیں جنیوا آن کر ملنے کو کہا۔ وہاں وہ اوپیک کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ وہی اوپیک کو وجود میں لائے، وہی اس کے روح رواں تھے، اس لیے ان کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں، لیکن شام کو جب وہ میٹنگوں سے فارغ ہو جاتے، وہ ہمیں اور اپنی بیگم تمام کو لے کر جنیوا کے کسی عالی شان ریسٹورنٹ میں لے جاتے اور یوں ہمارے ساتھ کچھ وقت گزار کر سارے دن کے ذہنی بوجھ کو کم کرتے۔ شیخ ذکی اور ان کی بیگم بخوبی جانتے تھے کہ اچھا کھانا کیا ہے۔

چند روز بعد شیخ ذکی نے اچانک بتایا کہ وہ ریاض جا رہے ہیں، کیا ہم بھی ان کے ساتھ چلیں گے؟ میں نے انہیں مطلع کیا کہ فروری میں یہاں آنے کی وجہ سے میں اپنے سارے کپڑے جنیوا کی شدید سردی کو ذہن میں رکھ کر لائی تھی، لیکن انہوں نے جواب دیا کہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شام کو ان کی بیگم تمام کی سیکرٹری نے ہمارے

Marfat.com

ہوٹل کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہاں میں بتاتی چلوں کہ شیخ ذکی کے مہمان کی حیثیت سے ہم ہمیشہ انٹرنیشنل ہوٹل میں ٹھہرتے تھے اور کار مع ڈرائیور مستقل ہمارے استعمال میں رہتی تھی۔ اس سیکرٹری نے تین شاندار اور خاصی مہنگی جوتیوں کے جوڑے میرے حوالے کر دیئے۔ شاید انہیں خود تمام نے منتخب کیا تھا۔ بعد میں جب ہم ریاض پہنچے تو وہاں کی گرم آب وہوا اور قدامت پسند ماحول کے مطابق موزوں ملبوسات بھی مہیا کر دیئے گئے۔

ریاض کا ہوائی اڈہ دنیا کے خوبصورت ترین ہوائی اڈوں میں سے ایک ہے۔ یہاں پہنچتے ہی ہمیں پتہ چلا کہ ہم سعودی ویزا لینا تو بالکل بھول ہی گئے ہیں (ہم نے غیر شعوری طور پر اس ملک کو اپنا گھر سمجھ رکھا تھا)، لیکن شیخ ذکی کے اعلیٰ منصب اور شاہی خاندان سے اسد کے مضبوط تعلقات کے سبب فوراً ویزوں کا بندوبست ہو گیا اور ہم شیخ ذکی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

یہاں قیام کے دوران میں بھی اسد اپنے کئی نجدی دوستوں سے ملے۔ پچھلے کچھ سالوں میں ان کے بہت سے احباب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ 1920ء اور 1930ء کی دہائیوں میں اسد یہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد یہ شہر بہت بدل گیا، لیکن اسد اب بھی بہت سی پرانی جگہوں کی نشاندہی کر سکتے تھے۔ ہم نے یہاں جو کچھ دیکھا، وہ پُرکشش تھا۔ اگرچہ ریاض بالکل بدل دیا گیا تھا، لیکن جو نئی عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں، وہ عمدہ ذوق کی ترجمانی کرتی تھیں۔ وہ مدینہ کی جدید عمارات سے اچھی تھیں۔ شاہ عبدالعزیز کا پرانا شاہی محل آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ نئی سڑکوں کے کنارے درخت، پھول اور پودے لگائے گئے تھے اور جا بجا باغات دکھائی دیتے تھے۔ ہر طرف پھیلی ہوئی اس ہریالی سے اسرائیل کے اس دعویٰ کی تردید ہو جاتی ہے کہ وہی ریگستانوں کو باغوں میں تبدیل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہماری اس بات کا ثبوت وہ بڑے بڑے زرعی فارم ہیں، جو ریاض کے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں اور سائنسی علوم کو عملی جامہ پہنانے کے جو مفید نتائج مرتب ہوتے ہیں، ہم ان کے پیش نظر وثوق سے یہ بات کہتے ہیں۔ فلسطین کے قابضین یعنی یہودیوں نے جو ترقی کی ہے، وہ امریکیوں اور مغربی ممالک کی دولت کی مرہون منت ہے، جبکہ سعودیوں نے اپنے وسائل سے یہ سب کچھ کیا ہے۔ انہوں نے ریاض کے مٹی کے گھروں کو جدید عمارتوں کا شہر بنا دیا، لیکن اس کے باوجود اس شہر کی اصل پہچان کو برقرار رکھا اور یہ اب بھی عربوں کا مخصوص شہر ہی نظر آتا ہے۔

ہم نے اپنا بیشتر وقت شیخ ذکی اور ان کی بیوی تمام کی فرحت بخش معیت میں گزارا۔ کبھی کبھار ہم خود بھی ریاض سے باہر نکل جاتے تھے، کیونکہ اسد چاہتے تھے کہ میں قدیم عرب اور ریگستان کی ہواؤں اور فضاؤں کی خوشبو محسوس کر سکوں۔ ہمیں ضریّیا (Daraiyyah) جیسی اہم ترین جگہ دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ اس شہر کو وہابی تحریک میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ اب تو مٹی کی اینٹوں کے بنے ہوئے ویران قلعوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ایک صدی پرانی کچھ اثر انگیز باقیات یا بدوؤں کے شکستہ تہذیبی آثار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ میں اس طرح ریاض کو پسند کرتی تھی، جیسے کئی سال پہلے اسد اس شہر کی محبت کے اسیر ہو گئے تھے۔ میں نے کبھی اپنے چہرے کو نقاب سے نہیں ڈھانپا، لیکن

Marfat.com

روایات کا احترام کرتے ہوئے سر پر کپڑا رکھا اور ہلکے سیاہ رنگ کی عبا پہنے رکھی۔ خواتین کا یہ خوبصورت اور خوش وضع لباس ہے۔ مجھے سعودی عرب میں کبھی "مسائل" کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ہمارے اس قیام کا یادگار دن وہ تھا، جب شیخ ذکی کا سب سے بڑا اور عمدہ اطوار کا حامل بیٹا ہانی (Hani) جدہ سے یہاں آیا۔ ایک روز ہم اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے کہ اس نے اسد سے درخواست کی کہ وہ لیلیٰ سے رسمی سگائی کے لیے اس کے والد سے بات کریں۔ گورے رنگ، سنہری بالوں والی یہ حیرت انگیز حسین لڑکی احمد عبدالوہاب کی دختر تھی۔ ان دنوں عبدالوہاب شاہ فہد کے سررشتہ استقبال کے سربراہ تھے۔ وہ برسوں شاہ فیصل کے ساتھ اسی عہدے پر کام کر چکے تھے۔ درحقیقت وہ شاہ فیصل اور شاہ خالد کے خاص آدمی تھے۔ اسد انہیں عرصہ دراز سے جانتے تھے۔ ان کا شمار عرب کے مشاہیر میں ہوتا ہے اور وہ اپنے اعلیٰ طور طریقوں اور سوجھ بوجھ کے اعتبار سے سررشتہ استقبال کا موزوں ترین سربراہ تھا۔

شام کو شیخ ذکی نے اچانک مطلع کیا کہ وہ ہمیں رات کے کھانے پر کہیں باہر لے جا رہے ہیں۔ بالعموم وہ ایسا پروگرام پہلے سے بنا چکے ہوتے تھے، لیکن اس کا اعلان اچانک کرتے تھے۔ وہ ہمیں اپنی بیگم تمام کے ساتھ احمد عبدالوہاب کے گھر لے گئے اور راستے میں ہمیں بتایا کہ اپنے پرانے دوست کی بیٹی کے ساتھ ہانی کی منگنی کے ہم گواہ ہوں گے۔ میزبان نے حسب عادت گھر کے دروازے پر ہمارا استقبال کیا اور اپنی خوبصورت دمشقی بیوی اور دونوں بیٹیوں سے تعارف کرایا۔ ان میں سے بڑی بیٹی کے ساتھ ہانی کی منگنی ہوئی۔ وہ خوبصورت اور اعلیٰ تعلیم گاہوں کی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ وہ قدرے شرمیلی تھی اور اس کے طور طریقوں میں معصومیت اور سادگی جھلکتی تھی۔ ہمیں بخوبی اندازہ ہو گیا کہ ہانی نے اپنی ہونے والی بیوی اور اس کے لواحقین کا کتنا اچھا انتخاب کیا ہے۔ یہ تو میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ ان کے شیخ ذکی کے ساتھ کتنے پرانے اور قریبی دوست تھے۔ ہم نے شام کا کھانا اکٹھے کھایا اور اس میں صرف گھر کے افراد ہی شامل تھے۔ احمد عبدالوہاب کی بیوی نے شامی طرز کے پرتکلف کھانے تیار کرائے تھے۔ بعد میں اس رسم سگائی کے "سرکاری" گواہ کی حیثیت سے معروف مذہبی رسم کے مطابق ہمیں یہ لکھنا پڑا کہ ہانی اور لیلیٰ زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھی رہیں گے۔ منگنی کی اس عمدہ اور سادہ تقریب میں ہماری گواہوں کی حیثیت سے شمولیت باعث مسرت ثابت ہوئی۔

(3)

سعودی عرب میں ہم کئی بار آئے اور ہمارے قیام کے سبھی انتظامات شیخ ذکی اور اس کے افراد خانہ کرتے تھے۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری کر دی گئی، جب ہم ہانی کی شادی میں شرکت کے لیے مدعو کیے گئے۔ یہ تمام سہولتیں، آسائشیں اور عربوں کی روایتی مہمان نوازیاں اپنی جگہ، لیکن یہاں بار بار آنے جانے سے اسد کی سوچ اور مزاج پر منفی اثر بھی پڑا۔ عرصہ دراز کے بعد انہیں اپنے بہت سے پیارے دوستوں کے پاس وقت گزارنے کا موقع ملا۔ یہ تمام

Marfat.com

دوست ایسے تھے، جو اب ہمارے 'خاندان' کا حصہ بن چکے تھے، چنانچہ جب ہم واپس آتے تو اسد اداس اور بے سکون ہو جاتے۔ چنانچہ کچھ دیر کے بعد یہ بے کلی اتنی بڑھ گئی کہ بالآخر ہمیں اپنا محبوب ترین ملک پرتگال بھی چھوڑنا پڑا اور اس واقعہ نے ہماری زندگیوں کو بے شمار غیر متوقع طریقوں سے متاثر کیا۔

ذکی یمانی ہر طرح سے ہماری مدد کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ محمد اسد کو بڑھاپے میں کوئی کمی محسوس نہ ہو اور انہیں ہر طرح کی سہولت میسر ہو، لیکن انہوں نے ہمارے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ ہمارے حالات سے بخوبی واقف تھے، لیکن ہمارا کونسا فیصلہ صحیح ہے اور کونسا غلط، اس کے بارے میں وہ بالکل مداخلت نہیں کرتے تھے۔ پہلے تو اسد نے سوئٹزرلینڈ واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں وہ جنیوا کی جھیل کے پاس رہنا چاہتے تھے، کیونکہ اس جھیل کے فرانسیسی کنارے پر شیخ ذکی نے خاصی بڑی جاگیر خرید رکھی تھی، لیکن جب اس جگہ کے قریب ہی اپنی پسند کا گھر تلاش کیا تو وہ اس قدر مہنگا تھا کہ ہم شیخ ذکی جیسے اپنے مخلص اور فیاض دوست کو زیر بار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس جھیل کے کنارے ہم نے جو یادگار دن گزارے تھے اور اس وقت جتنا ٹھوس اور مثبت کام کیا تھا، اس کے پیش نظر ہم یہیں کہیں آس پاس جائے سکونت تلاش کرتے رہے، لیکن دو ماہ کی مسلسل دوڑ دھوپ کے باوجود ہمیں کوئی اپنی حیثیت کے مطابق گھر نہ مل سکا۔ چنانچہ ہم نے یہاں رہنے کا ارادہ ترک کر دیا اور پرتگال اپنے گھر واپس آ گئے۔ یہاں دو پالتو کتے ہمارے منتظر تھے۔

پرتگال واپس آنے کے کچھ دن بعد اسد کو ایک پرانے دوست شیخ عبداللہ بالخیر کا خط ملا۔ انہوں نے حال ہی میں کوسٹا ڈل سول (Costa del Sol) پر ماربیلا (Marbella) میں اپارٹمنٹ خریدا تھا اور وہاں وہ بڑی خوشگوار اور پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ ہم موسم گرما میں مختصر وقت کے لیے وہاں گئے اور اسد نے فوراً کوسٹا ڈل سول منتقل ہونے کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ کوسٹا ڈل سول ہم میں سے کسی کو بھی پسند نہیں تھا، لیکن اسد کے لیے یہاں ایک بات تھی جو ان کے دامن دل کو کھینچ رہی تھی اور وہ یہ کہ سعودی عرب میں ان کے بہت سے احباب ہسپانوی ساحل کے اس سازگار ماحول میں موسم گرما کی چھٹیاں گزارنے آیا کرتے تھے۔ چنانچہ ماربیلا کے نواح میں ہم نے ایک گھر تلاش کر لیا، جو تنجیہ اور پرتگال میں ہمارے گھروں سے خاصا کمتر تھا۔ ہم نے پرتگال میں اپنے گھر کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بدقسمتی سے ہمیں خریدار بھی جلد ہی مل گیا اور کم از کم مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے اس گھر کو مستقل طور پر خیر باد کہنا پڑا۔

پرتگال سے روانگی سے چند ماہ قبل ہمارا افغانی النسل کتا شمشیر اچانک بیمار پڑ گیا اور رات کو مر گیا۔ شاید کسی زہریلی چیز اُس کی موت کا باعث بنی۔ ہم نے اپنے گھر کے باغ میں اسے دفن کر دیا اور ایک ماہ بعد اس کا ساتھی اور ہمارا عربی النسل سلوکی [redacted] بھی اس کے پہلو میں ابدی نیند جا سویا۔ ہم اسے ہر سال ٹیکہ لگوانے علاج گاہ مویشیاں لے جایا کرتے تھے۔ اس علاج گاہ کے سامنے اسے دل کا دورہ پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ ہم اسے گھر لے آئے اور اگلی صبح وہ فوت ہو گیا۔

ازرق

Marfat.com

میں بتا نہیں سکتی کہ میں نے پرتگال میں اپنے آخری دن اور ہفتے کتنی تنہائی اور افسردگی میں گزارے۔ بہرکیف مجھے اس بات کا شدید احساس تھا کہ ہم سے ایک فاش غلطی سرزد ہوگئی ہے اور بعد میں یہ ثابت بھی ہوگیا۔ ہم بڑے دکھ کے ساتھ اپنے دو سفیر دوستوں، ان کی بیگمات اور بیلاس میں Vilas Boas کے خوش اخلاق ہمسایوں سے رخصت ہوئے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میرے دل پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا گیا ہے۔ آخری روز جب ہم اپنا سامان باندھ رہے تھے، تو اسد تھکاوٹ سے چُور چُور ہو گئے۔ اگرچہ سامان کو باندھنے کے لیے تجربہ کار لوگ موجود تھے اور پرتگال جیسے ملک میں ان سے بہتر لوگوں کا ملنا مشکل تھا، پھر بھی ہمیں ان کا ہاتھ بٹانا پڑ رہا تھا۔ اسد بھی مصروف کار تھے، حالانکہ چھیاسی برس کے عمر رسیدہ شخص کو ایسا کام نہیں کرنا چاہیے تھا اور مجھے بھی انہیں روکنا چاہیے تھا، لیکن ان کی جیون ساتھی بننے سے پہلے، ان کے ایام جوانی سے جو بے چینی یا بے آرامی ان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی، وہ اب مزید راسخ ہو چکی تھی۔ شاید وہ اپنے اصلی گھر یعنی سعودی عرب جانے کے لیے بے قرار تھے، جو ان کے قلب و ذہن میں بس چکا تھا۔ برسوں پہلے وہ اپنے اس وطن کو چھوڑ چکے تھے، لیکن حقیقتاً انہوں نے اسے کبھی نہیں چھوڑا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

Asad war Österreicher jüdischer Abstammung, der 1926 in Berlin zum Islam konvertierte und daraufhin zunächst in Saudi Arabien lebte, wovon auch seine Autobiographie *Der Weg nach Mekka* handelt. Seine Konversion war durch die Überzeugung motiviert, der Islam verbinde Rationalität und Spiritualität auf eine für ihn befriedigende Weise. Schon bald entsprach Saudi Arabien allerdings nicht mehr seinem Idealbild einer islamischen Gesellschaft und es zog ihn 1932 auf den indischen Subkontinent. Aus Lahore und später aus Delhi war er für die NZZ zeitweise als Korrespondent tätig. Nach dem Zweiten Weltkrieg und der Teilung des Landes siedelte er nach Pakistan über und wurde 1952 für einige Jahre Repräsentant Pakistans bei der UNO.

„Europe's Gift to Islam"

Chaghatais Studie zu Asad trägt den Titel *Europe's Gift to Islam (Europas Geschenk an den Islam)*. Daraus wird deutlich, dass er in Leben und Wirken von Asad selbst eine Art abendländisch-islamischen Dialog verwirklicht sieht, der einen hohen Wert für den modernen Islam hat. Auch dem zeitgenössischen Dialog hat Ikram Chaghatai einen Dienst erwiesen, als er die Artikel von Pater Bütler unter dem Titel *Trying to Respond (Versuchen zu antworten)* edierte, womit Bütlers Arbeit für einen tragfähigen interreligiösen Dialog in Pakistan gut dokumentiert ist.

بامبرگ (جرمنی) کے ایک جریدہ A.K.O.N. (14 ستمبر 2007ء) میں Thomas Wuertz کے مضمون کا ایک اقتباس

Marfat.com

باب سیزدہم

بند گلی

(1987ء-1992ء)

(1)

جب ہم کاسا کاراولا (Casa Caravela) کے سبزہ زار میں اپنے دونوں پالتو کتوں کو منوں مٹی تلے دبا کر ماربیلا پہنچے، تو اس وقت موسم گرما ختم ہونے والا تھا، لیکن ہمارے دوست عبداللہ بالخیر اپنے افراد خانہ سمیت ابھی وہیں موجود تھے۔ انہوں نے اپنے وسیع اپارٹمنٹ میں ہمیں کئی بار کھانے کی دعوت دی اور کئی طریقوں سے ہماری اعانت کرتے رہے، لیکن ان کے جانے کے بعد ماربیلا میں موسم سرما شروع ہو گیا اور ہمیں اکیلے پن کا زیادہ احساس ہونے لگا۔ وہاں ہماری جان پہچان کے چند لوگ تھے، لیکن وہاں دوست کوئی نہ تھا۔ پرتگال سے ہمارا گھریلو سامان پہنچ گیا تھا اور ہم اسے کھولنے میں مصروف ہو گئے۔ اس سے پہلے ملاغہ (Malaga) کے کسٹمز احکام قواعد کے برخلاف ہمارے اس ذاتی سامان کو کھول کر دیکھ چکے تھے۔ بعد میں ہمیں علم ہوا کہ ہماری بہت سی قیمتی اشیاء چرالی گئی تھیں۔ ہمیں کسٹم والوں کو تمام اخراجات ادا کرنا پڑے، حالانکہ یہ بھی قواعد کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ سپین یا کوسٹا ڈل سول میں ہماری نئی زندگی کا یہ آغاز تھا۔ اب ہم بڑے بڑے گٹھوں میں سے قیمتی قالین، پرانا فرنیچر اور فنی شاہکاروں کو نکالنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے، کیونکہ مجھے احساس تھا کہ یہ کبھی بھی ہمارا اصلی گھر نہیں بن سکے گا۔

کوسٹا میں ہمیں بڑی سہولتیں حاصل تھیں اور دنیا کے کونے کونے سے یہاں آنے والوں کے لیے بہت سی ترغیبات تھیں، لیکن مجھے یہ شہر جچا نہیں۔ یہاں کی آب و ہوا تنجیہ سے مختلف نہیں تھی، لیکن دونوں میں ہزاروں میل کا فاصلہ جان پڑتا تھا، حالانکہ جغرافیائی اعتبار سے دونوں کے درمیان ایک تنگ سی آبنائے جبرالٹر واقع ہے۔ ہم نے اپنے نقصانات کی تلافی کرنے کے متعلق سوچا، ماربیلا میں اپنا گھر فروخت کر دیا اور حتمی فیصلہ کرنے تک تمام سامان ایک سٹور میں رکھوا دیا۔ ہم تنجیہ واپس جانے کا بھی سوچتے رہے، جہاں کا ''ولا اسدیہ'' ابھی ہم نے نہیں بیچا تھا، لیکن بالآخر ہم نے واپس نہ جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ بھی کسی بڑی غلطی سے کم نہیں تھا۔ ہم نے اپنے ایک دوست سے دریافت کیا کہ کیا پرتگال میں ہمارا گھر، جو مجھے بے حد عزیز تھا، پھر سے فروخت تو نہیں ہو رہا، لیکن ہمارے معلوم کرنے

Marfat.com

سے صرف چند ہفتے پہلے یہ بک چکا تھا اور اب یہ کسی نئے خریدار کی ملکیت تھا۔ یہ جان کر مجھے دھچکا سا محسوس ہوا۔ پھر ہم جبرالٹر میں قیمتی فلیٹ خریدنے کے بارے میں سوچنے لگے، لیکن یہ بھی ممکن نہ ہوا اور ہم انگلستان چلے گئے تا کہ وہاں مستقل رہائش کے امکانات کا جائزہ لیا جا سکے۔ مختلف حوالوں سے یہ وقت ہمارے لیے بڑا کٹھن تھا۔ انگلستان اور زیادہ تر لندن میں بہت سے احباب کے باوجود ہماری چند ماہ کی تگ و دو بے نتیجہ رہی اور ہم نے یہاں سکونت کا خیال ترک کر دیا۔

میں شہروں کی نسبت مفصلات کے گھروں کو ترجیح دیتی تھی، لیکن ایسے گھر یا تو بہت دور افتادہ جگہوں پر ملتے تھے یا دہ خاصے مہنگے ہوتے تھے۔ عموماً لندن کے گھر تنگ کمروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ بحیرہ روم کے پاس اتنا عرصہ رہنے کے سبب ہمارے لیے یہاں کی آب و ہوا بھی ناموافق تھی۔ اسد اپنے دوستوں کی آراء اور صائب مشوروں کو توجہ سے سنتے رہے، لیکن ہمیں کہاں رہنا چاہیے، اس کے متعلق وہ مختلف الخیال تھے۔ ماضی میں ہم جو فیصلے کرتے تھے، وہ خود ہی پورے تیقن سے کرتے تھے۔ بالعموم وہ صحیح ہوتے تھے، کم از کم ہمارے اپنے لیے۔

ہم سپین واپس چلے آئے اور پھر گھر تلاش کرنے لگے، لیکن اس دفعہ میجاس (Mijas) کے علاقے میں۔ تلاش بسیار کے بعد ہمیں ایک گھر مل گیا۔ یہ ''ہسپانوی انداز'' کا گھر تھا، جو کسی غیر ملکی نے تعمیر کیا تھا یا اس کے لیے بنوایا گیا تھا اور یہ میجاس کے نواح میں واقع تھا۔ ہم نے سٹور میں محفوظ پڑے ہوئے اپنے سامان کو اٹھوایا اور وسط دسمبر 1987ء کو نئے گھر میں لے آئے۔ انگلستان سے ہم خوبصورت سیاہ رنگ کا افغان کتا بھی ساتھ لے آئے تھے۔ اس کا نام شیطان رکھا گیا۔ آکسفورڈ میں ہماری کچھ دوست خواتین تھیں۔ انہوں نے ہمیں یہ کتا بطور تحفہ دیا تھا اور ہمیں اسے قبول کرنے میں خوشی محسوس ہوئی۔

کوئی معقول وجہ بتانا تو مشکل ہے، لیکن ہم دونوں بری طرح یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ ہمارا گھر نہیں بلکہ مکان ہے، جو شومئی قسمت سے ہمارے لیے منتخب ہوا یا ہمارے مقدر ہی میں یہی لکھا تھا۔ سڑک کی دوسری جانب ہمسائے اور نئے واقف کار ہماری مدد کرتے رہتے تھے، لیکن حقیقتاً یہاں ہمارا جی نہیں لگا۔ ایک نوجوان ہسپانوی جوڑے سے شناسائی ہوئی۔ یہ دونوں ڈاکٹر تھے اور دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ رحیما اور یحیٰی مولینا اکثر ہمیں ملنے آتے۔ ان دنوں وہ ملاغہ (Malaga) میں رہائش پذیر تھے اور یہ خاصا دور تھا، لیکن وہ گاڑی پر اپنے دو بچوں سمیت آتے رہتے تھے۔ موسم گرما شروع ہوتے ہی سعودی عرب سے آنے والے کئی اصحاب سے ملاقات ہوئی اور ملاغہ میں سعودی قونصل جنرل بشیر الکردی تو اکثر ہمارے ہاں آتے رہتے۔ ہم پر ان کی مہربانیاں اور احسانات بہت ہیں اور وہ اب بھی میرے آرام و سکون کا بہت خیال رکھتے ہیں، لیکن جو زندگی ہم یہاں بسر کر رہے تھے، اس میں سکون نہیں تھا اور یہ ہماری فطرت کے بالکل الٹ تھا۔ میں آج تک اسے سمجھ نہیں سکی اور نہ اس بے اطمینانی کو بیان کر سکتی ہوں، لیکن یہاں اس کربناک صورت حال سے نجات حاصل نہیں کر سکی۔

Marfat.com

(2)

1986ء کے موسم گرما میں جرمنی کے ایک مشہور صحافی کارل گیونٹر سیمون (Karl Günter Simon) ہمیں ملنے آئے۔ وہ جرمن اخبار Frankfurter Allgemeine Zeitung کی فرمائش پر اسد کا تفصیلی انٹرویو کرنا چاہتے تھے۔ نازیوں کے دور سے پہلے اسد اس اخبار میں نمائندے کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے، لیکن اس وقت اس اخبار کا نام Frankfurter Zeitung تھا۔ اگرچہ برسوں پہلے اسد ایسے انٹرویوز دیتے دیتے تھک چکے تھے، پھر بھی وہ اپنے اس 'خاص' اخبار کے لیے انٹرویو دینے کو تیار ہو گئے۔ سیمون میجاس کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور وہ بلاناغہ ہمارے گھر آتے رہے۔ انہیں بھی یہ عجیب سا لگا کہ جب سعودی عرب کے حوالے سے شہرت کے مالک محمد اسد نے اپنے انٹرویو میں یہ کہا کہ کاسٹا ڈل سول میں ان کا ''گھر دیگر ہزاروں گھروں جیسا ہے''۔ بظاہر اس گھر میں یا اس علاقے میں، جہاں یہ واقع تھا، کوئی بری بات تو نہیں تھی۔ یہاں سے Fuengirola دکھائی دیتا تھا اور ہماری تین اطراف سمندر کے کنارے ہلکورے کھاتی ہوئی پہاڑیاں تھیں، لیکن جیسا اپنائیت کا احساس سوئٹزرلینڈ، مراکش اور پرتگال میں تھا، وہ یہاں ناپید تھا۔ یہاں کسی حد تک غیریت محسوس ہوتی تھی، اگرچہ لوگ بڑے تہذیب یافتہ اور نفیس طبع تھے۔ زیادہ تر سکینڈے نیویا کے دولت مند لیکن بے حس لوگ یہاں آباد تھے، جو پین اپنے بڑھاپے یا ادھیڑ عمر کے دن گزارنے آتے تھے۔ ان میں ہماری قبیل کا ایک بھی شخص نہیں تھا۔

اسد کا یہ انٹرویو نومبر میں منظر عام پر آیا۔ اس انٹرویو کے بارے میں میں نے ہانس گیونٹر سیمون سے یہ پیش گوئی کی تھی کہ یہ اسد کا آخری اخباری انٹرویو ہوگا۔ اس میں ان کی بھرپور شخصیت کی روح سمو دی گئی تھی اور اس کے ساتھ ان کی کئی غیر معمولی تصاویر بھی شائع کی گئی تھیں۔ غالباً اسد کی یہ آخری تصویریں ہیں[125]۔ انہی میں ایک تصویر ہمارے پالتو کتے شیطان کی بھی ہے، جو میرے شوہر کے قریب بیٹھا ہے۔ ہمارے بھی کتے ہم دونوں سے بڑا پیار کرتے تھے۔ میں تو ویسے ہی ان کی خدمت گزار تھی اور شیطان سے میرا ایسا ہی تعلق تھا۔

اسی سال جون میں ہمیں ایک بڑا سا لفافہ موصول ہوا، جس میں دو خط تھے، جو صدر پاکستان ضیاء الحق نے ہم دونوں کو الگ الگ تحریر کیے تھے۔ ان مکتوبات میں ہمیں پاکستان آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ پاکستان مین میرا قیام مختصر رہا، لیکن میں اسد کی نسبت یہاں کی طرز زندگی کو زیادہ پسند کرتی تھی۔ پھر اس ملک میں ہمارے بہت سے دوست بھی تھے۔ ضیاء الحق نے ان خطوط میں اسد کی علمیت کی بہت تعریف کی تھی، اس لیے ہم نے اتفاق رائے سے اس دعوت کو قبول کرنے اور مستقبل قریب میں وہاں جا کر گھر تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جونہی ہم نے ضیاء الحق کو اپنی رضامندی کی اطلاع دی، وہ پاکستان ہی میں طیارے کے ایک 'حادثہ' میں ہلاک ہو گئے۔ یوں ہماری قسمت نے اچانک ایک اور موڑ لیا۔ ضیاء الحق کی ہلاکت کے بعد ان کے جانشین صدر نے اس دعوت نامہ کو برقرار رکھا، لیکن اب ہم میں سے کوئی بھی جانے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے ضیاء الحق کے جانشین کا نام یاد نہیں رہا، لیکن یقیناً وہ ضیاء الحق جیسا نہیں تھا۔

چند ماہ بعد شاہ فیصل کے چھوٹے بھائی امیر سلمان نے اسد کو ماربیلا میں اپنے خوبصورت لیکن سادے سے

Marfat.com

گھر پر کھانے کی دعوت دی۔ اسد، ابن سعود کے اس حقیقی بیٹے سے بہت متاثر ہوا۔ وہ خوش شکل، خوش لباس، سادہ طبع، معنز ز اور ذہین شخص تھے۔ چند ہفتوں بعد وہ اپنے بیٹے اور شیخ عبداللہ بالخیر سمیت متعدد عرب شیوخ کے ساتھ ہمارے گھر تشریف لائے۔ میرا خیال ہے کہ دوران گفتگو ہمارے پاکستان جانے کے ابتدائی فیصلے کا ذکر آیا تو شہزادہ سلمان نے ہمیں جدہ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی تجویز پیش کی، جہاں وہ اسد کے لیے اچھے سے گھر کا بھی اہتمام کردیں گے اور سعودی عرب کا پاسپورٹ بھی انہیں دے دیا جائے گا، حالانکہ اس کا حصول ناممکن ہے۔ اگر اسد اس تجویز کو قبول کر لیتے تو کیا یہ ان کے اصل گھر یعنی سعودی عرب آخری بار جانا ہوتا، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

شہزادہ سلمان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد شاہ سعودیہ کے فرزند امیر فیصل بن فہد کا فون آیا۔ انہوں نے اسد کو دوپہر کے غیر رسمی کھانے پر بلایا۔ سعودی شہزادے اپنے مہمانوں کی آؤ بھگت کرنے میں غیر رسمی انداز اپنائے رکھتے ہیں۔ وہاں جو تصاویر کھینچی گئیں، وہ میرے شوہر کی آخری یادگار تصویریں ہیں۔ وہ اپنے ہم ذوق اور ہم مزاج اصحاب میں گھرے ہوئے تھے۔

(3)

اس سال موسم خزاں میں ہمارا پالتو کتا شیطان، جو ابھی جوان اور صحت مند تھا، شدید بیمار پڑ گیا۔ طبی معائنہ ہوا تو اس کے لبلبے میں سوزش کا پتہ چلا۔ غالباً اس کی بیماری کا باعث وہ گوشت تھا جو ہم میجاس سے خریدتے تھے۔ اس کا دوادارو شروع ہوا اور اس نوعمری میں اسے تھوڑا سا پرہیزی کھانا دیا جاتا، جس سے اس کا وزن خاصا کم ہو گیا۔ جب اس کی حالت قدرے بہتر دکھائی دی تو اس کے خون کا معائنہ کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک خوفناک مرض میں مبتلا ہو چکا ہے، جس کو یہاں عرف عام میں ''بحیرۂ روم کا مرض'' کہا جاتا ہے اور اس علاقے کے زیادہ تر کتوں کو یہی مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ مرض لاعلاج ہے اور اگر یہ ابتدائی مرحلہ میں ہو تو باقاعدگی سے روزانہ ٹیکے لگوانے سے اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ پھر بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کتا کمزور ہونا شروع ہو جاتا ہے اور پھر کوئی علاج ممکن نہیں ہوتا۔ فروری کے آخر میں شیطان بھی مر گیا۔ اس وقت اس کی عمر دو سال سے بھی کم تھی۔

تقریباً ایک ماہ بعد ہم پر آلام ومصائب کی بجلی سی گری۔ بعض علامات اسد کی خرابی صحت کی نشاندہی کرتی تھیں، چنانچہ ڈاکٹر کو دکھایا گیا تو پتہ چلا کہ وہ مثانے کے کینسر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ Torremolinos کے قریب ایک کلینک میں ان کا فوراً آپریشن کیا گیا، لیکن اس کے بعد مزید علاج کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ حسب معمول ایسے تکلیف دہ حالات میں اسد نے شیخ ذکی کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے فوراً متعلقہ کلینک سے تمام ایکسریز اور طبی رپورٹیں منگوائیں اور انہیں میرے آبائی شہر بوسٹن کے میساچوسٹ جنرل ہسپتال بھجوا دیا، تاکہ ان کی روشنی میں اسد کا صحیح طریقے سے علاج کروایا جاسکے۔ 12 اپریل کو میری سالگرہ تھی اور اسی دن ہم بذریعہ ہوائی جہاز ملاغہ سے نیویارک روانہ ہو گئے۔ ہم وہاں طلال اور اس کی بیگم کے پاس ایک دو روز گزار کر بوسٹن کے مجوزہ ہسپتال میں

Marfat.com

جانا چاہتے تھے۔ طلال کو ہم اپنی آمد کی پہلے سے اطلاع کر چکے تھے اور وہ دونوں میاں بیوی نیویارک کے ہوائی اڈہ پر ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ طلال خاصا غمگین تھا اور اس نے میرے قریب آ کر اپنے دکھ درد کا اظہار کیا۔ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد وہ کبھی میرے اتنے قریب نہیں آیا تھا۔ حقیقتاً وہ اپنے باپ سے بڑی محبت کرتا تھا اور آئندہ باپ کی صحت کی متوقع صورت حال کی وجہ سے وہ خاصا متفکر بھی تھا۔

شیخ ذکی نے بوسٹن میں ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ہر طرح کے انتظامات کر دیئے تھے۔ ہمیں ایک نہایت اعلیٰ ہوٹل کے سویٹ (suite) میں ٹھہرایا جہاں سے پبلک گارڈنز اور بوسٹن کامن صاف دکھائی دیتے تھے۔ یہاں میں نے اپنی جوانی کا بیشتر حصہ گزارا تھا۔ اس ہوٹل میں ہم جب تک چاہیں، رہ سکتے تھے۔ میساچوسٹ جنرل ہسپتال کے ایک معروف لیکن اکھڑ مزاج ماہر ڈاکٹر سے اسد کو دکھانے کے لیے وقت طے ہو چکا تھا۔ طبی معائنے کے بعد اس نے بڑے سرد لہجے میں مرض کی تشویش ناک صورت حال کا ذکر کیا۔ کینسر پھیلتا جا رہا تھا اور اب بلا تاخیر ایک اور آپریشن کرنا ضروری تھا۔ اس نے اسد کو بتایا کہ بحالی صحت کی پچاس فیصد امید ہے۔ آپریشن کیا گیا اور اس کے بعد کئی ماہ تک کیمیائی علاج ہوتا رہا اور اشعاع ریزی کا عمل بھی جاری رہا۔

اپریل تا نومبر اسد ہسپتال آتے جاتے رہے۔ بظاہر ان کی صحت حیران کن حد تک بہتر ہو گئی تھی، لیکن مجھے اس میں تعجب کا کوئی عنصر دکھائی نہیں دیتا تھا، کیونکہ اسد ہمیشہ باہمت اور راضی برضا رہنے والے شخص تھے۔ انہوں نے کبھی شکایت نہیں کی تھی۔ قرآن میں صبر کی جس اعلیٰ صفت کا بار بار ذکر کیا گیا تھا، وہ اس کی عملی مثال تھے۔ شیخ ذکی روزانہ ہم دونوں کو فون کرتے۔ جولائی میں وہ کچھ وقت کے لیے اسد کو دیکھنے بھی آئے۔ انہوں نے میرے شوہر کے ساتھ اپنے باپ جیسا برتاؤ کیا۔ وہ ہر طرح کے دنیاوی وسائل سے مالا مال تھے۔ اس طویل قیام کے دوران میں ہمارے کئی دوستوں کے فون آتے رہے، لیکن ان میں کوئی شیخ ذکی جیسا نہیں، شاید پوری دنیا میں ہمیں ان کا ثانی نظر نہ آئے۔

ستمبر کے آغاز میں اسد کا سکینر پر طبی معائنہ ہوا اور انہیں بالکل صحت مند قرار دیا گیا۔ صرف ایک دفعہ اور شعاع ریزی کا عمل تجویز کیا گیا۔ برقی شعاعیں دوبارہ ان کے جسم پر پڑنا تھیں۔ جو ٹیکسی ہمیں ہسپتال لے کر آئی تھی، اس سے باہر نکلے۔ اسد ڈرائیور کی جانب سے ذرا جھک کر ڈرائیور کو بخشیش (tip) دینے کے لیے بٹوے کو ٹٹول رہے تھے۔ پہنچنے سے پہلے اس نے بے صبری سے تیزی کے ساتھ گاڑی آگے بڑھا دی اور اسد زمین پر گر پڑے۔ اسد سے خود اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان کی ران کی دوسری ہڈی بھی ٹوٹ گئی ہے۔ ہسپتال جاتے ہی میں نے اصرار کیا کہ برقی علاج سے قبل ایکسرے کروا لیں اور وہ بمشکل اس پر آمادہ ہوئے۔ ایکسرے سے معلوم ہوا کہ ران کی ہڈی میں دراڑ پڑ گئی ہے۔ اس وقت تک میں خود بھی ان ہڈیوں کی ماہر ہو چکی تھی۔

اسد اشعاع ریزی کے عمل کو ہر صورت میں مکمل کرنے پر مُصر تھے، جس میں ان کو بڑے سے میز پر لٹا کر اوپر اٹھا دیا جاتا اور اس سے یقیناً کسی بہتری کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ بعد میں انہیں پہیوں والی کرسی پر بٹھا دیا

Marfat.com

گیا۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جو میرے دل کو چیر کر رکھ دیتا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق ہسپتال میں سکینر پر ان کا طبی معائنہ لازمی تھا۔ یہ دنیا کے مشہور ترین ہسپتالوں میں سے ایک تھا، اس لیے وہاں انتظار کرنے والے مریضوں کی ایک لمبی فہرست آویزاں تھی۔ چنانچہ ہمیں انتظار کرنا پڑا، لیکن یہ تاخیر نقصان دہ ثابت ہوئی، کیونکہ جب پانچ دنوں کے بعد ہماری باری آئی، پوری ہڈی ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اب اس طرح کے آپریشن کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا، جیسا ہم اس سے قبل دو بار رباط اور لندن میں کرا چکے تھے۔

بوسٹن کے ایک ماہر سرجن نے آپریشن کیا اور یہ کامیاب رہا، لیکن یہ ان کے دل کے لیے مناسب نہیں تھا، جو پہلے ہی خاصا کمزور ہو چکا تھا۔

آپریشن کے کئی روز بعد یہ تجویز کیا گیا کہ اسد کو فزیوتھراپی کے لیے Spaulding Rehabilitation Hospital جانا چاہیے، جہاں شیخ ذکی کے متعدد دوست ڈاکٹروں نے تمام ضروری انتظامات کر رکھے تھے۔ ایک ماہ کے علاج کے بعد اسد ہسپتال سے ہوٹل اور وہاں سے سپین اپنے گھر جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے کہ خبر ملی کہ شیخ ذکی ہارورڈ لا اسکول میں اپنے سالانہ لیکچر دینے کے لیے آنے والے ہیں، اس لیے ہم ان کی آمد تک رک گئے۔ اس دفعہ شیخ ذکی کی بیگم بھی ان کے ہمراہ آئی تھیں اور حسب معمول انہوں نے ہمارے ہوٹل کے ایک علیحدہ بڑے کمرے میں رات کے کھانے کا اہتمام کیا، جس میں انہوں نے بوسٹن میں مقیم اپنے کئی دوستوں کو بھی بلایا۔ مہمانوں میں جج، وکلا، ڈاکٹر اور ایک خوش طبع یسوعی پادری ڈاکٹر گاون (Gavin) بھی شامل تھا، جو عربوں کا شیدائی تھا اور ہارورڈ کے سامی میوزیم کے نگران کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بوڑھی والدہ تھی، جو اب بھی خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ شیخ ذکی یمانی کے ہر جگہ دوست ہیں اور وہ بہت سے دوستوں کا دوست ہے۔ میرے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے شیخ ذکی سے زیادہ اسد کی خدمت کی ہو۔ اس کے اندر محبت کے جو جذبات موجزن ہیں اور اس کے دل میں جو کشادگی ہے، وہ میں کیا، کوئی بھی صحیح طور پر بیان کرنے سے قاصر ہے۔

ہم براستہ نیویارک واپس آ گئے۔ اگرچہ ہمارے لیے نیویارک رکنا تکلیف دہ تھا، پھر بھی ہم ہوائی اڈہ پر طلال اور اس کی بیوی سے ملنا اور ان کے ساتھ چند گھنٹے گزارنا چاہتے تھے۔ طلال اپنے والد کی عیادت کے لئے تین بار بوسٹن آیا تھا اور اکثر فون پر مزاج پرسی بھی کرتا رہتا تھا، لیکن اس نے کبھی مجھ سے بات تک نہیں کی۔ طلال اور تانیا ہمیں الوداع کہنے جہاز تک آئے۔ مجھے یوں لگا جیسے طلال اور اس کا باپ ایک دوسرے کو آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ طلال اور اس کی بیوی ہمیشہ اسد کو ابوطلال کہا کرتی تھی۔ طلال کی والدہ بھی اپنے خاوند کو ایسے ہی کہا کرتی تھی۔ طلال کے ساتھ اسد کا حقیقی رشتہ بھی تو یہی تھا۔ 'ابوطلال'۔

(4)

سپین واپس آنے کے بعد ہم شیخ ذکی کے اصرار پر چند ماہ ماربیلا کے ایک ایسے ہوٹل میں ٹھہرے، جس میں کلینک بھی تھا۔ یہاں بھی تمام انتظامات انہی کی ہدایت پر کئے گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم میجاس کے نزدیک اپنے

Marfat.com

قدرے بے سکون گھر میں اپنے روزمرہ زندگی کے معمولات شروع کرنے سے قبل گذشتہ نو مہینوں کی بیماری اور تھکن سے بحال ہو جائیں۔ ہماری غیر موجودگی میں ڈھیروں خطوط آئے اور وہ جوں کے توں پڑے تھے۔ ان کو الگ الگ کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن نظر آتا تھا۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد ان کو ترتیب سے رکھنے میں کئی ماہ صرف ہو گئے۔

ہم نے اپنی بے ترتیب زندگی کو پھر سے ڈھب پر لانے کی کوشش کی، لیکن اب یہ خاصا مشکل کام تھا۔ آنے والے دو سالوں میں کوئی قابل ذکر واقعہ رونما نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ ہم دونوں اکیلے رہے اور تکالیف کو مل کر برداشت کرتے رہے۔

(5)

1990ء کے موسم گرما میں اچانک ہمارے ہاں مہمان آ گئے۔ یہ مہمان جب بھی آتے، ایسے ہی اچانک اور بغیر اطلاع دیئے آتے۔ یہ مہمان تھے شیخ ذکی اور ان کی بیوی تمام۔ وہ اپنی بادبانی کشتی (yacht) میں ہمیں دیکھنے ملاغا آئے تھے۔ ہمیں شیخ ذکی کے ایک دوست نے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی جو Fuengirola میں رہتے تھے اور یہ جگہ میجاس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ بدقسمتی سے اس روز میری طبیعت ناساز تھی، اس لئے اسد کو اکیلے ہی جانا پڑا۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا، کیونکہ ہم کہیں بھی جاتے، ہمیشہ اکٹھے جاتے تھے۔ واپسی پر اسد کے ہمراہ شیخ ذکی، تمام، اُن کی والدہ اور ان کے پانچ نوجوان اور سلیقہ مند بچے بھی تھے، جنہیں ہم اچھی طرح سے جانتے تھے۔ اس مختصر قیام میں، میں نے شیخ ذکی کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ ہم ان کے اور ان کے خاندان کے کس قدر ممنون ہیں۔ یہ ہمارے اپنے خاندان جیسا ہی ہے اور اب صرف یہی ایک بچا ہے۔ انہوں نے ہمارے لیے جو کچھ کیا، اس کا شکریہ ادا کرنے کے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ اسد کے انتقال سے پہلے یہ آخری موقع تھا، جب ہم نے اپنے کرمفرما شیخ ذکی کو دیکھا تھا۔

انہی دنوں شہزادہ سلمان نے ہمیں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ انہیں ماربیلا آئے چند ہی روز ہوئے تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد خلیج فارس میں جنگ چھڑ گئی اور شہزادہ سلمان اور شیخ ذکی دونوں کو اچانک الگ الگ اپنے ملک جانا پڑا اور یوں اس شہزادے سے ہماری طے شدہ ملاقات نہ ہو سکی۔

ہمارا اگلا سال بھی بغیر اہم اور قابل ذکر واقعات کے بیت گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اسد زندگی اور مجھ سے بھی کنارہ کشی اختیار کرنے لگے ہیں اور ان کا یہ رویہ میرے لیے انتہائی کرب ناک تھا۔ فروری کے شروع میں ان کا زیادہ وقت بستر ہی پر گزرا۔ زندگی میں ایسا پہلی بار ہوا، کیونکہ انہوں نے ہمیشہ پختہ ارادے اور ہمت سے فعال اور بھرپور زندگی گزاری تھی۔ اب انہیں حالات حاضرہ، کتابوں حتیٰ کہ میری ذات سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں انہیں آمادہ کرتی کہ وہ میرے سہارے گھر ہی میں چہل قدمی کر لیا کریں۔ میں نے مقدور بھر کوشش کی کہ وہ زندگی کے معمولات یا کم از کم میری ذات میں کوئی دلچسپی لیں۔ لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رفتہ رفتہ ہر چیز سے الگ تھلگ ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے ڈنمارک کے ایک مقامی ڈاکٹر سے ان کے طبی معائنے کے لیے درخواست کی۔ اس نے مشورہ دیا

Marfat.com

کہ انہیں کچھ عرصہ جدید بائیوکیمیکل ادویات استعمال کرائیں تاکہ ان کی جسمانی قوت قدرے بحال ہو اور گھٹتی ہوئی بھوک بھی ٹھیک ہو جائے۔ میں نے ڈاکٹر کو ایک طرف لے جا کر پوچھا کہ ان حالات میں کیا کیا جائے تو اس نے کہا کہ جب تک ان کی عمر سو سال نہیں ہو جاتی، یہ ایسے ہی رہیں گے۔ وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اور پھر تیزی سے ان کی حالت بگڑنے لگی اور دو روز بعد وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ یہ فروری کی شام تھی اور میں نے انہیں تھوڑا سا کھانا کھلانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ وہ کچھ کھا لیں اور دوائی لے لیں۔ اسی شام میں نے ڈاکٹر کو بلانے کا ارادہ کیا، اگرچہ اب تاخیر ہو چکی تھی۔ میں نے انہیں تھوڑا سا پانی پلایا، میں نے جھک کر ان کے لبوں کو چوما۔ انہوں نے بڑی بے ہمتی سے اس کا جواب دیا اور جب میں فوراً باورچی خانہ سے واپس لوٹی، وہ دائمی طور پر داغ مفارقت دے چکے تھے۔

اس اندوہناک واقعہ کے بعد مجھ پر جو بپتا پڑی، اس کو میں کیسے بیان کروں۔ ڈنمارک کے ہمسایوں نے ڈاکٹر تک پہنچانے میں میری مدد کی اور میری درخواست پر انہوں نے فون پر طلال کو ان کے والد کے فوت ہونے کی اطلاع دی۔ جب سے ہم سپین واپس آئے تھے، طلال باقاعدگی سے ہر ہفتے ایک بار اپنے والد کو فون کرتے اور آخری بار اس نے مجھ سے بھی بات کی، کیونکہ اسد کے لیے ٹیلی فون تک جانا ممکن نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ مارچ میں کچھ وقت نکال کر والد کی عیادت کے لیے آئے گا۔

اسی رات میں نے سعودی عرب کے قونصل جنرل بشیر الکردی کو بھی فون کیا، لیکن وہ سویڈن گئے ہوئے تھے۔ ان کا ڈرائیور عبدالرحمٰن بن صود قین انڈونیشیا سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ ذہین نوجوان ہمارا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ فوراً پہنچ گیا اور کئی گھنٹے میرے ساتھ رہا۔ اگرچہ اب دیر ہو چکی تھی، لیکن گھر میں کسی دوسرے انسان کی موجودگی نفسیاتی اعتبار سے مضبوط سہارے سے کم نہ تھی۔ میں نے یہ رات اکیلے گزاری۔ گھر کی تمام اشیاء جلائے رکھیں۔ میرا شوہر تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا چکا تھا، لیکن ان کی باقیات تو تھیں اور اب انہی کے سہارے زندگی کے باقی دن گزارنا تھے۔

رات گئے بشیر الکردی نے سٹاک ہوم سے فون کیا اور پوچھا کہ کیا میرے مرحوم شوہر نے تجہیز و تکفین کے لیے کوئی وصیت کی تھی۔ میں نے جواب دیا کہ انہوں نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ انہیں اسلامی طریقے سے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ بعد میں عبدالرحیم نے جو سپین میں میرے قریبی اور مخلص دوست ہیں، مجھے بتایا کہ ماربیلا میں گاڑی پر کہیں جاتے ہوئے انہوں نے ذکر کیا کہ اسد اپنے چہیتے ملک سعودی عرب میں مرنا چاہتے تھے، لیکن انہوں نے مجھ سے کبھی اپنی اس خواہش کا ذکر نہیں کیا تھا، شاید وہ مجھے اتنی دور جانے کی اذیت سے بچانا چاہتے تھے۔

علی الصبح ماربیلا میں شاہ عبدالعزیز مسجد کے امام گھر آئے۔ ان کے ساتھ سعودی قونصل خانہ کے کچھ ملازمین اور عبدالرحیم بھی تھے۔ انہوں نے اسد کو غسل دیا اور ان کی میت کو دفن کرنے کے لیے کفن پہنایا۔ یہ سب کچھ کس قدر اذیت ناک تھا۔ اس سے قبل میرے ساتھ کبھی ایسا سانحہ پیش نہیں آیا تھا۔ عبدالرحیم میرے ساتھ تھا اور وہی میرے غم میں شریک تھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ وہ اسد کی میت کو اٹھا کر ماربیلا کی خوبصورت مسجد میں نماز جنازہ کے لیے لے

Marfat.com

گئے۔ یہ مسجد ان کے عظیم اور پیارے دوست عبدالعزیز ابن سعود کے نام سے منسوب تھی۔ ان کی نماز جنازہ کے لیے اس سے زیادہ موزوں جگہ اور کونسی ہو سکتی تھی۔

بروز سنیچر سہ پہر کو اسد کا اکلوتا بیٹا طلال بھی آ گیا۔ وہ بذریعہ جہاز نیویارک سے براستہ لندن پہنچا اور میجاس کے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ مجھے توقع تھی کہ اس موقع پر ہماری قدرے عجیب اور طویل قرابت داری کے باعث ہم ایک دوسرے کے دکھ بانٹ سکیں گے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اتوار کی صبح اپنے مہربان دوست عبدالرحیم کے ساتھ ہم دونوں غرناطہ پہنچے۔ جان پہچان کے کچھ لوگ اور سعودی عرب کے قونصل خانہ کے چند ملازمین ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے اسد کو، جن کے ساتھ میں نے زندگی کے چالیس سال گزارے تھے، الحمرا پہاڑی کے مقابل مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جگہ "متعصب کیتھولک" جنرل فرانکو نے اپنے مراکشی ساتھیوں اور ان کے خاندان والوں کو دفنانے کے لیے مختص کی تھی۔ یہ ایک خوبصورت لیکن میرے لیے سنسان جگہ تھی اور گردونواح کی پہاڑیاں برف سے اٹی پڑی تھیں۔ ہم نے اسد کو کم گہری قبر میں دفن کر دیا۔ ان کے ساتھ والی قبروں میں ہمارے ہسپانوی مسلمان دوست میاں بیوی یحیٰی اور رحیما مولینا کی بیس دنوں کی نومولود بیٹی اور ایک نوے سالہ بوڑھا شخص مدفون تھے۔ مجھے یہ جگہ بھلی محسوس ہوئی اور کسی حد تک ذہنی اطمینان سا ہوا، لیکن میں صحیح طور پر بتا نہیں سکتی کہ کیوں۔

اس سچے اور عظیم شخص کی سادہ سی رسم تدفین کے موقع پر صرف معدودے چند ایسے اشخاص موجود تھے، جو اسد کو جانتے تھے اور ان سے محبت کرتے تھے۔ ان میں میرے علاوہ طلال، عبدالرحیم، میرا انڈونیشیائی دوست، جو میرے ساتھ بڑے احترام اور خلوص سے ملتا اور ڈاکٹر یحیٰی۔ وہ اس نوزائیدہ بچی کا باپ تھا، جو میرے شوہر کے پہلو میں ابدی نیند سو رہی تھی۔

(6)

سعودی عرب کے قونصل جنرل کی سویڈن سے واپسی سے پہلے اسد کو دفن کیا جا چکا تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ ان کی جنازے میں شرکت نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہی دنوں ان کی بیوی کا سویڈن میں دماغ کے کینسر کا آپریشن ہوا تھا، لیکن انہوں نے اپنے عملہ کو اس مشکل وقت میں ہر ممکن طریقے سے میری مدد کرنے کی تاکید کر دی تھی اور وہ تمام لوگ انتہائی مہربان اور مددگار ثابت ہوئے، اگرچہ اس کے بعد میں انہیں مل بھی نہیں سکی۔ وہ اس حقیقت سے بالکل لاعلم تھے کہ میں بالکل اکیلی ہوں اور خاندان کا کوئی فرد یا دوست موجود نہیں، اس لیے اگر وہ ملنے آتے یا مختصراً فون پر بات کرتے تو میں متشکر ہوتی۔ اس کے بجائے وہ ایک وفد کی شکل میں طلال سے ملنے ہوائی اڈہ گئے، حالانکہ انہوں نے اسے کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ طلال کے ہوٹل جا کر ملے اور رسمی اطوار کے ساتھ انہیں رخصت کرنے ملاغہ کے ہوائی اڈے بھی گئے۔ مجھے حیرت ہے کہ میرے شوہر جیسے معروف شخص کی وفات کے بعد اس کی بیوی کے ساتھ دنیائے عرب میں ایسے ہی برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اب میں ان باتوں کو لائق اعتنا نہیں سمجھتی، لیکن میرے خیال میں شاید ایسا ہی ہوتا ہو۔

Marfat.com

میں اکثر عبدالرحیم کو فون کرتی۔ وہ سعودی عرب کے قونصل خانے میں ڈرائیور تھا، قونصل جنرل اور ماربیلا میں اپنے عرب دوستوں کے بھی کام ذوق وشوق سے کرتا تھا۔ ان مصروفیات کی وجہ سے اس کا مجھے آ کر ملنا ممکن نہیں تھا، لیکن میں جانتی تھی کہ وہ ہمیشہ میری مدد کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔

جس بات نے مجھے زیادہ اداس کر دیا تھا، وہ یہ تھی کہ شیخ ذکی اسد کے جنازے میں شرکت کے لیے جدہ سے پہنچ نہیں سکے تھے۔ چند روز قبل Fuengirola میں مقیم ان کے ایک دوست نے اسد کی علالت کے بارے میں انہیں بتایا تھا۔ وہ بلا تاخیر ہمارے پاس آنا چاہتے تھے۔ اگر وہ اس وقت آ جاتے، تو میری ڈھارس بندھ جاتی۔ جب انہوں نے جدہ سے مجھے فون کیا، اسد فوت ہو چکے تھے۔ شیخ ذکی اور ان کی بیوی تمام فون پر مجھ سے باتیں کرتے رہے اور اس صورت حال میں ہر طرح سے میرے ساتھ تعاون کرنے کی پیشکش کی۔ شیخ ذکی سے بولنا بھی مشکل ہو رہا تھا اور ظاہر ہے، ان کے لیے جنازے میں شرکت بھی ممکن نہیں تھی، لیکن میں نے اسد کی قبر کے پاس ان کی موجودگی کو محسوس کیا، کیونکہ وہ ان کے قریب ترین دوست تھے اور دوست سے بھی کچھ زیادہ ہی تھے۔ اسد اور شاید مجھے بھی ان سے زیادہ ہمدرد انسان ملنا مشکل ہے۔

قونصل جنرل سے اسد کی رحلت کی خبر سن کر شہزادہ سلمان نے کم از کم مختلف مواقع پر تین بار فون پر میری خیریت دریافت کی۔ وہ دیگر عربوں سے کتنا مختلف تھا، لیکن وہ صرف شہزادہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک عظیم شخص بھی تھا۔ وہ دوسرے کے حالات، احساسات کا کماحقہٗ خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ وہ ذاتی طور پر اسد کی تجہیز و تکفین کے تمام اخراجات برداشت کریں گے۔ اس سلسلہ میں سعودی عرب کے شاہی خاندان کے افراد نے دست تعاون بڑھایا۔ اسد اپنے ایام جوانی کے دوست عبدالعزیز ابن سعود کی آلِ اولاد سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کا جسد خاکی تو سعودی عرب کی سرزمین میں دفن نہ ہو سکا، لیکن میں اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ اس کا کچھ حصہ ہمیشہ اس ملک میں رہے گا۔

بعد میں کچھ لوگوں نے شکایت کی کہ مجھے اسد کی میت کو تدفین کے لیے مکہ یا مدینہ لانا چاہیے تھا اور میں انہیں جواباً حضور اکرمؐ کی اس حدیث کا حوالہ دیتی، جو اسد نے مجھے کئی بار سنائی تھی کہ ''کوئی نہیں جانتا کہ اس کی ہڈیاں کہاں دفن ہوں گی۔''

اسد نے اپنی زندگی کا سفر جس شاہراہ پر شروع کیا تھا، وہ یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ ایک طویل اور پُرخطر شاہراہ۔ اب وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ غرناطہ کے ایک چھوٹے سے قبرستان میں دائمی نیند سویا پڑا ہے۔

(7)

جس غیر معمولی شخص کی رفاقت میں چالیس سال گزارے ہوں، اس کی شخصیت، کردار اور مزاج کے بارے میں غیر جذباتی اور انسانی حد تک ممکن معروضی پیرائے میں مختصراً اظہار خیال کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ پھر بھی

Marfat.com

میں اتنا ضرور کہنا چاہوں گی کہ وہ ایک پُر جوش، نفس پرست لیکن بے انتہا ضبط نفس کی صفت کے مالک، قدرے متین اور بظاہر الگ سبھاؤ اور وضع قطع کے انسان تھے۔ وہ زندگی کے آخری لمحہ تک مجھ سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتے تھے، لیکن ظاہری یا نجی طور پر وہ اس کے اظہار سے گریز کرتے تھے۔ وہ مجھے چھو کر اپنے جذبہ محبت کو ظاہر کرنے کے ناقابل تھے، حالانکہ میں اکثر اپنے دل میں ایسی آرزو رکھتی تھی، لیکن وہ میرے جذبات اور میری خوشی کا بڑا خیال رکھتے تھے اور بے شمار طریقوں سے اس کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ انہیں میرا گھر کا کام کاج کرنا پسند نہیں تھا، حتیٰ کہ جب ہم مالی طور پر تنگ دستی کا شکار ہوتے تھے، اس وقت بھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ایسے گھریلو بکھیڑوں میں اپنا وقت ضائع کروں۔ وہ ہمیشہ میری سہولت کے لیے گھر میں ملازمہ کا بندوبست کر دیتے تھے۔ البتہ جب ہم سپین آ گئے تو پھر میری معاونت کے لیے ایسی سہولت مہیا کرنا مشکل ہو گیا۔

انہیں جانوروں خصوصاً اعلیٰ نسل کے کتوں اور گھوڑوں سے گہری محبت تھی اور وہ اپنی اس محبت کا کھل کر اظہار بھی کرتے تھے۔ ان کے دوستوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ انہیں بے حد عزیز تھے، لیکن بدقسمتی سے ان میں سے بہت سے دوست جو مجھ سے بھی ویسے ہی دوستانہ برتاؤ کرتے تھے، پوری دنیا میں بکھرے پڑے تھے۔ چند احباب کو چھوڑ کر باقی سب مسلمان تھے، لیکن وہ ان سے کسی خیالی ''اسلامی یک جہتی'' کے باعث محبت نہیں کرتے تھے، بلکہ غیر مسلمانوں کی نسبت ان کے مابین قلب و ذہن کی قربت کے کئی اور عوامل بھی کارفرما تھے۔

وہ اپنے اکلوتے بیٹے طلال اور اس کی تمام ''حرکات'' کے باوجود گہری محبت کرتے تھے۔ وہ اپنے اس ''عجیب و غریب'' بیٹے کو بہت کچھ بتانا چاہتے تھے اور میری بھی خواہش تھی کہ وہ ایسا ضرور کریں، لیکن میں نے اپنی طویل ازدواجی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا کہ وہ اس سے اپنے دل کی بات کہہ سکے۔ طلال ایک سرد مہر اور پیچیدہ شخصیت کا مالک ہے اور اس کے ظاہری طور طریقوں سے اس والہانہ محبت کا اظہار نہیں ہوتا، جو اسے اپنے باپ سے ہونا چاہیے تھی۔ یہ افسوسناک بات تھی اور مجھے اس کا پورا احساس تھا۔ میں نے طلال کو بتانے کی کوشش کی کہ اس کے باپ نے ہمیشہ اسے پدرانہ شفقت سے نوازا ہے، لیکن وہ طبعاً اپنے بیٹے سے پوری طرح محبت کا اظہار نہیں کر سکے اور طلال اسے تنہائی یا دور افتادگی کے ''ناقص جذبات'' ہی سمجھتا رہا، جبکہ حقیقت اس کے بالکل الٹ تھی۔

جہاں تک اسد کے میرے ساتھ تعلقات کا سوال ہے، تو وہ مجھ سے کبھی بھی الگ تھلگ نہیں رہے، نہ داخلی طور پر اور نہ خارجی طور پر۔ وہ زندہ دل، شفیق اور بامروت شخص تھے۔ مختصراً قدرت نے انہیں جتنا جذبہ محبت ودیعت کیا تھا، اسی کے مطابق وہ مجھ سے اس کا اظہار کرتے تھے اور میں سمجھتی ہوں کہ میرے لیے یہی کافی ہے۔ آخر کار صرف میں ہی ان کی محبت کا حقیقی محور و مرکز رہ گئی۔ بظاہر ان کو قابو میں رکھنا کسی انسان کے بس میں نہیں تھا اور یہ صرف میری ہی ذات تھی جو ان پر ''قبضہ'' جمانے کا کچھ کچھ دعویٰ کر سکتی ہے۔

وہ خوبصورت افراد کی معیت میں وقت گزارنا پسند کرتے تھے، لیکن وہ آسانی ان کے بغیر بھی زندگی گزار سکتے تھے۔ وہ میرے جسمانی اوصاف کو پسند کرتے تھے۔ جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی، میں ایک نوجوان،

Marfat.com

خوبصورت خاتون تھی۔ عمر کے بڑھنے سے میں ویسی تو نہیں رہی تھی، لیکن پھر بھی میں ان کی نظروں میں خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ میں ان کی اکیلی محبوب نظر تھی اور وہ مجھ سے محبت کرتے تھے......

ظاہراً ان کی شخصیت خاصی مرعوب کن تھی۔ میں جب ان سے ملی تھی وہ بندوق کے گز کی طرح سیدھے اور دراز قد وقامت کے مالک تھے، اگرچہ بعد میں ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف جس میں اب خاصا افاقہ ہو چکا تھا، اور کولہے کی ہڈی کے تبدیل ہونے کے باعث ان کی کمر جھک گئی تھی اور یہ کبڑا پن ان کی عمر کے آخری حصے میں ہوا تھا۔

ان کے کندھے بڑے، سیدھے اور نوکیلے تھے، اس لیے ان پر لباس بہت سجتا تھا۔ ان کی ٹانگیں بھی خوبصورت تھیں۔ انہوں نے کبھی داڑھی نہیں منڈوائی تھی۔ ہم دونوں نے شادی کے موقع پر یہ عہد کیا تھا کہ وہ کبھی داڑھی نہیں منڈوائیں گے اور میں اپنے بال نہیں کٹواؤں گی۔ ہم نے زندگی بھر یہ عہد نبایا۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ موزوں لباس میں ان کی مردانہ وجاہت میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا لیکن سیر یا ادھر اُدھر گھومنے پھرنے کے لیے وہ عام سے جیکٹ یا موٹے ڈوریا دار کپڑے کی پتلونیں استعمال کرتے تھے۔ ان کے ماہر درزیوں سے سلوائے ہوئے دیدہ زیب سوٹ بغیر استعمال کئے پڑے رہے، جو میں نے ان کی وفات کے بعد اپنے دوستوں کو دیئے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا کہ ہمارے ایک عرب واقف کار نے بتایا کہ اس نے بچپن میں محمد اسد کو مدینہ میں دیکھا تھا۔ اسے ابھی تک یاد تھا کہ محمد اسد پیروں میں سینڈل پہنے اپنے اور پیغمبر اسلامؐ کے محبوب ترین شہر کی گلیوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ انہیں عربوں کا لباس بہت پسند تھا اور وہ خود اس لباس میں بہت اچھے دکھائی دیتے تھے، لیکن وہ اس لباس کو لارنس یا دیگر نومسلموں کی طرح نمائش کی خاطر نہیں پہنتے تھے، بلکہ وہ اسی کو ''فینسی ڈریس'' کہا کرتے تھے اور میرے خیال میں ان کا یہ کہنا بالکل درست تھا۔ وہ مزاجاً اداکار تو بالکل نہیں تھے، البتہ وہ فطرتاً سادہ لوح اور شفیق انسان تھے۔

زندگی کے آخری دنوں میں مَیں نے ان سے دو سوال کیے۔ لیکن یہ نہیں جانتی کیوں؟ شاید اس کی وجہ غیر مصدقہ پیش بینی کا یہ احساس تھا کہ وہ اب قریب المرگ تھے۔ ان میں ایک سوال یہ تھا کہ آپ کی زندگی میں وہ کونسی خواتین تھیں، جن سے انہوں نے سچی محبت کی، انہوں نے ایک پل سوچے بغیر بے ساختہ جواب دیا ''تم اور ایلسا'' (مؤخر الذکر ان کی پہلی بیوی تھی، جن کا 1927ء میں مکہ ہی میں انتقال ہو گیا اور وہیں مدفون ہے)۔[126]

دوسرا سوال اسد کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا ان کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا، جس پر بعد میں وہ شرمسار ہوئے ہوں۔ انہوں نے فی الفور جواب دیا ''ہاں! ایک دفعہ'' پھر انہوں نے بتانا شروع کیا کہ 1920ء کی دہائی کے آغاز میں، جب ابھی ان کے دل میں اپنے مسلمان ہونے کا خیال تک نہیں آیا تھا اور اسلام قبول کرنے سے برسوں قبل، وہ اپنی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے احمد کے ساتھ ایران کے مختلف علاقوں کا سفر کر رہے تھے کہ انہیں معاً اپنے پروردگار کے ساتھ تنہائی میں کچھ وقت گزارنے کا خیال شدت سے ستانے لگا۔ ان کا ارادہ تھا کہ بیوی بچے کو اپنے کچھ دوستوں کے ہاں چھوڑ کر خود سفر جاری رکھیں اور کسی گوشۂ تنہائی میں اکیلے اپنے مالک حقیقی کے ساتھ وقت گزاریں اور یوں اپنی دیرینہ خواہش کو پورا کریں۔ پھر انہوں نے سوچا کہ مختصر وقت کے لیے بیوی کو اپنی

Marfat.com

زندگی سے یوں نکال باہر کرنا ایک خود غرضانہ اور ظالمانہ فعل ہوگا، اس لیے انہوں نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ انہوں نے ایلسا سے اپنی سوچ کا کبھی ذکر تک نہیں کیا، لیکن وہ اپنی حساس طبیعت اور شوہر سے گہری محبت کے سبب ان کے ارادے کو کچھ کچھ بھانپ گئی تھی۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا، جس پر اسد ستر سال کی طویل مدت گزرنے کے باوجود نادم تھے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ انہوں نے مجھے زندگی بھر یوں تنہا چھوڑنے کا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ہم ہمیشہ ایک ساتھ رہے، ان کی زندگی کی آخری سانس تک......

انہیں پاکستان دل و جان سے عزیز تھا۔ وہ تصور پاکستان سے محبت کرتے تھے، حالانکہ اس ملک نے ان کے ساتھ معاندانہ رویہ اپنایا، لیکن وہ کبھی اس طرز سلوک کے شاکی نہیں رہے۔ وہ پاکستان کے پہلے شہری تھے اور آخر عمر تک انہوں نے پاکستان کے ساتھ اس گہرے تعلق کو قائم و دائم رکھا۔ اس دوران میں امیر سلمان کی جانب سے کئی بار پُرزور طریقے سے سعودی عرب کی شہریت مع پاسپورٹ کے پیشکشیں ہوتی رہیں، جو ان کی زندگی اور مختلف ممالک کے سفروں کی سہولتوں میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتی تھیں۔

پاکستان کے برعکس سعودی عرب سے ان کی محبت ذرا مختلف نوعیت کی تھی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ پاکستان سے ان کی محبت کا تعلق دماغ سے تھا اور سعودی عرب سے دل کا۔ (اگر کوئی انسان کسی جگہ، قوم یا ماحول سے حاسد ہو سکتا ہے تو میں بسا اوقات سعودی عرب کے بارے میں ایسے جذبے کا شکار ہو جاتی ہوں)۔ وہ عرب کے وسیع و عریض، تند و تیز ریگستانوں، یہاں کے باشندوں بالخصوص بدوؤں اور اپنے پسندیدہ نجد میں بسنے والے لوگوں کو بہت چاہتے تھے۔ انہوں نے ابن سعود کے وارثوں یعنی سعودی عرب کے شاہی خاندان کے تمام افراد کے ساتھ ان کی تمام تر کوتاہیوں اور کمیوں کے باوجود محبت کا رشتہ منقطع نہیں کیا۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو دنیا میں کونسا انسان ہر اعتبار سے مکمل ہے!

ان میں خودنمائی اور تکبر کا شائبہ تک نہیں تھا۔ 1980ء کی دہائی کے شروع میں لندن میں ایک باہمت اور قدرے ذہین پاکستانی خاتون سے آمنا سامنا ہو گیا اور اس نے اسد سے مخاطب ہو کر کہا کہ "تم بڑے مغرور شخص ہو"۔ اس کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں حیران رہ گئی، کیونکہ وہ بالکل ایسے نہیں تھے۔ وہ انتہائی حلیم الطبع اور منکسر المزاج شخص تھے، لیکن وہ رجحانات اور میلانات پر سختی سے کاربند تھے۔ وہ جب کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے تو اس کا بلاخوف و خطر کھل کر اظہار کرتے۔ وہ دوسروں کے دلائل کو بڑی توجہ سے سنتے، لیکن اپنے موقف پر ڈٹے رہتے، کیونکہ وہ گہری سوچ بچار کے بعد کوئی نتیجہ اخذ کرتے تھے اور جب انہیں یقین ہو جاتا کہ ان کا نقطہ نظر درست ہے تو پھر اس کا دفاع کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے، چاہے انہیں اس کے لیے مالی نقصان سمیت کسی بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ سیدھے سادے انسان تھے، لیکن اپنے رویے میں بے جا کسر نفسی سے کام نہیں لیتے تھے۔ مختصراً وہ بھلے اور مکمل طور پر شریف الطبع انسان تھے۔

وہ میری محبت میں کبھی کبھار ہی حسد محسوس کرتے تھے، لیکن جب بھی انہیں یہ احساس ہوتا تو پھر اس کا اظہار شدت سے ہوتا تھا۔ وہ بہت کم آپے سے باہر ہوتے، لیکن جب انہیں کسی بات پر غصہ آ جاتا تو پھر جی بھر کر دل کی

Marfat.com

بھڑاس نکال لیتے، مگر انہیں اپنے غصے پر قابو پانے میں خاصا وقت درکار ہوتا۔ جبکہ میری حالت ان سے بالکل الٹ تھی، کیونکہ میرے غصے کا پارہ فوراً اوپر چڑھ جاتا ہے، لیکن جلد ہی یہ نیچے بھی آ جاتا ہے۔ ہم دونوں کے مزاج میں تلخی کے اسباب مختلف ہوتے، لیکن جب بھی ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی، تو ہمیشہ مجھے ہی معذرت کرنا پڑتی اور ناقابل برداشت سکوت کی فضا کو بحال کرنے میں مجھے ہی پہل کرنا پڑتی، باوجودیکہ مجھے اپنی ناراضی کے سبب کے درست ہونے کا پورا یقین ہوتا تھا۔ ایسی صورت حال ہمیشہ تو درپیش نہیں ہوتی تھی، لیکن اکثر ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔ مختصراً میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ ایسے حالات ہی اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ایک مکمل شوہر تھے۔ بلاشبہ انہوں نے تقریباً چالیس برس میرے بااعتماد ساتھی کی حیثیت سے گزارے۔

مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ ان گزرے ہوئے مشاہدات، حالات وواقعات اور بیتے ہوئے لمحات کو یاد کرتے ہوئے میں ایک ادب پارے کی حدود سے تجاوز کر رہی ہوں، لیکن کیا کروں کہ ''صرف'' یہی ایک ایسا راستہ ہے، جس پر گامزن ہو کر میں اسد کے محبین اور پوری دنیائے اسلام میں پھیلے ہوئے ان کے معترفین کو یہ بتا سکتی ہوں کہ وہ ''حقیقتاً'' کتنی بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے۔ تاہم مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ ان یادوں کا گہرا تعلق میری ذات سے ہے، لیکن چونکہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے، اس لیے ان خوشگوار لمحوں کی یادان کی خوش اطواری کو مجروح نہیں کر سکتی۔ ویسے بھی اس حیران کن شخصیت میں غیر شائستگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ان کی شخصیت پیچیدگی اور بنیادی طور پر سادگی کا حسین امتزاج تھی۔

میں نے اسد کو جیسے دیکھا، کم وکاست ویسا ہی بیان کر دیا، لیکن ان میں ان ظاہری خوبیوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا۔ مثلاً انہیں روپیہ پیسہ جمع کرنے میں کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی۔ قرآن کے بے مثال انگریزی ترجمہ وتفسیر کی اشاعت کے بعد کچھ رقم جمع ہو گئی تھی، لیکن اس میں ان کے ارادے یا کوشش کا قطعاً کوئی دخل نہیں تھا، بلکہ یہ عنایت خداوندی تھی، جو ہمارے عظیم دوست شیخ ذکی یمانی کے توسط سے ہمیں حاصل ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ جب میرے شوہر کا انتقال ہوا، میں امیر خواتین میں شمار کی جاتی تھی۔ میں نہ صرف مالی طور پر آسودہ حال تھی، بلکہ حسین یادوں کی دولت سے بھی مالا مال تھی۔ برسوں کی تنگی حالات کے بعد جب قدرے روپے پیسے کی ریل پیل ہوئی تو اسد کے لیے اس کا سنبھالنا یا استعمال کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی دولت مجھ پر بھی خرچ کرتے تھے، لیکن اس میں انہوں نے کبھی اسراف سے کام نہیں لیا۔

وہ اپنے والد کی جانب سے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا رومانیہ کے معروف ربی تھے [127]۔ وہ اپنی بے تعصبی اور دیگر مذاہب کے افراد سے دوستانہ مراسم کے سبب عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے قریب ترین احباب میں ایک کیتھولک پادری بھی تھے۔ اپنے والد اور والدہ دونوں جانب سے ان کے آباؤ اجداد یقیناً ترکی النسل تھے۔ یعنی ان کا نسلی تعلق خزر سے تھا، جن کے بارے میں آرتھر کوسلر (Arthur Koestler) نے اپنی انگریزی کتاب ''تیرہواں قبیلہ'' میں بڑے اچھے پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ

Marfat.com

بڑھاپے میں ان کی آنکھیں اوپر کی طرف واضح طور پر ترچھی ہوگئی تھیں اور ان کی ابھری ہوئی خوبصورت رخساری ہڈیاں ٹالسٹائی کی طرح قدرے نمایاں نظر آتی تھیں۔ میری نظر میں وہ چہرے کی ان تبدیلیوں کی وجہ سے زیادہ صحت مند دکھائی دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ جرمن لہجے میں انگریزی بولتے تھے۔ انہیں عمدگی سے انگریزی لکھنے میں کامل دسترس حاصل تھی۔ میری گھریلو زبان انگریزی تھی، لیکن میری نسبت ان کا ذخیرۂ الفاظ بہت زیادہ تھا۔ ابتدائی برسوں میں وہ ہندوستانی لہجے میں انگریزی بولتے تھے، لیکن میری ملاقات سے قبل یہ لہجہ ختم ہو چکا تھا اور اس کے بجائے وہ آخر تک جرمن لہجے ہی میں انگریزی میں گفتگو کرتے تھے۔ ان کے دیگر خصائص کی طرح ان کا یہ لہجہ بھی مجھے دلکش محسوس ہوتا۔

وہ پُرتکلف کھانے کے شوقین تھے لیکن بالعموم وہ خورد ونوش میں احتیاط سے کام لیتے تھے، لیکن جب کبھی وہ بدپرہیزی کے مرتکب ہوتے تھے تو وہ اپنے پسندیدہ کھانے تیار کراتے تھے، جن میں جھینگا مچھلی یا چھوٹی جھینگا مچھلی سے ملتی جُلتی مچھلی (crayfish) تھی، جس کو وہ میونیز میں گھوٹ کر پکواتے تھے۔ وہ تیز ہندوستانی مرچ مصالحوں کے شیدائی تھے اور ان کھانوں میں وہ گھی استعمال کرتے تھے۔ میں انہیں ستانے کی خاطر اس گھی کو گریس کہا کرتی تھی۔ ویسے بھی مجھے ان مرغن کھانوں سے خوف آتا تھا۔ وہ چاکلیٹ اور کریم کے ساتھ میٹھی چیزیں کھانا پسند کرتے تھے، لیکن کبھی کبھار جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ جب وہ بوسٹن میں کینسر کے موذی مرض کا علاج کرا رہے تھے، تو ہمارے محب شیخ ذکی کا اصرار تھا کہ ہم فور سیزنز ہوٹل میں کمروں کا سویٹ نہ چھوڑیں، جس کی کھڑکیاں باغ کی جانب کھلتی تھیں۔ ہمیں اندازہ تھا کہ یہاں کا کرایہ کس قدر مہنگا ہے، اسی لیے ہم ناشتے اور دوپہر کے کھانے میں بڑی کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔ رات کو ہم ہیمبرگر کھا لیتے، لیکن جب یہ کھاتے کھاتے تنگ پڑ گئے تو ہم نے کلب سینڈوچ کا استعمال شروع کر دیا۔ ہم دونوں کے لئے ذکی کی بے حد و شمار مہربانیوں کو سہارنا مشکل تھا۔ ذکی کو اگر یہ معلوم ہو جاتا تو وہ یقیناً پریشان ہو جاتے اور شاید اب بھی یہ سطور پڑھ کر پریشان ہو جائیں، کیونکہ وہ بار بار یہی تاکید کرتے تھے کہ اسد اچھی خوراک کھائیں۔ ہم اپنے مہربان ذکی سے معافی کے خواستگار ہیں کہ ہم ان کی دلی خواہش کے باوجود ایسا نہ کر سکے اور کھانے پینے میں کفایت شعاری سے کام لیتے رہے۔

جب کبھی اسد کی جیب خالی ہوتی تو وہ اپنے متعدد باثروت دوستوں سے مالی اعانت سے گریز کرتے تھے۔ کسی سے بھی ادھار رقم لینا انہیں پسند نہیں تھا، لیکن جب وہ اپنے لیے یا میرے لیے یا اپنی کسی تصنیف کے حوالے سے کوئی رقم بطور تحفہ وصول کرتے تو اسے بڑی ممنونیت کے ساتھ قبول کر لیتے۔ ایسی رقوم کی وصولی میں ان کی طلب شامل نہیں ہوتی تھی، لیکن اس بات کا پورا احساس تھا کہ وہ ان کے اہل ہیں۔ اگرچہ شاہ ابن سعود جب وہ نسبتاً غریب بادشاہ تھا، اس وقت بھی اسد پر مہربان تھا، پھر بھی انہوں نے ایک غریب شخص کی طرح سعودی عرب کو الوداع کہا، حالانکہ وہ کسی تگ و دو یا بے ایمانی سے ابن سعود کے دیگر حواریوں اور شاہی خاندان کے افراد کی طرح بآسانی کروڑ پتی یا ارب پتی بن سکتا تھا۔ شاہ فیصل کا مزاج روپے پیسے کے معاملے میں اپنے والد کے بالکل برعکس تھا۔ وہ بے دریغ دولت لٹانے کے خلاف تھا، لیکن اسد کی مالی اعانت کے لیے اس نے کبھی ہاتھ نہیں کھینچا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسد نے اس ضمن

Marfat.com

میں ان سے کبھی رابطہ نہیں کیا، سوائے ایک موقع کے جب تجیہ میں ہمارا گھر مکمل ہو چکا تھا اور ہمارے پاس ایک دھیلہ بھی نہیں بچا تھا۔ ہم نے مکان کی تعمیر کے لیے تجیہ ہی کے ایک بنک سے کچھ رقم بطور قرض لے رکھی تھی اور اب ہمارے لئے اس کی قسط ادا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ بالآخر اسد نے شاہ فیصل کو بذریعہ خط اپنی حالت زار سے مطلع کیا اور انہیں پانچ ہزار پونڈ بھجوانے کی درخواست کی۔ یہ رقم مل تو گئی لیکن اس دوران میں پاؤنڈ تخفیف زر کا شکار ہو گیا، لیکن اسد نے شاہ فیصل سے اس کمی کا کبھی ذکر تک نہیں کیا۔ مطلوبہ رقم ملنے تک آدھی رہ گئی۔ بہرحال ہم نے کسی نہ کسی طرح بقیہ آدھی رقم کا بندوبست کیا اور یوں ہمیں بنک کے اس قرض سے نجات حاصل ہوئی۔

ابن سعود کے سبھی بیٹے ہمارے مشفق و مہربان ہیں۔ موجودہ شاہ فہد اور ان کے برادر خورد سلمان اسد کے آخری دنوں میں بڑی شفقت فرماتے رہے۔ میری ابھی تک شاہ فہد سے ملاقات نہیں ہو سکی، اس لیے میں ان کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ اسد ان کی وسیع المشربی کے بڑے معترف تھے۔ جب وہ اپنے بھائی خالد کی وفات کے بعد مسندِ بادشاہت پر متمکن ہوئے، تو انہوں نے بحرین میں جو تقریر کی، اس کو سن کر ہم دونوں بڑے متاثر ہوئے، کیونکہ اس میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا، وہ ان کی آزاد خیالی یا 'جدید' ذہن کی بھرپور ترجمانی کرتے تھے۔ بدقسمتی سے ان کے ملک کے لوگوں کے ساتھ ساتھ دنیائے اسلام کے دیگر ممالک نے بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اگرچہ وہ سعودی عرب میں اپنی خواہش کے مطابق تبدیلیاں نہیں لا سکے، لیکن اپنے عوام الناس کی طبعی قدامت پرستی کے باوجود وہ ہر ممکن طریقے سے ملک کی بہتری کے لیے کوشاں ہیں۔ ان کا طریق کار بالکل درست ہے، کیونکہ آپ کو بالجبر ایسے اصلاحی اقدامات نہیں اٹھانا چاہئیں۔ ایک عقلمند بادشاہ نہ صرف اپنے عوام کی راہنمائی کرتا ہے، بلکہ ان کی متابعت بھی کرتا ہے اور میرے خیال میں سعودی عرب درست سمت میں ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔

جہاں تک امیر سلمان کا تعلق ہے، تو میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ حقیقی معنوں میں شریف النفس شخص ہیں، اپنے بھائی فیصل کی طرح لیکن زیادہ فیاض۔ مجھے یقین ہے کہ جب ان کو موقع ملے گا، وہ بہتر حکمران ثابت ہوں گے۔ ولی عہد عبداللہ بھی ایک نفیس شخص ہیں۔ اگرچہ میری ان سے ذاتی ملاقات نہیں ہو سکی، پھر بھی میرے شوہر اور متعدد سعودی اصحاب الرائے نے جو کچھ بتایا ہے، اس کے پیش نظر میں نے ہی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

اسد جانوروں پر بہت مہربان تھے اور ان کے متعلق انتہا درجے کے مشفقانہ جذبات رکھتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے ایک ترکمانی گھوڑے کے متعلق بتایا کہ وہ ایرانی دیہاتوں کی گلیوں میں بغیر لگام کے ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا اور ایک بار اس نے اسد کے گھر میں بھی داخل ہونے کی کوشش کی۔ میں اس محبت کی کشش کو بخوبی سمجھ سکتی ہوں، جو اس گھوڑے کو اسد کے تعاقب پر مجبور کرتی تھی۔ جتنی مدت ہم نے اکٹھے گزاری، اس دوران میں پانچ کتے ہمارے ساتھ رہے۔ جس شفقت سے اسد ان کی دیکھ بھال کرتے تھے، وہ ناقابل بیان ہے، لیکن وہ اس سے بخوبی آشنا تھے۔ وہ عالمی سطح پر ''انسانیت'' کے متعلق نہیں سوچتے تھے، لیکن مسلم امہ کی فکر انہیں ہر وقت دامنگیر رہتی تھی۔ بحیثیت رفیقہ حیات میرا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ اپنے اکلوتے بیٹے اور حقیقی دوستوں کے متعلق ان کا طرز سلوک اس سے

Marfat.com

بھی بڑھ کر تھا۔

میں خود کو ایک خوش قسمت خاتون تصور کرتی ہوں، کیونکہ مجھے ان کی بے لوث محبت اور رفاقت کا جو تجربہ حاصل ہوا، اس سے کم خواتین واقف ہوں گی۔ مجھے پورا احساس ہے کہ اب وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے ہیں، لیکن ان کی حسین یادیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں اور انہی کے سہارے اذیت ناک تنہائی کے لمحات گزار رہی ہوں، کیونکہ اب مجھے تنہا ہی زندگی گزارنا ہے۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ پروردگار نے مجھے محمد اسد جیسا جیون ساتھی عطا فرمایا۔

غرناطہ میں ان کی نماز جنازہ میں بہت کم لوگوں نے شرکت کی اور ان کی قبر بھی بڑے سادہ انداز سے بنائی گئی۔ ان کی تدفین میں جو لوگ شریک تھے، وہ بلاشبہ مسلمان تھے، لیکن انہیں اس شخص کی عظمت اور یکتائی کا ذرہ بھر علم نہیں تھا، جس کے جسد خاکی کو وہ قبر میں اتار رہے تھے۔ صرف میں اور ان کے بیٹے کچھ کچھ جانتے تھے۔ ان مسلمانوں کا تعلق نام نہاد صوفیاء کے ایک گروہ سے تھا، جن کے اسد کچھ زیادہ قائل نہیں تھے، لیکن انہیں مسلمان ضرور سمجھتے تھے۔ غرناطہ میں کم وبیش دس سال سے مقیم ان لوگوں سے اسد Albaicin میں کوئی مناسب گھر تلاش کرنے کی درخواست کرتے رہے، لیکن وہ اس شرط پر انکار کرتے رہے کہ پہلے اسد تجیہ میں مقیم ان کے ''شیوخ'' میں سے کسی شیخ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کریں، اسلام کا مطالعہ کریں اور پھر غرناطہ میں رہائش پذیر ہونے کا فیصلہ کریں۔ ان کی اس بات سے ہمیں یوں لگا جیسے غرناطہ کا شہر انہی کے تصرف میں ہے۔ یہ انتہائی توہین آمیز خط تھا، جس کا اسد نے جواب دینا گوارا نہ کیا۔ انہوں نے پڑھ کر قہقہہ لگایا اور غرناطہ میں رہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اسد کے انتقال کے بعد ان کے ابتدائی سالوں کے قریبی دوستوں نے اپنے تعزیت ناموں میں ان کے بارے میں مجھے بہت کچھ لکھا۔ میں انہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کو جانتی ہوں، بلکہ ان کے ماضی کے بہت سے دیگر واقعات سے بھی بخوبی واقف ہوں، حتیٰ کہ ان کی ولادت سے پہلے کے حالات وواقعات بھی میرے علم میں ہیں۔ وہ اپنے ہر خیال اور یاد میں مجھے شریک کرتے تھے اور یوں مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نہ صرف ان کی یادداشتوں کو مکمل کروں، بلکہ مجھے یہ بھی دیکھنا ہو گا وہ فلم جو ان کی زندگی یا اس کے کچھ حصے پر بنائی جائے گی، کیونکہ مکمل زندگی کے لیے تو کئی فلمیں بنانا پڑیں گی، ممکن حد تک صحیح واقعات پر مبنی ہو۔ اس میں صرف شخصیت ہی کی تصویر کشی نہ کی جائے، بلکہ ان کے ایام جوانی کے عربی پس منظر کو بھی سامنے لایا جائے، بدوؤں کی اکثریت چیتھڑوں میں ملبوس تھی اور ان کا رہن سہن بھی صاف ستھرا نہیں تھا۔ ان کی نسبت حقیقی عرب قدرے مختلف لباس پہنتے تھے اور بعد کے زمانے کے ملبوسات سے وہ زیادہ خوبصورت ہوتے تھے۔ وہ جو تفصیلات بیان کرتے تھے، وہ مکمل طور پر تو میرے ذہن میں محفوظ نہیں، لیکن انہوں نے اس دور سے متعلقہ تصاویر کا جو نادر ذخیرہ چھوڑا ہے، وہ ہر پہلو کو سامنے لے آتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز کی جو خوبصورت ترین اور مشہور تصویر دستیاب ہے، وہ میرے شوہر کی کھینچی ہوئی ہے۔ اس

Marfat.com

میں وہ بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر سر ہلا رہے ہیں تا کہ اپنے کوفیہ (kuffiya) کو درست کر لیں اور کیمرے کی آنکھ نے اس عظیم شخصیت کے خارجی اور داخلی حسن کی جھلک کو فلم پر منتقل کر دیا ہے۔ فکر انگیز آنکھیں، سنجیدہ اور مضبوط اور حسیاتی چہرہ، جیسا کہ ایک عام انسان کا ہونا چاہیے۔ مجھے فخر ہے کہ یہ شاندار اصلی تصویر میرے پاس محفوظ ہے۔ ہم نے اپنے ہر گھر کے استقبالی کمرے کو اس تصویر سے سجائے رکھا۔ اب میں تنہا ہوں، لیکن پھر بھی یہ تصویر اسی کمرے کی زینت ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اس خوبصورت اور عجیب وغریب شخص کو جانتی ہوں، جس کے متعلق اسد کہا کرتے تھے کہ اس کا دامن زندگی کی وسعتوں سے زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ عبدالعزیز ابن سعود نہ صرف اپنی جسامت اور قد وقامت کے اعتبار سے عظیم الجثہ تھے، بلکہ اپنے کردار کے لحاظ سے وہ یکتا، بے مثال اور لاثانی تھے۔ یہ بات باعث تعجب نہیں کہ ان کے بیٹے اپنے باپ کا نام عزت سے لیتے ہیں اور ان پر ہونے والی ناجائز تنقید کی پرزور مذمت بھی کرتے ہیں۔

(8)

میرے خیال میں محمد اسد کی طویل، نتیجہ خیز اور بنیادی طور پر خوشگوار زندگی کا موزوں ترین اختتامیہ ''شاہراہ مکہ'' کے درج ذیل اقتباس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا، جو ان کی پوری زندگی کا محور و مرکز ہے:

''میرے بازو چلیپائی انداز میں میری گردن کے نیچے تھے اور میں جزیرۂ عرب کی گہری سیاہ، تاروں بھری اور اپنے اوپر جھکی ہوئی رات کا نظارہ کر رہا تھا۔ شہاب ثاقب غیر معمولی کمان کی مانند قطار اندر قطار آسمان کی پہنائیوں میں گم ہو جاتے ہیں اور روشنی کی یہ کمانیں رات کے گھپ اندھیروں کو چیر دیتی ہیں۔

کیا اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے، مگر کیسے؟ میں جب سے سعودی عرب آیا ہوں، میرا رہن سہن عربوں جیسا ہی رہا ہے۔ صرف عربی لباس زیب تن کیا، عربی زبان کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا، اسی زبان میں اپنے خواب دیکھے۔ عربی رسوم ورواج اور تمثیلات نے غیر محسوس طریقے سے میرے خیالات کی صورت پذیری کی۔ متعدد ذہنی تحفظات کو جو عموماً ایک غیر ملکی کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں، سدراہ نہیں ہونے دیا۔ اس ملک کے آداب نشست وبرخاست سے شناسائی اور زبان کو سیکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اس تمام تر مساعی کا یہی مقصد تھا کہ عامۃ الناس کے حقیقی جذبات تک رسائی حاصل کی جائے اور وہ جس دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں، خود کو اسی کا ایک فرد سمجھوں۔

اچانک آزادی اور خوشی سے میں نے اتنی بلند آواز سے قہقہے لگانا شروع کر دیئے کہ زید حیرت سے مجھے دیکھنے لگا اور میری اونٹنی نے بھی اپنی گردن گھما کر آہستگی اور قدرے مستی کے انداز میں میری عجیب حالت کا جائزہ لیا۔ اس مسرت بھرے قہقہے کی وجہ یہ تھی کہ اب میں اس طویل لیکن سادہ اور سیدھی شاہراہ کو دیکھ سکتا تھا، جو مجھے ایسی دنیا سے جو میری نہیں تھی، اُس دنیا کی طرف لے جانے والی تھی، جو حقیقتاً میری اپنی تھی۔

سچ پوچھئے تو اس سرزمین پر میری آمد بالکل ایسے ہی تھی، جیسے میں اپنے اصلی گھر واپس آ گیا ہوں۔ ایسا گھر، جس میں میرے دل کا بسیرا ہے، جو ہزاروں سال کی طویل مدت کے بعد پیچھے مڑ کر اپنے قدیم مسکن کو دور سے

Marfat.com

دیکھ رہا ہے اور اب اس آسمان کو، جو میرا اپنا آسمان ہے، کربناک مسرت کے ساتھ پہچان گیا ہے۔ جزائرعرب کا یہ آسمان، جو کسی بھی علاقے کے آسمان کے مقابلے میں زیادہ سیاہ، بلند اور اپنے جگمگ ستاروں سے درخشاں ہے، جس نے میرے آباؤ اجداد کے طویل راستے کو ڈھانپ رکھا ہے۔ میرے یہ بزرگ خانہ بدوش جنگجو چرواہے تھے، جو ہزاروں برس قبل نئی زمینوں اور مال غنیمت کے حصول کی خاطر اپنے انجانے مستقبل سے بے پرواہ کلدیوں کے زرخیز علاقوں کی جانب چل پڑے۔ عبرانیوں کے اسی چھوٹے بدوی قبیلہ ہی سے اس شخص کے آباؤ اجداد کا تعلق تھا، جس نے کلدیوں کے شہر اُر (Ur) میں پیدا ہونا تھا۔

یہ شیخ یعنی ابراہیمؑ اصلاً اُر سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ عرب کے بہت سے قبیلوں میں ان کا بھی ایک قبیلہ تھا، جو کسی زمانے میں بھوک کے ہاتھوں تنگ آ کر جزیرہ نما کے صحراؤں سے شمالی علاقوں کو کوچ کر گیا۔ یہ شام، عراق اور مشرقی بحیرۂ روم تا خلیج فارس کے سرسبز و شاداب اور لوگوں سے آباد علاقے تھے اور ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ بسا اوقات یہ قبائل یہاں کے مقامی لوگوں کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور مسند اقتدار پر بھی قبضہ جما لیتے۔ آہستہ آہستہ ان نوواردوں کا مقامی لوگوں سے میل ملاپ بڑھا اور کچھ عرصے کے بعد ایک نئی قوم نے جنم لیا، آشوریوں اور بابلیوں کی طرح جنہوں نے ابتدائی سمیری تہذیب کے کھنڈروں پر اپنی سلطنت قائم کی، یا کلدانیوں کی طرح جنہوں نے بابل میں زمام اقتدار سنبھالی، یا آموریوں کی طرح جو بعد میں فلسطین میں کنانیوں کے نام سے جانے پہچانے لگے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خانہ بدوش بھی اس قابل نہ رہے کہ وہ ابتدا میں آنے والوں کو زیرنگیں رکھ سکیں اور بالآخر وہ بھی انہیں میں گھل مل گئے یا متبادل صورت میں ایسا بھی ہوا کہ یہاں کے مقامی لوگوں نے خانہ بدوشوں کو واپس صحرا میں دھکیل دیا، تاکہ وہ کہیں اور چراگاہیں تلاش کریں یا اور علاقوں پر اپنی فتح کے پرچم لہرائیں۔ کتاب پیدائش کے مطابق ابراہیمؑ کے قبیلے کا نام 'ابرم' تھا۔ جس کا قدیم عربی میں مفہوم 'He of the High Desire' ہے۔ بظاہر اس کا شمار کمزور قبائل میں ہوتا تھا۔ یہ قبیلہ صحرا کے کنارے واقع اُر شہر میں مقیم تھا۔ انجیل میں اس دور کا ذکر کیا گیا ہے جب اس قبیلہ کے افراد کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اپنے لئے جڑواں دریاؤں کی سرزمین پر نئی اقامت گاہیں نہیں بنا سکتے اور وہ حران کی جانب دریائے فرات کے ساتھ شمال مغرب میں واقع کسی علاقے اور پھر وہاں سے شام کو کوچ کرنے والے تھے۔

'He of the High Desire' میرا جد اعلیٰ تھا، جس کو خدا نے نامعلوم مقامات کی طرف دھکیل دیا اور وہ اپنی ذات کی دریافت میں مشغول رہا۔ وہ بہتر طور پر جانتا ہوگا کہ میں یہاں کیوں موجود ہوں، کیونکہ اسے بھی اپنی اصل حقیقت تک رسائی کے لیے متعدد ممالک میں گھومنا پھرنا پڑا ہوگا۔ اس کے دہشت انگیز تجربے کے مقابلے میں میری کمزور سی الجھن کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جیسا کہ میں جانتا ہوں کہ اسے اس بات کا علم ہوگا کہ میری تمام آوارہ گردیوں کا مطلب اس پوشیدہ خواہش میں مضمر ہے کہ میں ایک ایسی دنیا کو دیکھنے کا متمنی ہوں، جہاں زندگی کے حقیقی مقاصد تک رسائی ممکن ہے اور میں نے اپنے بچپن اور جوانی میں جو دنیا دیکھی ہے، وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔''

Marfat.com

''شاہراہ مکہ'' کا جو ایڈیشن 1973ء میں طبع ہوا تھا، اس کے ''پس نوشت'' میں اسد نے لکھا کہ:

''یہ میرے سفر مکہ کی روداد ہے۔ دراصل یہ میرے اصلی گھر لوٹنے کی کہانی ہے۔ 1932ء کے موسم گرما کے اواخر میں جب ہم دو شخص دو اونٹنیوں پر سوار جنوب کی طرف سعودی عرب کی حدود پار کر رہے تھے، تو اس وقت میرے ذہن میں بار بار یہی خیال آ رہا تھا جیسے میرا قلب اپنے حقیقی گھر کو جا رہا ہے۔ جب بھی میں سعودی عرب میں اپنے بیتے ہوئے سالوں کو یاد کرتا یا عربوں کو مسکراتے ہوئے اہلاً وسہلاً کہتے ہوئے سنتا، تو ہمیشہ میرے کانوں میں انہی الفاظ کی گونج سنائی دیتی۔ 1927ء کے موسم سرما میں یہی الفاظ سنائی دیئے جب مکہ کی جامع مسجد کے کتاب خانہ میں امیر فیصل سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ شاہی خاندان کے اس شخص سے میرے برسوں تعلقات رہے اور میں انہیں اپنے قریب ترین اعزہ ہی میں سمجھتا ہوں۔ ان کے والد اور پہلے بادشاہ ابن سعود سے بھی اسی انداز سے ملتا رہا۔ وہ جب بھی مجھے بلاتے ''میرا فرزند'' کہہ کر بلاتے۔

برسوں گزر گئے لیکن اہلاً وسہلاً کے الفاظ کی گونج جوں کی توں رہی۔ جب سعودی عرب کو چھوڑے ہوئے خاصی مدت بیت گئی، تو یہ الفاظ ماضی کا حصہ بن گئے اور بحیرۂ عرب کے مغربی افق کی وسیع پہنائیوں میں کہیں گم ہو گئے۔ اس وقت میں ہندوستان میں مقیم تھا اور یہاں کی گرد صحرائے عرب کی صاف شفاف ہوا کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ وہاں میں ایک خواب کا پیچھا کرتا رہا اور بالآخر اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود میرے اس خواب نے پاکستان کی اسلامی ریاست کے قیام سے حقیقت کا وجود اختیار کر لیا۔

پاکستان میں میں نے جتنا وقت گزارا اور اس ملک کے لیے میں نے جو کچھ کیا، وہ بالکل ایک الگ کہانی ہے، جو شاید میں پھر کسی وقت بیان کروں گا، لیکن ایک بار پھر میری زندگی کے یہ دو دھارے آپس میں مل گئے ہیں، جب میں تقریباً اٹھارہ برس کے بعد 1951ء میں سعودی عرب واپس آیا اور جدہ سے مکہ جاتے ہوئے یہاں کے ستاروں بھرے آسمان کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ اس وقت میں ایک ایسی کار میں سوار تھا، جس پر پاکستانی پرچم لہرا رہا تھا اور یہ ایک ایسی شاہراہ پر فراٹے بھرتی جا رہی تھی، جس کے نیچے اونٹوں اور گدھوں کے بنائے ہوئے بہت سے قدیم راستے معدوم ہو گئے تھے اور صدیوں سے ان پر چلنے والے حجاج کرام کے پیروں کے نشان بھی مٹ گئے تھے۔ میں حکومت پاکستان کے ایک سفارت کار کی حیثیت سے آیا تھا، پھر بھی یہی محسوس ہو رہا تھا کہ میں باطنی طور پر اپنے اصل گھر کو لوٹ آیا ہوں۔''

Marfat.com

حواشی

1- اس سے مراد سعودی عرب کے بانی اور پہلے حکمران شاہ عبدالعزیز ابن عبدالرحمٰن السعود (1880ء-1953ء) ہے۔ محمد اسد کے ابن سعود کے ساتھ گہرے مراسم تھے، یہاں تک کہ اس نے محمد اسد کو 1929ء میں ایک خفیہ مشن پر کویت بھجوایا۔ محمد اسد نے ''شاہراہِ مکہ'' میں ابن سعود سے اپنے دوستانہ تعلقات، اس کی شخصیت اور مختلف پالیسیوں سے اپنے اختلافات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ''شاہراہِ مکہ'' کے علاوہ اسد نے اپنے بعض جرمن مضامین میں بھی اس پہلے سعودی حکمران کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مثلاً ''شاہ سعودیہ'' در: Frankfurter Zeitung (برلین)، بابت 2 اپریل 1926ء۔ ابن سعود ہی کی ذاتی دعوت پر اسد اپنی جرمن نومسلم بیوی ایلسا اور سوتیلے بیٹے احمد شیمان کے ہمراہ فریضۂ حج ادا کرنے مکہ پہنچے۔ اسد تقریباً پانچ سال (1927ء-1932ء) سعودی عرب میں مقیم رہے اور اس دوران میں انہیں حکومت کی جانب سے تمام سہولتیں حاصل تھیں۔ ابن سعود کے ساتھ انہی مراسم کے سبب تمام سعودی حکمرانوں نے اسد کی عزت افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ابن سعود کے لیے رک:

Muhammad Almana: Arabia Unified; A Portrait of Ibn Sa'ud. London 1980;

Alexei Vassiliev: *The History of Saudi Arabia*. London 2000.

جلالت الملک عبدالعزیز مرحوم و مغفور از غلام رسول مہر (در ہفت روزہ ''الاعتصام'' (گوجرانوالہ) ۱۱ دسمبر ۱۹۵۳ء)

2- ان ہندوستانی حجاج میں محمد اسماعیل غزنوی (م 1960ء) کا نام قابل ذکر ہے، جو مولانا داؤد غزنوی (1895ء-1963ء) کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ برسوں سعودی حکومت کی جانب سے برصغیر پاک و ہند کے حجاج کرام کے انتظام و انصرام کی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ان کا آبائی شہر امرتسر تھا اور ایک رپورٹ کے مطابق اسد کراچی سے بذریعہ ریل انہیں کے پاس پہنچے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے راقم کی انگریزی کتاب *Muhammad Asad: Europe's Gift to Islam*، لاہور 2006ء، جلد اول (= گفٹ)۔ اس ضمن میں سعادت حسن منٹو کا، جو خود بھی امرتسر ہی سے تعلق رکھتے تھے، درج ذیل اقتباس بھی اہم ہے:

''مولانا داؤد غزنوی اور مولانا اسماعیل غزنوی کے خاندان کی ایک دوشیزہ مرحوم شاہ سعود کے والد بزرگوار جناب عبدالعزیز ابن سعود کے رشتہ مناکحت میں جا چکی ہیں۔ آپ کو شاید معلوم ہو

Marfat.com

کہ مولانا اسماعیل غزنوی نے اسی سلسلے میں 27 حج کئے تھے، حالانکہ ایک ہی حج کافی تھا۔"

(چچا سام کے نام آٹھواں خط، در: اوپر، نیچے اور درمیان)

اسماعیل غزنوی اور خانوادۂ غزنوی کے لیے رک: گفت، ص 319-325۔ غزنوی خاندان از عبدالرشید عراقی، کراچی 2003ء، ص 95-97، 98-150۔ سیدی وابی، مرتب ابوبکر غزنوی، لاہور۔ نقوش عظمت رفتہ از محمد اسحاق بھٹی، لاہور، 1996ء، ص 11-122۔

نیز رک: اسماعیل غزنوی کی کتاب "جلالۃ الملک ابن سعود"، امرتسر 1930ء۔

3- امیر حبیب اللہ خاں، شاہ افغانستان (دور حکمرانی 1901ء-1919ء)

4- امان اللہ خاں، امیر افغانستان (دور حکمرانی 1919ء-1928ء)۔ علامہ اقبال نے "پیام مشرق" (طبع اول 1923ء) اسی امیر کے نام معنون کی تھی۔ 1926ء کے موسم سرما میں تقریباً چھ ماہ اسد افغانستان میں گھومتے پھرتے رہے۔ کئی ہفتے کابل میں امان اللہ خاں کے مہمان رہے اور علماء اسلام اور بااثر خوانین سے قرآنی تعلیمات اور دیگر مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ (رک: "شاہراہ مکہ")۔ اسد کے سوتیلے بیٹے احمد شیمان نے اپنے ایک خط میں بتایا ہے کہ وہ اور اس کی والدہ ایلسا اکٹھے افغانستان گئے تھے اور ان کا زیادہ تر وقت ہرات میں گزرا۔ اسد کی افغانستان سے ارسال کردہ رپورٹ جرمن اخبار "فرانکفورٹر تسائی تونگ" میں شائع ہوئی (بابت 21 مارچ 1926ء)۔

5- مولانا عبدالقادر قصوری (م۔ 1942ء) رک: مولانا عبدالقادر قصوری کا انتقال (انقلاب، بابت 18 نومبر 1942ء اور اداریہ بابت 19 نومبر 1942ء)۔ نیز رک: صدق (لکھنؤ) بابت 3 نومبر 1942ء۔ مولوی عبدالقادر قصوری مرحوم- ایک خلافتی لیڈر کا انتقال از عبدالماجد دریابادی۔ انہی کے چھوٹے بھائی عبداللہ قصوری تھے۔ رک: قصوری خاندان از محمد اسحاق بھٹی، ماموں کانجن 1994ء، ص 46-60۔ برائے عبدالقادر قصوری، ص 19-46۔

6- محمد بن عبدالوہاب (1703ء-1792ء)۔ انہی کے نام کی مناسبت سے برصغیر کے اہل حدیث اصحاب کو 'وہابی' کہا جاتا ہے۔ رک: محمد بن عبدالوہاب (ایک مظلوم اور بدنام مصلح) از مسعود عالم ندوی، فیصل آباد، 1977ء۔

The Birth of the Islamic Reform Movement in Saudi Arabia: Muhammad ibn Abd al-Wahhab and the Beginnings of the Unitarian Empire in Arabia. By George S. Rentz, London 2004.

7- منیرہ بنت حسین۔ معروف نجدی قبیلہ Sammar سے تعلق رکھتی تھی۔ اسد کی پہلی جرمن بیوی ایلسا (اسلامی نام عزیزہ) کا ملیریا کے باعث جون 1927ء کو انتقال ہو گیا اور مکہ میں اسے سپرد خاک کر دیا۔ تین سال بعد 1930ء میں اسد نے اس عرب نوجوان خاتون سے شادی کر لی۔ اس وقت دلہن کی عمر پندرہ سال تھی۔ اسد کے قیام ہندوستان کے دوران میں وہ اس کے ساتھ رہی۔ جب جنگ عظیم دوم کے آغاز میں اسد کو گرفتار کر کے قیدیوں کے کیمپ میں بھیج دیا گیا تو وہ دارالاسلام (پٹھانکوٹ) کے بانی چودھری نیاز علی خاں کے ہاں مقیم رہی۔ رہائی کے بعد اسد اور منیرہ کے درمیان رنجش

Marfat.com

بڑھ گئیں اور جب اسد نے پولا سے شادی کا فیصلہ کر لیا تو یہ اختلافات بام عروج تک جا پہنچے۔ بالآخر اسد نے منیرہ کو طلاق دے دی۔ منیرہ کا انتقال ریاض میں 1978ء میں ہوا۔

-8 طلال کی 1932ء میں بمقام مدینہ منورہ ولادت ہوئی۔ برصغیر میں ان کا بچپن اور لڑکپن لاہور، سرینگر اور دہلی میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم زیادہ تر لاہور میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن میں رہے۔ بیشتر وقت اپنی والدہ کے ساتھ گزارا۔ پولا سے شادی کے بعد باپ بیٹے کے تعلقات میں کشیدگی بڑھ گئی۔ کبھی کبھار والد سے ملتے لیکن پولا سے ہمیشہ کھنچے کھنچے ہی رہے۔ سٹی یونیورسٹی آف نیویارک میں پروفیسر آف انتھروپولوجی کی حیثیت سے خوب نام کمایا۔ اب بھی وہیں رہائش پذیر ہیں اور اپنے موضوع پر معتبر شخصیت گردانے جاتے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اسد پر بہت کم لکھا ہے۔ ہیمن نے اسد پر اپنی فرانسیسی کتاب (پیرس 2004ء) کے آخر میں ان کا ایک انٹرویو شامل کیا ہے۔ اسی طرح ایرین ڈیوڈ نے اپنے ایک مضمون "لیوپولڈ آف عریبیا" (2001ء) میں بھی طلال کی اپنے والد کے بارے میں بعض اہم معلومات شائع کی ہیں۔ اپریل 2008ء میں حکومت آسٹریا کے مالی تعاون سے جو دستاویزی فلم بنائی گئی ہے، اس کا پہلا شو ویانا میں ہوا اور اس میں طلال بطور مہمان خصوصی شامل ہوئے۔

ان کی تازہ کتاب زیر عنوان On Suicide Bombing نیویارک سے 2007ء میں طبع ہوئی ہے۔

-9 مولانا عبدالقادر قصوری کے چھوٹے بھائی (م۔ 1949ء)۔ 1933ء میں مصری شاہ کے قریب احاطہ تھانیدار میں رہائش پذیر تھے۔ رک: قصوری خاندان از محمد اسحاق بھٹی، ماموں کانجن، 1994ء۔

-10 اسد کے ہندوستان پہنچتے ہی خفیہ پولیس مسلسل ان کا پیچھا کرتی رہی۔ موصولہ اطلاعات کے مطابق اسد کی ہندوستان آمد کو برطانوی حکمران نقصان دہ سمجھتے تھے۔ حکومت ہند کے انٹیلی جنس بیورو نے اسد کی "مشکوک کارروائیوں" سے متعلق ایک رپورٹ بھی تیار کی تھی، جو اب بھی برٹش لائبریری (لندن) کے متعلقہ شعبے میں محفوظ ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے 'مارٹن کریمر کا مقالہ' در: گفت، ص 249-250۔

خفیہ پولیس کی ایک رپورٹ کے مطابق اسد کراچی سے سیدھے امرتسر پہنچے اور اسمٰعیل غزنوی کے گھر قیام کیا، لیکن سر یامین خاں کا کہنا ہے کہ وہ یہاں پہنچتے ہی سیدھے نومسلم عبدالمجید سندھی سیالکوٹی سے ملنے چلے گئے (بحوالہ: "نامۂ اعمال")۔ رک: گفت کا تعارف، ص xiii۔

-11 پاکستان کے مشہور صحافی اور دانشور جناب خالد احمد نے پرتگال میں اسد سے ملاقات کی تھی (1987ء) اور ان سے تفصیلی گفتگو کی روشنی میں ایک مضمون لکھا تھا (رک: گفت، ص 287-291)۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اسد جنگ عظیم دوم کے ختم ہونے کے بعد اندرون شیرانوالہ دروازہ کے ایک دینی مدرسہ میں جایا کرتے تھے، جبکہ اسد کا کہنا ہے کہ وہ اس جنگ کے اختتام پر قیدیوں کے کیمپ سے رہا ہوتے ہی سیدھے ڈلہوزی گئے اور وہاں سے اپنے انگریزی مجلّہ "عرفات" کا اجرا کیا۔

-12 اسد 1927ء سے سوئٹزرلینڈ کے جرمن اخبار Neue Zürcher Zeitung (تسیورخ) کے نمائندے کی

Marfat.com

حیثیت سے مشرق وسطیٰ کے بلاد اسلامیہ پر مضامین لکھ رہے تھے۔ لاہور سے ان کا جو پہلا مضمون ستمبر 1932ء کو بھجوایا گیا' اس کا عنوان تھا Gesprach in Indien (گفتگو متعلقہ ہندوستان) اور یہ اسی اخبار میں شائع ہوا (بابت 11 دسمبر 1932ء)۔ اس میں انہوں نے بادشاہی مسجد کے فن تعمیر کی حسن کاریوں کا ذکر کیا ہے اور وہاں ان کے ذہن میں "ہندوستانی کلچر" کے متعلق جو سوالات پیدا ہوئے، ان کے بارے میں اپنے دوست (نام نہیں لکھا) سے اظہار خیال کیا ہے۔ یہ گفتگو سوال وجواب کے انداز میں ہے اور اس میں لاہور کی عمومی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اپنے پہلے مختصر قیام لاہور کے دوران میں اسد نے صرف یہی مضمون متذکرہ بالا اخبار کو ارسال کیا۔

13- اسد جب بادشاہی مسجد یا کشمیری رقاصہ کا ناچ دیکھنے گئے، ان کا یہ بے نام دوست ساتھ رہا۔ وہ لاہور میں اپنی بیوی اور نومولود طلال کے ساتھ مولانا عبداللہ قصوری کے گھر رہائش پذیر تھے اور وہی لاہور کے گلی کوچوں میں ان کے ساتھ گھومتے پھرتے رہے۔ شاید ان کا یہ بے نام دوست مولانا ہی ہوں۔

14- اسد نے لاہور واپس آتے ہی سوئٹزرلینڈ کے محولہ بالا اخبار کو اپنی روداد سفر، ارسال کردی۔ اسد کا یہ سیاحت نامہ متعدد اقساط میں شائع ہوا، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

الف: Wer denkt an Kulu (کولو کے متعلق جو سوچتا ہے)

بابت 5 فروری 1933ء

ب: Zu den Goettern von Kulu (کولو کے دیوتا)

بابت 12 فروری، 19 فروری 1933ء

ج: Die Goetter tanzen (دیوتاؤں کا ناچ)

بابت 17 ستمبر 1933ء (از کولو)

د: Temple und Gottsucher im Himalaja

(مندر اور ہمالیہ کے متلاشیانِ خدا)

بابت 21 ستمبر 1933ء

ہ: Um Grat der Welt (دنیا کا کنارہ)

بابت یکم اکتوبر 1933ء، 8 اکتوبر 1933، 15 اکتوبر 1933ء، 22 اکتوبر 1933ء

ان تمام اقساط میں کم وبیش وہ تمام تفصیلات درج ہیں، جو اسد نے اس باب میں بیان کی ہیں۔ بعض حصوں کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے انہی قسطوں کو معمولی ترامیم کے ساتھ انگریزی خودنوشت سوانح عمری میں منتقل کردیا ہے۔

15- اسلام پر اسد کی یہ پہلی انگریزی کتاب بیک وقت لاہور اور دہلی سے طبع ہوئی (اپریل وجون 1934ء) اور اب بھی لاہور کے ایک معروف ناشر اس کو وقفے وقفے سے چھاپتے رہتے ہیں۔ اس کا ایک اردو ترجمہ "اسلام اور مغرب" کے عنوان

Marfat.com

کے تحت چھپ چکا ہے، مترجم محمد جمیل احمد (کراچی، 2005ء)۔ اس کتاب کا چودھواں ایڈیشن دارالاندلس، جبرالٹر سے منظر عام پر آیا، جس میں مصنف نے نو حواشی کا اضافہ کیا (1982ء)۔ اس ایڈیشن کا اردو ترجمہ لاہور ہی سے بعنوان ''اسلام دوراہے پر'' شائع ہوا۔ مترجم محبوب سبحانی (2004ء)۔

علامہ اقبال نے اس کتاب کے متعلق اس رائے کا اظہار کیا ہے:

"This work is extremely interesting. I have no doubt that coming as it does from a highly cultured European convert to Islam it will prove an eye-opener to our younger generation."

16- اقبال اور اسد کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی، وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اب یہ عقدہ حل ہو گیا ہے۔ اقبال کے احباب، معاصرین اور ملاقاتیوں کے احوال وسوانح پر خاصا کام ہوا ہے، لیکن اقبال کے اس میزبان چودھری الٰہی بخش کا کہیں نام تک نہیں ملتا۔ اقبال اور اسد دونوں کے اس قریبی دوست کے حالات زندگی کا کھوج لگانا ضروری ہے۔ بعض ثقہ اصحاب (مثلاً احمد سعید صاحب) کی رائے میں یہ رحیم بخش ہیں، جن کو اسد نے سہواً الٰہی بخش لکھ دیا ہے۔

17- ''شاہراہِ مکہ'' کے آغاز ہی میں اسد نے یہ برملا اظہار کیا ہے کہ انہوں نے اقبال کے مشورے سے اپنی آئندہ سیاحت کے پروگرام کو ختم کر کے مستقلاً برصغیر ہی میں قیام کا فیصلہ کر لیا۔ اقبال اور اسد کے تعلقات کی تفصیل کے لیے رک: گفت، ص 325-330۔ ان سطور سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ اسد نے صحیح بخاری کے انگریزی ترجمہ کا عظیم منصوبہ بھی اقبال ہی کے کہنے پر شروع کیا۔

18- سوئٹزرلینڈ کے اس اخبار کے لیے اسد کا پہلا مضمون "Arabische Reise" (سفر عربستان از محمد لیوپولڈ وائس) 3 اپریل 1927ء اور آخری مضمون "Die indische Bitternis" (ہندوستانی تلخی از محمد اسد) 22 دسمبر 1934ء کو شائع ہوا۔ ظاہر ہے اس کے بعد اسد نے اپنا طویل صحافتی سفر ختم کر دیا اور تمام تر توجہ مسلمانوں کو درپیش فکری اور تہذیبی مسائل کا حل تلاش کرنے پر مرکوز کر دی یا اپنے قلم کا رخ سنجیدہ علمی منصوبوں (بشمول ترجمہ صحیح بخاری) کی جانب پھیر دیا۔

18-(الف) چودھری نیاز علی خاں کا مکتوب بنام مولانا عبدالماجد دریابادی:

''حاجی اسد صاحب کی نظر بندی بدستور ہے۔ البتہ جناب یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ان کی خانگی مصیبتیں اس صورت میں کم ہو گئی ہیں کہ وہ اپنی بیوی بچہ کے ہمراہ ایک جگہ رہتے ہیں۔ تین سال تک بیچارے الگ رہے لیکن سرکاری وظیفہ کے علاوہ انہیں اپنی ضروریات کے لیے سال میں لگ بھگ ایک ہزار کی ضرورت اور پڑ جاتی ہے۔ جن ایام میں ان کی کتاب ترجمہ ''صحیح بخاری'' کے لیے اپیل ہوئی تھی اور جناب کے ذریعہ سے ایک گمنام معطی کی طرف سے ایک نہایت معقول رقم مل گئی تھی، اس وقت پچھلے قرضہ جات صاف ہو گئے تھے، مگر اب پھر کچھ عرصہ سے ان کی بربادی ہو گئی ہے۔ اگر ''صحیح بخاری'' کی فروخت کی تحریک ایک بار پھر کر دی جائے تو بڑی عنایت ہو۔ شاید اب کے بھی کوئی صورت نکل آئے۔''

Marfat.com

ادارتی نوٹ:

''جو صاحب ہمت ان سطروں کو پڑھ کر اس مرد مجاہد کی کوئی مالی خدمت کرنا چاہیں، وہ براہ کرم بجائے مدیر ''صدق'' کے براہ راست چودھری صاحب کو مخاطب فرمائیں۔ خود مدیر ''صدق'' اپنی ہمت و بساط کے مطابق ان شاء اللہ کچھ خدمت ضرور کرے گا۔''
(صدق (لکھنؤ)، 2 اگست 1943ء، ص 3)

ممکن ہے، یہ معطی یہی میزبان ہو۔

19- چودھری رحمت علی (1893ء-1951ء)۔ 28 جنوری 1933ء کو پمفلٹ Now or Never شائع کیا۔ تفصیل کے لیے رک:

K. K. Aziz: *Rahmat Ali; A Biography*. Lahore: Sang-e-Meel, 2008 (1987)

20- سر سکندر حیات خاں (1892ء-1942ء)۔ رک: صدق (لکھنؤ) 18 فروری 1943ء یا وفیات ماجدی ترجمہ حکیم عبدالقوی دریابادی، لکھنؤ 1978ء، ص 175-176۔

21- میر واعظ یوسف شاہ۔ معروف کشمیری رہنما۔ (برائے تفصیل رک: آتش چنار۔ خود نوشت سوانح از شیخ عبداللہ، لاہور، بلا تاریخ)

کشمیر میں اسد کی ''مشکوک'' سرگرمیوں پر مبنی خفیہ پولیس کی رپورٹ، دیکھیے:

Lieut-Col. L.E. Lang, Resident in Kashmir (Sialkot) to B.J. Glancy, Political Secretary, Govt. of India, Foreign and Political Department (New Delhi), 31 Jan. 1934. British Library, India Office and Oriental (London), R/1/1/4670.

22- ''لسان العرب'' ابن منظور (1233ء-1312ء) کی معروف عربی لغت۔ رک: براکلمان 2:21، تکملہ 2:14۔

23- محمد حسین بابری (1895ء-1980ء) خلوص و محبت کا پیکر تھا اور ہر طرح کے طمع و لالچ یا ذاتی غرض مندی کے بغیر دوستی نباہنا جانتا تھا۔ جب اسد بسلسلہ ملازمت پاکستان سے امریکہ چلے گئے تو اس نے اپنی رہائش گاہ (51 عمر دین روڈ، وسن پورہ، لاہور) پر عرفات پبلی کیشنز کا دفتر قائم کر دیا اور وہیں سے 1955ء میں ''اسلام دوراہے پر'' (انگریزی) کا ساتواں ایڈیشن طبع ہوا۔ اسد کی اجازت سے پاکستان کا جو ناشر ان کی کتاب شائع کرتا تھا، اس کی رائلٹی محمد حسین بابری کو ادا کی جاتی تھی۔ وہ اسد کو ''پکا وہابی'' کہتا تھا۔ اس کے پاس اسد کے بہت سے خطوط اور نادر تصاویر محفوظ تھیں، جو اس کی وفات کے بعد اس کے بڑے بیٹے مقبول حسین کی تحویل میں رہیں۔ اب اس کا بھی انتقال ہو گیا ہے (25 فروری 2002ء)۔ شنید ہے کہ مکتوبات اور تصاویر کا یہ اہم ذخیرہ کسی صاحب علم نے محفوظ کر لیا ہے۔

24- اس افغان شہزادے کے نام وغیرہ کا کچھ پتہ نہیں چل سکا، لیکن یہ طے ہے کہ وہ مغربی زبانوں سے واقف اور وسیع المطالعہ شخص تھا۔ اس کی جان پہچان کے حلقہ میں مقتدر اور بااثر و رسوخ اشخاص شامل تھے۔

Marfat.com

25- اسد کا یہ مضمون فرانکفورٹ کے اس اخبار میں 1925ء کو نہیں، بلکہ 21 مارچ 1926ء (بروز اتوار) شائع ہوا، اس جرمن عنوان کے تحت "Der Staat der Wilden Knaben" (جنگجو نوجوانوں کی ریاست)۔

26- نواب آصف جاہ (میر عثمان علی خاں)، 1886ء-1967ء۔ برائے تفصیل رک:

V.K. Bawa: *The Last Nizam*, New Delhi 1992.

Margit Pernau: *The Passing of Patrimonialism. Politics and Political Culture in Hyderabad, 1911-1948*. New Delhi 2000; Sidq Jaisi: *The Nocturnal Court. Darbaar-e-Dürbaar. The Life of a Prince of Hyderabad*. Trans. Narendra Luther. New Delhi 2004; Omar Khalidi: *Muslims in the Deccan. A Historical Survey*. New Delhi 2006.

نواب موصوف کی سادگی اور کفایت شعاری کے لیے رک:

تذکرہ دربار حیدر آباد از رمن راج سکسینہ، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1986ء، ص 308-311۔

27- سر اکبر حیدری (8 نومبر 1869ء، بمبئی-8 جنوری 1942ء، نئی دہلی)۔ کھمبایت (گجرات) کے سلیمانی بوہروں سے تعلق تھا۔ تقریباً چھتیس برس (1905ء-1941ء) مختلف حیثیتوں میں حیدر آباد دکن کی ریاست سے منسلک رہے۔ 1937ء میں اسی ریاست کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ رک:

M. A. N. Hydari: *Eminent Mussulmans*. Madras 1926, p. 491; T. V. Haranatha Babu: "Sir Akbar Hydari. The Forgotten Prime Minister of Hyderabad State", in: *Deccan Studies* (Hyderabad Deccan), Jan.-June 2004, pp. 23-41.

28- لیڈی امینہ حیدری، تفصیل کے لیے رک:

Gail Minault: "Coming Out: Decisions to Leave Purdah", in: *India International Centre Quarterly* 23, nos. 3-4. (Winter 1996)

29- خلافت عثمانیہ کے خاتمہ (یکم نومبر 1922ء) کے بعد عبد المجید ثانی کو بھی معزول کر دیا گیا (3 مارچ 1924ء)۔ وہ رخت سفر باندھ کر چند ملازمین کے ہمراہ یورپ کو کوچ کر گئے اور بالآخر فرانس میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ نظام دکن میر عثمان علی خاں ترکیہ کے شاہی خاندان کے ان جلاوطن افراد کی مالی مدد کرتے رہتے تھے۔ پھر آصف جاہی اور عثمانیہ خاندانوں کو قریب لانے میں مولانا شوکت علی (1873ء-1938ء) نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور 12 نومبر 1931ء کو عبد المجید ثانی کی خوبصورت اور ذہین دختر دُرِ شہوار کی شادی شہزادہ اعظم جاہ اور سابقہ عثمانی خلیفہ کی بھتیجی نیلوفر کی شادی دوسرے شہزادہ معظم جاہ سے ہوئی۔

Marfat.com

دُرِ شہوار دراز قد کی حسین و جمیل خاتون تھی۔ ترکی کے علاوہ انگریزی اور اردو روانی سے بولتی تھی۔ وہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ ریاست حیدر آباد میں خواتین کی تعلیم کے لیے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے دو بیٹے تھے، جن میں بڑا اکرم جاہ اور چھوٹا مفخم جاہ تھا جو اپنے دادا کے انتقال (1967ء) کے بعد نظام کا جانشین ہوا۔ دُرِ شہوار 12 مارچ 1913ء یا 1914ء میں پیدا ہوئی۔ 12 نومبر 1931ء کو حمایت علی خان اعظم شاہ سے شادی ہوئی۔ 92 سال کی عمر میں لندن میں وفات پائی۔ رک: شہزادی دُرِ شہوار، (مجلہ عثمانیہ (کراچی)، جون تا دسمبر 2007ء، ص 18-19)

30- دُرِ شہوار کی عم زاد شہزادی نیلوفر، سلطنت عثمانیہ کے سلطان مراد پنجم کی صاحبزادی تھی۔ اس کے شوہر معظم جاہ (1907ء-1987ء) اردو کے باکمال شاعر تھے۔ نیلوفر کا انتقال 1989ء میں ہوا۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ 1952ء میں معظم جاہ نے نیلوفر کو طلاق دے دی تھی۔ اس کے بعد وہ استانبول واپس آ گئی اور 1963ء میں ایک امریکی تاجر ایڈورڈ جے پوپ سے شادی کر لی۔ ان دونوں شہزادیوں کے متعلق تفصیلات کے لیے رک:

Omar Khalidi: "Ottoman Royal Family in Hyderabad, Deccan, India" (in: *Journal of the Pakistan Historical Society* (Karachi), July 1998, pp. 89-97)

31- خلیفہ عبدالمجید ثانی 1944ء میں پیرس میں فوت ہوئے۔

32- یعنی ولی عہد معظم جاہ (م۔ 1970ء)۔ رک: *The Last Nizam*. William Dallymple, New Delhi: OUP.

33- اقبال کو اسد کی صلاحیتوں کا پورا علم تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اُن کے علم و دانش، دنیائے اسلام کو درپیش مسائل سے آگاہی اور اسلام کے عمیق مطالعہ سے استفادہ کیا جائے۔ اسی مقصد کے تحت انہوں نے اسلامیہ کالج (لاہور) کے شعبہ اسلامیات میں اسد کی تقرری کے لیے بھرپور کوشش کی (رک: گفت، ص 326-328) جیسا کہ اسد خود یہ بتا چکے ہیں کہ انہوں نے صحیح بخاری کا انگریزی ترجمہ اقبال کی تجویز پر شروع کیا تھا۔ اب یہ بھی معلوم ہوا کہ اس منصوبے کے لیے مالی اعانت کی خاطر اقبال نے سر اکبر حیدری کو الگ سے خط بھی تحریر کر دیا تھا، جو تا حال ان کے کسی مجموعہ مکاتیب میں شامل نہیں ہوا۔

ابتدا میں اسد نے چالیس حصوں پر مشتمل یہ ترجمہ شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن وہ پانچ حصے ہی چھپوا سکے تھے کہ جنگ عظیم دوم چھڑ گئی اور وہ برسوں مقید رہے۔ رہا ہوئے تو ''عرفات'' کی ادارتی ذمہ داریوں میں پھنس گئے۔ 1947ء کے بعد لاہور آ گئے اور یہیں ایک روز انہوں نے دریائے راوی کے سیلاب میں ''صحیح بخاری'' (ترجمہ) کے مسودے کو سطح آب پر تیرتے ہوئے دیکھا۔ انتھک محنت سے تیار کردہ اس کام کو یوں برباد ہوتے دیکھ کر وہ اس قدر مایوس ہوئے کہ وہ پھر اسے شروع نہ کر سکے۔ تفصیل کے لیے رک: گفت، راقم کا مقالہ، جلد اول۔

جب اسد نے ''صحیح بخاری'' کے ترجمہ کا آغاز کیا تو سید سلیمان ندوی نے اپنے شذرات میں اس کا ان الفاظ میں ذکر کیا:

Marfat.com

''آسٹرین نومسلم محمد اسد جن کی کتاب ''اسلام راہ عبور پر'' کا تذکرہ پچھلے ''معارف'' میں آ چکا ہے، اپنے ایک تازہ خط میں یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ انہوں نے صحیح بخاری کے انگریزی ترجمہ کا کام شروع کر دیا ہے۔ بخاری کے تیس پاروں کو مع متن تیس جزوں میں ماہوار شائع کریں گے۔ پہلا جزو غالباً آئندہ دسمبر یا جنوری میں شائع کر دیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمان نوجوانوں کے سامنے ''سنت محمدیؐ'' کی اصلی تصویر پیش کرنی چاہیے تاکہ ان میں اس کی پیروی کا صحیح جذبہ پیدا ہو سکے۔'' (معارف، نومبر 1934ء، ص324)

مولانا غلام رسول مہر اطلاع کرتے ہیں:

''حال ہی میں شیخ محمد اسد نے صحیح بخاری کا انگریزی زبان میں ترجمہ شائع کرنے کا جو عزم ظاہر کیا ہے، اس کی نظیر ساری دنیائے اسلام میں نہیں ملتی۔ یہ کام اتنا بڑا اور اتنا کٹھن تھا کہ قلمرو برطانیہ کے دس کروڑ مسلمانوں میں سے کسی نے اس کے اختیار کرنے کی جرأت نہ کی اور سچ یہ ہے کہ اس کام کے اہل بھی مسلمانوں میں الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں۔ شیخ محمد اسد بوجوہ اس عظیم الشان کام کے لیے موزوں ترین آدمی ہیں، اس لیے انگریزی میں آپ کی قابلیت انشاپردازی مسلم ہے۔ عربی زبان کے آپ ماہر ہیں۔ پانچ چھ سال مسلسل مدینہ طیبہ میں رہ کر رات دن گھر میں اور باہر ہر جگہ عربی بولتے رہے ہیں۔ علمائے حجاز سے آپ نے علم دین حاصل کیا ہے اور نہایت پکے اور راسخ الاعتقاد مسلمان ہیں۔ ظاہر ہے کہ صحیح بخاری کے ترجمے کا کام آپ کے سوا اور کسی سے نہ ہو سکتا تھا۔

اس ترجمے کے شائع ہوتے ہی انگریزی داں طبقے میں اسلام کا صحیح مطالعہ شروع ہو جائے گا اور زمانہ حاضر کے سوچنے سمجھنے والے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ وہ کونسی چیز تھی جس نے کبھی ہمارے پرچم اقبال کو آدھے جہاں پر لہرا دیا تھا اور کس چیز کا فقدان ہے جس نے آج ہمیں قعر مذلت میں گرا رکھا ہے۔ غیر مسلم انگریزی دانوں کو براہ راست شارح اسلامؐ کے خیالات مقدس سے واقف ہونے کا موقع ملے گا اور تبلیغ اسلام کی بہترین خدمت انجام پائے گی۔''

(انقلاب، 31 مئی 1935ء، اداریہ)

اسد کے اس ترجمہ کے مطبوعہ پانچ حصوں پر تنقید و تبصرہ کے لیے رک:

(صدق (لکھنؤ)، 11 جون 1935ء، یکم اکتوبر 1935ء، 22 اپریل 1936ء، یکم نومبر 1936ء۔ انقلاب (لاہور)، 30 نومبر 1941ء)۔

34- محمد مارماڈیوک پکتھال کا انتقال از عبدالماجد دریابادی (صدق (لکھنؤ)، یکم و 11 جون 1936ء۔ پکتھال مرحوم: انگریز نومسلم کے قابل تقلید معمولات از عبدالماجد دریابادی (ایضاً، یکم جولائی 1936ء)

Peter Clark: *Marmaduke Pickthall -- British Muslim*. London 1986. Ibid.: "Pickthall's Busy Years, 1931-32" (in *Islamic Culture* (Hyderabad Deccan), Oct. 1999)

35- پکتھال کے بعد اسد کو ''اسلامک کلچر'' (انگریزی) کا مدیر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے دو سال یہ ادارتی فرائض ادا کئے۔

Marfat.com

(1937ء، 1938ء) اور آٹھ شماروں میں ان کے دو مضامین شائع ہوئے۔ اسد نے اس مجلّہ کے ظاہری اور موضوعی پہلوؤں کو خوب سے خوب تر بنانے میں کئی عملی اقدام اٹھائے۔ ان دنوں یورپ میں کچھ ایسے سیاسی واقعات رونما ہوئے کہ انہیں اس رسالے کی ادارتی ذمہ داریوں سے مستعفی ہو کر دیا نا جانا پڑا۔ محمد اسد نے ماڈل ٹاؤن لاہور ہی میں ''اسلامک کلچر'' کا دفتر قائم کر رکھا تھا اور یہیں سے وہ ادارتی فرائض سرانجام دیتے تھے۔

ایک معاصر اخبار کا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی تازہ معارف پروری

مولانا محمد اسد (آسٹرین) مترجم بخاری شریف کی قدر افزائی

مشہور آسٹروی نومسلم مولانا محمد اسد (سابق لیوپولڈ وائس) نے جو اپنے علم و فضل اور عربی دانی کے اعتبار سے مشہور آفاق ہیں، بخاری شریف کا حامل المتن ترجمہ انگریزی میں شروع کر رکھا ہے جس کا ایک پارہ نہایت آب و تاب سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ آپ کی خواہش تھی کہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم شہریار دکن اس امر کی اجازت دے دیں کہ یہ مقدس ترجمہ حضور کے اسم گرامی سے معنون کیا جائے۔ للہ کہ اعلیٰ حضرت نے یہ استدعا قبول فرمائی اور حضور کی سرپرستی علوم اسلامیہ سے یہی توقع بھی تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ ترجمہ بخاری کا عظیم الشان کام زیادہ آسان ہو جائے گا اور اعلیٰ حضرت کی سرپرستی مولانا محمد اسد کو بہت سے تفکرات سے آزاد کر دے گی۔

''اسلامک کلچر'' کی ادارت

مولانا مارماڈیوک پکتھال مرحوم و مغفور کے زیر ادارت حیدر آباد دکن سے ایک نہایت مفید اور سہ ماہی رسالہ انگریزی میں شائع ہوتا تھا۔ نہایت مسرت کا مقام ہے کہ اعلیٰ حضرت قدر قدرت نے یہ خدمت بھی مولانا محمد اسد کے سپرد کر دی ہے۔ یہ حضور کی مردم شناسی کی بہت ہی روشن دلیل ہے کیونکہ آج مولانا اسد سے بہتر کوئی شخص نہیں جو ہر اعتبار سے مسٹر پکتھال کا جانشین بن سکے۔

اعلیٰ حضرت کی اس علم پروری اور اسلام نوازی پر سارا اسلامی ہند مسرور و نازاں ہے۔ اللہ تعالیٰ پادشاہ اسلام کو مدت دراز تک علوم اسلامیہ کی حفاظت و ترقی کے لیے سلامت رکھے۔''

(انقلاب (لاہور)، 18 اکتوبر 1936ء)

نیز رک: حق بحقدار مولانا لیوپولڈ اسد کے انگریزی ترجمہ صحیح بخاری کی سرپرستی نظام دکن کی طرف سے از عبدالماجد دریابادی (صدق (لکھنؤ)، یکم نومبر 1936ء)

36- مولانا سید سلیمان ندوی اپنے ایک شذرہ میں رقمطراز ہیں:

''اب انہوں نے [اسد نے] اپنا لائحہ عمل (پروگرام) مرتب کر لیا ہے اور قرول باغ دہلی میں ''عرفات'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کر لیا ہے۔ اس کی طرف سے عنقریب وہ ایک انگریزی رسالہ کے اجرا کا ارادہ رکھتے ہیں اور ''عرفات بک ڈپو'' کے ذریعہ سے اپنی تصنیفات کی اشاعت کا سامان کر لیا ہے۔''

Marfat.com

(معارف (اعظم گڑھ)، اکتوبر 1934ء،ص 243)

37- اسد نے اس ناشر اور کتب فروش کا نام نہیں لکھا، لیکن یہ لاہور کا معروف اشاعتی ادارہ شیخ اشرف اینڈ سنز ہی ہوگا، کیونکہ وہی اسد کی انگریزی کتاب "......کراس روڈز" بھی شائع کرتا رہا۔ اُن دنوں اس ناشر کا دفتر کشمیری بازار میں تھا۔

38- جب سے اسد نے ہندوستان میں قدم رکھا، خفیہ پولیس ان کے پیچھے لگی رہی اور ان کی نقل و حرکت کی رپورٹ حکام بالا کو دیتی رہی۔ جن دنوں اسد سرینگر میں تھے اور وہ لاہور آتے جاتے رہتے تھے، خفیہ پولیس والے کچھ زیادہ مستعد ہوگئے تھے، چنانچہ اس وقت انہوں نے ایک مفصل رپورٹ بھی تیار کی تھی، جس کا مکمل حوالہ درج ذیل ہے:

"History Sheet of Herr Leopold Weiss Alias Mohammad Asad Ullah Vyce. An Austrian Convert to Mohammadanism", prepard by the Intelligence Bureau of the Government of India, included in letter from E. J. D. Colvin, Political Secretary, His Highness' Government Jammu and Kashmir (Jammu) to Lieut.- Col. L.E. Lang, Resident in Kashmir (Sialkot), 30 Jan. 1934, British Library, India Office and Oriental (London) R/1/1/4670.

39- سکندر حیات خاں (1892ء-1942ء)۔ رک: انجمن (ذاتی یادداشتوں اور تاثرات کا مجموعہ) از فقیر سید وحید الدین، کراچی 1966ء، ص 113-119۔

40- اسد کے والد Karl Weiss نظر بندی کے کیمپ میں فوت ہوگئے (بعمر ستر برس)، بہن Rachel Weiss اور سوتیلی والدہ Bertha Weiss نے ایک گیس چیمبر میں سسک سسک کر دم توڑ دیا، البتہ ان کا ایک سوتیلا بھائی Martin M. Goldenberg لندن پہنچ گیا اور وہیں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی۔

41- چودھری نیاز علی خاں (29 جون 1880ء-1976ء بعمر 96 سال جبکہ اسد نے چورانوے سال لکھا ہے)۔ اقبال اور اسد کے مداح اور انہیں کی مشاورت سے پٹھانکوٹ (ضلع گورداسپور) میں دارالاسلام کی بنیاد رکھی، جس کی سربراہی کے لیے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (1903ء-1979ء) کو خصوصی طور پر حیدرآباد دکن سے بلایا گیا۔ تفصیل کے لیے رک: اقبال، دارالاسلام اور مودودی از اسعد گیلانی، لاہور 1978ء۔ گفٹ، ص 330-337۔ نیز رک: ادارہ دارالاسلام کی تاسیس (ترجمان القرآن، ستمبر 1938ء، ص 15-16۔ بطور ضمیمہ دستور العمل ادارہ دارالاسلام مع توضیح مقاصد و طریق کار)۔ دارالاسلام از مولانا مودودی (ایضاً، شوال 1356ھ، ص 44-65)۔ دارالاسلام کا ذہنی پس منظر از عزیز ہندی (ایضاً، مئی 1938ء، ص 42-52)

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد نیاز علی خاں، جوہر آباد میں سکونت پذیر ہوگئے اور اپنی وفات تک وہیں رہے۔ 1957ء میں جب اسد اور ان کی بیوی پولا اسلامک کلوکیم کے انعقاد کے سلسلہ میں لاہور آئے تھے، تو دونوں

Marfat.com

چودھری نیاز علی خاں سے ملنے جوہر آباد گئے۔ اپنے دیرینہ دوست کے انتقال پر اسد نے جو خط لکھا تھا، وہ ان کے جذبات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ جوہر آباد میں چودھری نیاز علی اور ان کے افراد خانہ کے ہمراہ تصویر اور تعزیتی مکتوب کا عکس ''گفٹ'' (جلد دوم) میں شامل ہے۔

42- اس دور میں لاہور کے دو اردو روزناموں کا چرچا تھا، ایک ''انقلاب'' اور دوسرا ''احسان''۔ یہ تراجم ان میں سے کسی ایک اخبار میں شائع ہوئے ہوں گے۔

43- اقبال میوزیم (لاہور) میں ایک بڑے سائز کا رجسٹر محفوظ ہے، جس میں اقبال کے جنازے میں شریک اہم شخصیات کے نام درج ہیں۔ ان میں اسد کا نام بھی شامل ہے۔ اقبال کے مقبرہ کے لیے رک: راقم کی کتاب ''اقبال، افغان اور افغانستان''، لاہور 2003ء۔

44- جسٹس دین محمد (1886ء-1965ء) گوجرانوالہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں ریاست بہاولپور کے چیف جسٹس ہو گئے۔ گورنر سندھ، وزیر امور کشمیر، مسجد شہید گنج کے مقدمہ کے تین ججوں میں سے ایک، جنھوں نے مسلمانوں کے حق میں فیصلہ دیا۔ رک: انجمن، متذکرہ بالا، ص 172-175۔ کشکول (انتخاب اشعار) مرتبہ جسٹس دین محمد، جس میں اقبال کا کلام بھی شامل ہے (بحوالہ انوار اقبال مرتبہ بی۔ اے۔ ڈار، لاہور 1977ء (1967ء)، ص 305)۔

نیز رک: *Muslim India (1857-1947). A Biographical Dict*. By Ahmad Saeed, Lahore 1994, p. 115.

45- اسد نے سعودی عرب کے قیام (1927ء-1932ء) کے دوران میں سنوسی تحریک کو مضبوط بنانے میں ہر طرح سے تعاون کیا اور ان کی تمام کارروائیوں میں انہیں سعودی عرب کی اعانت حاصل تھی۔ ان دنوں اس تحریک کا رہنما سید احمد (1873ء-1932ء) بھی سعودیہ میں جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے۔ اسد کی تمام تر کوششیں بارآور ثابت نہ ہو سکیں اور اطالوی فوج نے اس تحریک کو ختم کر دیا۔ رک: ''شاہراہ مکہ'' اور ''گفٹ'' بمد اشاریہ۔

46- مارچ 1938ء کو جرمنی نے آسٹریا پر قبضہ کر لیا۔ اسد کے والدین اور تمام اعزہ یہودی تھے، اس لیے انہیں یقین کامل تھا کہ وہ جرمنوں کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہیں گے۔ وہ والد، سوتیلی والدہ اور بہن کو ویانا سے نکلوانے میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے لگے۔ لندن پہنچ کر اسی تگ و دو میں رہے (اپریل 1939ء) اور وہاں اپنے ویزے میں توسیع کے لیے درخواست دے دی۔ وہ اپنی دوڑ دھوپ میں کامیاب نہ ہو سکے اور 1939ء کے موسم گرما میں ہندوستان واپس آ گئے۔ تفصیل کے لیے رک:

Florence Heymann: *Un Juif pour l'Islam*. Paris 2005, pp. 224-225.

اسد کو جنگ عظیم دوم شروع ہونے کے چند ماہ بعد گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی نظربندی کی مدت یکم ستمبر 1939ء تا 14 اگست 1945ء ہے۔ ابتدائی چند سال ان کی بیوی منیرہ اور بیٹا طلال، نیاز علی خاں کے پاس رہے، لیکن رہائی کے تھوڑا عرصہ قبل ان کو اسد کے ساتھ کیمپ میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ نیاز علی خاں اسد کی رہائی کے لیے متواتر کوششیں کرتے رہے اور

Marfat.com

متعلقہ حکام کو ہر شعبہ زندگی کے بارسوخ شخصیات کے دستخطوں سمیت خطوط لکھتے رہے۔ بالآخر حکومت ہند نے ایک کمیٹی تشکیل دی، جس کے ایک رکن سر محمد یامین خاں (1886ء-1966ء) بھی تھے۔ بحیثیت رکن محمد یامین خاں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری بعنوان ''نامۂ اعمال'' تفصیل سے اس کمیٹی کی کارروائی قلمبند کی ہے۔ رک: گفت، ص 339-342۔ امیر بن ڈیوڈ کا مضمون ''لیوپولڈ آف عریبیا'' (2001ء)، ذیلی عنوان "Behind the barbed wire fence" جس میں طلال اسد کی زبانی بعض اہم واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیز دیکھئے:

ایک بزرگ قوم کی ابتلاء: نومسلم مولانا لیوپولڈ مصیبت میں (صدق (لکھنؤ)، 20 مئی 1940ء)۔ صحیح بخاری کا انگریزی مترجم: مولانا لیوپولڈ اسد کی خدمات دینی اور ان کی افسوسناک نظر بندی (ایضاً، 13 اپریل 1942ء)۔ ایک مردِ مجاہد: نومسلم فاضل حاجی لیوپولڈ اسد کے بارے میں ایک خط (ایضاً، 2 اگست 1943ء)۔ اہل خیر سے: آسٹروی نومسلم لیوپولڈ اسد کے لیے اپیل (ایضاً، 11 دسمبر 1944ء)۔ مجرم بے جرم: لیوپولڈ اسد کی ناجائز نظر بندی (ایضاً، 29 ستمبر 1945ء)۔

47- محمد اسد نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافی کی حیثیت سے کیا اور وہ برسوں جرمنی، ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ کے معروف اخباروں میں مشرق وسطیٰ کے بلاد اسلامیہ میں مختلف موضوعات پر اپنی نگارشات بھجواتے رہے۔ ہندوستان آنے کے بعد وہ اس طرح یہاں کے کسی انگریزی روزنامہ سے منسلک نہیں ہوئے، البتہ انہوں نے یہاں اپنا ایک الگ مجلہ ''عرفات'' کے عنوان کے تحت نکالنے کا ارادہ کر لیا تھا، جب کہ علامہ اقبال نے اپنے ایک مکتوب بنام سید نذیر نیازی (بابت 30 جولائی 1934ء) میں ذکر کیا ہے، لیکن بعض نجی مصروفیات اور طویل مدت اسیری کے باعث وہ اس کے اجراء کا فوری اہتمام نہ کر سکے، چنانچہ انہوں نے رہائی پاتے ہی 'قمبر ویو' ڈلہوزی (موجودہ مدھیہ پردیش، بھارت) سے اس مجلہ کی اشاعت کے لیے ضروری انتظامات شروع کر دیئے۔ ایک معاصر روزنامہ میں محمد اسد کے اس مجلہ کی اطلاع ان الفاظ میں دی جاتی ہے:

''......آپ کا [محمد اسد کا] ارادہ ہے کہ عنقریب ''عرفات'' کے نام سے ایک ماہوار رسالہ انگریزی زبان میں جاری کریں۔ غالباً اس سلسلے کا پہلا نمبر اگست میں شائع ہو جائے گا۔

اس رسالے کا مقصد یہ ہوگا کہ اصول اسلام کو ان کی صحیح روشنی میں پیش کیا جائے اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے زمانے میں شریعت اسلامی کی تفسیر و تشریح پر جو غبار جم چکا ہے، اس سے اس کو پاک کر کے حال و مستقبل میں اسے مسلمانوں کی حیات قومی کا ایک نظام بنایا جائے۔ جو مسلمان اسلام کی ابدیت اور اس کے حقائق کی جاودانی حیثیت کے قائل ہیں، انہیں چاہیے کہ اس رسالے کی خریداری میں ایک لحہ بھی تامل نہ کریں۔ چونکہ کاغذ کی قلت کی وجہ سے اس رسالے کی بہت محدود کاپیاں چھاپی جا سکیں گی اس لیے ایک۔ ایک پرچہ بھیجنا ناممکن ہوگا، صرف سالانہ خریداری کا چندہ ہی قبول کیا جائے گا۔

سالانہ چندہ ساڑھے سات روپے مقرر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

تمام انگریزی دان مسلمانوں کو چاہیے کہ ذیل کے پتے سے فرمائش اور چندہ جلد سے جلد بھیج دیں۔ تاخیر سے ممکن ہے کہ رسالہ دستیاب ہی نہ ہو سکے......''

(انقلاب، 17 جون 1946ء)

''ایک علمی اسلامی ماہنامہ (انگریزی میں)

قارئین ''انقلاب'' مولانا محمد اسد (لیوپولڈ وائس) مترجم بخاری شریف کے نام نامی سے واقف ہیں۔ آپ آسٹرین نومسلم ہیں اور جرمن اور انگریزی کے علاوہ علوم عربیہ دینیہ کے بھی فاضل ہیں۔ آپ نے بخاری شریف کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ایک ایک پارہ کر کے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ ابھی چند پارے ہوئے تھے کہ جنگ شروع ہو گئی اور آپ غیر ملکی ہونے کی وجہ سے نظر بند کر دیئے گئے۔ جنگ کے خاتمہ پر آپ کی رہائی عمل میں آئی۔ اب آپ ڈلہوزی میں مقیم ہیں اور اپنے علمی و دینی مشاغل از سر نو شروع کر رہے ہیں۔ عنقریب بخاری شریف کے ترجمہ کی اشاعت بھی شروع ہو جائے گی۔

آپ کا ارادہ ہے کہ عنقریب ''عرفات'' کے نام سے ایک ماہوار رسالہ انگریزی زبان میں جاری کریں، غالباً اس کا پہلا نمبر اگست میں شائع ہو جائے گا۔

اس رسالہ کا مقصد یہ ہوگا کہ اصول اسلام کو ان کی صحیح روشنی میں پیش کیا جائے اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے زمانہ میں شریعت اسلامی کی تفسیر و تشریح پر جو غبار جم چکا ہے، اس سے اس کو پاک کر کے حال و مستقبل میں اسے مسلمانوں کی حیات قومی کا ایک نظام بنایا جائے۔ چونکہ کاغذ کی قلت کی وجہ سے اس رسالہ کی بہت محدود کاپیاں چھاپی جا سکیں گی، اس لیے ایک ایک پرچہ بھیجنا ناممکن ہوگا۔ صرف سالانہ خریداری ہی کا چندہ قبول کیا جائے گا۔ سالانہ چندہ ساڑھے سات روپیہ مقرر کیا گیا ہے۔ تمام انگریزی داں مسلمانوں کو چاہیے کہ ذیل کے پتہ سے فرمائش اور چندہ جلد سے جلد بھیج دیں۔ جناب مینجر صاحب ''عرفات'' ڈلہوزی۔۔(انقلاب)۔(صدق (لکھنؤ) 26 جون 1946ء، ص 5)

''انگریزی زبان میں ایک مذہبی رسالہ کا اجراء

مشہور آسٹرین نومسلم محمد اسد صاحب، جو زمانہ جنگ میں گرفتار کر لئے گئے تھے، اب الحمدللہ قید فرنگ سے آزاد ہو کر پھر اپنے علمی و مذہبی کاموں میں مشغول ہو رہے ہیں۔ موصوف گرفتاری سے پہلے صحیح بخاری کا انگریزی ترجمہ کر رہے تھے جس کے کچھ پارے چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی ایک کتاب Islam at the Crossroads علمی و مذہبی حلقوں میں کافی شہرت پا چکی ہے۔ جو لوگ ان کتابوں سے واقف ہیں، وہ موصوف کے طرز فکر اور انداز بحث سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اب ہمیں یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی ہے کہ موصوف ماہ اگست 46ء سے ڈلہوزی سے انگریزی زبان میں عرفات نامی ایک پرچہ نکال رہے ہیں جس کا اشتہار ان صفحات میں کہیں دیا جا رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ ان توقعات کے بالکل مطابق ہوگا جو مصنف سے علمی و مذہبی حلقوں میں قائم کی جا چکی ہیں۔'' (ترجمان القرآن، جولائی 1946ء، ص 78)

Marfat.com

''عرفات'' کا پہلا شمارہ ستمبر 1946ء کو شائع ہوا اور اس کی ابتدا میں مدیر یعنی محمد اسد نے یہ نام رکھنے کے تین دلائل پیش کیے:

"It is on the plain of Arafat......that the yearly congregation of Muslims, clad in the all-levelling pirgrims' garb, became truly the symbol of an *ummah,* a community in which there are no differences of race, nation, social function; no differences of sect or "school of thought"; a community, in short, of Muslims without any qualifying adjective. Secondly, the pilgrims' meeting on the plain of Arafat has been likened by our Prophet (upon whom the blessing and peace) to that greater meeting on Resurrection Day when every soul will await the Judgment and in the meantime will try to render account to itself about its doings, in the world: and the Muslims of today need such a reminder more than anything else: because they need self-criticism more than anything else. And, thirdly, it was at Arafat, during the Prophet's Farewell Pilgrimage, that the words are revealed: "Today I have perfected for you your religion, and fulfilled My favour unto you, and willed that Islam should be your religion" (5 : 3) - an eternal reminder to us that we need only the Qur'an and the Sunnah, and nothing else, to know what Islam is "

نیز رک: اسلامک کلچر (حیدر آباد دکن)، جولائی 1947ء، ص 321-322۔

ڈلہوزی سے ''عرفات'' کے نو شمارے طبع ہوئے (ستمبر 1946ء تا جولائی 1947ء) اور ان سب میں صرف محمد اسد کی اپنی تحریریں ہی شائع ہوئیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد جب حکومت پنجاب نے محمد اسد کو احیائے اسلامی کے حوالے سے ایک نئے ادارے کا سربراہ مقرر کیا، تو اس کی جانب سے انگریزی اور اردو زبانوں میں جو رسالہ شائع ہوا (مارچ 1948ء) اس کا عنوان بھی ''عرفات'' ہی رکھا گیا۔ اس عنوان کے تحت شائع ہونے والے کل دس شمارے نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں، اس لیے ان تمام کے مضامین کو ''گفٹ'' کی جلد دوم میں شائع کر دیا گیا ہے۔

محمد اسد کو عرفات کے نام سے گہری ذہنی اور جذباتی وابستگی تھی، اسی لیے انہوں نے اس مجلّہ کے علاوہ اپنے نجی ادارۂ مطبوعات کا نام بھی عرفات پبلی کیشنز ہی رکھا اور ''اسلام دوراہے پر'' (انگریزی، طبع اول) اور صحیح بخاری کے انگریزی

Marfat.com

ترجمہ کے پانچوں حصے اسی ادارے کی جانب سے منظر عام پر آئے۔

48- بقول محمد اسد، انہیں ''صحیح بخاری'' کے انگریزی ترجمہ کا خیال اس وقت ان کے ذہن میں آیا، جب وہ مسجد نبوی میں احادیث کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کے سعودی احباب نے بھی انہیں ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا، لیکن انہیں سب کام چھوڑ چھاڑ کے ہندوستان آنا پڑا، اس لیے یہ منصوبہ کچھ دیر کے لیے معرض التوا میں پڑ گیا۔ یہاں ان کے قریبی اہل حدیث دوست بھی ان کی توجہ اس جانب مبذول کراتے رہے، لیکن جب ایک نجی مجلس میں علامہ اقبال نے اس ترجمے کی اہمیت پر زور دیا تو پھر وہ باقاعدگی سے اور سنجیدگی کے ساتھ اس کام میں مصروف ہو گئے۔ اس ترجمے کے لیے مطلوبہ فنڈز کی کمی اصل رکاوٹ تھی اور جب علامہ اقبال کی سفارش پر سرکار آصفیہ نے مالی تعاون کی پیش کش کر دی تو پھر اسد کی پوری توجہ اسی کام پر مبذول ہو گئی۔

محمد اسد کا ابتدائی منصوبہ اس ترجمہ کو آٹھ جلدوں میں مکمل کرنے کا تھا اور یہ کل چالیس حصوں پر مشتمل تھا یعنی ہر جلد میں پانچ حصے ہونا تھے، لیکن وہ صرف پانچویں جلد (مشتمل بر فضائل اصحاب النبی، بدأ الاسلام، ''کتاب المغازی'') کے پانچ حصے ہی شائع کر سکے (دسمبر 1935ء-مئی 1938ء، سرینگر و لاہور)۔ وہ دس سال (صحیح بخاری کے) ترجمہ و تشریح میں مصروف رہے اور تقریباً تین چوتھائی کام مکمل کر چکے تھے، لیکن وہ ان مسودات کو محفوظ نہ رکھ سکے اور یہ تمام تقسیم ہند کے فسادات کی نذر ہو گئے۔ برسوں بعد اسد نے انہی پانچوں حصوں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں طبع کرا دیا (1981ء مع نیا دیباچہ)۔

برائے تفصیل رک: انقلاب، 31 مئی 1935ء، اداریہ 18 دسمبر 1936ء۔ گفت، ص 345-347۔ صدق (لکھنؤ)، نمبر 35 (1936ء)۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے محمد اسد کے ترجمہ کے ایک حصہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں:

''......کوشش یہی رہی ہے کہ حتی الامکان پوری دیانت کے ساتھ عربی الفاظ انگریزی الفاظ میں منتقل ہو پائیں، نہ یہ کہ صرف موٹے اور عام مطالب اخذ کر کے لکھ دیئے جائیں۔ انگریزی محاورہ کے لحاظ سے جہاں کسی لفظ کے اضافہ کی ضرورت پیش آئی ہے، اسے مترجم نے قوسین کے اندر دے دیا ہے یا لفظی ترجمہ متن میں دینا غیر فصیح معلوم ہوا، تو حاشیہ پر لفظی ترجمہ بھی دے دیا ہے......

حواشی بکثرت ہیں اور حسب ضرورت مفصل بھی۔ یہ زیادہ تر توضیح مطالب سے متعلق ہیں۔ ان مواقع پر شارح نے عموماً ''فتح الباری'' پر اعتماد کیا ہے۔ اس کے بعد عینی کی ''عمدۃ القاری'' پر اور کہیں کہیں دوسری شرح پر بھی۔ بعض حواشی لغوی ہیں اور لغت میں شارح کے پیش نظر عموماً ''لسان العرب'' رہتی ہے اور پھر انگریزی کی ''القاموس''۔ جہاں تاریخی شخصیتوں کے تذکرے آئے ہیں، وہاں شارح کے مآخذ ''طبقات ابن سعد'' اور پھر طبری اور ''استیعاب'' وغیرہ۔ ایک جگہ ایسا بھی، جہاں شارح نے نفس حدیث پر تنقید کی ہے اور امام بخاری پر جرح کر ڈالی ہے...... مناقب زبیر بن عوام کے سلسلہ میں راوی حدیث مروان بن الحکم کے ثقہ و قابل قبول ہونے پر۔ یہاں شارح نے مروان کے ''کرتوت'' زیادہ

Marfat.com

ابن سعد کے حوالہ سے بیان کر کے حیرت ظاہر کی ہے کہ ایسے شخص سے امام بخاریؒ اور دوسرے محدثین (بجز امام مسلمؒ کے) روایت حدیث کرتے کیونکر ہیں اور اس کا شمار صحابہ کے زمرہ میں کیسے کرتے ہیں۔ یہ بحث دراصل شروع یہاں سے ہوتی ہے کہ صحابی کسے کہتے ہیں اور زمرۂ صحابہ میں آتے کون کون لوگ ہیں۔ عموماً صحابی کا اطلاق ہر اس کلمہ گو پر کر دیا گیا ہے جس نے رسول اللہ صلعم کو دیکھا ہو، خواہ ایک بار اور خواہ اس کا سن کچھ ہی رہا ہو۔ شارح کو اس تعریف سے اختلاف ہے۔ انہوں نے مقدمہ میں اس مسئلہ پر تفصیلی نظر کی ہے اور محدث ابن صلاحؒ اور تابعی سعید بن مسیبؒ اور صحابی انس بن مالکؓ کے حوالہ' نیز لغت کی مدد سے' صحابی اسے قرار دیا ہے جس نے بہ حالت ایمان ایک مدت تک رسول اللہ صلعم سے شرف صحبت حاصل کیا ہو۔

کتاب بہرصورت پڑھنے کے قابل ہے۔ منکرین کے لیے، قائلین حدیث کے لیے بھی اور حدیث سے ناواقفوں کے لیے بھی اور جو انگریزی خواں عربی نہیں جانتے، ان کے حق میں تو ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ ایسی کتابوں کی نکاسی ہوتی ہی کہاں ہے اور اگر اعلیٰ حضرت نظام دکن کی اعانت' خدا کے فضل سے، نہ حاصل کی گئی ہو تو طبع و اشاعت کی شاید نوبت ہی نہ آتی۔"

(صدق (لکھنؤ)، بابت 21 اپریل 1938ء)

49- لارڈ ماؤنٹ بیٹن (1900ء-1979ء) ہندوستان کے آخری وائسرائے اور گورنر جنرل۔

50- ریڈکلف ایوارڈ۔ رک:

Radcliffe's Betrayal and Sikhs (in: *Quaid-i-Azam Jinnah. As I knew Him.* By M.A.H. Ispahani, 3rd ed. 1976, pp. 240-251.

51- راشٹریہ سیوک سنگھ (آر کے کے)، ہندوستان کی ایک انتہا پسند ہندو جماعت۔ دیکھئے *RKK in the Punjab.* Govt. Publication, after 1947.

52- جن خطرناک حالات میں اسد نے چودھری نیاز علی اور ان کے افراد خانہ کو بحفاظت لاہور پہنچانے کا اہتمام کیا، وہ ان کے پُرخلوص اور گہرے محبت آمیز جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ غالباً اس بات کا بھی پہلی بار علم ہوا ہے کہ مولانا مودودی اور ان کے چند رفقاء بھی اسی قافلے میں شامل تھے اور انہیں راستے میں پیش آنے والے خطرات اور سرحدی چوکیوں کی تلاشیوں سے بچا کر منزل مقصود تک پہنچانے میں بھی محمد اسد ہی کی کوششوں کا دخل ہے۔ محمد اسد اور مولانا مودودی کے تعلقات کے لیے رک: گفت، ص 330-337۔

53- خواجہ عبدالرحیم (1909ء-1974ء) اعلیٰ سول افسر۔ لاہور کے سیاسی رہنما طارق رحیم کے والد۔

54- معلوم نہیں، محمد اسد کی یہ ریڈیائی تقریریں ریڈیو پاکستان، لاہور کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں یا نہیں، البتہ ان کے ایک پرانے دوست اور مداح صادق قریشی کے پاس ان تمام تقاریر کے مسودے موجود تھے۔ وہ اپنے ایک مکتوب بنام محمد اسد (بابت 7 جولائی 1982ء) میں لکھتے ہیں: "......قیام پاکستان کے فوراً بعد آپ نے لاہور ریڈیو سٹیشن سے جو سات

Marfat.com

تقریریں نشر کیں، ان کے سکرپٹ میرے پاس موجود ہیں۔'' (نوائے وقت، 10 ستمبر 1982ء)۔ جواباً محمد اسد نے لکھا (مکتوب، 6 اگست 1982ء): ''آپ نے میری 1947ء کی نشری تقریروں کا ذکر کیا ہے، جن پر میں نے بہت محنت کی تھی۔ افسوس کہ میرے پاس ان کی کوئی نقل نہیں۔ اگر آپ ان تقریروں کی فوٹو کاپیاں بھجوا سکیں تو میں بے حد ممنون ہوں گا۔'' (نوائے وقت، ایضاً)۔ صادق قریشی صاحب نے ان تقریروں کی عکسی نقلیں ارسال کر دیں اور اپنی ''سیلانی کی ڈائری'' کی 126 ویں قسط میں ان کے کچھ اقتباسات بھی شائع کر دیئے (نوائے وقت، 3 اگست 1982ء)۔

محمد اسد نے ان تقریروں میں بار بار قیام پاکستان کے مقصد کی وضاحت کی اور اس مقصد کے حصول کے لیے مسلمانوں کی عظیم قربانیوں کا ذکر کیا۔ ایک اسلامی ریاست کے خدوخال بیان کئے۔ غیر مسلموں کے حقوق پر روشنی ڈالی اور مایوسی کا شکار ہونے والے لوگوں کو امید اور روشنی کی راہ دکھائی۔ ایک ناصح مشفق کی طرح انہوں نے اپنی تقریروں میں اصلاح احوال کی ضرورت پر زور دیا اور لوگوں کو ان کے فرائض کا نہایت دلسوزی کے ساتھ (اور بعض دفعہ تلخ نوائی سے) احساس دلایا۔

-55 محمود علی قصوری (1910ء-1987ء) فرزند عبدالقادر قصوری اور پاکستان کے معروف قانون دان۔

-56 افتخار حسین ممدوٹ (1905ء-1979ء)۔ پنجاب کے پہلے وزیر اعلیٰ۔

-57 مولانا داؤد غزنوی (1895ء-1963ء) اہل حدیث عالم دین اور تحریک خاکسار کے فعال رکن۔ امرتسر کی اس غزنوی خاندان سے محمد اسد کے دیرینہ مراسم تھے۔ رک: گفت، ص 219-322۔ نیز رک: نقوش عظمت رفتہ از محمد اسحاق بھٹی، لاہور 1996ء۔ غزنوی خاندان از عبدالرشید عراقی، کراچی 2003ء۔ تحریک اہل حدیث، تاریخ کے آئینے میں از قاضی محمد اسلم سیف، لاہور 2005ء، ص 345-348۔

-58 ادارے کے ملازمین میں مولانا محمد حنیف ندوی (م۔ 1987ء) اور مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری بھی شامل تھے۔ شاید ان ''نوجوان اور باصلاحیت علماء'' سے مراد یہی دونوں علمائے دین مراد ہوں، جو بعد میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ (لاہور) میں دینی موضوعات پر تحقیق و تصنیف کے کاموں میں مصروف رہے۔ رک: ارمغان حنیف مرتبہ محمد اسحاق بھٹی، لاہور 1989ء۔

-59 قرین قیاس یہی ہے کہ یہ ''پُر جوش طالب علم'' افتخار احمد چشتی مرحوم ہیں۔ اس ادارے کے جملہ اراکین کا جو گروپ فوٹو دستیاب ہے (دیکھئے 'گفت' حصہ تصاویر) اس کی دوسری قطار میں وہ بھی کھڑے ہیں۔ ان کا موضوع بھی اسلامیات ہی تھا۔ وہ بعد میں گورنمنٹ کالج (فیصل آباد) کے شعبہ علوم اسلامیہ ہی میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

رک: پاکستان ٹائمز (لاہور)، بابت 19 اکتوبر 1947ء۔ محمد اسد کے انٹرویو کا عنوان:

Building up an ideological community. Aims of Islamic Reconstruction Department.

Marfat.com

60- ممتاز حسن (1907ء-1974ء) مالیاتی امور کے ماہر، جانے پہچانے معارف پرور اور اقبال شناس۔

61- سردار شوکت حیات (1913ء-1998ء) سابق وزیر اعلیٰ پنجاب سردار سکندر حیات کے صاحبزادے۔ جنگ پبلشرز کی جانب سے ان کی خودنوشت سوانح عمری ''گم گشتہ قوم'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ (لاہور 1995ء)۔ افتخار حسین ممدوٹ نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے سردار شوکت حیات کو جو قلمدان وزارت سونپا، اس میں محکمہ احیاء ملت اسلامیہ بھی شامل تھا (رک: گم گشتہ قوم، ص 249)

62- مہاتما گاندھی (1869ء-1948ء)

63- محمد اسد کی ابتدائی تحریروں میں احیائے فکر اسلامی (ری کنسٹرکشن آف اسلامک ریلجس تھاٹ) کی اصطلاح بڑے تواتر سے استعمال ہوئی ہے۔ انہوں نے ''عرفات'' کے نام سے جس علمی رسالے کا اجراء کیا تھا، اس کے ذیلی عنوان میں بھی یہ اصطلاح موجود تھی۔ ممکن ہے، یہ علامہ اقبال کے ''خطبات'' یا ان کی گفتگوؤں کا اثر ہو کہ وہ ہر سطح پر اس تصور کو بروئے کار لانے میں سرگرم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں ایک نئے ادارے کا سربراہ مقرر کیا گیا، تو انہوں نے اس کے نام میں بھی اس اصطلاح کو شامل کر دیا اور یوں علامہ اقبال ہی کی فکر کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

حکومت مغربی پنجاب کے تحت قائم ہونے والے اس ادارے کا سنگ بنیاد کب رکھا گیا، کچھ معلوم نہیں۔ اس سے متعلقہ ریکارڈ بھی پنجاب آرکائیوز میں محفوظ نہیں۔ معاصر اخبارات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اکتوبر 1947ء کے پہلے ہفتے میں اس ادارے کے قیام کے لیے تمام ضروری سرکاری کارروائیاں مکمل ہو گئیں اور اس نے محمد اسد کی سربراہی میں اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ بطور سربراہ ادارہ ریڈیو پاکستان لاہور سے محمد اسد کا ایک تفصیلی انٹرویو نشر کیا گیا اور اسی کی بنیاد پر انگریزی روزنامہ ''دی پاکستان ٹائمز'' (لاہور) نے ایک مفصل رپورٹ شائع کی (بابت 19 اکتوبر 1947ء، ص 7)۔ اس میں محمد اسد نے ادارے کے اغراض و مقاصد بیان کئے اور اس بات پر زور دیا کہ دنیائے اسلام میں یہ پہلا سرکاری ادارہ ہے، جس کے نام کے ساتھ لفظ ''اسلام'' استعمال کیا گیا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق پاکستان ایک نوزائیدہ نظریاتی مملکت ہے اور جس نظریئے کی بنیاد پر یہ ملک معرض وجود میں آیا ہے، اس کے پیش نظر اس کا آئین اور دیگر قوانین بنائے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام غیر مسلموں کے ہر طرح کے حقوق کو مکمل تحفظ حاصل ہوگا۔ انہوں نے اس ادارے کو مختلف خیالات و تصورات کا ''کلیئرنگ ہاؤس'' قرار دیا۔ اس انٹرویو کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"All that we are expected to do - all that we can legitimately do - is to help the community to co-ordinate its spiritual and intellectual resources, and to revive the moral strength of which the *Millat* must be capable of virtue of its being the *Millat* of Islam: in other words, to help the *Millat* to re-create the Islamic atmosphere so necessary for a

Marfat.com

revival of Islamic life in its practical aspects."

"محکمہ احیاءِ ملت اسلامیہ" کے دائرہ اثر کو بڑھانے کے لیے یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ اس میں الگ سے اردو شعبہ قائم کیا جائے اور اس کے لیے "ایسے لوگ مقرر کیے جائیں، جو دینی علوم و مقاصد میں مہارت کے علاوہ مصالح ملی و قومی سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ جانتے ہوں کہ احیاء و تجدید کے کام کی بنیادیں کیا ہیں اور ہمارے خاص ماحول کے پیش نظر ان کے لیے سعی و کوشش کی مناسب تدبیریں کیا ہو سکتی ہیں۔" (انقلاب، 20 مئی 1948ء) معلوم نہیں، اس تجویز پر کہاں تک عمل ہوا۔

64- مضمون کا عنوان "Towards an Islamic Constitution" ہے، جو ڈلہوزی سے چھپنے والے "عرفات" کے نویں شمارے (جولائی 1947ء) میں شائع ہوا تھا۔ (رک: گفت، ص 933-949)۔

65- لیاقت علی خاں (1875ء-1951ء)۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم جو راولپنڈی میں گولی کا نشانہ بنا دیے گئے۔ رک:
Ziauddin Ahmad: *Liaquat Ali Khan, Leader and Statesman*. Karachi 1970.

66- چودھری محمد علی (1905ء-1980ء)۔ وزیر اعظم پاکستان (1955ء-1956ء)۔ انگریزی کتاب The Emergence of Pakistan کے مصنف (مطبوعہ نیویارک، 1967ء)

67- نظام حیدر آباد دکن میر عثمان علی خاں کی جز رسی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ان کے تقریباً سبھی سوانح نگاروں نے ایسے متعدد واقعات قلمبند کیے ہیں، جن سے ان کے خسیس مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ رک: میر لائق علی کی کتاب "دی گریٹ ٹریجڈی"۔

68- جواہر لال نہرو (1889ء-1964ء)۔ بھارت کے پہلے وزیر اعظم۔

69- میجر جنرل حمید۔ ان کا شمار پاکستانی فوج کے ابتدائی افسران بالا میں ہوتا ہے۔ اسد کے مداحوں میں بعض بااثر فوجی لوگ بھی شامل تھے۔

70- صاحبزادہ یعقوب علی خاں (1920ء-.....)۔ رک: *The Story of Soldiering and Politics in India and Pakistan*. By Nawabzada Sher Ali Pataudi. Lahore 1978, ("I join the Pakistan Army") pp. 113-164.

71- کلیمنٹ ایٹلی (1883ء-1967ء)۔ برطانوی وزیر اعظم۔

72- سر ظفر اللہ خاں (1893ء-1985ء)۔ خود نوشت سوانح عمری بعنوان "تحدیث نعمت" مطبوعہ لاہور، 1971ء۔ نیز رک: انجمن از فقیر سید وحید الدین، متذکرہ بالا۔

73- غلام احمد قادیانی (م۔ 26 مئی 1908ء)۔ رک: محمد ظفر اللہ خاں کی کتاب:
Ahmadiyyat. The Ranaissance of Islam. London 1978.

Marfat.com

-74 محمد ضیاء الحق (1924ء-17 اگست 1988ء)۔

-74A Sir Terence Bernhard Creagh-Coin۔ سنہ ولادت 31 مارچ 1903ء-1927ء میں انڈین سول سروس میں شامل ہوئے۔ ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازی خاں۔ (1931ء-1932ء)، رجسٹرار لاہور ہائی کورٹ (1933ء-1935ء)، جائنٹ سیکرٹری، وزارت خارجہ (1947ء-1950ء)۔ اسد نے Creagh کے بجائے Craigh لکھا ہے۔

-75 حسن سہروردی۔ حسین شہید سہروردی، وزیر اعظم پاکستان کے برادر خورد، لیکن ان کا انتقال 1946ء میں ہو گیا تھا۔ اسد نے جس بھائی کا ذکر کیا ہے، اس کا نام ڈاکٹر شاہد حسن سہروردی، سابق سفیر پاکستان در سپین اور چیئرمین فیڈرل پبلک سروس کمیشن تھا۔ رک: Aftab Iqbal: *Diary of a Diplomat*, Karachi 1986.

-76 محمد اکرام اللہ۔ سنہ ولادت (1903ء-1963ء)۔ سیکرٹری وزارت خارجہ۔ برطانیہ میں پاکستان کے ہائی کمشنر۔ شائستہ اکرام اللہ کے شوہر۔

-77 بغداد پیکٹ۔ معروف دفاعی معاہدہ، جس کا ایک رکن پاکستان بھی تھا۔

-78 اپنے ایک مکتوب بنام صادق قریشی (بابت 6 اگست 1982ء) میں اسد لکھتے ہیں "میں قیام پاکستان کے وقت سے پاکستانی شہری چلا آتا ہوں۔ پاکستان کا شہری بننے پر پہلا پاسپورٹ میرے نام جاری ہوا تھا۔ فارن سروس چھوڑنے پر یہ سفارتی پاسپورٹ مجھے واپس کرنا پڑا۔" (نوائے وقت 10 ستمبر 1982ء)

-79 عبدالوہاب عزام۔ مصری وزیر خارجہ در پاکستان (1952ء تا نومبر 1954ء) و سعودی عرب۔ اقبال کی "پیام مشرق" اور "اسرار و رموز" کے اولیں منظوم عربی تراجم کیے۔ مطبوعہ بالترتیب لاہور: اقبال اکادمی، 1981ء (1951ء) و لاہور: المکتبۃ العربیہ 1978ء۔ مؤخر الذکر کی ابتدا میں دکتور سمیر عبدالحمید ابراہیم کا مفصل مقدمہ شامل ہے۔
رک: شرح حال عبدالوہاب عزام- شارح اقبال از حسن شادروان (در: اقبالیات (فارسی) شمارہ ہشتم (1992ء)، ص 201-218)۔

-80 حسن البنا (1906ء-1949ء)۔ "اخوان المسلمین" کے بانی۔ رک: رفعت السعید: حسن البناء، قاہرہ 1977ء۔
Olivier Carré and Gérard Michaud: *Les Frères Musulman, 1928-1982*. Paris 1983.

-81 شاہ فیصل (25 مارچ 1975ء کو اپنے ایک قریبی عزیز کے ہاتھوں قتل ہو گئے)۔

-82 عبدالعزیز ابن سعود (م۔ 9 نومبر 1953ء، بعمر 71 سال)۔

-83 اسد کی پہلی بار قاہرہ آمد کے بارے میں تفصیل کے لیے رک:
The Unromantic Orient. Tr. by Elma Ruth Harder, Lahore 2005, pp. 1-20.

Marfat.com

84- سعد زغلول پاشا (1860ء-1927ء)۔ اسد سے زغلول پاشا کی ملاقات کے لیے رک:

The Unromantic Orient, op. cit., pp. 114-121.

85- دمشق کے اس ابتدائی سفر کے تجربات و تاثرات کے لیے رک:

The Unromantic Orient, op. cit., pp. 96-110.

86- قیام پاکستان کے فوراً بعد بھارت نے سعودی عرب کو اپنے دام میں پھنسانے کے بڑے جتن کیے۔ اسی زمانے میں بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے سعودی عرب کا دورہ کیا اور ان کا وہاں ''رسول اسلام'' (امن کا ایلچی) کے نعروں سے خیر مقدم کیا گیا۔ معلوم نہیں، وہاں انہوں نے پاکستان کے متعلق کس قسم کی غلط فہمیاں پیدا کیں کہ 1951ء تک سعودی عرب میں پاکستان کا باقاعدہ سفارت خانہ نہ کھل سکا۔ مصر میں پاکستان کا سفارت خانہ سعودی عرب میں بھی پاکستانی امور اور پاکستانی حاجیوں کی تھوڑی بہت دیکھ بھال کرتا تھا۔ ایک چھوٹا سا پاکستانی قونصل خانہ جدہ میں قائم تھا۔ اس کے انچارج بطور قونصل محمد مسعود نامی ایک بنگالی تھے۔ اس وقت قاہرہ میں پاکستان کے سفیر حاجی عبدالستار اسحق سیٹھ تھے جو حج کے موقع پر ایک آدھ بار جدہ اور مکہ کا چکر لگا لیا کرتے تھے۔

مئی 1951ء میں حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا کہ سعودی عرب میں پاکستان کا باقاعدہ سفارت خانہ کھولنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے عبدالعزیز ابن سعود کی خدمت میں ایک وفد بھیجا جائے۔ اس وقت پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خاں اور وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں تھے۔ آئین ساز اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین خاں کو اس وفد کا قائد بنایا گیا اور محمد اسد کو سیکرٹری۔ وہ اس وقت وزارت خارجہ پاکستان میں جائنٹ سیکرٹری تھے۔ وفد میں سفیر پاکستان مقیم مصر عبدالستار اسحق سیٹھ بھی قاہرہ سے آکر شامل ہو گئے۔ صدر آزاد کشمیر کے سیکرٹری حافظ محمد یعقوب ہاشمی کو اس وفد میں کشمیری مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے شامل کیا گیا۔

اس وفد کے ذمہ انتہائی نازک کام تھا۔ ہندوستان کے مسموم پروپیگنڈے کے اثرات کو زائل کرنا، سعودی حکمرانوں کے دلوں سے پاکستان کے خلاف پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کر کے پاکستان کے ساتھ سعودی عرب کے دوستانہ اور خیر سگالی کے مراسم قائم کرنا اور اس کے بعد سعودی عرب میں پاکستانی سفارت خانہ قائم کرنے کی اجازت حاصل کرنا۔

یہ وفد اپنے مقاصد کے حصول میں نہایت خوش اسلوبی سے کامیاب ہوا۔ محمد اسد کے عبدالعزیز ابن سعود سے ذاتی تعلقات اور طویل رفاقت، دوستی اور محبت یہاں کام آئی۔ عالمی حالات کے سیاق و سباق میں قیام پاکستان کی اہمیت کو محمد اسد سے زیادہ کون سمجھتا تھا۔ انہوں نے نظریہ پاکستان، قیام پاکستان کی غرض و غایت اور عالم اسلام میں پاکستان کی اہمیت کی تفصیل پوری دلسوزی اور جذبات کے ساتھ کسی ترجمان کی مدد کے بغیر ابن سعود کی اپنی زبان اور لہجے میں پیش کی۔ اس وفد کے ایک رکن یعقوب ہاشمی کے الفاظ میں:

> ''پاکستانی وفد کے قائد سمیت ہر ممبر نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر علامہ اسد ساتھ نہ ہوتے تو شاید وفد کو بادشاہ سے ملاقات کا بھی موقع نہ مل سکتا۔ حضرت علامہ کی تصریحات کا

Marfat.com

سعودی عرب کے حکمران پر اس قدر گہرا اثر ہوا کہ نہ صرف انہوں نے جدہ میں پاکستان کا سفارت خانہ کھولنے کی بخوبی اجازت دے دی بلکہ ہمیشہ کے لیے اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کو سلطنت عربیہ سعودیہ کے انتہائی قریبی دوست کی حیثیت میں منتخب فرمالیا۔ آج ملت اسلامیہ پاکستان کے سعودی عرب کے ساتھ جو گہرے برادرانہ مراسم ہیں، وہ اسی وقت سے چلے آ رہے ہیں اور ان سے پاکستان کا ہر فرد ہی نہیں سارا عالم اسلام واقف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محافظین حرمین الشریفین کا پاکستان کے ساتھ جو مربیانہ سلوک ہے، اس سے ہر پاکستانی متاثر ہی نہیں متشکر بھی ہے لیکن ہم میں سے کتنوں کو اس حقیقت کا علم ہے کہ اس کا سارا کریڈٹ علامہ اسد کو جاتا ہے۔''

(نوائے وقت، 27 اگست 1982ء)

اس وفد کے افسر برائے تعلقات عامہ ضیاء الحسن موسوی تھے۔ حاجی محمد افضل بھی اس وفد کے رکن تھے، جو بعد میں حکومت پاکستان کے ڈپٹی سیکرٹری برائے امور کشمیر بھی رہے۔

محمد اسد اپنے ایک مکتوب بنام صادق قریشی (بابت 23 ستمبر 1982ء) میں اس وفد کے متعلق لکھتے ہیں:

''جہاں تک 1951ء میں میرے حکومت سعودی عرب سے مذاکرات کا تعلق ہے، ان کے بارے میں مَیں آپ کو کچھ زیادہ نہیں بتا سکوں گا کیونکہ ایک تو اس مشن کے بارے میں دستاویزات اب میرے پاس موجود نہیں۔ دوسرے بعض امور سرکاری رازوں کے زمرے میں آتے ہیں، جن پر لب کشائی نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ اب ان باتوں کو سرکاری راز رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اس وقت کے سعودی وزیر خارجہ (بعد میں شاہ) فیصل جو میرے دیرینہ اور انتہائی محبوب دوست تھے (اور آخر دم تک رہے) پاکستان سے گہری محبت رکھتے تھے۔ مذاکرات میں وہ بھی شامل تھے اور ان کی موجودگی میں تمام غلط فہمیوں کا دور ہو جانا مشکل بات نہیں تھی۔''

(در: نوائے وقت، 28 اکتوبر 1982ء، سنڈے میگزین)

بلاد اسلامیہ کی اپنی ایک الگ سے مقتدر تنظیم کے خیال نے متعدد اہل فکر و بصیرت کو مضطرب کیے رکھا۔ اس ضمن میں سید جمال الدین افغانی کا نام سرفہرست ہے، جنہوں نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں بالخصوص ان کے حکمرانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے وقف کر دی۔ وہ اپنے مقصد حیات کو تو حاصل نہ کر سکے، لیکن وہ امت مسلمہ کو ایک ایسی راہ سجھا گئے، جس پر گامزن ہو کر وہ عالمی سطح پر اپنی مؤثر آواز کا احساس دلا سکتے ہیں۔ اقبال بھی اسی خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے آرزومند رہے اور ''پاسبانیٔ حرم'' کے لیے مسلمانوں کے متحد ہونے کے متمنی رہے۔ افغانی اور اقبال کے زیر اثر محمد اسد بھی، نو مسلم ہونے کے باوجود یہی سوچتے رہے کہ کس طرح ممالک اسلامیہ کو باہمی اخوت اور یگانگت کے ایک ہی دھاگے میں پرو دیا جائے۔ انہوں نے مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک میں اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کیا اور کچھ مثبت عملی قدم بھی اٹھائے، لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ وہ اپنے مشن کو کامیابی کی منزل سے ہمکنار نہ کر سکے۔ مئی

Marfat.com

1970ء میں اسلامی ممالک کی ایک تنظیم (او آئی سی) معرض وجود میں آئی اور 1972ء کے چارٹر کے مطابق اس کے اغراض و مقاصد کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن اس کی ''اذان'' میں سبھی کچھ ہے مگر ''روح بلالی'' نہیں ہے۔

متذکرہ صدر وفد کی روانگی سے قبل محمد اسد کی وزیر اعظم پاکستان نواب زادہ لیاقت علی خاں سے تفصیلی ملاقات ہو چکی تھی، جس میں انہوں نے ممالک اسلامیہ کی ایسی تنظیم کے فوری قیام کا ذکر کیا تھا اور مختلف ٹھوس دلائل سے نوابزادہ صاحب کو قائل بھی کر چکے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ نواب زادہ صاحب لیاقت باغ (راولپنڈی) میں جو تقریر کرنے والے تھے، اس کا ایک اہم نکتہ اسی تنظیم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اس تقریر کا دوسرا اہم موضوع آئین پاکستان سے تعلق رکھتا تھا۔ نوابزادہ صاحب تقریر سے قبل ہی گولی کا نشانہ بن گئے، لیکن محمد اسد نے کم از کم ان دو نکات کی نشاندہی کر دی ہے، جن پر انہوں نے اپنی تقریر میں تفصیل سے اظہار خیال کرنا تھا۔

87- چودھری محمد علی (1905ء-1980ء)۔ رک: نوٹ نمبر 66۔

88- محمد علی بوگرہ (1909ء-1963ء)۔ وزیر اعظم پاکستان (اپریل 1952ء- اگست 1955ء)

89- حبیب بورقیبہ (Habib Bourquiba)۔ تیونس کے سابق صدر۔ سنہ ولادت 1903ء-1987ء میں علالت کے باعث سبکدوش ہو گئے۔ 6 اپریل 2000ء کو بعمر 96 سال وفات پائی۔

90- معروف نام پطرس بخاری تھا (1898ء-1958ء)۔ برائے تفصیل رک: ''نقوش'' کا پطرس بخاری نمبر، ستمبر 1959ء۔ عبدالحمید اعظمی: پطرس بخاری (شخصیت و فن)، اسلام آباد 2006ء۔ پطرس کے انتقال پر تعزیتی نوٹ، دیکھئے ہفت روزہ ''لیل و نہار'' (لاہور)، بابت 14 دسمبر 1958ء، ص 11-13، 42۔ نیز ملاحظہ کیجئے:

On this Earth Together. Ahmad S. Bukhari at UN, 1950-1958. Compiled and edited by Anwar Dil. Islamabad etc., 1994.

اسد اور پطرس بخاری کے تعلقات کشیدہ رہے۔ اسد کی نظر میں وہ ایک مغرور، خود بین اور دھونس جمانے والے افسر تھے۔ اختلاف رائے قطعاً برداشت نہیں کرتے تھے۔ دوسری جانب پطرس بخاری کو بھی ان کے متعلق کچھ غلط فہمیاں تھیں، چنانچہ دوران ملازمت وہ ایک دوسرے سے کھچے کھچے رہے اور ان کے محکمانہ اور نجی تعلقات میں یہ کشیدگی وزارت خارجہ سے اسد کے مستعفی ہونے تک جاری رہی۔

91- پولا حمیدہ اسد (م۔ 2007ء، سپین)۔ اسد کی تیسری یا چوتھی اور آخری بیوی، جس سے شادی (یکم نومبر 1952ء) کے بعد ان کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ بلا شبہ یہ شادی اسد کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ اسد کی پہلی بیوی ایلسا جرمن تھی، پہلے سے شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں۔ اسد کے اسلام قبول کرنے کے بعد وہ بھی اسی دین کے دائرہ امن و سلامتی میں داخل ہوئیں۔ کچھ دیر بعد وفات پا گئیں۔ اسد کی دوسری یا تیسری بیوی، منیرہ، عرب قبیلہ Shammar سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے بطن سے ان کا واحد بیٹا طلال پیدا ہوا، جو نیویارک میں مقیم ہے۔ پولا بھی پہلی بیوی ایلسا کی طرح پہلے سے شادی شدہ تھی اور اسے اسلام قبول کئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ تقریباً چالیس برس ان دونوں کا ساتھ

Marfat.com

رہا،لیکن بے اولاد رہے۔

اسد نے اپنی خودنوشت میں پولا کے متعلق جو تفصیلات رقم کی ہیں، ان کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شادی اسد کی ادھیڑ عمر کی شدید جذباتی وابستگی کا نتیجہ تھی۔ اس وقت اسد پچاس کے پیٹے میں تھے، جبکہ پولا کی عمران سے کم و بیش نصف تھی۔ اس ''عشق'' نے انہیں شادی کے بندھن میں باندھ دیا، لیکن اس کے لیے پولا کو تو اپنے خاوند سے طلاق ہی لینا پڑی، لیکن اسد کو بہت کچھ چھوڑنا پڑا، لیکن یہ ''جنونی کیفیت'' ہی ایسی ہوتی ہے کہ اس کے زیر اثر زندگی بھی داؤ پر بھی لگا دی جاتی ہے۔ اسد کو پولا کو پانے کے لیے کیا کچھ تیاگنا پڑا، ملاحظہ فرمائیے:

(الف) ان دنوں اسد پاکستان کی وزارت خارجہ کے ایک اہم عہدے پر فائز تھے اور اقوام متحدہ میں اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ جب انہوں نے پولا کو اپنی رفیقہ حیات بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا تو انہیں بتایا گیا کہ بس خاتون کی شہریت پاکستانی نہیں، اس لیے انہیں شادی کے لیے اپنی وزارت خارجہ کے توسط سے وزیراعظم سے پیشگی اجازت لینا پڑے گی۔ اسد نے بادل نخواستہ اس شرط پر عمل کیا، لیکن سفیر پاکستان پطرس بخاری سے ان کے کشیدہ تعلقات کے سبب انہیں اپنی درخواست منظور ہونے کی توقع نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد ان کی درخواست مسترد ہوگئی، لیکن انہوں نے اپنے اس اہم اور اعلیٰ عہدے کی بھی پرواہ نہیں کی اور مستعفی ہو کر پولا سے شادی کر لی۔ بظاہر ان کے اس فیصلے پر حرف گیری ہو سکتی ہے، لیکن یہ ''کھیل'' ہی ایسا ہے، جس کے نفع نقصان کے پیمانے بالکل الگ ہیں۔

(ب) اسد کی مسلمان بیوی، منیرہ بنت حسین، لندن میں رہائش پذیر تھی۔ جب انہیں اپنے شوہر کے عقد ثانی کی خبر ہوئی تو انہوں نے ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ ویسے تو برسوں پہلے اسد اور منیرہ کے ازدواجی تعلقات میں دراڑ پڑ چکی تھی اور وہ دونوں ذہناً اور مزاجاً ایک دوسرے سے بہت دور جا چکے تھے، پھر بھی اسد اپنی بیوی اور اکلوتے بیٹے کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ نیویارک کے پاکستانی سفارت خانہ کی طرح لندن کے پاکستانی ہائی کمیشن نے بھی منیرہ کا پورا ساتھ دیا اور اسد کے خلاف ایک محاذ کھڑا ہوگیا۔ یہ مخاصمانہ کوششیں اور معاندانہ پروپیگنڈہ اسد کے فیصلے کو تو روک نہ سکا، البتہ اس مہم نے ان کے منیرہ کے ساتھ تعلقات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیا اور بالآخر دونوں ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہوگئے۔

(ج) اسد کا اکلوتا بیٹا طلال 1932ء میں بمقام مدینہ طیبہ پیدا ہوا۔ اسے ہوش سنبھالنے کے بعد بہت تھوڑا عرصہ اپنے والد کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ اس کا زیادہ وقت اپنی والدہ کے پاس گزرا، اس لیے وہ بیشتر معاملات میں اپنی والدہ ہی کی طرفداری کرتا تھا۔ اپنے باپ کی پولا سے شادی کے موقع پر جو اُدھم مچا، اس میں بھی طلال کی ہمدردیاں اپنی والدہ کے ساتھ تھیں، یہاں تک کہ جب اسے اس شادی کی مصدقہ اطلاع موصول ہوئی تو اس نے کہا کہ ''آج میرا والد مر گیا ہے۔'' باپ بیٹے میں یہ ناچاقی اس کی والدہ کو طلاق ملنے کے بعد مزید بڑھ گئی اور یہ منیرہ کی وفات (1978ء) تک جوں کی توں قائم رہی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ علیحدگی اور ذہنی فاصلے کم ہوتے گئے اور کبھی کبھار باپ بیٹے میں ملاقات ہونے لگی حتیٰ کہ جب اسد کا انتقال ہوا تو طلال کی شمولیت کے بعد ان کی تجہیز و تکفین ہوئی۔

طلال اب ریٹائر ہو چکے ہیں اور نیویارک میں مقیم ہیں۔ اپنے موضوع پر سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ آسٹریا کی ایک

Marfat.com

فلمساز کمپنی نے وہاں کی حکومت کے مالی تعاون سے اسد پر جو دستاویزی فلم بنائی ہے، اس کا پریمئر اپریل 2008ء میں ویانا میں ہوا تو اس میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے طلال نے شرکت کی۔

بظاہر دیکھا جائے تو پولا سے شادی کا فیصلہ اسد کے لئے خاصا نقصان دہ ثابت ہوا۔ اچھی خاصی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے، منیرہ کو طلاق دینا پڑی، بیٹے کے جذبات مجروح ہوئے اور ان کے مابین فاصلے بڑھ گئے۔ بلاشبہ اسد نے ہر قیمت پر پولا کو حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ کھویا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے پایا بھی بہت کچھ۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ زندگی بھر جو کمی یا تشنگی محسوس کرتے رہے، وہ اس شادی کے بعد دور ہوگئی۔ جب اسد نے ایلسا سے شادی کی، تو وہ ان سے پندرہ سال بڑی تھی، لیکن وہ جلد ہی فوت ہوگئی۔ منیرہ ایک عرب قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی لیکن پڑھی لکھی نہ تھی۔ وہ ایک عام سی گھریلو خاتون تھی، لیکن اسد جیسی علمی شخصیت سے عمر بھر ان کی ذہنی مناسبت نہ ہوسکی۔ طوعاً و کرہاً وہ نباہ تو کرتے رہے، لیکن ذہنی طور پر وہ آسودہ نہ ہوسکے۔ پولا کے آنے سے اسد کو یہ ذہنی طمانیت اور جذباتی آسودگی حاصل ہوگئی اور اس کا پہلا ثمر ''شاہراہ مکہ'' جیسی معرکتہ لآراء روحانی خودنوشت کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ شادی کے فوراً بعد انہوں نے ایک سال میں یہ کتاب مکمل کرلی اور اس کو پولا ہی کے نام منسوب کردیا۔ اس کے بعد پولا ان کے ہر علمی منصوبے میں شریک رہی، حتیٰ کہ انہوں نے جو زیر نظر خودنوشت تحریر کی، اس کا آدھا حصہ بھی پولا ہی کا لکھا ہوا ہے۔

92- چھٹی صدی قبل از مسیح کا چینی مذہب۔ رک:

Wing-tsit Chan: *The Way of Lao Tzu*, New York, 1963.

93- خواجہ ناظم الدین (1894ء-22 اکتوبر 1964ء)۔ وزیراعظم پاکستان (1951ء-1953ء)۔ کیمبرج میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور (م۔ 1948ء) کے ہم جماعت۔

94- Martin Manfred Goldenberg. محمد اسد کی والدہ امالیا (Amalia) کا 1919ء میں انتقال ہوگیا اور اس کے والد کارل وائس (Karl Weiss) نے برتا (Bertha) نامی بیوہ سے شادی کرلی (17 اکتوبر 1921ء)۔ مارٹن، اس کے پہلے خاوند لیون گولڈن برگ سے پیدا ہوا تھا (سنہ پیدائش 30 جولائی 1917ء)۔ اسد کے اس سوتیلے بھائی نے ان کی وفات پر ایک معلوماتی تعزیتی مضمون بھی لکھا تھا۔

"From Galicia to Granada", in: Association of Jewish Refugees from Germany in Great Britain. Information, June 1992, p. 7.

95- یہ اخبار ابھی تک چھپ رہا ہے اور اب اس کا نام Frankfurter Allgemeine Zeitung ہے۔

96- Franziska Taubes

97- Heinrich Feigenbaum المعروف بہ Heinrich Taeni۔

98- رک: کیا علامہ اسد کبھی اسلام کو چھوڑ گئے تھے؟ (نوائے وقت، بابت 22 اکتوبر 1982ء۔ ''سیلانی کی ڈائری'' از صادق

Marfat.com

قریشی)۔

اسد اپنے ایک مکتوب بنام صادق قریشی (بابت 23 ستمبر 1982ء) میں رقمطراز ہیں:

''اب لیجئے میرے خلاف الزام تراشی کی مہم کو جو 1952ء میں میرے پاکستان سروس چھوڑ کر ملک سے چلے آنے کے بعد شروع کی گئی۔ان افواہوں کے پیچھے جو لوگ تھے،ان میں سے چند ایک کا نام جانتا ہوں مگر اب انتقامی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا بالخصوص اس وجہ سے کہ ان میں سے کچھ افراد اب اس دنیا میں موجود نہیں اور کسی بات کا جواب نہیں دے سکتے۔مگر اس سلسلے میں چند ایسے افراد کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے میرے اسلام چھوڑ دینے کے الزام کی سختی سے تردید کی اور اس میں میرا بھرپور دفاع کیا۔میں اس وقت نیویارک میں بیٹھا اپنی کتاب ''روڈ ٹو مکہ'' لکھ رہا تھا اور اتنی دور سے اپنے خلاف کسی الزام کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔میرے حامیوں میں سرفہرست مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے جنہوں نے میری اور میری شہرت کو ان الزامات سے بچانے میں بہت مثبت کردار ادا کیا۔میں نہ کبھی جماعت اسلامی سے وابستہ رہا ہوں اور نہ کبھی حضرت مولانا کو میرے تمام خیالات سے اتفاق ہوا تھا۔ان فکری اختلافات سے قطع نظر مجھے بصد مسرت اعتراف ہے کہ وہ ایک نہایت قابل احترام اور بے حد انصاف پسند شخصیت کے مالک ہیں۔میرے ایک اور حامی (وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں) ڈاکٹر عبدالوہاب عزام،سفیر مصر متعینہ پاکستان تھے جو آخر وقت تک میرے بہترین دوست رہے۔انہوں نے جب یہ الزام سنا کہ میں نے اسلام چھوڑ دیا ہے تو کہنے لگے''میں اسد کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔اتنا زیرک انسان اتنا احمق کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلام جیسی نعمت کو چھوڑ دے۔'' یہ بات کس قدر صحیح ہے۔

پھر کچھ اور لوگ بھی تھے جنہوں نے میری شہرت کو اس بے سروپا الزام سے داغدار ہونے سے بچایا۔یہ سب لوگ اب انتقال کر چکے ہیں۔ان میں ممتاز حسن،چودھری نذیر احمد خاں اور ''نوائے وقت'' کے مدیر شہیر حمید نظامی شامل تھے۔''

(نوائے وقت،28 اکتوبر 1982ء،سنڈے میگزین)

برسوں پہلے اسد نے خود اپنی ذات پر الزامات کی پُر زور الفاظ میں تردید کی تھی۔ان کا مندرجہ ذیل بیان اور اس پر ادارتی نوٹ ملاحظہ کیجئے:

''نومسلم مستشرق کی صفائی

مکرمی! میں آپ کے مؤقر جریدے کے توسط سے یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ میرے خلاف افترا٬ بہتان اور پروپیگنڈا کی ایک ناپاک مہم چلائی جا رہی ہے۔جو احباب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں،اس دجل اور کذب بیانی پر اعتبار نہیں کر سکتے،لیکن بہر حال میں غیر مبہم الفاظ میں یہ بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ حکومت پاکستان کی وزارت امور خارجہ سے میرا مستعفی ہونا ایک خالص نجی معاملہ تھا جسے پاکستان گورنمنٹ بھی اچھی طرح جانتی ہے۔یہ کہنا کہ میں پھر سے یہودی ہو گیا ہوں یا ارتداد کا میرے دل میں کبھی خیال بھی گذرا ہو، بالکل لغو اور جھوٹ ہے۔متواتر کئی سالوں سے میں اپنی تمام لیاقت اور استعداد کے مطابق اسلام کی سرخروئی کے لیے کوشاں رہا ہوں اور میری علمی خدمات مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے

Marfat.com

لیے ایک فیضی سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔ میں نے آج تک نہ کبھی کوئی ایسی بات زبان سے کہی ہے نہ قلم سے لکھی ہے جس سے کھینچ تان کر بھی یہ معنی نکالے جاسکیں کہ اسلام کے معاملہ میں میرے رویتے میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

میں نے نہ تو کبھی بھی نام نہاد "اسرائیلی ریاست" کی حمایت کی اور نہ ہی یہودی قوم کی، بلکہ اس کے برعکس حکومت پاکستان کی ملازمت سے قبل اور اس کے دوران میں اور اب ملازمت کے بعد بھی میں نے عربوں کے نقطۂ نظر کی پوری تائید و حمایت کی ہے اور "اسرائیلی ریاست" کے قیام کی ہر طرح سے مذمت کی ہے اور اس کے وجود کو ایک گھناؤنا اخلاقی جرم سمجھتا ہوں۔

بعض لوگوں نے یہ افترا پردازی بھی کی ہے کہ میں نے حال ہی میں ایک یہودی عورت سے شادی کر لی ہے، جو بالکل غلط ہے۔ میری بیوی بحمد اللہ مسلمان ہے اور اسلام سے قبل وہ رومن کیتھولک تھی۔

ستم ظریفی کی حد ہے کہ میرے خلاف تمام افواہیں ایسے وقت میں اڑائی جارہی ہیں جبکہ میں اپنے اسلام قبول کرنے کے اسباب اور حالات پر ایک کتاب تصنیف کر رہا ہوں۔ یہ کتاب جو میں امریکہ کی ایک بہت بڑی پبلشنگ کمپنی کے ایما پر لکھ رہا ہوں، صرف ادبی خدمت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعے مجھے مغربی دنیا کو یہ بتانے کا بھی موقع مل رہا ہے کہ ایک یورپین کا اپنے مذہب کو تبدیل کرنا کوئی "غیر معقول" فعل نہیں ہے جیسا کہ اکثر مغربین سمجھتے ہیں۔

اسلام ہمیشہ سے میری زندگی کا ایک لازمی جزو رہا ہے اور آج بھی ہے اور اس تلخ حقیقت سے اسلام کے ساتھ میری اطاعت شعاری میں کوئی فرق نہیں آسکتا کہ میری اپنی ہی قوم۔ مسلم قوم۔ کے بعض افراد نے میرے خلاف بہتان اور غیبت کے پروپیگنڈے کو سچ مان لیا ہے اور انہوں نے اس بات کا بھی خیال نہیں کیا کہ ہمارے رسول صلعم نے غیبت کی کتنی سخت الفاظ میں مذمت کی ہے۔ یہ اس بات کی افسوسناک شہادت ہے کہ ہماری قوم کا اخلاق اس درجہ گر چکا ہے کہ ایک ایسے شخص کے ایمان پر شبہ اور اس کے خلاف بدگوئی کی جاتی ہے جس کا سارا شباب اسلام ہی کی خدمت میں گذرا اور پھر یہ سب کچھ اپنی ہی قوم نے کیا جس کی بہتری کے لیے میں سعی کرتا رہا ہوں۔

محمد اسد سابق ایڈیٹر "عرفات" لاہور (بحوالہ "المسلمون"، مصر)

ادارتی نوٹ: "علامہ محمد اسد سابق لیو پولڈ ویس انگریزی مترجم بخاری شریف و مدیر رسالہ 'عرفات' کا ذکر کئی سال قبل "صدق" میں مختلف موقعوں پر بار بار آچکا ہے۔ پاکستان کے شعبہ اسلامیات میں گرانقدر خدمات انجام دے رہے تھے۔ اب ادھر دو چار سال سے ان کا کچھ پتہ نہ تھا بلکہ خبریں بہت ہی وحشتناک اور تکلیف دہ قسم کی یعنی خدانخواستہ ارتداد وغیرہ کی مشہور ہوگئی تھیں۔ مکتوب بالا جو پاکستان کے روزناموں سے بحوالہ المسلمون (مصر) لیا گیا ہے، بے شک بڑی حد تک باعث اطمینان و مسرت ہے۔ پھر بھی بہتر ہوتا کہ اس کی تائید میں کوئی بیان اگر پاکستان کے کسی ذمہ دار کی طرف سے نہیں تو کم از کم خان صاحب نیاز علی خاں (جوہر آباد ضلع سرگودھا) کی طرف سے بھی شائع ہو جاتا، جو مستشرق موصوف کے عزیز ترین رفیقوں میں سے تھے۔"

(صدق جدید۔ (لکھنؤ) 15 جنوری 1954ء، ص 8)

Marfat.com

نیز رک: الاعتصام (گوجرانوالہ) یکم جنوری 1954ء بعنوان "اسد کے ترک اسلام کی خبر غلط ہے۔"

99- چودھری نذیر احمد خاں (1898ء-1980ء) مجلّہ "الاحیاء" کے مدیر۔ جب اسد کے متعلق یہ خبر اڑائی گئی کہ وہ اسلام کو ترک کر کے پھر سے یہودی ہو گئے ہیں تو ان کے قریبی احباب کو یہ سن کر دھچکا سا لگا۔ چنانچہ چودھری صاحب اس خبر کی تصدیق کے لیے خود امریکہ گئے اور اسد سے ملے۔ انہوں نے اس خبر کی پُر زور طریقے سے تردید کی اور چودھری صاحب کو پورا اطمینان دلایا کہ وہ مسلمان ہیں اور انہوں نے کبھی ترک اسلام کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ اس کے بعد چودھری صاحب واپس چلے آئے۔

100- "روڈ ٹو مکہ" کا پہلا ایڈیشن نیویارک سے اور لندن (Max Reinhardt) سے بیک وقت 1954ء میں طبع ہوا۔ اس "روحانی سفرنامہ" کو منظر عام پر آئے ہوئے پچاس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا، لیکن اس کتاب کی مقبولیت میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔ اب تک اس کے مختلف ممالک سے بیسیوں ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ تقریباً ایک درجن زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں، جن میں عربی، ولندیزی، جاپانی، ملائی، سویڈش، سربی کروشیائی زبانیں بھی شامل ہیں۔ اردو میں اس کے دو تراجم دستیاب ہیں: شاہراہ مکہ (مطبوعہ کراچی) اور طوفان سے ساحل تک (مطبوعہ کراچی)۔ محمد اسد نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے کہ وہ ایسی کتاب دوبارہ نہیں لکھ سکتے۔

ان کا یہ کہنا بھی اس کتاب پر مختصر اور جامع تبصرہ ہے۔ اسرائیلی مورخ مارٹن کریمر کی رائے میں:

"'The Road to Mecca' cannot be read as a document on historical truth about Arabia, Ibn Saud, or even the author's life. It is an impressionistic self-portrait that suggests more than itself. The face of its subject is in half-shadow." (see *Gift*......, Vol. I)

101- "شاہراہ مکہ" کا جرمن ایڈیشن ایک سال بعد یعنی 1955ء میں فرانکفورٹ سے شائع ہوا۔ بعنوان Das Weg nach Mekka۔ دراصل یہ ترجمہ نہیں بلکہ مصنف نے حالات و واقعات کو تبدیل کئے بغیر انہیں اپنے انداز سے قلمبند کیا ہے اور اس میں کچھ ایسی تصویریں شامل کی ہیں، جو انگریزی ایڈیشن میں نہیں ہیں۔ اس جرمن ایڈیشن پر تبصرے کے لیے رک:

Muhammad Asad: "Der Weg nach Mekka." (in: *Der Spiegel*, Heft, 1956).

102- محمد اسد کی پہلی جرمن مصورہ بیوی ایلسا (اسلامی نام: عزیزہ محمد) کا بیٹا۔ ہائنرخ (احمد) شیمان۔ یکم ستمبر 1916ء کو پیدا ہوا اور نومبر 2002ء میں جرمنی کے شہر ویس بادن کے قریب ایک گاؤں میں وفات پائی۔ محمد اسد پر جرمن کتاب کے مصنف G. Windhager (ویانا، 2002ء) کو احمد شیمان نے اپنے اور اپنی والدہ کے بارے میں مفید معلومات فراہم کیں۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے، احمد شیمان کا مضمون:

Marfat.com

"Verwandschaft und Familie." (in: H. Becker and others (eds.): *Erziehung und Politik. Minna Specht zu ihrem 80. Geburtstag.* Frankfurt a. Main 1960, pp. 356-366.

103- اسد کی تصانیف میں ان تقاریر پر مشتمل کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ انہوں نے ریڈیو برن (سوئٹزرلینڈ) سے جن موضوعات پر تقریریں کی تھیں (1958ء-1959ء)، وہ بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوگئیں، رک:

Muhammad Asad and Hans Zbinden (eds.): *Islam und Abendland.* Freiburg i. Br., 1960.

104- اسد کے ان جرمن مضامین کی فہرست Windhager کی متذکرہ بالا کتاب میں درج ہے (ص 206-208)۔ انہی مضامین کی بنیاد پر اسد نے اپنی پہلی جرمن کتاب لکھی (1924ء)، جس کا انگریزی ترجمہ Unromantic Orient کے زیر عنوان شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے اسد سے اپنے دوستانہ مراسم اور کتاب کی اہمیت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

105- اس انگریزی کتاب کا عنوان ہے: *The Principles of State and Government in Islam* (1961ء)۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا غلام رسول مہر نے کیا تھا (لاہور، 1963ء)۔ نیز محمد عارف گل (مترجم)، لاہور 2000ء۔ اسلام اور سیاست ترجمہ عمر فاروق (ترجمان القرآن، نومبر/دسمبر 1964ء، ص 98-108)

106- اس عربی ترجمہ کا عنوان "الطریق الی الاسلام" ہے۔ مترجم عفیف البعلبکی۔ طبع ثانی، بیروت 1964ء۔ مقدمہ عبدالوہاب عزّام کا تحریر کردہ ہے (1955ء)۔

107- ڈاکٹر ذاکر حسین (8 مارچ 1897ء-3 مئی 1969ء)۔ رک: اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن)، بابت اپریل 1969ء۔ صدق جدید (لکھنؤ)، بابت 16 مئی 1969ء یا وفیات ماجدی مرتبہ حکیم عبدالقوی دریابادی، لکھنؤ 1978ء، ص 162-167)۔

108- اسد اور پولا، چودھری نیاز علی سے ملنے جوہرآباد گئے۔ اس ملاقات کی ایک یادگار تصویر چودھری صاحب کے فرزند کے۔ ایم۔ اعظم کے پاس محفوظ ہے۔ ان کے شکریہ کے ساتھ یہ تصویر "گفت" (جلد دوم) میں شائع ہوچکی ہے۔

چودھری نیاز علی 1947ء کے بعد جوہرآباد میں مستقلاً رہائش پذیر ہوگئے۔ وہاں بھی انہوں نے دارالاسلام نام کا ادارہ قائم کردیا۔ اس کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی "میثاق" (لاہور) سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں، جو درج ذیل ہے:

> "ہمارے مخدوم چودھری نیاز علی خاں صاحب نے جوہرآباد سے اطلاع دی ہے کہ انہوں نے ادارۂ دارالاسلام کے قیام کا اعلان کردیا ہے۔ یہ وہی ادارہ ہے جو چودھری صاحب موصوف نے علامہ اقبال کی تجویز کے مطابق پٹھان کوٹ (ضلع گورداسپور) میں قائم کیا تھا۔ یہ ادارہ

Marfat.com

تقسیم ملک کی نذر ہو گیا.....کوئی دوسرا ہوتا تو اس عظیم حادثے کے بعد ہمت ہار بیٹھتا لیکن چودھری صاحب نے سب کچھ ہارنے کے بعد بھی ہمت نہیں ہاری۔ پاکستان میں آ کر انہوں نے جس طرح اپنی ذاتی املاک و جائداد کی بحالی کی کوشش کی، اس سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ انہوں نے دارالاسلام کو جوہر آباد میں اس سے زیادہ شان واہتمام کے ساتھ از سر نو قائم کر دیا۔ پہلا دارالاسلام تو ان کے صرف دینی جذبہ اخلاص کی ایک یادگار تھا، لیکن یہ دارالاسلام ان کے دینی جذبہ کے ساتھ ساتھ ان کے غیر متزلزل عزم، ان کی ناقابل شکست ہمت اور ان کی انتھک محنت کی بھی ایک غیر فانی یادگار ہے۔ اس عمر میں ان کی ہمت کو دیکھ کر فی الواقع رشک آتا ہے اور دل سے دعا نکلتی ہے کہ اگر ہماری قوم باہمت نوجوانوں سے خالی ہو رہی ہے، تو اللہ تعالیٰ کچھ ایسے بوڑھے ہی قوم میں پیدا کر دے جن کی مثالوں سے ہم کچھ سبق حاصل کر سکیں۔"

(صدق جدید (لکھنؤ)، بابت 9 اپریل 1965ء، ص 6)

مولانا موصوف نے چودھری نیاز علی صاحب کا ایک مراسلہ بھی نقل کیا ہے، جس کی ابتدا میں مکتوب نگار نے اپنے قیام انگلستان اور وہاں کے کچھ ملاقاتیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

"میری عمر 29 جون کو 80 سال کی پوری ہو گئی۔ سرسید مرحوم کے آخری ایام میں ان کے شیدائیوں میں شامل ہوا اور اس کے بعد جہاں ڈھول بجا، وہاں پہنچا ہوں۔ دنگل میں کچھ نہ کچھ حصہ رہا۔ ساری عمر اس کھیل میں سر کھپا دینے کی آرزو میں گزری۔ آخر عمر میں ایک کھیل بنا اور بنتے بنتے ہی بگڑ گیا اور قدرت نے پھر اسی صحرازار میں لا کر کھڑا کر دیا مگر شوق بڑھتا ہی رہا۔ اب پھر کچھ تنکے چن کر جمع کر رہے ہیں۔ افریقہ کے حالات پڑھ کر دل میں ولولہ اٹھ رہا ہے۔ اب نیت یہ ہے کہ "صدق" اور کراچی کے "الاسلام" کے پیمانہ پر Holy Quran کے نام سے ایک رسالہ جاری کروں۔ مانگے تانگے کا یعنی اقتباسات اور تلخیص و تسہیل کا کام تو میں خود بھی کر سکتا ہوں مگر اس عمر میں اپنے بھروسہ پر کوئی کام نہیں کر سکتا ہوں۔ کیا کوئی صاحب اس کام کے لیے زندگی وقف کر سکتے ہیں۔"

(صدق جدید (لکھنؤ)، بابت 29 جولائی 1960ء، ص 6-7)

چودھری نیاز علی صاحب کی وفات (1976ء) پر اسد کے تعزیتی خط کے عکس کے لئے رک: گفت (جلد دوم)۔

109- نسیم حسن جب تک زندہ رہے، اسد کی تصانیف کے جملہ حقوق کی نگرانی کرتے رہے اور کوئی ناشران کی کسی کتاب کی بلا اجازت اشاعت مکرر یا ترجمہ کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں وہ حکومت پنجاب کے مشیر رہے۔ محکمہ احیاء ملت اسلامیہ قائم کرنے اور اسد کو اس کا سربراہ مقرر کرنے میں ان کا خاصا عمل دخل تھا۔ بعد میں وہ پیشہ وکالت

Marfat.com

سے منسلک ہو گئے۔رک:وفیات مشاہیر پاکستان مرتبہ محمد اسلم،اسلام آباد،1990ء۔

110- احمد دین اظہر کا آبائی تعلق سیالکوٹ سے تھا۔انڈین سول سروس میں شامل ہوئے اور کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ پاکستان میں بھی مختلف حکومتی اداروں میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔عمر کے آخری حصے میں وہ مرکزی اردو بورڈ (لاہور) کے سربراہ مقرر ہوئے۔کراچی میں وفات پائی۔پاکستان ٹیلی وژن کے سابق سربراہ اسلم اظہر کے والد تھے۔ رک:خفتگان کراچی از محمد اسلم،لاہور 1991ء۔

111- پاکستان کی سول بیوروکریسی کے ساتھ ساتھ اسد کے فوج کے اعلیٰ افسران سے بھی دوستانہ تعلقات تھے۔قبل ازیں وہ جنرل حمید اور نواب زادہ شیر علی خاں سے اپنے ایسے ہی مراسم اور ان کی فراہم کردہ سہولتوں کا ذکر کر چکے ہیں۔رک: وفیات اعیان پاکستان از محمد منیر سلیچ۔

112- محمد اسد اور مولانا مودودی کے تعلقات پر،رک:میرا مقالہ"محمد اسد کا قیام ہندوستان میں،1932ء تا 1947ء"(در: گفت، جلد اول)۔بعد میں ان میں بعض دینی مسائل پر اختلاف بھی ہو گیا،بالخصوص اسد کے ترجمہ قرآن کی ابتدائی نو سورتوں کی اشاعت کے بعد۔بقول مولانا رفتہ رفتہ ان کے ذہن پر نام نہاد ترقی پسندانہ تصورات کا زیادہ غلبہ ہو گیا۔ رک:

Correspondence between Mawlana Maudoodi and Maryam Jameelah. Delhi 1969, p. 15 (Maududi's letter, 25.2.1961)

جن دنوں جمال پور، پٹھان کوٹ میں دارالاسلام قائم کرنے کے بارے میں لائحہ عمل تشکیل دیا جا رہا تھا،اس وقت مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن سے لاہور بلایا گیا اور وہ دیگر افراد یعنی علامہ محمد اقبال،چودھری نیاز علی خاں اور محمد اسد سے متعارف ہوئے۔جب ان میں سے اول الذکر یعنی علامہ محمد اقبال رحلت فرما ہو گئے تو دوسرے رفقاء کی طرح مولانا کو بھی شدید جذباتی دھچکا محسوس ہوا۔وہ اس "سہارا" کے چھن جانے کا یوں ذکر کرتے ہیں:

"اب فی الواقع وہ صورت پیش آ چکی ہے۔ساحل کے سکون و عافیت سے نکال کر سمندر کے منجدھار میں پھینک دیا گیا ہوں۔وہی خواب تصور والی ٹوٹی ہوئی کشتی میرے حوالے کی گئی ہے جس کا تختہ تختہ الگ اور جس کے بادبان تار تار ہیں۔ سب سے بڑا امادی سہارا جس سے مدد کی توقع تھی،اقبال کا سہارا تھا،سو وہ بھی یہاں قدم رکھتے ہی چھین لیا گیا۔"

(ترجمان القرآن،محرم 1357ھ،اشارات)

113- بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ (31دسمبر 1957ء-8 جنوری 1958ء) پنجاب یونیورسٹی،لاہور کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔اس میں تیس ممالک کے سو سے زیادہ اسکالرز نے شرکت کی اور مختلف موضوعات پر اپنے عالمانہ مقالات پیش کیے (رک:انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم،پیپرز،لاہور:پنجاب یونیورسٹی پریس،1960ء)۔

23 اکتوبر 1957ء کی سہ پہر کو پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر میاں افضل حسین (م:یکم نومبر 1970ء) کے کمرے کا عقبی دروازہ کھلا اور ایک امریکی خاتون ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔خاتون کے ہاتھ میں ٹائپ کیے ہوئے

Marfat.com

انگریزی اور عربی کے خطوط اور دیگر کاغذات کا ایک پلندہ تھا مگر وائس چانسلر ان کاغذات کو دیکھے بغیر اس خاتون پر برس پڑے۔ خاتون نے کہا کہ وہ اپنے شوہر کا ہاتھ بٹانے کے لیے یہ کام کرتی ہے۔ اسے یونیورسٹی کی طرف سے ان کاموں کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا اور اس وقت وہ یہی کہنے آئی تھی کہ آئندہ وہ یہ اعزازی کام نہ کر سکے گی۔

یہ خاتون اس مجلس مذاکرہ کے ڈائریکٹر محمد اسد کی بیوی پولا حمیدہ اسد تھی، جو اعزازی طور پر ان کے سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔

مجلس مذاکرہ کے انتظامات کے بارے میں اسد اور وائس چانسلر کے اختلافات اس سے پہلے پیدا ہو چکے تھے جو متذکرہ بالا واقعہ کے باعث اور کشیدہ ہو گئے۔ اسد دوسرے روز دفتر نہ پہنچے۔ چند روز بعد اگرچہ وہ دفتر میں آنے لگے لیکن تعلقات کی تلخی بڑھتی گئی اور محمد اسد کو یقین ہو گیا کہ موجودہ حالات میں ان کا کام کرنا ممکن نہیں، چنانچہ یکم دسمبر 1957ء کو، جبکہ مجلس مذاکرہ کے انعقاد میں صرف چار ہفتے باقی رہ گئے تھے، اسد نے وائس چانسلر کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔

اس مجلس مذاکرہ کا انعقاد پاکستان کی یونیورسٹیوں کے زیر اہتمام ہوا۔ قبل ازیں 1954ء میں پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) اور امریکی کانگرس کے اشتراک سے ایک ایسی ہی بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ پرنسٹن میں منعقد ہو چکی تھی۔ اس وقت امریکہ میں پاکستان کے سفیر سید امجد علی نے منتظمین سے درخواست کی تھی کہ پاکستان میں بھی اس طرح کی ایک مجلس منعقد کی جائے۔ اتفاق سے جب یہ تجویز عملی جامہ اختیار کرنے لگی تو سید امجد علی پاکستان کے وزیر خزانہ بن چکے تھے، چنانچہ انہوں نے حکومت کی طرف سے سات لاکھ روپے کے اخراجات منظور کئے اور یہ کام پاکستان کی یونیورسٹیوں کے سپرد ہوا۔ ایک انتظامی کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں پاکستانی یونیورسٹیوں کے نمائندے شامل کئے گئے۔ اس کمیٹی نے (حکومت کے مشورے سے) اپنے پہلے اجلاس منعقدہ مارچ 1957ء میں محمد اسد کو اس کام کے لئے منتخب کیا اور ان کا مشاہرہ ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ مقرر ہوا۔ ان کے فرائض میں مجلس مذاکرہ کے جملہ انتظامات کی تکمیل اور مجلس کے اختتام کے بعد مقالات کی ترتیب واشاعت کا کام شامل تھا۔

(رک: ہفت روزہ ''لیل ونہار'' (لاہور)، بابت 8 دسمبر 1958ء، ص 8)

محمد اسد کے مستعفی ہونے کے ایک دن بعد انگریزی روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' کے سٹاف رپورٹر نے اسد اور وائس چانسلر کے اختلافات پر ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی، جس میں ان تین اختلافات کا ذکر کیا گیا:

"......1) provision of adequate staff for the Director's office,

2) appropriate and timely arrangements for the translation into Arabic of English papers to be read at the Colloquium and *vice versa*, as well as for trained interpreters required during the Colloquium and

3) unnecessary delays in the various administrative and

Marfat.com

organisational matters."

اس رپورٹ میں بعض ایسی باتیں بھی لکھ دی گئیں، جو حقائق کے منافی تھیں، چنانچہ ان کی تردید اور وائس چانسلر سے اپنے اصل اختلافات کے اظہار کے لیے اسد نے اس اخبار کے مدیر کے نام ایک مراسلہ لکھا، جو درج ذیل ہے:

"In the issues of your newspaper of Monday, Dec. 2, there appeared report about my resignation from the directorship of the International Islamic Colloquium. This report contained several inaccuracies which I would request you to correct.

1) I was not engaged by the Pakistan Government but by the University of the Punjab.

2) My engagement was not for a "term of two years" or for any specified period. My task was to organise the Colloquium and, presumably, also to edit the final report on its proceedings; but this last point was not mentioned in the exchange of letters on the basis of which I assumed my task.

3) I have never submitted any "budget" to the Colloquium Committee. The responsibility for the budget has never been entrusted to me, and all financial dispositions relating to the Colloquium have been and are being made by the Vice-Chancellor, University of the Punjab. What I did do, at the request of the Vice-Chancellor towards the end of October, was to prepare and submit an estimate of expenditure. Reference to the memorandum in which that estimate was included was made in the Progress Report which I submitted to the Colloquium Committee on Nov. 30.

4) During the period in which my wife was assisting me as Colloquium Secretary in an honorary capacity (that is, from the time of my assumption of the directorship in March last until her resignation on Oct. 23), my office staff consisted of a stenographer

Marfat.com

and one peon. The assistant mentioned in your report joined my staff only after my wife's resignation.

5) The Vice-Chancellor has never refused to accept my proposals regarding accomodation arrangements for the participants.

The main point at issue between the Vice-Chancellor and myself was the question of making suitable arrangements for a good translation into Arabic and English of the papers to be read by the participants (and to be printed for distribution during the Colloquium sessions) - a point I consider to be of utmost importance to the success of the Colloquium. The arrangements which the Vice-Chancellor has seen fit to make are, in my opinion, both belated and inadequate.

Another important point of disagreement was my insistence on an early finalisation of the programme of the Colloquium."

(The Pakistan Times, Dec. 4, 1957).

اس دور کے معروف انگریزی اور اردو اخبارات میں اسد اور وائس چانسلر کے اختلافات پر بہت خامہ فرسائی کی گئی، لیکن جو فیصلہ ہو چکا تھا، وہ جوں کا توں قائم رہا۔ محمد اسد کو مکمل طور پر اس مجلس مذاکرہ سے نکال باہر کیا گیا اور جب اس کی کارروائی اور منتخبہ مقالات بصورت کتاب شائع ہوئے، تو اس میں اُن کے نام تک کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ یہ ''غیر علمی'' یا ''غیر اخلاقی'' طرز سلوک پنجاب یونیورسٹی کے معتبر اور ذی علم اصحاب کے جانبدارانہ رویے کی عکاسی کرتا ہے۔

اسی بین الاقوامی مجلس مذاکرہ کے دوسرے ہدف ڈاکٹر داؤد رہبر تھے، جن کے مقالہ پر خاصی لے دے ہوئی۔ انہوں نے بہ قلم خود ساری روداد بیان کی ہے، جیسا کہ وہ ایک خط میں مطلع کرتے ہیں ''کولوکیم میں میرے مقالے پر جو ہنگامہ ہوا، اس کی روداد آج سے کئی برس پہلے میں نے انگریزی میں لکھی تھی، وہ ارسال ہے۔'' (سلام و پیام، جلد دوم، لاہور 2004ء، ص 142، بنام وجیہہ الدین احمد، بابت 4 دسمبر 2000ء)۔

ایک اور مکتوب بنام راقم (بابت 29 مارچ 2008ء) میں اس موضوع پر لکھتے ہیں:

''اسلامی کلوکیم میں شرکت کا دعوت نامہ مجھے اسد صاحب ہی کے دستخط سے انقرہ میں موصول ہوا تھا۔ میں نے اس کا جواب لکھا تو تخاطب میں مسٹر اسد کی جگہ Herr Asad لکھ دیا۔ انہیں اس طرز تخاطب میں بیگانگی محسوس ہوئی اور انہوں نے شکایت کا خط

Marfat.com

لکھا۔

کلوکیم کمیٹی کی سیکرٹری شپ سے وہ کولوکیم کے انعقاد سے قبل ہی یا تو خود ہی مستعفی ہو گئے یا اس سے ہٹا دیئے گئے۔ میاں افضل حسین صاحب اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور کولوکیم کمیٹی کے صدر۔ میرا قیاس ہے کہ ان دو عالی مرتبہ صاحبوں کی طبیعتوں میں موافقت ممکن نہ تھی۔''

مذہبی حلقوں نے ایک یہ اعتراض کیا کہ مقامی علمائے دین کی اکثریت کو بلایا نہیں گیا اور اگر بلایا گیا تو ان سے مقالہ نہیں پڑھوایا گیا۔ دوسرے بعض عربی مقالات کے انگریزی تراجم درست نہیں تھے، چنانچہ عبدالوہاب عزام نے اپنے ترجمہ پر شدید احتجاج کیا۔ (رک: الاعتصام (لاہور)، 10 جنوری 1958ء)
اس مجلس مذاکرہ میں پڑھے گئے بعض مقالات پر ناقدانہ تبصرے، اس کے مقاصد سے روگردانی اور انتظام و انصرام کی خرابیوں کے لیے رک:

ترجمان القرآن، جنوری 1958ء، اشارات، ص 2-16۔ مقالات کے نامکمل اور ناقص تراجم کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

''ان تراجم کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ محمد اسد کی شکایات بالکل بجا تھیں اور یہ لوگ اس معیار کو قائم نہیں رکھ سکے جس کی مجلس مذاکرہ متقاضی تھی اور جس کی یقین دہانی اسد صاحب کا استعفا قبول کرتے وقت بار بار کرائی گئی تھی۔'' (ص 11)

114- یہ ادارہ (انگریزی نام ''اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'') کراچی میں قائم ہوا۔ فضل الرحمٰن کو اس کا ناظم مقرر کیا گیا۔ یہ ادارہ اب اسلام آباد منتقل ہو چکا ہے اور اس کے موجودہ ناظم معروف اسلامی اسکالر ظفر الحق انصاری ہیں۔

115- جنگ عظیم دوم شروع ہوتے ہی اسد کو گرفتار کر لیا گیا۔ ابتدائی دو ڈھائی سال قید تنہائی میں بسر کیے۔ اس کے بعد انہیں اپنی بیوی اور بچے کو اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ جنگ کے اختتام پر سبھی کو رہائی نصیب ہوئی۔ تفصیل کے لیے رک: گفت، راقم کا مقالہ، جلد اول۔

116- منیرہ بنت حسین نے 1978ء میں وفات پائی۔

117- ابتدائی نو قرآنی صورتوں کا ترجمہ مع تشریح۔ مطبوعہ مکہ: مسلم ورلڈ لیگ، 1964ء۔

118- شیخ احمد ذکی یمانی، سعودیہ کے سابق وزیر تیل۔

119- یہ انگریزی ترجمہ مع تفسیری حواشی The Message of the Quran کے عنوان کے تحت شائع ہوا (1980ء)۔ رک: گفت (جلد اول) کا اس ترجمہ قرآن پر مخصوص حصہ۔

120- پولا کی فراہم کردہ یہ تفصیل اسد کے ترجمہ قرآن کے ابتدائی نمونہ سے متعلق ہے، جو جدہ سے طبع ہوا۔ رابطہ عالم اسلامی کی جانب سے اشاعت کے بعد اس پر پابندی کر دی گئی، لیکن اس سے پہلے دنیائے اسلام کے نامور علمائے دین سے رائے طلب کی گئی۔ جن علماء نے اس ترجمہ پر مستقل پابندی لگانے کی تحریری حمایت کی ان میں مولانا مودودی بھی شامل تھے۔

Marfat.com

اسد نے ان فتووں اور مخالفانہ تنقید وتبصرہ کی ذرہ بھر پرواہ نہ کی اور اپنا کام پورے جوش وجذبہ اور لگن سے جاری رکھا اور اسے مکمل کر دیا۔

انہی دنوں بزمی انصاری نے انگریزی تراجم پر ایک مقالہ سپرد قلم کیا، جس میں محمد اسد کے اس ترجمہ کے متعلق یوں اظہار خیال کیا گیا:

''جرمن نژاد یہودی نومسلم محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس) ان دنوں جنیوا میں مقیم ہیں۔ رابطہ العالم الاسلامی (مکہ مکرمہ) نے ان سے قرآن پاک کا ترجمہ کرایا تھا۔ اس ترجمے کی جلدیں چھپ کر پارسال مکہ مکرمہ پہنچ گئی تھیں اور انہیں مندوبین کانفرنس میں تقسیم کرنے کا ارادہ تھا[1]۔ اسی دوران یہ راز کھلا کہ بعض مقامات پر ترجمہ قابل اعتراض ہو گیا ہے اور وہ دین اسلام کے مسلمات کے خلاف پڑتا ہے[2]۔ رابطہ کے سکریٹری جنرل شیخ سرور الصبان کے حکم سے اس ترجمہ کی اشاعت اور مطبوعہ نسخوں کی تقسیم روک دی گئی۔ غالباً وہ تمام جلدیں ضائع کر دی جائیں گی۔ محمد اسد صاحب کو چونکہ اس کا حق المحنت ادا کیا جا چکا ہے، اس لیے وہ اس ترجمہ کا حق تصنیف گنوا بیٹھے ہیں۔ اب یہ ترجمہ شاید کبھی شائع نہ ہو سکے۔''[3]

۱۔ اس قابل داد ترجمہ کی پہلی جلد مولانا علی میاں کے توسط سے دیکھنے میں آئی تھی اور دوسری جلد کا بڑا اشتیاق وانتظار تھا۔

۲۔ ایسا ترجمہ ناممکن ہے جو سارے علماء کے مسالک کے مطابق اور امت کا متفق علیہ ہو۔ ایک ایک لفظ کے متعدد ترجمہ ہو سکتے ہیں اور کوئی نہ کوئی پہلو کسی نہ کسی فرقہ کے خلاف ضرور جا کر پڑے گا۔

۳۔ اناللہ...... اللہ ایسا کرے کہ کوئی صورت اس کے طبع واشاعت کی نکل آئے۔ انگریزی کے دو چار ترجمے (اپنے نقائص کے باوجود) بہترین ہیں۔ ان میں سے ایک وہ بھی ہے۔

(صدق جدید (لکھنؤ)، 2 جون 1967ء، ص 8، حواشی از مدیر)

تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد عبدالماجد دریابادی نے ''ایک افسوسناک فیصلہ'' کے زیر عنوان درج ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا:

''نومسلم شارح بخاری ومترجم قرآن علامہ اسد کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت کے روک دیئے جانے کا تذکرہ ''صدق'' میں آچکا ہے۔ اب اس کی تصدیق موصوف کے ایک قریب ترین ذریعہ سے بھی ہو گئی۔ معلوم یہ ہوا ہے کہ ترجمہ وتحشیہ کے بعض مقامات پر موتمر رابطہ عالم اسلامی کے بعض علماء کو کچھ اعتراض پیدا ہوا اور اس کی بنا پر کتاب کی اشاعت روک دی گئی ہے۔ کل پہلی ہی جلد تو ابھی تک نکلی تھی اور باقی دو جلدیں تو ابھی باقی تھیں۔ اعتراضات کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ اجمالاً صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ بعض مقامات کی تفسیر وتعبیر مفسرین سے ہٹ کر مفتی محمد عبدہٗ اور رشید رضا مصری کے اقوال کے مطابق تھی۔ یہ اگر صحیح ہے تو بندش تفسیر کا فیصلہ افسوسناک ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ قرآن مجید کی کوئی ایسی تفسیر لکھی جائے جس کے ہر جزو سے سارے ہی علماء کو اتفاق ہو۔ اور تفسیر تو بڑی چیز ہے، نفس ترجمہ ہی پر اتفاق کامل ممکن نہیں۔ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین تینوں تو ایک ہی مکتب فکر کے اور مسائل میں ہم عقیدہ وہم مسلک ہیں اور زمانہ میں بھی زیادہ فصل نہیں۔ اس پر بھی تینوں کے ترجمے ملا کر پڑھیے۔ ایک دوسرے سے اختلاف خفیف اور برائے نام نہیں ہے۔ اچھا خاصہ نمایاں اور واضح فرق نظر آئے گا۔ انہیں بھی جانے دیجئے۔ قدیم تفسیریں جو تیسری صدی سے

Marfat.com

ساتویں صدی تک لکھی گئی ہیں اور جو آج تک اسناد کے انتہائی مرتبہ پر ہیں۔طبری، قرطبی، کثیر وغیرہ ان میں ایک ایک آیت سے متعلق کتنے اختلافات آپ کو منقول پائیں گے۔اختلافات محض مفسرین ہی کے درمیان نہیں، تابعین بلکہ خود صحابہ کے درمیان؟ یہاں تک کہ حدیثیں بھی ایک دوسرے سے معارض۔یہ حال اس زمانہ کا تھا اور اب تو سائنس اور دوسرے علوم کے بعد متعدد آیات کی نئی تعبیر وتشریح ناگزیر ہوگئی ہے اور اللہ کے کلام کی عین بلندی دکھانے کے لیے قدیم مفسروں سے جا بجا ہٹنا اور ہر نئے اختلاف کو بشرطیکہ وہ دلیل صحیح کے ساتھ ہو، برداشت کرنا واجبات میں سے ہے اور ایسے مفید کام کو جیسا کہ اسد صاحب کر رہے تھے، روک دینا محض ایک نمونہ افسوسناک تنگ نظری کا ہے۔''

(صدق جدید (لکھنؤ)، 21 جولائی 1967ء، ص 1-2، اداریہ)

اس ضمن میں مرقومۃ الذیل مراسلہ بھی اہم معلومات فراہم کرتا ہے:

''ڈاکٹر اسد کا انگریزی ترجمہ قرآن

21 اور 28 جولائی کے پرچے آج موصول ہوئے۔ڈاکٹر محمد اسد کے ترجمۂ قرآن کے سلسلہ میں جناب بزمی انصاری کا ایک مراسلہ ''صدق'' میں شائع ہوا تھا، وہ پرچہ مجھے ذرا تاخیر سے ملا تھا۔دوسرے اپنی مشغولیت کی بنا پر اس وقت کچھ عرض نہ کرسکا تھا۔آج ''صدق'' (21 جولائی) میں ایک ''افسوسناک فیصلہ'' کے عنوان سے جناب والا کا نوٹ نظر سے گزرا۔

رابطہ سے تعلق کی بنا پر اس سلسلہ میں مجھے جو براہ راست معلومات ہیں، وہ عرض کرنا چاہتا ہوں:

ا۔رابطہ عالم اسلامی نے ڈاکٹر محمد اسد سے حقوق اشاعت حاصل نہیں کئے ہیں۔حقوق اشاعت ڈاکٹر محمد اسد نے اپنی بیوی کے نام رجسٹرڈ کیا ہے۔یہ اعلان پہلی جلد کے پہلے صفحہ پر موجود ہے۔جناب والا! اس ترجمہ کی پہلی جلد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں مدظلہ کے واسطہ سے ملاحظہ فرما چکے ہیں۔اگر اب بھی وہ نسخہ جناب کے پاس ہے تو ملاحظہ فرما لیں یا دوبارہ طلب فرما کر تصدیق کرلیں۔

۲۔رابطہ نے اس ترجمہ کی اشاعت سے پہلے اشاعت میں مدد اور تعاون کے طور پر اس کی چار ہزار کاپیاں پیشگی قیمت (بحساب ڈھائی پونڈ کاپی) دے کر خریدلی تھیں۔رابطہ جس طرح دوسری بعض اسلامی مطبوعات مسلم اداروں اور ضرورت مند اہل علم کو مفت پیش کرتا ہے، اسی ضمن میں یہ ترجمہ بھی تھا۔لیکن جب اس کی پہلی جلد چھپ کر آئی تو اس پر مجلس رابطہ کے علماء کو اعتراض ہوا۔نقطہ اعتراض جہاں تک مجھے معلوم ہے، وفات مسیح میں قادیانی نظریہ کی ہمنوائی ہے۔

۳۔جناب والا کے علم میں یہ بات جولائی گئی ہے کہ نقطہ اعتراض مفتی محمد عبدہٗ اور ان کے شاگرد رشید رضا کے خیالات کی ہم آہنگی ہے۔میرے خیال میں صحیح نہیں ہے کیونکہ مفتی محمد عبدہٗ کی تفسیر میں جو قابل اعتراض پہلو ہیں، ان کا تعلق حقیقت روح، ماہیت ملائکہ (آیا وہ نور سے پیدا کئے گئے ہیں یا نہیں اور ان کی زندگی سے تعلق) معجزات انبیاء، حقیقت جن، موضوع تابوت، روح (ملک یمین) وغیرہ۔ان مسائل میں ڈاکٹر محمد اسد نے مذکورہ بالا مفسرین کی ہمنوائی نہیں کی ہے بلکہ جمہور علماء اسلام سے ان کی تفسیر مطابق ہے۔

Marfat.com

۴۔ بہر حال رابطہ عالم اسلامی کو اس ترجمہ کی اشاعت روکنے یا نہ روکنے کا کوئی حق نہیں تھا اور نہ اس نے ایسا کیا ہے۔ وہ صرف اپنی خرید کردہ کاپیوں میں تصرف کا مجاز ہے، خواہ اس کو تقسیم کرے یا نہ کرے اور یہ مسئلہ اب بھی مجلس تاسیس کے ایجنڈے پر ہے۔ دوسرے علماء جو رابطہ کے ممبر نہیں ہیں، اپنی رائیں براہ راست یا کسی رکن کے ذریعہ بھیج سکتے ہیں۔

عبداللہ عباس ندوی

لیڈس یونیورسٹی، برطانیہ

(صدق جدید (لکھنؤ) یکم ستمبر 1967ء، ص 8)

121- اس انگریزی ماہنامہ کے کرتا دھرتا محمد صلاح الدین تھے، جن کا آبائی ملک مصر تھا لیکن وہ عرصہ دراز سے سعودی عرب میں مقیم تھے۔ یہ مجلّہ چند برس باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور پھر بند ہو گیا۔ اس رسالے کے ایک شمارہ میں اسد کا تفصیلی انٹرویو مع تصاویر شائع کیا گیا، بلکہ سرورق پر بھی ان کی تصویر شائع کی گئی۔ اس ماہنامہ کی اکثر اشاعتوں میں اسد کی کتابوں کے اشتہار کو نمایاں طور پر جگہ دی جاتی تھی۔

122- This Law of Ours and other Essays۔ مطبوعہ دار الاندلس۔ 1987ء

123- محمد اسد کو صدر پاکستان کی دعوت برطانیہ میں پاکستانی سفیر علی ارشد کے توسط سے موصول ہوئی۔ اس دفعہ ان کا دورہ سرکاری نوعیت کا تھا اور ان کی حیثیت مولانا ظفر احمد انصاری کمیشن کے مشیر کی تھی۔ ان کے بلانے کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ اسلامی طرز حکومت اور انتخابات وغیرہ کے بارے میں اسلامی اصولوں کی وضاحت کریں اور اپنے رائے پیش کریں۔ نیز ایک اسلامی ریاست میں پارلیمنٹ کے انتخابات کس طرح ہوں؟ سربراہ مملکت کا انتخاب کیسے ہو؟ انتخابات میں حصہ لینے والوں کی اہلیت کی بنیاد کیا ہو؟ وغیرہ۔ انہوں نے کمیشن کے چیئرمین، اراکین اور صدر پاکستان سے ملاقاتوں کے دوران میں ان اہم مسائل کے بارے میں اپنے مؤقف کو تفصیل سے بیان کیا، جس کے مطابق پاکستان فوجی طرز کے پارلیمانی نظام کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہاں ایک شخص کی حکومت ہو اور وہی سربراہ مملکت ہو۔ اس نظام کو صدارتی کے علاوہ کوئی اور نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ پارلیمنٹ دو ایوانی ہو۔ قومی سطح پر مجلس شوریٰ ہو جس کے نمائندے براہ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کیے جائیں۔ ایک سینٹ ہو جس کے لیے تمام صوبوں کو مناسب نمائندگی دی جائے۔ مجلس شوریٰ اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس میں صدر یا سربراہ حکومت کا انتخاب کیا جائے۔ ایک ایسا مصالحتی ادارہ بھی ہونا چاہیے کہ اگر مجلس شوریٰ، سینٹ یا ان دونوں اداروں کے مشترکہ اجلاس میں کوئی معاملہ طے نہ ہو سکے تو صدر اسے اس مصالحتی ادارے کے سپرد کر سکے جو اس مسئلہ کے اسلامی ہونے کا تجزیہ کرے اور اس ادارے کا فیصلہ حتمی ہو گا۔ اسد کی رائے میں موجودہ زمانے میں خلفائے راشدین کا دور کامیاب نہیں رہ سکتا۔ اس دور میں خلیفہ نے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کیا۔ اسلام میں بڑی لچک ہے۔ یہ مذہب ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس میں حکومت کرنے کا کوئی نظام متعین نہیں، بلکہ اصول بتائے گئے ہیں جن کی روشنی میں ہم اپنے لئے بہتر نظام مرتب کر سکتے ہیں مگر اس کی بنیاد خالص اسلامی ہو اور خالصتاً شریعت کے مطابق عمل کیا جائے۔ ان کے خیال میں کسی ایک حلقے سے عورت اور مرد امیدوار ہو سکتے ہیں۔ ان

Marfat.com

میں سے کوئی بھی کامیاب ہوکر مجلس شوریٰ تک پہنچ سکتا ہے۔اس طرح عورتوں کو ان کے حقوق ملنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔انہوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام کی حقیقی روح اور قرآن و سنت کے احکام کی مکمل پیروی کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے تقاضوں اور ضروریات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اسلام تمام زمانوں اور انسانی زندگی کے تمام ادوار کے مسائل کے بنیادی اصول پیش کرتا ہے۔اسلام کے متعلق صرف باتیں کرنے کی بجائے اپنی زندگیوں کو اس کے سانچے میں ڈھالنا ضروری ہے۔

اسلام آباد کے بعد اسد ایک دوروز کے لئے لاہور آئے اور اپنے پرانے دوستوں سے مل کر واپس چلے گئے۔یہ ان کے محبوب ترین ملک پاکستان کا آخری دورہ تھا۔اس کے بعد وہ یہاں آنے کی حسرت دل میں لئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اس دورے کی تفصیل کے لئے رک: نوائے وقت، یکم اگست، 12 اگست و26 اگست 1983ء۔

124- انہی دنوں پاکستان کے معروف دانشور اور صحافی جناب خالد احمد پرتگال گئے اور وہ سفیر سمیت اسد اور پولا سے ملے۔اس ملاقات کے تاثرات مع تصویر کے لیے رک: گفت، جلد اول۔

125- سیمون کے اس انٹرویو کے انگریزی ترجمہ کے لیے رک: گفت، جلد اول۔

126- ایلسا شیمان (اسلامی نام عزیزہ)۔7 دسمبر 1878ء کو برلین میں پیدا ہوئی۔فن مصوری سے گہرا لگاؤ تھا۔محمد اسد کی پہلی بیوی، جوان سے عمر میں تقریباً پندرہ سال بڑی تھی۔اسد کے قبول اسلام کے ایک ہفتہ بعد انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔پہلے برلین اور پھر قاہرہ میں دونوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔1927ء میں مکہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئیں۔پہلے خاوند سے ان کا بیٹا ہائنرخ شیمان نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ان کا اسلامی نام احمد شیمان تھا۔ان کا انتقال 2002ء میں ہوا۔

127- محمد اسد کے دادا کا نام Benjamin Weiss تھا۔سنہ ولادت 1841ء اور سنہ وفات 1912ء۔وہ Czernowitz کے ایک کٹر یہودی مبلغین کے گھرانے کا فرد تھا۔یہ شہر ان دنوں بوکووینا کا دارالحکومت تھا اور آجکل یوکرین میں شامل ہے۔

Marfat.com

اسلامک کولوکیم میں شرکت کا دعوت نامہ
مجھے اسد صاحب ہی کے دستخط سے الغزہ میں موصول ہوا تھا۔
میں نے اس کا جواب لکھا تو تخاطب میں مسٹر اسد کی جگہ
Herr Asad لکھ دیا، انہیں اس طرزِ تخاطب میں بیگانگی محسوس
ہوئی اور انہوں نے شکایت کا خط لکھا۔
کولوکیم کمیٹی کی سیکرٹری شپ سے وہ کولوکیم کے انعقاد
سے قبل تھا یا تو خود ہی مستعفی ہو گئے یا الگ ہٹا دیے گئے۔
میاں افضل حسین صاحب اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے وائس
چانسلر تھے اور کولوکیم کمیٹی کے صدر، میرا قیاس ہے کہ ان دو
عالی مرتبہ صاحبوں کی طبیعتوں میں موافقت ممکن نہ ہوئی۔

ڈاکٹر داؤد رہبر کے مکتوب بنام محمد اکرام چغتائی (29 مارچ 2008ء) کا ایک اقتباس متعلقہ اسلامک کلوکیم

Marfat.com

DER WEG NACH MEKKA: MOHAMMAD ASAD

Von Karl Günter Simon
Fotos Hermann Dornhege

FAZ Magazin 18 NOV. 1988

Das weiße Dorf klebt an den Hängen über jener sonnigen Küste, von der die Spanier inzwischen sagen: Gibraltar werden wir vielleicht wiederkriegen, die Costa del Sol nimmermehr. Das weiße Dorf – alte Kirche, Wallfahrtsgrotte, malerische Plaza de Toros – ist inzwischen ein Thema der Anthropologen-Soziologen; drei Bücher haben sich dem Dorf gewidmet. Vor zwanzig Jahren lebten hier achttausend Einheimische, zwei Drittel in ihren Fincas auf dem Feld; das Leben war mühsam, die Dörfler, die Großgrundbesitzer ausgenommen, waren bitterarm.

„In diesem Jahr, 1988", sagt die nette Dänin im Ausländerbüro des Ayuntamiento, „haben wir sechzehntausend Spanier und zweiunddreißigtausend turistas residentes, Häuschenbesitzer aus zweiundfünfzig Nationen." Das Gemüse ist teuer, die Äcker sind schmucke Villengärten, die Bauern haben sich in Maurer und Kellner verwandelt, zahllose Kneipen servieren fried chicken oder fish and chips. Die Esel befördern Touristen, und flotte Mopeds heulen durch die Nacht. Das Dorf – vor zwanzig Jahren per Auto kaum zu erreichen – gilt heute als eine der reichsten spanischen Kommunen; das neue Rathaus hat drei Millionen Mark gekostet.

Eines von ein paar tausend neuen Häusern heißt Dar al-andalus. Dar ist arabisch, das Wort für „Haus"; andalus hat, obwohl es arabisch-spanisch aussieht, eine germanische Wurzel: Die Vandalen waren die ersten Germanen, die hier die Sonne suchten.

Ein afghanischer Hirtenhund steht wie ein Denkmal über der Gartenmauer; eine Frau öffnet das Tor. Sie sei Nordamerikanerin, sagt sie dem neugierigen Taxifahrer, der sich zum erstenmal hierher verirrt, „und mein Mann ist Österreicher-Pakistani", das sei alles ziemlich kompliziert. Welche Sprache beliebt? „Englisch", sagt der Mann an der Haustür, „aber auch Arabisch oder Deutsch." Und wenig später: „Wen kennen Sie noch von der Frankfurter Zeitung? Benno Reifenberg, Paul Medina oder den Doktor Heinrich Simon?" Persönlich kenne ich keinen, nicht mal den Simon. In Berlin? „Bert Brecht traf ich im Café des Westens, oder war es das Romanische Café? Marlene Dietrich, Murnau. Erinnern Sie sich an Colin Ross?" Nur den Namen. „Wir waren die beiden Reisereporter, Colin Ross und ich – ich, na ja, Leopold Weiß ..." Leopold Weiß ist vergessen. Muhammad Asad ist berühmt, jedenfalls in der Welt des Islam. Dieses Jahr wird er achtundachtzig.

„Um die Wiedergeburt des Islam zu erreichen, müssen wir nicht nach neuen Leitbildern suchen, die von außen kommen. Wir müssen nur die alten Prinzipien wiederbeleben, die wir vergessen haben. Fremde Kulturen mögen uns neue Impulse geben, aber die perfekte Werkstatt des Islam können wir nicht durch irgend etwas Nicht-Islamisches ersetzen, ganz gleich, ob es vom Westen oder Osten stammt. Der Islam, diese geistige und soziale Institution, kann nicht verbessert werden. Was wie ein Verfall des Islam aussieht, ist in Wahrheit nur der Tod und die Leere in unseren Herzen ..." – Eine Streitschrift der Muslim-Brüder? Ein Manifest der Fundamentalisten, wer immer die auch sind? O nein. Diese modernen Sätze stehen in einem alten Bändchen aus dem Jahr 1933: „Islam at the crossroads" war das erste Buch des Muhammad Asad. Nicht ganz das erste des Autors: Leopold Weiß hatte, als Vierundzwanzigjähriger, „Unromantisches Morgenland" geschrieben, Reportagen im Verlag der Frankfurter Zeitung. Beim zweiten Buch hat die Feder gestreikt. Er wollte fort von Frankfurt, heim ins Morgenland. „Weit weg, fast wie ein Traum", so heißt es in der Erinnerung des Zweiunddreißigjährigen, „liegt meine abendländische Vergangenheit zurück – nicht unwirklich genug, um vergessen zu werden, und nicht mehr wirklich genug, um Teil meiner Gegenwart zu sein. Sooft ich mich einige Monate in einer Stadt aufhalte, wächst eine Unruhe in mir auf, ein Verlangen nach Tat und Bewegung, nach der trockenen, frischen Wüstenluft, nach dem Geruch der Kamele und ihrem wiegenden Schritt ..."

Heinrich Simon – der Enkel des Leopold Sonnemann, der die Frankfurter Zeitung gegründet hatte – hat seinen Starautor gefeuert. Aus Leopold Weiß wurde Muhammad Asad, aus dem Reporter ein Gelehrter des Islam.

Die ersten, die mir von Muhammad Asad erzählten, waren Araber, Muslime. Ich las seine Studie „The Principles of State and Government in Islam", ein schmales Bändchen, das heute in einer Epoche, da die Muslime auch in der Politik nach ihren alten Wurzeln suchen, immer mehr an Gewicht gewinnt. Und Araber legten mir „The Road to Mecca" ans Herz, den Lebensbericht, der im Jahr 1932 endet: Muhammad Asad entschloß sich, zweiunddreißigjährig, Arabien zu verlassen und gen Osten zu reisen, nach Indien. Von da an ließ sich seine Biographie nur noch in Bruchstücken rekonstruieren: Pakistan, New York, was dann? Deutsche Muslime berichteten mir, sie hätten den alten Muhammad Asad in Mekka gesehen, als Pilger; er lebe in Tanger. Schließlich half uns ein deutscher Botschafter, der selbst ein Muslim ist, auf die richtige Spur.

Das weiße Dorf. Dar al-andalus. Er gebe keine Interviews mehr, sagt Frau Pola Hamida, aber der Name „Frankfurter" habe ihn wohl sentimental gemacht.

Wir sitzen beim Abendessen. Lachs aus dem Supermarkt in Marbella, frisches schwarzes deutsches Brot. „Das beste Brot", sagt der alte Herr, „das hat ein Bäcker in Lwów gebacken, ich habe den Geschmack noch auf der Zunge." Lwów? „Na ja, Lemberg, das war damals Österreich. Wissen Sie, Lemberg kommt von ‚Löwe' – und als ich 1926 in Berlin zum Islam konvertierte, sagte der indische Imam zu mir: Sie heißen Leopold, und Leo heißt Löwe – also nehmen wir den arabischen Namen für ‚Löwe': Asad."

Lwów, Lemberg, im Jahr 1900 – „eine lange Straße von etwas verstaubter Eleganz, von Kastanienbäumen umsäumt und mit Holzklötzchen gepflastert, die den Hufschlag der Pferde dämpften und jede Tagesstunde in einen lässigen Nachmittag verwandelten. Ich liebte diese liebliche Straße weitaus bewußter, als es meinem kindlichen Alter zukam, und nicht nur etwa, weil es meine heimatliche Straße war. Ich liebte sie, glaube ich, um der stattlichen Selbstbeherrschung willen, mit der sie aus dem heiteren

فرانکفورٹ (جرمنی) کے اخبار میں شائع شدہ محمد اسد کا آخری انٹرویو (18 نومبر 1988ء)

Marfat.com

Muhammad Asad (Leopold Weiss, 1900-1992), an Austrian converted Muslim, wrote his "spiritual autobiography" entitled *The Road to Mecca* (1954) that covers his life till the point of his departure from Arabia to India in 1932. His readers were left with a thirst for the remainder of his autobiography and expressed the hope that he would continue his life story where he left off in *The Road to Mecca.*

In his last years, Muhammad Asad began work on a sequel, tentatively entitled *Homecoming of the Heart,* which unfolded the rest of his active and fruitful life (1932-1992). It was partially completed by Asad--part one--and the second part was accomplished by his wife, Pola Hamida Asad (d. 2007). The present book is the Urdu translation (with copious notes and annotations) of this still unpublished sequel.

Marfat.com

Muhammad Asad
A Man of the Desert

By

Muhammad Asad

Pola Hamida Asad

Translated & annotated by

M. Ikram Chaghatai

The Truth Society, Lahore

2009

Marfat.com

محمد اسد (1930ء)

Marfat.com

منیرہ بنت حسین (م۔1978ء) اپنے نومولود بیٹے طلال اسد (سنہ ولادت 1932ء، مدینہ شریف) کے ہمراہ (یہ تصویر صرف "شاہراہ مکہ" کے جرمن ایڈیشن (1955ء) میں طبع ہوئی)۔

Marfat.com

شاہ ابوالفیصل، محمد اسد کے قریبی دوست اور سرپرست (تصویر از محمد اسد)

Marfat.com

علامہ محمد اقبال کی تصویر جو محمد اسد نے اپنے کیمرے سے خود کھینچی (1934ء؟)

Marfat.com

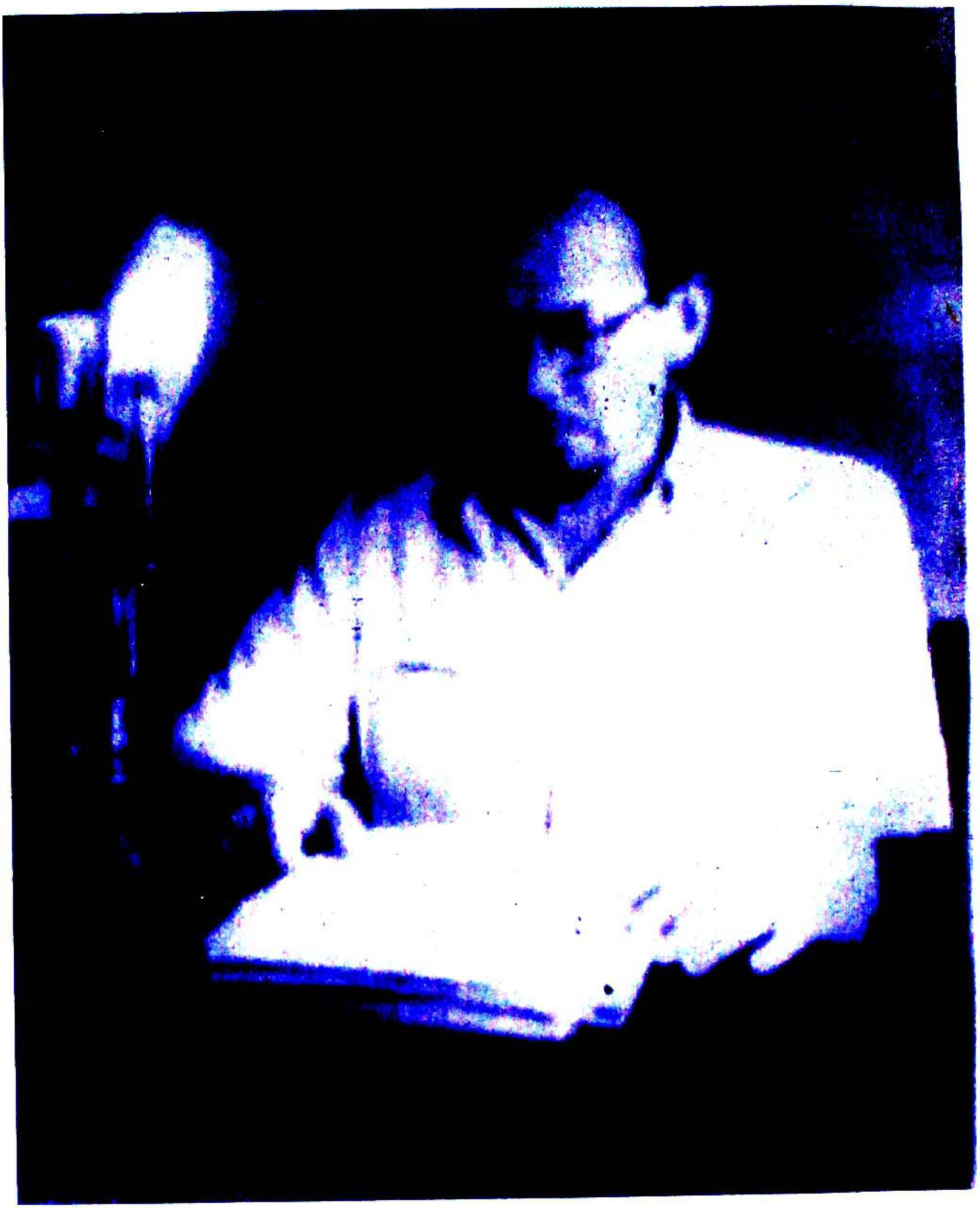

ریڈیو پاکستان لاہور، بسلسلہ تقاریر (اوائل 1948ء)

Marfat.com

سرکاری وفد کے ایک اہم رکن کے حیثیت سے سعودی عرب میں ایک اجلاس سے خطاب (1950ء)

اقوام متحدہ (نیویارک) میں چیئرمین پاکستان کی حیثیت سے (1952ء)

Marfat.com

بطور سفارت کار، اقوام متحدہ (1952ء)

Marfat.com

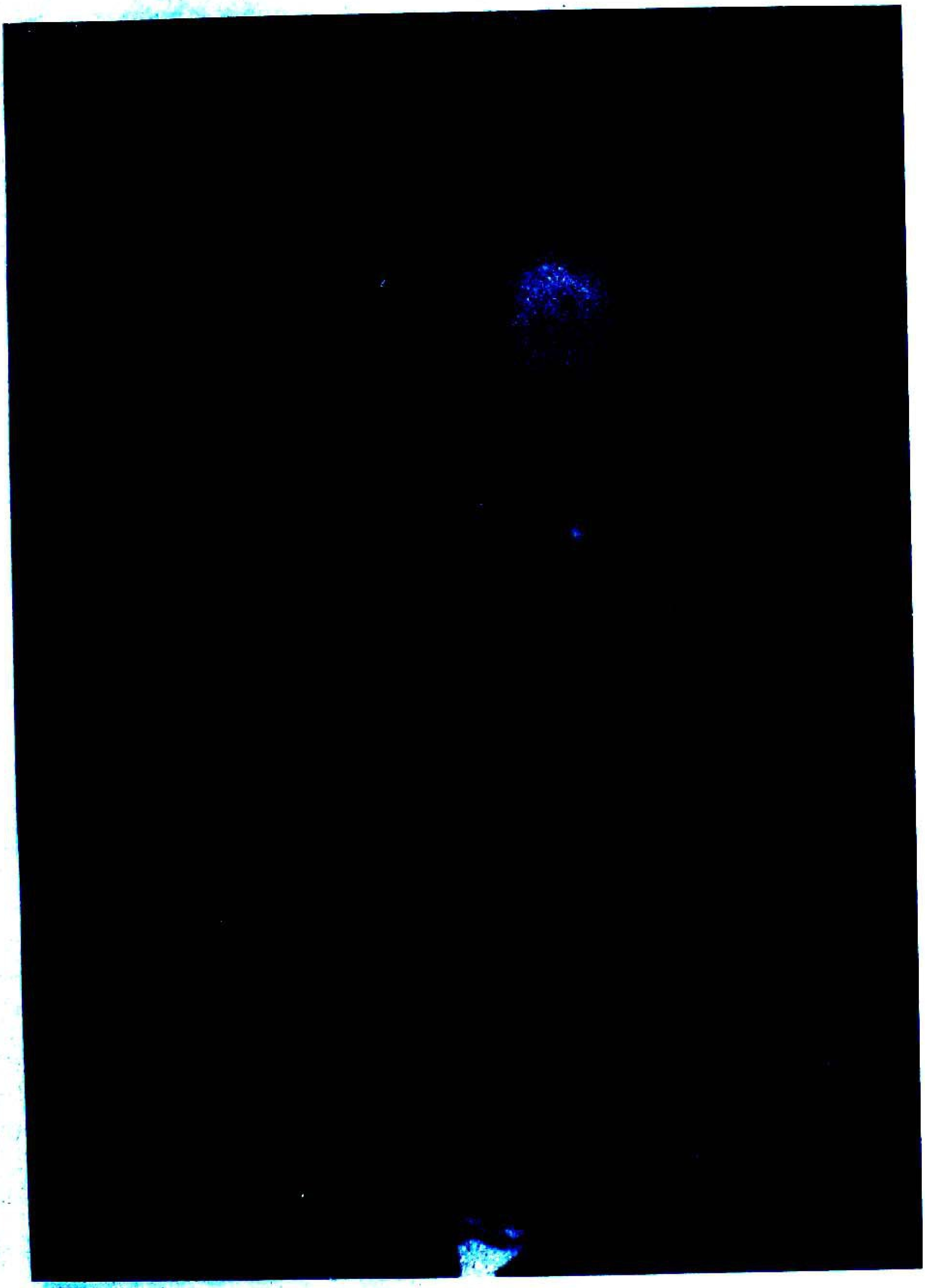

بطور سفارت کار، اقوام متحدہ (1952ء)

Marfat.com

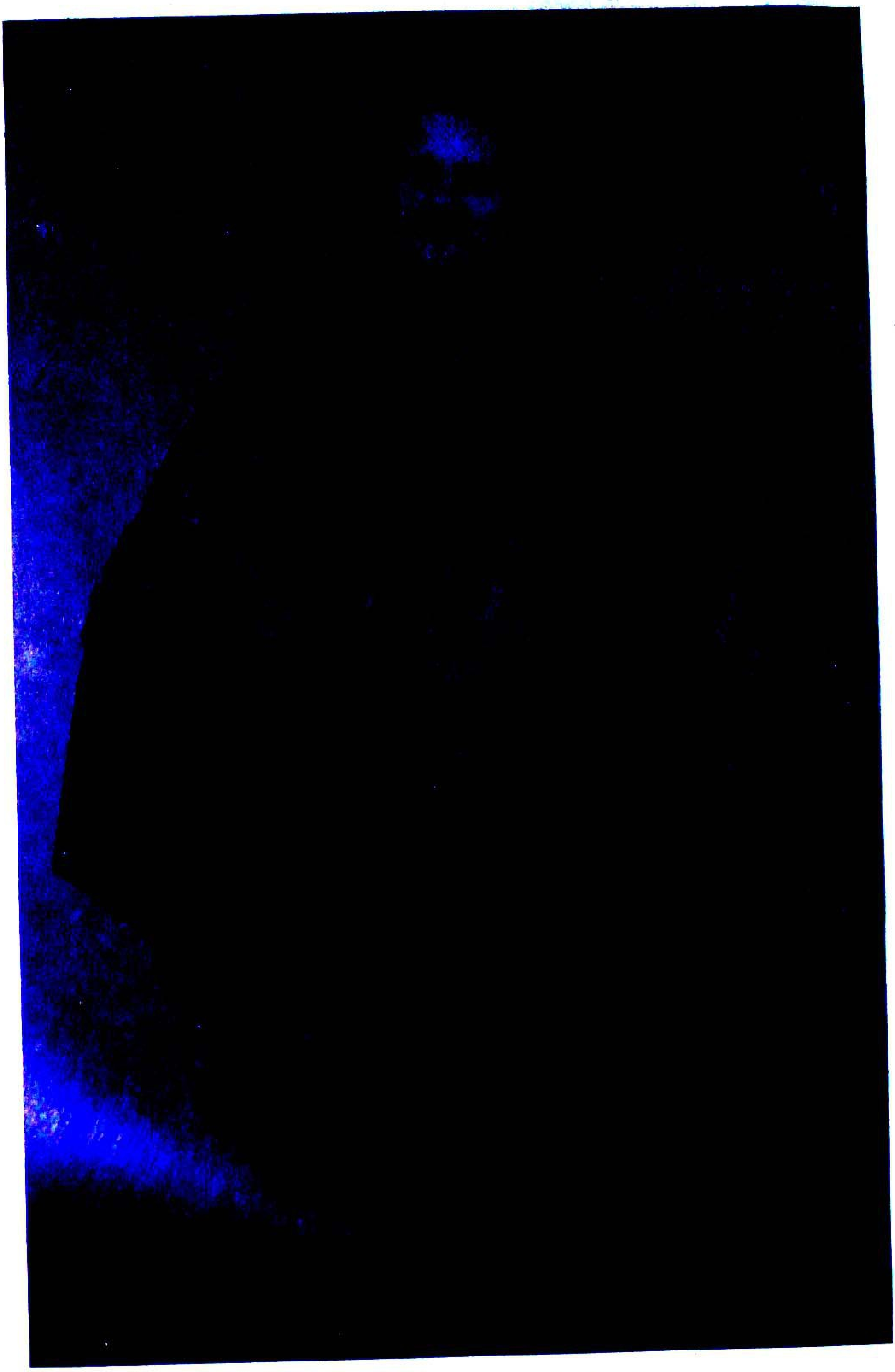

محمد اسد کی رفیقہ حیات پولا حمیدہ اسد (1957ء)

Marfat.com

اقوام متحدہ کے ایک اجلاس میں مندوبین سے ملتے ہوئے (1953ء)

Marfat.com

پاکستان کے سابق وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں کے ہمراہ (1952ء)

اقوام متحدہ کے ایک اجلاس میں، سامع کی حیثیت سے (1952ء)

Marfat.com

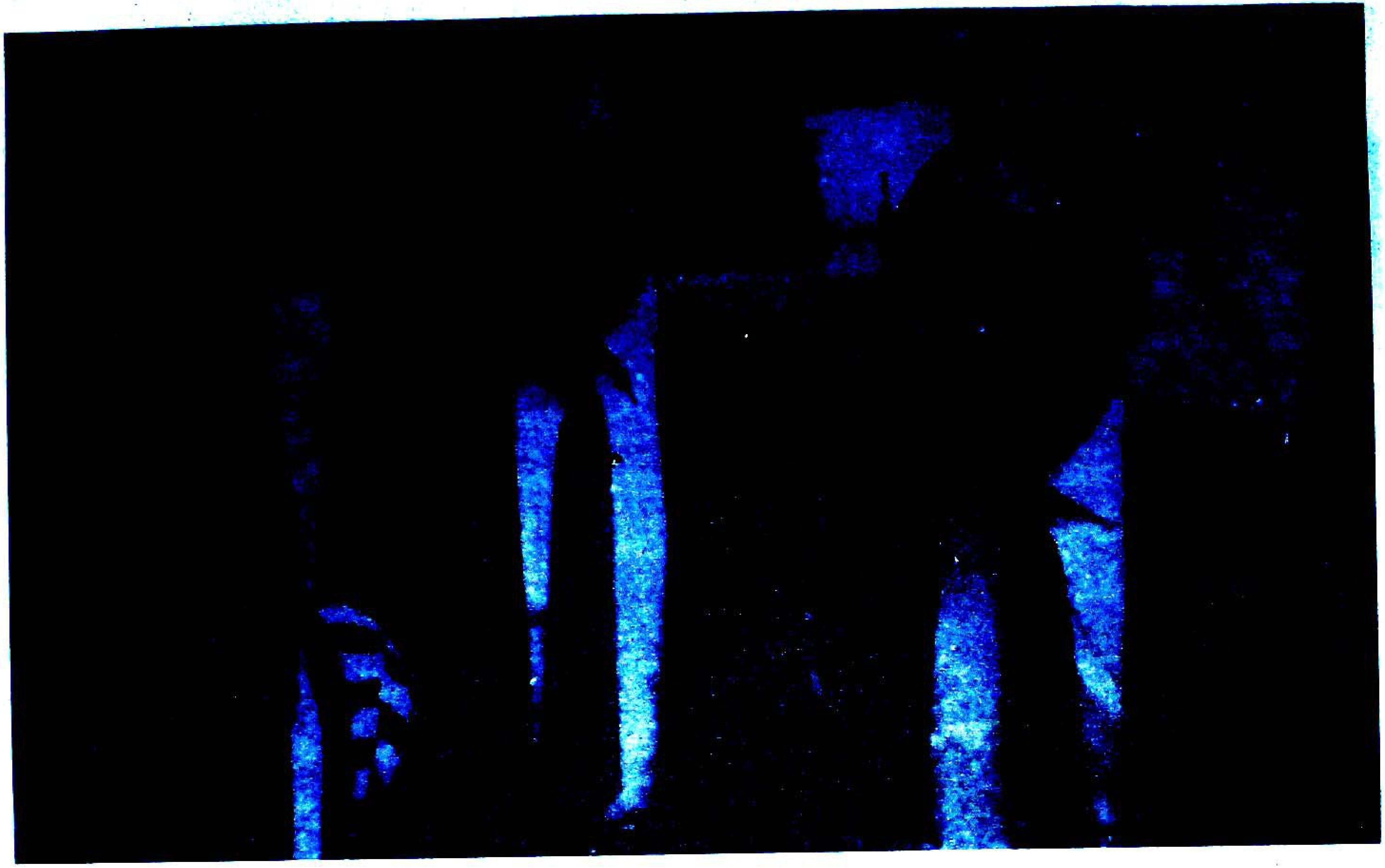

محمد اسد، جرمنی کے سابق نومسلم سفیر مراد ہوفمان اور پولا حمیدہ اسد (1985ء)

Marfat.com

اسلامک کلوکیم (لاہور، 1958ء)۔ پنجاب یونیورسٹی کے طلباء عزت علی، محمد جہانگیر عالم اور حافظ عبدالغفور کے ہمراہ

محمد اسد تصنیف و تالیف میں مصروف (1982ء)

Marfat.com

محمد اسد مراکش کے شہر تنجیہ (Tangier) میں (1982ء)

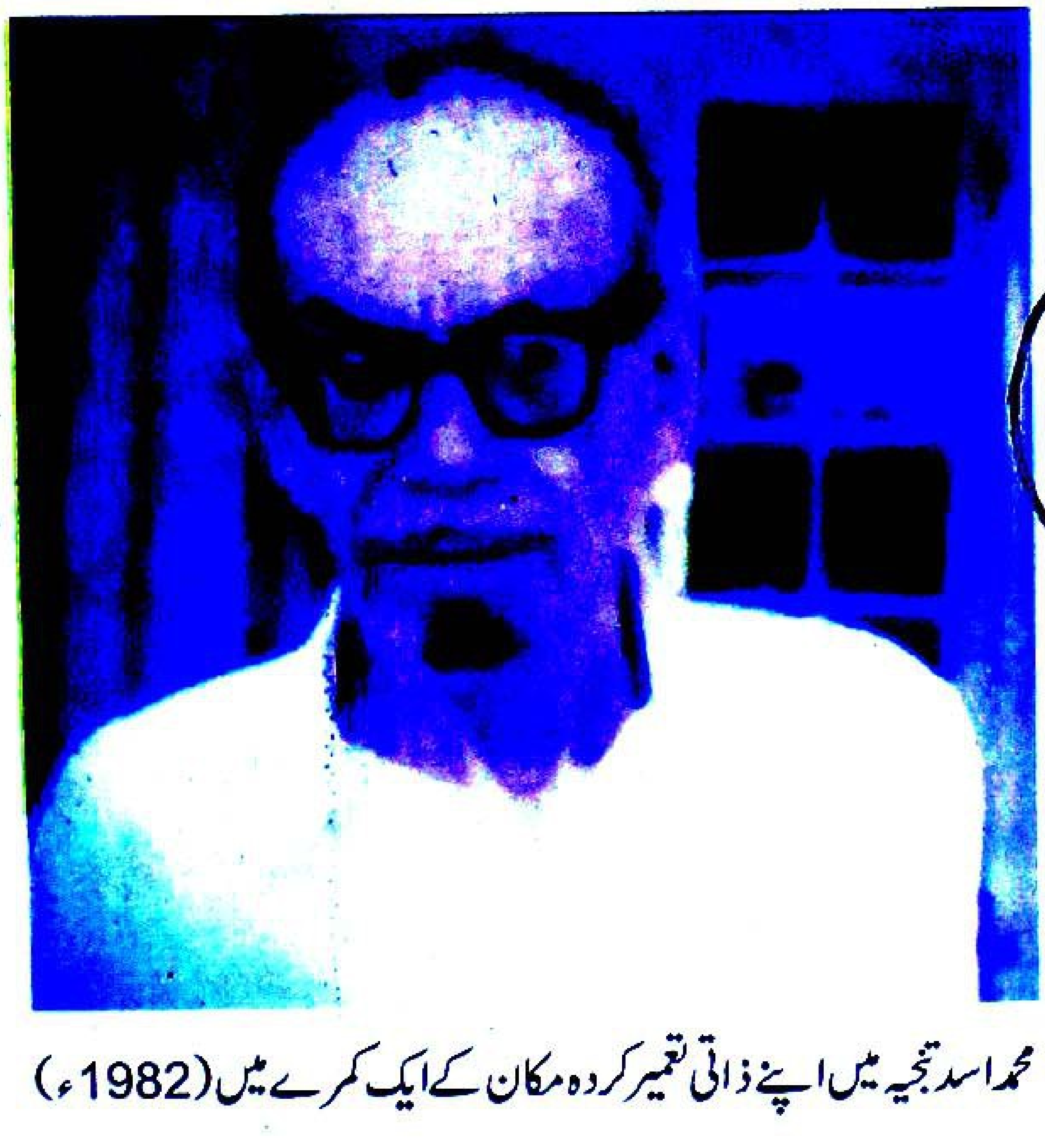

محمد اسد تنجیہ میں اپنے ذاتی تعمیر کردہ مکان کے ایک کمرے میں (1982ء)

Marfat.com

Marfat.com

Muhammad Asad (Leopold Weiss, 1900-1992), an Austrian converted Muslim, wrote his "spiritual autobiography" entitled *The Road to Mecca* (1954) that covers his life till the point of his departure from Arabia to India in 1932. His readers were left with a thirst for the remainder of his autobiography and expressed the hope that he would continue his life story where he left off in *The Road to Mecca*.

In his last years, Muhammad Asad began work on a sequel, tentatively entitled *Homecoming of the Heart*, which unfolded the rest of his active and fruitful life (1932-1992). It was partially completed by Asad--part one--and the second part was accomplished by his wife, Pola Hamida Asad (d. 2007). The present book under the title *Muhammad Asad--A Man of the Desert*, is an Urdu translation (with copious notes and annotations) of this still unpublished sequel.

Apart from this, M. Ikram Chaghatai authored and compiled two other books on Muhammad Asad's life and his contribution to Islamic learning, *viz.*: i) *Muhammad Asad: Europe's Gift to Islam* (2 vols., Lahore: The Truth Society, 2006), a voluminous English book that covers Asad's biography, different scholarly studies and rare bibliographical material; ii) *Muhammad* Asad--An *European Bedouin* (in Urdu, Lahore 2009) that deals with the critical studies of Asad's writings and their translations.

M. Ikram Chaghatai is a reputed scholar of the country who was decorated by the Austrian Federal President in 1998 for his diligent researches about the history of orientalism in German-speaking countries. Prof. Dr. Annemarie Schimmel (d. 2003), a renowned German orientalist writes: "I have known Ikram Chaghatai....who have mastered German. His bibliographical knowledge is overwhelming, and as a scholar trained in the classical German tradition of strict historical research I cannot but admire his skill and his thorough interpretation of the sources. I had always found Ikram Chaghatai to be an inexhaustible source of information, and have learnt much [illegible] painstaking approach to my own culture which he, through many years, has [illegible] in the language of his country. By doing so [illegible] has proven himself [illegible] between Germany and Pakistan, and I do hope that he will be given the [illegible] for the services he has rendered to both countries and, above all, to true, [illegible] scholarship ... I am sure that not only his compatriots but also European scholars will greatly benefit from his scholarly work."

Marfat.com